مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ یونس

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

CamScanner

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۂ یونس)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	مئی 2017ء
مطبع	....	باقریونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

سرٹیفیکیٹ تصحیح

مطالب القرآن فی دروس الفرقان
کی سورۂ یونس بغیر قرآنی عربی متن
کے مکمل پروف کی مکمل پروف ریڈنگ
کی گئی ہے۔

ٹوٹل بل = 3000 ہزار

[signature]
20/8/16

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویز ؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)

ایک ضروری وضاحت

''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کا زریں سلسلہ محترم محمد اشرف ظفر صاحب کے بنیادی کام کے بعد اب تک محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی زیرادارت تکمیل کے مراحل سے گذرتا رہا۔ فی الحقیقت اگر ڈاکٹر منظور الحق صاحب جیسی علمی اور تحقیقی شخصیت کی محنتِ شاقہ شامل نہ ہوتی تو شاید اس سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی ہی وجود میں نہ آتی۔ علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کے دروس الفرقان کی تسوید، پروف ریڈنگ اور حاشیہ نویسی کے بعد طباعت کے مراحل طے نہ ہو پاتے اگر ڈاکٹر صاحب موصوف حامی نہ بھرتے۔ ''دروس الفرقان'' کی 29 ضخیم جلدوں کی اشاعت میں اگر یہ کہا جائے کہ کلیدی کردار انہی کا رہا تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ ہماری کوتاہ بختی ہے کہ اب ڈاکٹر صاحب پیرانہ سالی کے باعث اور کچھ طبیعت ناساز رہنے کی وجہ سے اِس قدر باریک بینی کا کام اس رفتار سے نہیں کر پاتے جو کہ ان کا خاصہ رہا۔ بہ امرِ مجبوری دروس الفرقان کی آئندہ جلدیں کسی قسم کی ایڈیٹنگ کے بغیر علامہ پرویزؒ کے بولے ہوئے الفاظ کو جوں کا توں (As it is) درج کر کے شائع کی جارہی ہیں تا کہ باقی ماندہ دروس کو کتابی شکل میں شائع کر کے اس سلسلۃ الذہب کو جلد از جلد مکمل کیا جا سکے۔ ان دروس کی کمپوزنگ/کتابت میں اغلاط کی نشاندہی کے لیے محترم شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ صاحب نے ذمہ داری قبول کی ہے جس کے لیے وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

محمد اکرم راٹھور

(چیف ایڈیٹر، ادارہ طلوع اسلام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ یونس
مطالب القرآن فی دروس الفرقان

قرآن حکیم کی اہمیت، افادیت اور اس کی غرض وغایت کے علاوہ اس کی ترتیب اور پھر عقل انسانی کے ساتھ اس کے رشتے کا تعلق 27

روزے فرض کرنے کا مقصد اور اس کا نتیجہ جو محسوس شکل میں دیکھا جانا ضروری ہے _____ 28

ہم نے قرآن حکیم کی روشنی میں روزوں کے محسوس نتائج دیکھنے کی بجائے صرف لفظ ثواب تک محدود کر رکھے ہیں ___ 29

نتائج حاصل کیے بغیر خوش فہمی کا عملی نتیجہ ایک تمثیل کی روشنی میں _____ 29

تقلید پرستی انسانی سوچ کو مفلوج کرتی ہوئی اسے حیوانی سطح تک لے آتی ہے _____ 30

قرآنی حقائق کو عملی شکل دینے کا نتیجہ قوموں کی امامت کی شکل میں نکلتا ہے _____ 31

مومن زندگی کے میدان میں کبھی کسی کا محتاج نہیں ہوتا ___ 32

ہم نے استخلاف فی الارض کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی خاطر اسے روحانیت کے غیر محسوس رشتے سے جوڑ دیا ___ 32

مافوق الفطرت تصورات کا عقل انسانی کے ساتھ ان کا کیا تعلق؟ _____ 33

نبی اور رسول کے متعلق فوق البشر ہونے کا تصور _____ 33

آج کے مذہب پرست انسان اور چودہ سو سال پہلے کے انسان میں کوئی فرق نہیں _____ 34

عقل وفکر پر مبنی بات کے برعکس کرامت میں کوئی ربط نہیں ہوتا _____ 35

عقل وبصیرت کے تحت کسی چیز کو ماننا مقام بلند سے باشرف ہونا ہے _____ 35

لفظ سحر کا لغوی مفہوم جھوٹ کے ہوتے ہیں، جادو کے نہیں ___ 35

متبعین کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی _____ 37

پارہ نمبر 11 سورۃ نمبر 10 تخلیق کائنات کی اہمیت اور اس کا نظم وضبط _____ 38

وحی خداوندی کی روشنی میں رسول اور انسان کا باہمی تعلق اور اس کی منزل کا تعین _____ 38

قدرت کا سب سے بڑا معجزہ تو بذاتِ خود کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ ہے _____ 39

تورات کے مطابق اگر خدا تعالیٰ نے یہ کائنات چھ دنوں میں پیدا کی تو یہ دن رات کا وجود کائنات سے پہلے کہاں سے آ گیا؟ 39

اس کائنات کے متعلق ہندوؤں کا تصور تو یہ ہے کہ یہ کائنات ایک خواب کے سوا کچھ اور نہیں _____ 40

قرآن حکیم کے نزدیک اس کائنات کو لہو ولعب یا کھیل وتماشہ کے طور پر پیدا نہیں کیا _____ 40

عربی زبان میں ایام Stages دخان گیس کے گولے
کے لیے بولا جاتا ہے _____ 40

زمین وآسمان کے متعلق قرآنی حقائق کا بیان اور
سائنسی انکشافات _____ 41

ہمارے ہاں اس زمین وآسمان کے متعلق مذہبی دنیا میں
پائے جانے والے تصورات حقیقت کے آئینہ میں _____ 41

کارخانہ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والی ہستی اس
سلسلہ دراز میں ہر آن نت نئے اضافہ کرتی رہتی ہے _____ 42

شفیع المذنبین کا تصور قرآنی مکافات عمل کے تصور
کے منافی ہے _____ 42

سفارش کے موجودہ تصور کے تحت عدالت خداوندی
میں حاضری کی نوعیت _____ 43

لفظ شفیع، وتر اور شفاعت کا مفہوم اور اس کی نوعیت _____ 43

انگریزی کے مقابلے میں بھی عربی زبان کی فضیلت _____ 44

تخلیق کا مرحلہ تو امر کے فوری بعد شروع ہو جاتا ہے _____ 44

امر کا لفظ نشانات راہ کی نشاندہی کے لیے استعمال ہوا ہے _ 44

یہ کائنات چھ مراحل طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے
جب کہ ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی _____ 45

ایک کے ساتھ دوسری چیز کا امتزاج عمل تخلیق کا مظہر ہوتا ہے 45

دین کی بنیادی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے خدا تعالیٰ کی
صفات کو سمجھنا نہایت ضروری ہے _____ 46

کالی دیوی کی پرستش کا تصور _____ 46

خدا کا صحیح اور حقیقی تصور صرف قرآن حکیم میں محفوظ ہے __ 47

ہر چیز خلق ہو جانے کے بعد قانون کے دائرے کے
اندر آ جاتی ہے _____ 47

جو خدا اپنے اوپر لگائی گئی پابندیوں کو نہیں بدلتا تو وہ کسی
کے لیے کیوں بدلے گا _____ 48

انسان کسی چیز کو عدم سے وجود میں تو نہیں لا سکتا البتہ تخلیقی
حدود تک یہ خالق ضرور ہے _____ 48

قرآنی حکومت کا فریضہ انسانی حدود تک ربوبیت کے
فرائض سرانجام دینا ہے _____ 49

عبادت کا ترجمہ پرستش نہیں بلکہ قوانین خداوندی کی
محکومیت اختیار کرنے، اطاعت کرنے کے ہیں _____ 49

قرآنی حکومت کا فریضہ ربوبیتِ عالمین کا نفاذ ہے _____ 49

انسان کی یہ زندگی انسانی زندگی کی بجائے حیوانی سطح تک
محدود ہو کر رہ گئی ہے _____ 50

انسان کا کوئی عمل بھی نتیجہ خیز ہوئے بغیر نہیں رہتا _____ 50

جس طرح انسان کی طبعی زندگی پر طبعی قوانین اثر انداز ہوتے
ہیں اسی طرح اس کا عمل اس کی ذات پر ایک نقش چھوڑتا ہے 51

عالمِ خلق کو وجود میں لانے کے بعد المصور اور الباری کا
عمل شروع ہوتا ہے _____ 51

لفظ الباری کا لغوی مفہوم سمجھنے کے لیے کمہار کی مثال _____ 52

زمین وآسمان کے اندر پھیلی ہوئی کائنات کا مقصد انسانی
اعمال کی نگہداشت کرنا ہے _____ 53

مجوسیت کے غلط تصورات نے انسانوں کی سوچ کو گردش
افلاک سے وابستہ کر دیا ہے یعنی دین کو مذہب میں بدل دیا گیا 53

تقدیر کے اس عقیدے کے متعلق فکرِ اقبال _____ 54

انسان کا اپنا عمل ہی جزا یا سزا کا مستوجب ہوتا ہے _____ 54

یہ کائنات انسانی اعمال کے نتائج کو کس طرح مرتب کرتی
ہے یہ معاملہ بڑا غور وفکر کا متقاضی ہے _____ 55

CamScanner

کائناتی نظام کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مکافات عمل کی
صداقت کو مکمل طور پر تسلیم کرنا ہوگا _____ 55
کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ اپنے اندر عقل وفکر کا ایک
سمندر لیے ہوئے ہے _____ 55
کس قدر حسین ہوگا وہ دور کہ جب خدا اور اس کے فرشتے
زمین پر اتریں گے _____ 56
چاند تو سورج سے روشنی حاصل کرنے کے لیے اس کے
پیچھے پیچھے رہتا ہے _____ 57
چاند کے نام پر کیلنڈر کی تیاری اور قدرت کی متعین کردہ
منازل کہ جن کی رفتار میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کا
بھی فرق نہیں آتا _____ 57
سورج تو خداؑ کے مقرر کردہ پیمانوں میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا 58
قدرت نے اگر ہر شے کے لیے پیمانے مقرر کیے ہیں تو
اس کا کنٹرول بھی اپنے پاس رکھا ہے _____ 58
دنیائے عرب کے صحرانشینوں کی راہنمائی ستاروں کی
گردش کی بنا پر ہے _____ 59
چاند کے علاوہ سورج سے بھی کیلنڈر ترتیب دیا جاسکتا ہے _ 59
حق کی اصطلاح تو بڑی جامع اصطلاح ہے _____ 60
حضرت عمرؓ سے کلمہ کی اصطلاح کے متعلق ایک سوال اور اس
کا جواب اور ہماری اپنی حالت _____ 60
علامہ اقبال کے نزدیک کلمہ کی حقیقت _____ 61
یہ پوری کائنات قرآنِ حکیم کی تفسیر ہے اور اس پر غور وفکر
کرنے والوں کو قرآن حکیم نے علماء اور متقی کہا ہے
یا یوں کہیے کہ سائنٹسٹ کہا ہے _____ 61
تخلیق کائنات کی اہمیت اور پھر دنیا بھر کے مذاہب
کو ایک کھلا چیلنج _____ 63
انسان نے طبعی کائنات کو ناپاک اور قابلِ نفرت
گردانتے ہوئے رہبانیت کا تصور پیش کیا ہے _____ 64
کائنات کے متعلق قرآن حکیم کے 4 لفظوں نے انسانی
سوچ کا زاویہ نگاہ بدل دیا _____ 65
شروع سے آخر تک قرآن حکیم کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ دین ہے
'مذہب نہیں _____ 65
قرآن حکیم کے نزدیک علماء کی تعریف _____ 66
قرآن حکیم کی طرف سے ارض وسما کے اندر پھیلی ہوئی
نعمائے خداوندی پر غور وفکر کی دعوت _____ 66
کائنات کو مختلف منازل سے گزارنے کا عمل جو ہر آن
جاری وساری ہے _____ 66
قرآن حکیم نے تو انسانی تخلیق کے علاوہ مختلف نوع
(Species) پر غور وفکر کرنے والوں کو علما کہا گیا ہے ___ 67
کائنات اپنے اس عظیم محیر العقول سلسلہ پر غور وفکر کرنے
والوں میں ذہنی بالیدگی پیدا کر دیتی ہے _____ 68
دنیا بھر کے سائنٹسٹوں سے تخلیق کائنات کے متعلق ایک اہم
سوال اور اس کا جواب _____ 68
فکر قرآنی کو تسلیم کرنے والوں کی نگاہ بصیرت ہی کو خدائے
علیم نے علماء کہا ہے _____ 70
لفظ متقی اور تقویٰ کی Definition اور پھر بندۂ مومن
کے طرزِ زندگی کی وضاحت _____ 70
تیسرے نمبر پر ہماری کیٹیگری جو قدم قدم پر محتاج ہونے
کے باوجود انہیں ہر وقت گالیاں دینے میں مصروف ہے ___ 72
ملائکہ کو سرنگوں کرنے سے پہلے مقام انسانیت کا حصول

CamScanner

ممکن ہی نہیں ________ 72
زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کرنے کے لیے سورج کی
شعاعوں کو گرفتار کرنا ہی کافی نہیں، قندیل آسمانی کا ساتھ
ہونا بھی اشد ضروری ہے ________ 73
انسانی دنیا کا کوئی شخص خدا تعالیٰ کی لامحدود صفات
کو اپنے محدود تصورات میں بیان کر ہی نہیں سکتا ____ 74
لفظ جاہلیہ اور جہالت کا لغوی مفہوم اور اُن کا استعمال ____ 74
نظامِ ربوبیت کی بنا پر انسانوں کے باہمی روابط کی کیفیت کا
ایسا معیار کہ دیکھنے والے اسے دیکھ کر محوِ حیرت ہو جائیں __ 75
قوانین فطرت کی طرف سے منہ موڑنے والوں کا انجام اور
پھر آج ہماری اپنی حالت، جان بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر _ 76
اقبال کی جگر سوز آہ و فغاں ________ 76
مکافاتِ عمل کی ایک اہم شق یعنی مہلت کا وقفہ اور
اس کی نوعیت ________ 77
غلط روش زندگی کے لیے باز آفرینی کا امکان خدا کی
بہت بڑی رحمت ہے ________ 77
کائناتی قوتوں کو مسخر کرتے ہوئے اس کے ماحصل
کو وحی کی روشنی میں صرف کرنا امروز و فردا کے لیے خوشنودی،
ایک یقینی امر ہے ________ 78
انسان کی بدعملی کے نتائج انسان کو نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں 78
قوانین خداوندی پر عمل پیرائی انسانی شعبوں میں استقامت
پیدا کر دیتی ہے ________ 79
جب برائی بھلائی بن کر دکھائی دینا شروع کر دے تو اس کا
نتیجہ سوائے بربادی کے کچھ نہیں نکلتا ________ 80
مسرفین جو فطرت کی قوتوں کو مسخر تو کرتے ہیں لیکن ان
کے ماحصل کو اقدارِ خداوندی کے تابع صرف نہیں کرتے __ 81
مذہب پرست دنیا کی کیفیت ________ 81
ختمِ نبوت کے بعد پیغام پہنچانے کے سلسلہ میں رسالت کی
اہمیت کے پیشِ نظر امت کا اجتماعی فریضہ ہے ____ 82
اپنے ہاں بھی ذلیل اور دوسروں کی نگاہوں میں بھی ذلیل __ 82
ہم نے اُن کے ہاتھوں شکست کھائی کہ جنہوں نے دنیا
میں کسی کو آج تک شکست نہیں دی ________ 83
1947ء کو کرۂ ارض پر ایک قرآنی حکومت کی تشکیل کی خاطر
مملکت کے قیام سے ہمارا کیا جانے والا سلوک ____ 83
12 اگست 1973ء کو 14 اگست کے حوالے سے علامہ
پرویز کا ایک خصوصی درس کہ کیا ہم آزاد ہیں؟ ____ 84
قرآن حکیم میں بیان کردہ داستانوں کا مقصد قوموں کی موت
وحیات کے لیے دیئے گئے اصولوں کی وضاحت کرنا ہی ہے 86
قرآن حکیم کی طرف سے قوموں کی موت وحیات کے
یہ پیمانے ہر دور کے لیے ابدی ہیں ________ 86
مملکتِ پاکستان کے تمکن کا مقصد قابلِ غور ہے ____ 87
قوموں کی زندگی سے ہر دم جہادِ مسلسل اور سعی وپیہم ضروری
ہے جیسے زندگی کے لیے مسلسل سانس لینا ضروری ہے ____ 88
قرآن حکیم نے جہاد کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے پہلی
جہاد بالمال یعنی انفاق کی وضاحت ________ 88
دوسری شق جہاد بالسیف کی عملی شکل اور اس پر عمل نہ کرنے
والوں کا نتیجہ ________ 88
لفظ استبداد اور جرم کا بنیادی مفہوم دوسروں کا پھل کاٹ
کر اپنے گھر لے آنے کے ہیں ________ 89
قوموں کی ہلاکت تو قوانین خداوندی کو نظر انداز کرنے

CamScanner

سے ہی وارد ہوتی ہے _____ 90

شروع میں تو ظلم و جرائم کی سزا غیر محسوس طور پر ہی

سامنے آتی ہے _____ 90

جسٹس کے معنی رائج الوقت قانون کے مطابق فیصلے

کرنے کا نام انصاف سمجھا جانا صحیح نہیں _____ 91

قانون کا بذاتِ خود عدل پر مبنی ہونا بھی ضروری ہے _____ 91

انسانی اختیارات پر خدائے علیم و خبیر کی طرف سے پابندیوں

کا مقصد معاشرتی نظم و نسق کو مختلف الجھنوں سے محفوظ رکھنا ہے 92

قرآنی اقدار کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں مسلمان تیرہ

سو سال سے حالتِ تذبذب میں ہیں _____ 93

قرآنِ حکیم کی مثل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کردہ اقوال

(حدیث رسول) کے ذریعے قرآنی آیات کو منسوخ

کرنے کے عقیدے نے جنم لیا _____ 94

اگر حدیث کی Definition اقوالِ منسوب الی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کر دی جائے تو پھر حدیث کا صحیح مقام قرآن حکیم کی روشنی

میں متعین کرنے میں آسانی ہو جائے گی _____ 94

ملوکیت ہو یا مذہبی پیشوائیت خدا تعالیٰ اپنے قانون میں کسی

کے لیے بھی کوئی تبدیلی نہیں کرتا _____ 95

وحی خفی اور وحی جلی یعنی وحی متلو اور دوسری غیر متلو کی حقیقت

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات کی وضاحت قابل غور ہے 95

قرآنی احکامات کے گراں گزرنے کی وجہ کہ ہم صرف خدا کے

قانون کا اتباع کیوں کریں؟ _____ 96

خدا پر ایمان لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خدا کی کتاب کو

کافی سمجھا جائے _____ 96

قرآن حکیم کے احکام تو بغیر کسی تفریق کے پوری نوعِ انسانی

کے لیے ہیں _____ 97

جس معاشرے میں ظلم ہو رہا ہو تو پھر اس معاشرے میں

فساد برپا ہو جاتا ہے _____ 97

قرآنی ضابطہ حیات کی خوبی یہ ہے کہ وہ متعین بات کرتا ہے

کسی بات میں بھی کوئی الجھاؤ باقی نہیں رکھتا _____ 98

قانون بنانے یا تبدیل کرنے کا حق صرف خدا تعالیٰ کو ہی ہے 98

حقائق کا ادراک صرف اور صرف وحی کا ہی احسان ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس میں اپنا کوئی دخل نہیں ہوتا _____ 98

انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب ___ 99

وحی کی حقیقت سمجھ آنے سے پہلے قدامت پرستی کے دور میں

علامہ پرویزؒ کا برس ہا برس تک تشکیک کی وادیوں میں

سرگردانی کے دور کا ذکر _____ 100

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا وہ پہلو کہ جس نے پرویز

کو سوچنے پر مجبور کر دیا _____ 100

مملکتِ پاکستان کے وجود کو مفاد پرستیوں نے خطرے

سے دوچار کر دیا _____ 101

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی آپ کے صادق ہونے کا

سب سے بڑا ثبوت ہے _____ 101

اپنی بات کو خدا کی آیات کہہ کر پیش کرنے والے سے

بڑا ظالم اور کوئی ہو نہیں سکتا _____ 102

کسی کے غلط یا صحیح ہونے کا ثبوت انسان کے اختیار کردہ

نظام کے نتائج سے ہی ہوتا ہے _____ 102

رسل و رسال کے اس قدر مشکل حالات میں دس لاکھ مربع

میل پر آپ کا کنٹرول یہ بہت بڑا معجزہ تھا _____ 103

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قائم کردہ مملکت اور رومن

CamScanner

اور ایرانیوں کی مملکت میں فرق _____ 103

بڑے سے بڑا ڈکٹیٹر اور قوت کا مالک حق کی قوت

کا مقابلہ نہیں کر سکتا _____ 103

حق کا بیج اپنے اندر کونپل بننے اور ابھرنے کی پوری

صلاحیت لیے ہوئے ہوتا ہے _____ 104

اگر انسان کو عملِ صالح کے ساتھ کسان جیسی محنت میسر آ جائے

تو نمود کی صلاحیتیں تو اس کے اندر پہلے ہی موجود ہوتی ہیں _ 104

مخالفین کی جانب سے نبی اکرم کے لیے ایک سوال

اور اس کا جواب _____ 104

قوانین خداوندی کے برعکس خود ساختہ شریعت کی حکمرانی کا ذکر اور اس

کے شرائط _____ 106

بت پرستی سے زیادہ خطرناک عمل فرقہ پرستی اور خود ساختہ شریعت کی

حکمرانی ہے _____ 108

خدا کی عبودیت کا بنیادی مفہوم خدائی احکام کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا 108

ملوکیتی اسلام اور خانقاہیت کے خدوخال اور پھر خدا کی عبادت اور دعا

کی عملی شکل _____ 109

"لفظ درس کا حقیقی مفہوم اور اس کی عملی شکل _____ 111

معاشرتی زندگی میں اپنائے جانے والے نظامِ حیات کی اہمیت 112

انسانی زندگی کے لیے قرآنِ حکیم کے نزدیک نظامِ حیات کی اہمیت اور

فریضۂ نبوت _____ 113

غلط نظام میں انسانوں کی قلبی کیفیت اور اس کا علاج _____ 113

لفظ شفاعت کا مفہوم اور ذاتِ خداوندی سے قرب حاصل کرنے کی

وضاحت _____ 114

خدا کا وہ تصور جو خود قرآن پیش کرتا ہے وہی حرفِ آخر ہے _ 115

ذاتِ خداوندی تو انسان کے دل میں گذرنے والے خیالات سے بھی

واقف ہے _____ 116

ذاتِ خداوندی کسی کی منتوں کی محتاج نہیں _____ 117

انسانی معاشرے میں تمام تر خرابی اس کے غلط نظام کی وجہ سے پیدا

ہوتی ہے _____ 118

انسانی معاشرے کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرنا فرعونی سیاست ہے۔ 118

سب سے بڑا جرم عالمگیر برادری میں تفرقہ پیدا کرنا _____ 119

انسانوں کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے سلسلہ میں UNO آخر

کیوں کامیاب نہیں ہوتی؟ _____ 120

انسان انتشار کو ختم کرنے کے لئے قرآنِ حکیم کا نسخہ "ایک اور صرف

ایک ضابطۂ حیات" _____ 120

ہمارے ہاں ہزار برس سے ایک غلط عقیدہ کی تشہیر _____ 121

انبیاء کے آنے کا بنیادی مقصد اختلافات کو ختم کرنا ہے _____ 122

دنیا بھر میں کسی لفظ کو بغیر سوچے سمجھے بار بار دہرائے جانے والی مظلوم

کتاب کا حشر _____ 123

یہاں تو مذہبی دنیا میں سوائے ایک فرقے کے ہر دوسرا فرقہ جہنمی ہے 124

ہر معاملے میں اللہ میاں کو ذمہ دار قرار دینے کا نتیجہ _____ 124

خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو اختیار و ارادہ کی

نعمت عطا کرنے کا مقصد _____ 125

ذاتِ خداوندی نے انسان کو جانوروں کی طرح مجبورِ محض نہیں

بنایا کیا یہ عظیم نعمت نہیں ہے _____ 126

علم غیب کے علاوہ معجزہ کی وہ حقیقت جو یقینی

طور پر قابلِ فہم ہے _____ 126

نبی اکرمؐ کی مکی اور مدنی زندگی کے متعلق پائے جانے

والے مروجہ قابلِ صد افسوس تصورات _____ 128

آپؐ کی مکی زندگی میں عملِ صالح کا وہ پودا جو آپؐ کی

مدنی زندگی میں ثمر بار ہوا _____ 129

آج کے ناگفتہ بہ حالات میں مایوس نہیں ہونا چاہیے

لیکن ایک شرط کے ساتھ _____ 130

نئی نسل کے متعلق محترم علامہ پرویز صاحبؒ کی دل

گرفتگی جو اس محسن ملت کی زندگی بھر کی عکاس ہے _____ 131

آک کے پودے کے ساتھ آم نہیں لگا کرتے _____ 132

ہر عمل کی نتیجہ خیزی ہمیشہ متعین وقت کی ہی

رہین منت ہوتی ہے _____ 132

ذاتِ انسانی اپنے ایک ایک عمل کے نتیجے کو خود ہی ساتھ

کے ساتھ مرتب کرتی چلی جاتی ہے _____ 133

ہر قسم کی تباہی و بربادی قانونِ خداوندی کو نظر انداز

کرنے کا ہی نتیجہ ہوتی ہے _____ 135

انسان کی نفسیاتی کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کی بنیادی وجہ 136

انسان دراصل حیوان کی ہی ایک ارتقائی شکل ہے اس

کے تو بنیادی تقاضے بھی ایک جیسے ہیں _____ 137

انسان کے 9/10 حصے کی حیوانی سطح کو انسانی زندگی کی سطح تک

لانے کے لیے بنی آدم کو وحی کی اقدار سے متعارف کرایا گیا تھا 138

انسان کی حیوانی سطح کی خواہشات کی شکل وصورت اور

اس کا علاج _____ 138

قدرت نے انسان کو احسنِ تقویم پیدا کیا تھا اب انسانیت

کی سطح اختیار کرنا تو انسان کا اپنا کردار ہے _____ 139

جہانِ فردا کی ارتقائی منازل لامنتہا وسعتوں پر پھیلی ہوئی ہے 139

قرآن حکیم نے انسان کی زندگی کے ہر دو پہلوؤں کو کھلے

الفاظ میں پیش کیا ہے _____ 140

قرآن حکیم اپنے ہاں حیوان اور انسان کو کس شکل میں

برابری کی سطح پر جانتا ہے؟ _____ 140

شکم پروری کے سلسلہ میں انسانی اور حیوانی سطح زندگی میں

فرق کی نوعیت _____ 141

تکاثر کی خاطر دوسروں سے بڑھ جانے کا جذبہ تو انسان

کو پاگل کر دیتا ہے _____ 141

حیوان سے بھی زیادہ گیا گزرا اور خطرناک _____ 141

اگر وحی کی اقدار کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر کوئی انسان

دوسرے سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتا _____ 142

انسان کی نفسیاتی کیفیت اور مفادِ عاجلہ کی نوعیت _____ 142

اقدارِ خداوندی پر غور و فکر انسانی زندگی کو آسودہ

خاطر بنا دیتی ہے _____ 143

مفادِ عاجلہ کی بنیاد پر حاصل کردہ نتائج کے ماحصل کی

قدر و قیمت ایک تمثیل کی روشنی میں _____ 143

زندگی کی اس نمود و نمائش کے بعد مذہبی تصورات اور پھر

تصوف کی دنیا کا پروپیگنڈا _____ 144

بغیر کسی مقصد کے طبعی طور پر حیوانی زندگی کے مختلف

پہلوؤں کا نتیجہ تسلسلِ حیات سے محرومی ہے _____ 144

طبعی زندگی کے ختم ہوتے ہی ہر چیز کی قیمت بھی

ختم ہو جاتی ہے _____ 145

مذہبی پیشوائیت کے وعظوں میں پایا جانے والا دو قسم

کا متضاد اسلام _____ 145

ساری زندگی ''عزت کی نوکری'' کی ہے اب تو

عاقبت کی فکر ہے _____ 146

ہمارے ہاں قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق ایک حصے کو ماننا

اور دوسرے سے انکار کرنا ہے _____ 146

علامہ اقبالؒ نے ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ہونے والی گہری سازش کی عکاسی اپنی کتاب ارمغانِ حجاز کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ میں بڑی وضاحت سے کی ہے ______ 147
ابلیس کی طرف سے ملتِ اسلامیہ کو زیر کرنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم کے حقائق ان کی نظروں سے اوجھل کر دیے جائیں ______ 147
ابلیس کی مجلس شوریٰ میں زیرِ بحث آنے والے مسئلے کی مزید شقیں ______ 148
ملتِ اسلامیہ کو مکمل طور پر مدہوش کر دینے والا ابلیسی نسخہ ______ 149
ابلیسی پروگرام کے برعکس قرآن حکیم کی طرف سے زندگی بخش پروگرام کی نوید ______ 149
لفظ سلام کا لغوی مفہوم سلامتی کے علاوہ انسانیت کی تکمیل کرنے والا بھی ہے ______ 150
قرآنِ حکیم کے مفردات تو بڑے غور طلب ہوتے ہیں اور یہ تو میرے عمر بھر کا نچوڑ ہے (از پرویزؒ) ______ 150
ہمارے ہاں دار السلام کے نام پر مختلف تصورات کی علم داری 150
حسنِ عمل ہمیشہ اعمالِ حسنہ کا متقاضی ہوتا ہے ______ 151
علامہ پرویزؒ کی آخر خواہش ایک کالج کی تعمیر تھی جہاں قرآن حکیم کو ایک نصاب کی شکل میں پڑھایا جاتا ______ 151
احسان کا بدلہ احسان نہیں بلکہ حسن ہوتا ہے جس میں توازن بدوش اعمال سرانجام پاتے ہیں ______ 152
توازن بدوش اعمال کی نشاندہی اور ان کو اپنانے کا عملی طریق 152
روحانیت والوں کا نظریہ حیات اور ان کے ہاں تزکیہ نفس کی عملی شکل ______ 153
طبعی قوانین کے تحت حاصل کردہ وسائل کے برعکس اُخروی زندگی کی اہمیت اور قدر و منزلت ______ 153
قرآنی تعلیم کا منشاء ہر دو زندگیوں میں خوش گوار لمحات کی نوید ہے ______ 154
ترکِ دنیا کا تصور تو قوانین خداوندی کی کھلی خلاف ورزی ہے 154
قوموں کی تباہی و بربادی کی اصل وجہ طبقاتی تفریق کو ہوا دینے اور مصنوعی نظام کو تشکیل کرنے میں ہے ______ 155
انسانی اقدار کو نظر انداز کرنے کے سلسلہ میں ہماری کم فہمی اور اس کا نتیجہ ______ 155
ناہمواریاں پیدا کرنے کا نتیجہ یہ کہ جہاں سوائے رسوائی اور ذلت کی اندھیری رات کے روشنی کی کوئی کرن بھی دکھائی نہ دے 156
علامہ اقبال کے نزدیک جہنم میں جانے والوں کے متعلق ایک واعظ کی کیفیت ______ 156
جہنم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے شفاعت حاصل کرنے کا عقیدہ اور اس کی حقیقت 157
قرآن حکیم کے مطابق جہنم میں لیڈرز اور ان کے Followers کے باہمی مکالمات ______ 157
جہنم میں جانے والے عوام ہوں یا لیڈرز، دونوں مجرم ہوں گے آخر کیوں تم نے انہیں طاقت دی اور انہوں نے اپنی طاقت کا غلط استعمال کیا ______ 158
ظہورِ نتائج کے وقت ایک ایک فرد سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا ______ 159
اس قدر وسیع و عریض کائنات کو اصولوں کی زنجیروں میں کس نے جکڑ رکھا ہے؟ تقویٰ کا بنیادی مفہوم قوانین کی نگہداشت کے ہیں اور یہی پورے قرآن حکیم کی تفسیر ہے ______ 160
سائنس کے مختلف طبعی شعبوں کے مختلف قوانین کے باہمی

ربط نے عقل انسانی کو غور فکر کی بدرجہ اتم ترغیب دی ہے ___ 161
قرآنِ حکیم کی نظر میں قانون کی دوٹوک اور واضح تر وضاحت 162
ساری کی ساری کائنات میں ایک ہی قانون کی عمل داری
ہے اور یہی خدا کا امر ہے _____ 162
قرآنِ حکیم کا دنیا بھر کے قانون دانوں کو ایک ایسا کھلا چیلنج
جسے کوئی شخص کبھی قبول نہیں کر سکے گا _____ 163
کیا دنیا بھر کا کوئی شخص بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے بنائے
گئے قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی لا سکتا ہے؟ _____ 163
قرآنِ حکیم کی طرف سے خطاب کرنے کا انداز _____ 164
آئن سٹائن کا قول کہ ''ہم کتابِ فطرت لکھتے نہیں ہیں'
کتابِ فطرت پڑھتے ہیں'' _____ 164
انسانی زندگی اور پھر اس کائنات کے اندر قدم قدم پر انگنت
نعمائے خداوندگی کا وجود آخر کس خالق کا پیدا کردہ ہے؟ ___ 164
ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش اور اس کی طبعی مشینری کیا
یہ غور و فکر کی متقاضی نہیں _____ 165
زندگی اور موت کا قانون اور بیالوجی کا یہ سارا سلسلہ کیا
یہ قابل غور نہیں؟ _____ 166
پوری کائنات کے اندر یہ تدبیر امور کو کنٹرول کرنے کا ذکر
اس کی تنظیم کا ذکر _____ 167
اس پورے کائناتی نظام میں انسانی زندگی ایک
اہم موڑ کی حامل ہے _____ 167
جنگلی مخلوق سے ہٹ کر انسانی زندگی کے تمدن میں فرق
کی بنیاد صرف اختیار و ارادے کی صلاحیت ہے _____ 168
زندگی کے معاملات پر انسانی جذبات کی رنگینی کا اثر انداز
ہونا ایک لازم شے ہے _____ 168
ذاتِ خداوندی نے اپنی صفات کی بنا پر انسان کو انسانی
سطح پر نظام ربوبیت کے قوانین عطا کیے ہیں _____ 169
خارجی کائنات کی بھی کوئی شے ایسی نہیں جو اپنی منزل
مقصود کی طرف بتدریج گامزن نہ ہو _____ 170
قطرے کو گہر ہونے کے لیے بھی اپنی تمام ارتقائی مراحل
سے گزرتے ہوئے الحق کی منزل تک پہنچنا ہوتا ہے ____ 171
انسانی زندگی کا کوئی قانون بھی عملی شکل اختیار کیے
بغیر الحق ثابت نہیں ہو سکتا _____ 171
اس قدر روشن واضح دلیل و براہین کے باوجود بھی قانون کو
تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ جواز باقی رہ سکتی ہے _____ 171
کلمت اللہ اور سنت اللہ کے لغوی اور عملی مفہوم کی وضاحت _ 172
لفظ فاسق اور فاجر کا مفہوم _____ 172
کھنڈرات کی شکل میں بکھری ہوئی بستیوں کی داستانیں
آج بھی اقدار خداوندی کے انکار کی زندہ ثبوت ہیں ____ 173
وجودِ کائنات کی ابتدا کے متعلق ذہن انسانی تو آج بھی
حیران و ششدر ہے _____ 173
کائنات کو وجود میں لانے کے بعد قدرت تھک ہار کر کہیں
بیٹھ تو نہیں گئی _____ 174
خالق امر اپنے پروگرام کی تکمیل کی خاطر ہر آن اسے
گردشیں دیتا ہے _____ 174
اجرام فلکی کی گردش میں اگر کہیں ایک سیکنڈ کے کروڑوں
حصہ کا فرق بھی آ جائے تو یہ کائنات تباہ ہو جائے _____ 174
عقلِ انسانی سے کائنات کے وجود میں آنے کے سلسلہ
میں ایک اہم سوال _____ 175
کائنات کے سلسلہ میں اس کے غیر متبدل اصول کس

CamScanner

نے متعین کیے ہیں؟ اس قطب تارے کو ایک جگہ کھڑا رہنے
کا سبق کس نے دیا ہے؟ _____ 175
عقل انسانی کی بنیاد پر اختیار کردہ راستوں کی نوعیت اور مصائب
و آلام کی کیفیت یہ سب ظن و تخمین کا نتیجہ ہے _____ 176
انسان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے
الٰہ کو تو تسلیم کرتا ہے مگر انسانی یا ارضی زندگی سے انکار کرتا ہے 177
انسان کا خود کو الٰہ بنا لینے کا نتیجہ زندگی کے ہر شعبہ میں
فساد ہر سو نا ہمواریاں _____ 178
آج انسانوں کی تمدنی زندگی میں افسردگی اور جہالت پیدا
ہونے والی مشکلات کے حل کے لیے بے لگام مغربی
جمہوریت کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی _____ 178
عہدِ جاہلیت میں سیکڑوں خداؤں کا تصور اب توحید یا
وحدتِ الٰہ کی طرف گامزن ہے _____ 179
اگر خارجی دنیا میں دو خداؤں کی حکمرانی ہو تو اس کا کوئی
شعبہ بھی فساد سے نہیں بچ سکے _____ 179
خارجی کائنات اور انسانوں کی دنیا میں اگر کوئی فرق ہے
تو وہ صرف اختیار و ارادے کا ہے _____ 180
انسانوں کی طرف نازل ہونے والی وحی کی اہمیت _____ 180
ملا کے نزدیک القرآن کی نوعیت جو حقائق سے بعید تر ہے _ 180
نظم و نسق کے سلسلہ میں انسانی کوششوں کی انتہا
اور ان کا علاج _____ 180
قرآن حکیم نے سابقہ آسمانی کتابوں کے لیے تحریف کا
لفظ استعمال کیا ہے _____ 181
چاند پر سونے والوں کو یہاں زمین سے اٹھایا جاتا ہے
لیکن کیسے؟ _____ 181
قادرِ مطلق کی رحمانیت کا اندازہ حضرت انسان کو سائنس
کے مختلف شعبہ جات کے مطالعہ سے کرنا ہوگا _____ 182
نسلِ انسانی کو مقامِ انسانیت تک پہنچنے کے لیے اقوامِ عالم
کی ربوبیت کے فارمولے کی جگہ کوئی فارمولہ کارگر نہیں ہو سکے گا 182
سابقہ ملحقہ آیات کی یاددہانی _____ 184
کائنات کی کوئی شے بھی اپنے لیے قانون وضع کرنے
کی مجاز نہیں _____ 185
دنیا بھر کے انسان مل بیٹھ کر بھی قرآن حکیم کی طرف
سے عطا کردہ قانون کی ایک تمثیل نہیں لا سکتے _____ 185
عربوں کی زبان ہی عربوں کی خصوصیت کبریٰ تھی _____ 186
قرآن حکیم کے انداز بیان کی خصوصیات اپنے ہاں
ایک عجیب انداز لیے ہوئے ہے _____ 186
زبان دانی کے سلسلہ میں نیٹشے کے تاثرات اور ان کی
کتاب زرا تشرا کا ذکر _____ 187
قوانین کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی طرف سے دنیا بھر
کے مفکرین کو زندگی بھر کے لیے چیلنج _____ 187
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ ضابطۂ حیات کی
بنیادی خصوصیات _____ 188
کراچی میں GIBB کی علامہ پرویز سے ملاقات نیز
قرآنی تراجم کے متعلق اس کا تصور _____ 188
عربی زبان کے مرادفات کا اندازہ یہاں سے لگائیں کہ ایک
اونٹ کے لیے ہزار اور تلوار کے لیے آٹھ سو لفظ ہیں _____ 189
عربی زبان کے گیسوؤں کو سنوارنے کے لیے صدیوں کی
کوشش شامل حال رہی _____ 190
عربی زبان کی لغت لکھنے والے غیر مسلم حضرات کا ذکر _____ 190

تین تین سو سال تک جنگ وجدل کرنے والا یورپ بھی
قرآن حکیم پر حرف گیری کرنے سے قاصر رہا _____ 191
وحی تو خالصتاً خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں کسی رسول کا
بھی کوئی دخل نہیں ہے _____ 191
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے اہم ترین تین اصول جو
نہایت ضروری ہیں _____ 192
قرآن حکیم کی پیش کردہ ہدایت کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ___ 193
البتہ حقائق کو سمجھنے کے لیے علمی دلائل اور بصائر کی
ضرورت ہوگی _____ 193
انسانی علم کے تحت حقائق کا ادراک آنے والے دور
کے لیے سند نہیں ہو سکے گا _____ 194
پچھلے دور میں قرآن فہمی کی علمی سطح کی ایک جھلک _____ 194
اس قسم کی غیر شعوری معلومات کو نبی اکرم کی طرف منسوب
کر دیا گیا جو صدیوں سے ہمارے جمود کی وجہ بنی ہے ___ 195
ہمارے ہاں کی تمام تفسیریں اس پہلی تفسیر کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں
اور جس کو نہ ماننے والا کافر قرار پاتا ہے اور ماننے والا منافق 196
قیامت کے قریب آنے کا تصور جو 50 سال تک قائم رہا _ 196
کسی دعوے کی صداقت کو پرکھنے کے دو ہی طریق ہوتے
ہیں یا تو دوسرے کو عمل کرنے دو یا وہ خود عمل کر کے دیکھ لے 197
لفظ تاویل کا لغوی مفہوم _____ 198
دین ایک عملی پروگرام دیتا ہے جبکہ مذہب کے نزدیک کوئی
پروگرام ہی نہیں ہوتا چنانچہ وہ فریب نفس میں مبتلا رکھتا ہے _ 199
امام مہدی کا انتظار، مجدد سو سال کے بعد، مسیح اور مہدی کا
قیامت کے قریب آنے کا تصور _____ 200
قرآن حکیم کو سمجھنے کا ایک تیسرا طریق سابقہ اقوام کے
اجھڑے ہوئے کھنڈرات کی داستانیں _____ 200
تاریخ کا بطور سائنس مطالعہ کرنا ہوگا _____ 200
مذہبی مدارس میں سات سات سال کا کورس کرنے کے بعد
تعلیم کا معیار اور علامہ اقبال کا تبصرہ _____ 201
قرآن حکیم کے حقائق کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ جواز اور
پھر اس کا نتیجہ _____ 202
بات تو قرآن حکیم کی ہے لیکن ترجمانی ہماری ہے _____ 202
قرآن حکیم کی بات کو سننے کا اصل مقصد تو دل و دماغ
کی تصدیق سے ہے _____ 203
قرآنِ حکیم کے نزدیک ہر وہ شخص جو عقل وفکر سے کام
نہ لے وہ بہرہ ہے _____ 203
ملتِ اسلامیہ کو صدیوں سے صرف ناظرہ قرآن پڑھ لینے
کے بعد ثواب حاصل کر لینے کے تصور میں الجھا رکھا ہے ___ 204
صدیوں سے قرآن حکیم کا بطورِ ناظرہ بغیر سمجھے پڑھتے چلے
جانا کہ جی ثواب ہوتا ہے _____ 204
سکول میں بچوں کو قرآن حکیم کا ترجمہ پڑھانے کا مطالبہ
اور ساتھ ہی یہ الجھن کہ کس فرقے کا ترجمہ پڑھایا جائے _ 205
نبی اکرمؐ کی مجلس میں بیٹھنے والوں کی کیفیت کہ دیکھ رہے ہیں
مگر دیکھ نہیں رہے سن رہے ہیں مگر سن نہیں رہے _____ 206
فریب خوردہ قوم کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد _____ 207
لفظ حشر کا مفہوم تو کہیں اکٹھا ہونے کے ہیں _____ 208
جہنم کے اندر لیڈرز اور ان کے Followers کے
مابین الزام تراشی کا مقابلہ _____ 208
روزِ قیامت سب سے بڑے عذاب کی نوعیت کہ
جب انسان کا ذرہ ذرہ نکھر کر سب کے سامنے آجائے گا _ 209

روزِ محشر زندگی کا آخری چانس بھی باقی نہ ہوگا _____ 209

بسلسلہ تجدید یادداشت _____ 211

چشمے کے صاف وشفاف بہتے ہوئے پانی کی مانند انسانیت کے

امام نبی اکرم ﷺ کی 40 سالہ زندگی کے چند ایک نشانات 213

نبوت ملنے کے بعد مصائب وآلام سے بھرپور زندگی اور پھر

دل میں مچلنے والی ایک معصوم سی آرزو کا ذکر اور اس کا جواب 213

خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا جواب ایک نفسیاتی پہلو

لیے ہوئے ہے _____ 215

اگر زندگی کا پیمانہ بدل دیا جائے تو اضطرابی کیفیت

بدل جاتی ہے _____ 215

قرآنِ حکیم کا فلسفہ حیات تو انسان کے تصورات کو

ہی بدل دیتا ہے _____ 216

قانونِ خداوندی یہ ہے کہ وہ کسی کو غلط راستے سے آگاہ کیے

بغیر یونہی تباہ نہیں کرتا _____ 216

سب سے پہلے مملکت کو قانون کی تشہیر کرنا لازم ہوگی تاکہ

لوگ اس سے آگہی حاصل کریں _____ 217

قانون سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے مملکت کی طرف

سے بغیر کسی فیس کے کچھ افراد کا مقرر ہونا مفتی کہلاتا تھا ___ 217

مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ تباہی کب آئے گی مجھے تو اپنے متعلق

بھی غیب کا علم نہیں _____ 218

لفظ الا ماشآء اللہ کا وہ حقیقی تصور جس کے تحت وہ یہ لفظ

استعمال کرتے تھے _____ 219

لفظ 'مشیت' کا اور اجل کا مفہوم _____ 219

اگر ہر قوم کے لیے موت اور زندگی کی معیاد مقرر ہے تو

ہر معیاد کے لیے بھی تو ایک قانون مقرر ہے _____ 219

خدا کی کتاب کے سلسلہ میں بہائیوں کے دعویٰ کی

نوعیت اور تجزیہ _____ 220

زندگی اور موت کے غیر متبدل اصول جن کی آگہی

از بس ضروری ہے _____ 221

بدعملی کے نتائج یقیناً مرتب ہو کر رہیں گے اور یہ

کبھی ٹل نہیں سکتے _____ 223

مدائن کے اندر ایران کی تباہی ایک حقیقت بن کر

سامنے آگئی تھی _____ 223

جب قانون فیصلہ دے دے تو پھر ندامت کا تصور چہ معنی ___ 224

کائنات کی ایک ایک قوت انسانی اعمال کا نتیجہ

ساتھ کے ساتھ مرتب کرنے میں مصروف کار ہے _____ 224

خدا کے وعدہ سے مراد خدا کا قانون ہے اور ہمیشہ اٹل ہوتا ہے 225

اپنے بیٹے کے قاتل کو پناہ دینے والے سے

وعدہ خلافی نہیں کی _____ 225

آج کی ابلیسی سیاست میں کیے گئے معاہدوں

کی صورتِ حال _____ 226

قوموں کی موت وحیات کے سلسلہ میں خدا کے کئے

وعدوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی _____ 227

عید کے تہوار کی حقیقت تو جشنِ نزول قرآن کی نوید ہے ___ 227

لفظ وعظ کا مفہوم ہلاکتوں سے روکنے کے ہیں یعنی

قلب ونگاہ کی نفسیاتی بیماریوں کو شفا بخشنے کے ہیں _____ 227

دلوں کا روگ ہی قوموں کے زوال کا باعث بنتا ہے _____ 228

اسبابِ زوال انسانیت کے سلسلہ میں چودہ سو سال

پیشتر قرآن حکیم کی تشخیص اور اس کا علاج _____ 229

خدائے علیم نے ایک فرد سے لے کر پوری انسانیت تک امراض

قلب کا علاج قرآن حکیم ہمیشہ کے لیے پیش کر دیا ہے ___ 229
قرآن حکیم اپنے فلسفۂ حیات کو عقیدت کی ..... بجائے
عقل و بصیرت اور دلیل و براہین کی بنا پر پیش کرتا اور منواتا ہے _ 230
پیر اسی وقت تک پیر کہلواتا ہے کہ جس وقت تک آپ اسے
پیر تصور کریں _____ 230
توہم پرستی ہمیشہ کم علمی اور جہالت کی پیداوار ہوتی ہے ___ 231
قندیل آسمانی کی شکل میں فکر انسانی کو جلا بخشنے والا ایک
ایسا تحفہ جو دنیا بھر کی دولت سے زیادہ قیمتی ہے _____ 231
خدائے علیم نے ماہ رمضان میں انسانیت کے شب و روز
کی خاطر صراطِ مستقیم کی وضاحت کے لیے ایک مکمل
ضابطہ حیات عطا کر دیا _____ 231
اس متاع حیات مل جانے پر جشن منانے کا حکم _____ 232
جشنِ نزول قرآن کے لیے ایک ماہ کی تیاری کا پروگرام ___ 232
قرآن حکیم کا ایک لفظ سمجھے بغیر اسے دہراتے چلے جانے
کا تصور ما حصل _____ 233
ماؤزے تنگ کی کتاب سے اہل چین کا سلوک _____ 233
قرآنِ حکیم کی تعلیم کا مقصد تو فکر و نظر کی تطہیر اور حج کے
موقعہ پر اجتماع کا مقصد اور آج ہماری حالت _____ 234
علامہ اقبال آج کی عید کو تو ہجوم مومنین کے نام سے پکارتا ہے 234
فکر و نظر کی تطہیر کے بغیر قرآنی حقائق کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا _ 235
قرآن حکیم کی فضیلت یہ ہے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کے
لیے ایک ہی منشور پیش کرتا ہے وہ حلال و حرام کی الگ
الگ فہرستیں نہیں دیتا _____ 236
سوائے بنی آدم کے کائنات کی ہر شے خدا کے بنائے
ہوئے قوانین پر چلنے کے لیے مجبور ہے _____ 236
کائنات کے اندر انسان کا مقام یہ ہے کہ قدرت نے
اس کا اختیار و ارادہ سلب نہیں کیا _____ 237
کسی جنگل میں تنہا رہنے والے کی کیفیت اور اس کے اثرات 238
اختیار و ارادے کے ساتھ ساتھ کچھ معاشرتی کنٹرول کی
ترغیب کا مسئلہ _____ 238
حق حکومت خدا کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے _____ 238
قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے حدود کی پیروی
انسان کو کئی قسم کے وسوسوں سے محفوظ رکھتی ہے _____ 239
انسان کی آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرنے کا
حق صرف خالق کائنات کو ہے _____ 240
خالق کائنات نے اپنے اوپر خود پابندی لگا رکھی ہے کہ وہ
اپنی سنت یا اپنی روش میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کرے گا ___ 240
انسانی اختیارات کو حدود میں رکھنے کا مقصد اور حلال و حرام
کی وضاحت _____ 241
ان انسانی حدود کا سرچشمہ کہاں ہے؟ طلوع اسلام
کنونشن 1974ء میں پرویز کا خطاب _____ 241
خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی
کے متعلق حدود و قیود متعین کرنے کی بنیادی وجوہات ____ 242
حلال و حرام کے سلسلہ میں خود ساختہ فہرستیں مرتب کرنے
کا حق کسی کو نہیں ہے _____ 242
تحسین ذوق کے لیے زیب و زینت کی چیزوں کو قدرت
نے حرام قرار نہیں دیا _____ 243
قرآنِ حکیم کے نزدیک شرف انسانیت کا راز انسان کو
انسان کی غلامی سے نجات دلاتا ہے _____ 243
حلال و حرام کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کو قرآن حکیم کا ارشاد

243 _____

ختم نبوت، عقل انسانی کے بالغ ہونے کا اعلان تھا جو

ایک بہت بڑی نعمت ہے _____ 245

خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حدود کو توڑنے کا اختیار

کسی انسان کو حاصل نہیں _____ 246

ہر شخص خدا کے قانون کے سامنے جوابدہ ہے _____ 247

آج کی جمہوریت اور ڈکٹیٹر میں کوئی فرق نہیں، اسی کا نام

تو سیکولر نظام ہے۔ اسے اسلامی نظام نہیں کہا جا سکتا _____ 247

یورپ نے اپنے نظام حیات میں خدا کو شامل ہی نہیں کیا اور

اسی کو مادہ پرستی کہتے ہیں _____ 248

آج کرۂ ارض کے کسی کونے میں بھی اسلامی مملکت قائم نہیں،

یہ سب مسلمانوں کی مملکتیں ہیں _____ 248

زندگی کے میدان میں انسانیت کے شب و روز کے متعلق

حدود اللہ کی اہمیت اور پھر انہیں نظر انداز کرنے کا نتیجہ _____ 249

نظامِ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے پیش نظر

حدود اللہ کی پیروی نہایت ضروری ہے _____ 249

زندگی کے میدان میں حدود اللہ کے تعین کے بغیر زندگی

جیسا اہم ترین میچ کھیلا ہی نہیں جا سکتا _____ 250

دین کے غیر متبدل اصولوں کے برعکس مذہبی فرقہ بندی

پر مبنی اجارہ داری نے ملتِ اسلامیہ کی زندگی کو ہر میدان

میں شکست سے دوچار کر رکھا ہے _____ 250

خدا کی طرف سے زندگی گزارنے کے لیے کچھ حدود کا تعین اور

ان حدود کے اندر انسانی آزادی یہ خدا کا بہت بڑا انعام ہے 251

زندگی کے میدان میں انسان کا ایک ایک عمل خدائے

علیم و بصیر کے سامنے ہوتا ہے _____ 252

زندگی بھر کا اعمال نامہ انسان کے گلے میں لٹکا ہوا ہوگا،

جسے وہ خود ہی پڑھے گا _____ 253

ظہورِ نتائج کے وقت حدود کی نگہداشت کرنے والوں کو

نہ خوف ہوگا نہ ہی حزن _____ 253

لفظ حزن کا مفہوم جو انسانی نفسیات کا ترجمان ہے _____ 254

قرآنِ حکیم تو حزن کو صاحبِ ایمان کے قریب تک نہیں

آنے دیتا _____ 254

اولیاء اللہ کا مفہوم، جنہوں نے بھی حدود اللہ کے مطابق زندگی

بسر کی وہی اولیاء اللہ ہیں یہ کوئی الگ گروہ نہیں _____ 255

لفظ تقویٰ کا مفہوم تو اپنے دامن کو بدعملی کے کانٹوں سے

بچا کر رکھنے کا ہے _____ 255

ہمارے ہاں اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ تصور کیا جاتا ہے

جب کہ یہ قرآنی تصور نہیں _____ 257

قرآنِ حکیم نے نبی اکرم ﷺ کے بلند اخلاق اور سیرت و

کردار کا تو ذکر کیا ہے، روحانی بلندی کا نہیں _____ 257

دو متوازی حکومتوں کا وجود دنیاداروں کی حکومت اور

دوسری روحانیت کی دنیا _____ 258

غیر شعوری طور پر تصوف کا تعلق مختلف پیر یا مرشد کی راہ گذر

سے ہوتا ہوا، حضرت علیؓ سے ملا دیا جاتا ہے _____ 259

روحانیت والوں کی طرف سے دنیاوی حکومتوں کے

متعلق جگر سوز فتویٰ _____ 259

قرآن حکیم کے ہاں لفظ ولی کے مفہوم کے تحت کوئی الگ

گروہ نہیں ہے _____ 259

خدا نے اپنی ہم کلامی کا سلسلہ نبوت کے اختتام

پر ہی ختم کر دیا تھا _____ 260

انسانوں میں سے خدا کی ہم کلامی کی خصوصیت صرف نبی
تک ہی مختص تھی، نیز یہ کہ کشف اور الہام کے علاوہ
بشارتوں کا تصور قرآن حکیم کے ہی خلاف ہے ____ 261
خوابوں کی بنیاد پر بشارتوں کی نوعیت اور نبی اکرمؐ کے
خوابوں کے ذکر کی قابلِ غور حقیقت ____ 261
خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو کی گئی وحی کو
دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا نتیجہ ____ 262
انسانوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ذات صرف قرآن حکیم
کے ذریعے ہم کلام ہوتی ہے ____ 262
لفظ بشریٰ کا مفہوم قرآن حکیم کے آئینہ میں، اعمالِ صالح
کے نتیجہ میں خوشخبری کے ملنے کو بشریٰ کہا گیا ہے ____ 263
کرۂ ارض پر وہ استخلاف جو محسوس طور پر سامنے نظر آئے ____ 264
تمکن کے حصول کے بغیر خوف وحزن سے چھٹکارا پایا
ہی نہیں جا سکتا ____ 264
حکومتِ برطانیہ کی خدمت گزاری کے سلسلہ میں
مرزا غلام احمد کی خدمات کا ذکر اور پھر کچھ معاوضہ طلبی کا اظہار 265
قرآن حکیم کے حقائق سامنے آنے سے پہلے
علامہ پرویزؒ کی ذات خاص جنہیں تصوف کی وادیوں میں
خلافت کے عہدہ پر فائض ہونے کا 'شرف' حاصل رہا ____ 266
مومنین کی سب سے بڑی نشانی کفار پر تسلط اور غلبہ
حاصل کرنا ہے ____ 266
لفظ مبشرات کی عملی تفسیر پُرے کی ہوائیں اور کسان کے
چہرے پر خوشی کے آثار ____ 267
قرآن حکیم نے مومنین کو ہی اولیاء کہا ہے ____ 268
قرآن حکیم اپنی طرف سے پیش کردہ اصطلاحات کا مفہوم واضح
طور پر خود متعین کرتا ہے اور وہ اپنے کلمات کو تبدیل نہیں کرتا 268
قرآن حکیم نے تو اپنے ہاں نجات کی بجائے فوز کا لفظ
استعمال کیا ہے ____ 269
عیسائیت کے ہاں جہنم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے
عقیدے کے بعد ہندوؤں کا تصورِ نجات ____ 270
تصوف اور ویدانت کا تصورِ حیات مادے کے دلدل میں
پھنسی ہوئی زندگی واصل بالحق کے لیے رو رہی ہے ____ 270
عیسائیت کے ہاں نُزل کی زندگی کا تصور ____ 271
تصوف کے وارثیہ سلسلہ کی دلہنیں ____ 271
ہمارے ہاں شریعت کی انتہا کے برعکس قرآن حکیم کا
عظیم پروگرام ____ 272
زندگی کے متعلق قرآن حکیم کا فلسفہ حیات ____ 272
تزکیہ نفس کا لغوی قرآنی مفہوم ہر آن ایک نئی شان سے
ہم کنار ہونا ہے ____ 273
اختیارات میں وسعت پیدا کرنے کے لیے قرآن حکیم
انسانی زندگی کو ہر لحہ جہانِ نو کی نوید دیتا ہے ____ 273
لفظ جہنم جہاں انسانیت ذبح ہو رہی ہو جہاں زندگی میں
روانی نہ رہے وہ جہنم ہے ____ 274
جنت بھی انسانیت کا آخری مقام نہیں ہے ____ 274
مدینے کی ابتدائی زندگی کے کٹھن مراحل، کفار کا مخالفانہ
ابلیسی پروپیگنڈ اگر خدائے علیم کی طرف سے بشارتیں ____ 274
ابلیس کی خدا تعالیٰ سے درخواست ____ 275
لفظ عزیز کا لغوی قرآنی مفہوم صاحبِ اقتدار کا ہے ____ 276
لفظ ذلت کے معنی توہین نہیں بلکہ کمزور ہونے کے ہوتے ہیں 276
خدا تعالیٰ تو اپنی تمام صفات کے ساتھ مقام کبریائی پر فائز ہے

CamScanner

_____ 277

احکامِ خداوندی کے مقابلے میں انسان کی تمام تدابیر ظن وقیاس پر مبنی ہوتی ہیں _____ 277

حکمرانوں کی تو ساری قوت لوگوں کے ووٹ کی رہین منت ہوتی ہے _____ 278

خالقِ کائنات کے اقتدار کی ایک جھلک _____ 278

کیا اس قدر وسیع کائنات کا وجود حقیقت کو سمجھنے اور اُسے تسلیم کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ _____ 279

عیسائیوں کی رومن امپائر جیسی بڑی سلطنت کے نزدیک خدا کے ہاں بیٹے کا تصور _____ 279

مذہبی پیشوائیت کے نزدیک تو قرآنِ حکیم ایک بے ربط کتاب ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) _____ 280

قرآنِ حکیم کے نزدیک خدا کا تصور نہایت واضح اور لاریب ہے۔ یہ وہ ہستی ہے کہ جس نے پوری کائنات کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے _____ 280

قرآن حکیم کے نزدیک ولی کی تعریف _____ 282

مذہبی پیشوائیت کے کردار کی نوعیت جس کو قرآن حکیم نے افتراء علی اللہ کہا ہے _____ 283

مذہبی پیشوائیت ہر رسول کی طرف سے پیش کردہ وحی کی تعلیم کو اپنی روٹی کی خاطر مذہبی عقائد میں بدل دیتی ہے 283

دوسروں کے لیے کوئی تعمیری کام کیے بغیر دوسرے کا مال کھا جانے والے سب سے زیادہ معزز _____ 284

مذہبی پیشوائیت کے سلسلہ میں تاریخ کا دوسرا رُخ عیسائیت کے اندر کیتھولک کے بعد لوتھر کی تحریک کا کردار اور پھر پروٹسٹنٹ کے ہاں پادری اور اب دہریت کی تاریک رات 284

یورپ میں مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مذہبی پیشوائیت کے خلاف اُٹھنے والی تحریک کی بنیادی وجہ _____ 285

مذہبی پیشوائیت کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن عذاب ان کے اپنے پیشے سے محرومی کا خوف ہے _____ 286

چراغ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کے سلسلہ میں قرآنی حقائق کو تاریخی حوالے سے پیش کرنے کے لیے

حضرت نوح کی داستان کا ذکر _____ 286

قرآن حکیم کا اندازِ بیان لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں _____ 287

حضرت نوح کی طرف سے پیش کردہ دعوت کی مخالفت اور آپ کی استقامت کا ذکر _____ 288

قرآن حکیم کے نزدیک مذہبی پیشوائیت کی روش _____ 289

نبی کی ذات تو کسی سے بھی کسی معاوضے کی طلب گار نہیں ہوتی 289

قرآنِ حکیم کی دعوت کو ذریعہ معاش بنانا کسی صورت میں بھی درست نہیں۔ دین اور مذہب میں یہی وہ بنیادی فرق ہے جو ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہے _____ 290

اجر کا حصول صرف کسی بات کو تسلیم کرنے پر موقوف نہیں بلکہ اس پر عمل کرنے پر ہے _____ 291

مذہب کی بنیاد تو سراپا انفرادیت پر ہوتی ہے جب کہ دین شروع سے آخر تک اجتماعیت کا درس دیتا ہے _____ 291

قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کو کہا کہ تم جماعت کے ہی ایک فرد ہو _____ 292

اور تو اور جنت میں داخلہ بھی اجتماعیت کا رہین منت ہوگا ___ 292

قرآن حکیم میں تکرار کا مقصد تو ایک بات کو کسی دوسرے انداز میں مزید واضح کرنے کے ہوتے ہیں _____ 293

دین کی تکذیب کرنے والوں کی حالت آخرکار بربادی
اور ذلت ورسوائی ہی ہوتی ہے _____ 293
تکذیب دین اور کفر میں فرق _____ 294
قرآن حکیم تو اپنے اصول کی سچائی کو ثبوت کے
ساتھ پیش کرتا ہے _____ 295
جس معاشرے میں مذہبی پیشوائیت کا غلبہ ہوگا' وہ معاشرہ کبھی
عزت واحترام کی' وقار کی زندگی بسر نہیں کر سکے گا _____ 295
قرآن حکیم میں بیان کردہ واقعات کا مقصد قوموں کی
موت وحیات کے اصول بیان کرنا ہے _____ 296
مذہب کی بنیاد پندارِ نفس پر استوار ہوتی ہے' مذہب میں
دلیل نہیں' تقلید مقدم ہوتی ہے _____ 296
زندگی کا ایک بہترین اصول یہ ہے کہ کسی بات پر فوری فیصلہ
صادر نہیں کر دینا چاہیے _____ 297
قرآنِ حکیم کے نزدیک مذہبی مناظرے اور مباحثے کبھی
نتیجہ خیز نہیں ہوتے _____ 297
انسان کی ضد بازی اس کے دل پر مہر لگا دیتی ہے جس سے
اس کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں _____ 298
انسان بنی اسرائیل' مقام نبوت کی خصوصیات اور فرعون
کی متکبرانہ ذہنیت _____ 299
فرعون کی مستکبرانہ ذہنیت' اس کا استحصالی نظام اور لفظ
جرم کا لغوی مفہوم _____ 300
حضرت موسیٰ کے فرعون کے صاحبِ ثروت حضرات
کے ساتھ سوال وجواب کی محفل کا تذکرہ _____ 300
حضرت موسیٰ کا فرعون سے مطالبہ محکوم قوم کی آزادی
حاصل کرنا تھا _____ 300
لفظ سحر کا مفہوم فریب کو سچ کر کے دکھانے کے ہیں _____ 301
ملتِ اسلامیہ نے ہزار سال سے مذہب کو دین سمجھ رکھا ہے _ 301
جھوٹ کو سچ کے پردے میں پیش کرنے والوں کا انجام
خود اپنا ثبوت آپ ہوتا ہے _____ 302
عقل وفکر کو خیر باد کہتے ہوئے اسلاف کے عمل کو مقدم
جاننے پر زور _____ 303
چھوٹے جادو کے مقابلے میں بڑا جادو نبوت کی شان
کے شایان نہیں ہوسکتا _____ 303
رسیوں کا سانپ اور عصا کا اژدھا بن جانا یہ تو سنت اللہ
کے ہی خلاف ہے _____ 304
فرعون کو تو اپنے تخت وتاج کی فکر لاحق تھی _____ 304
اہل دربار کی طرف سے فرعون کو مشورہ اور اس کا جواب
جسے اقبال نے سیاست فرعونی کہا تھا _____ 304
مذہبی پیشوائیت کی طرف سے عوام کو بھڑکانے کی سیاست
کو علامہ اقبال نے فرعونی سیاست سے تعبیر کیا تھا _____ 305
حضرتِ موسیٰ کی طرف سے فرعون کے بڑے بڑے
مناظرہ کرنے والوں کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کا چیلنج _ 305
فرعون کی طرف سے عوام کو بھڑکانے کے لیے اس کے
مذہبی پیشواؤں کے فریب کار اور دلائل _____ 306
ذاتِ خداوندی تو حق کو ثابت کرنے کے لیے اپنے
قوانین کو پیش کرتی ہے نہ کہ معاذ اللہ کسی جادو کو _____ 306
قرآنِ حکیم کے نزدیک معجزات کی اصل حقیقت' قرآنی
آئین کی روشنی میں _____ 307
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ حقائق کو الحق
ثابت کرنے کا طریق _____ 307

CamScanner

فرعون کے جادوگروں کا عمل اور حضرت موسیٰ کی طرف سے
عصا کے اژدھا بن جانے کی کہانی، تورات کی ہے ____ 309
تباہ حال قوموں کی بیماری کا علاج قانون خداوندی کی
بنیاد پر نظام Establish کرنے میں ہے ____ 310
دلیل و برہان کے برعکس معجزوں کے زور پر ذہنوں کی
آب یاری ممکن ہی نہ تھی ____ 311
عہدِ فرعونیت میں مذہب کے اندر اپنے عقائد یا اپنے
تصورات کو بدلنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی ____ 312
ہمارے اس دور میں بھی مذہب کو تبدیل کرنے والے
کے لیے سزائے موت ہی تجویز کی گئی ہے ____ 312
فرعون کے دربار سے سزا پانے والوں کا فرعون کو
جرات مندانہ جواب ____ 313
قرآن حکیم نے نظریاتی تبدیلی کے لیے کسی قسم کی کوئی
پابندی نہیں لگائی ____ 313
زندگی کے سفر میں نوجوان نسل زیادہ پُرعزم ہوتی ہے ____ 314
لفظ توکل کا لغوی مفہوم یعنی وہ محکم سہارا جو کبھی نہ ٹوٹے
دھوکہ دے ____ 314
منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے پہلی شرط، قانون کو تسلیم کرنا
اور پھر پوری طرح اس پر بھروسہ کرنا ہوگا ____ 316
قرآنِ حکیم نے کسی چیز پر ایمان کو سچ ثابت کرنے کے
لیے دل و دماغ کی ہم آہنگی کو مشروط قرار دیا ہے ____ 316
اصل میں دل کا تقاضا ہی کسی کے لیے عمل کا سبب بنتا ہے ____ 317
انسانی ذات کی ہلاکت کا احساس ہی انسان کو کسی بدعملی
سے روک سکتا ہے ____ 317
کسی بات کا جان لینا اور پھر طبیعت کا ادھر آنا دو الگ
الگ کیفیات ہیں ____ 318
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ تصورِ حیات انسانی
جذبات کا رُخ ہی دوسری طرف موڑ دیتا ہے ____ 318
جذبات کا رُخ بدلنے کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا
فرمان کہ "میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے" ____ 319
مسلمان قوم کا فرد بننا یا ہونا ایک بات ہے جب کہ
مسلمان ہونا ایک دوسرا عمل ہے جس کے لیے ابلیس کو
مسلمان کرنا ہوتا ہے ____ 319
فرعون کے دربار میں ان نوجوان طبقے کا اظہارِ خیال کہ
جن پر حقیقت واضح ہو چکی تھی ____ 320
حضرت موسیٰ کے زیر سایہ سینا کی وادیوں میں ایک آزاد
مملکت کے قیام کے لیے فکری انقلاب کی ضرورت ____ 321
قیامِ پاکستان سے قبل ہندوستان میں ہماری حالت اور ایک
الگ مملکت کے قیام کا مقصد ____ 321
معاشرے میں پیدا ہونے والے اثرات اور قوموں
کی موت و حیات کے لیے قبلے کے رخ کا تعین گھریلو
زندگی سے ہوتا ہے ____ 322
صدیوں سے لاکھوں کی تعداد میں حج کے موقعہ
پر کعبے کے سائے میں مومن روتا ہوا آتا ہے اور روتا
ہوا ہی واپس چلا جاتا ہے ____ 323
استحصالی نظام کی بنا پر استبدادی معاشرے
کی تشکیل کے اثرات ____ 324
خدا کے حضور حضرت موسیٰ کی التجا اور خدا کی طرف سے
اس کے جواب کی نوعیت ____ 325
حضرت موسیٰ کو دعا کی قبولیت کے لیے فرعون کی سرکشی

CamScanner

کو توڑنا ہوگا _____ 325
بنی اسرائیل کے متعلق دریا کو پار کرنے کی وضاحت
کے سلسلہ میں یہودی یونیورسٹی کی ریسرچ اور تورات کے
نئے ایڈیشن کا بیان _____ 326
قرآن حکیم میں جوار بھاٹا کی تائید _____ 327
پانی کے بیچ فرعون کی زندگی کے آخری لمحات میں خدا پر
ایمان کا اقرار _____ 328
ہمارے ہاں کی تفسیروں میں فرعون کے آخری وقت
کی بیان کردہ روئداد جو عقل وشعور کی دشمن اور قرآن حکیم
کے بیان کی نفی ہے _____ 328
آخری لمحات میں ایمان کچھ کارگر ثابت نہ ہوا بلکہ فرعون کی
لاش کو آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا گیا _____ 330
حضرت موسیٰ کی طرف سے صدق وعدل پر مبنی حکومت کا قیام 331
رزق طیب صرف انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے
آزاد مملکت میں ہی ممکن ہے _____ 331
فرعونی حکومت جسے ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی اس
کی بنیادی وجہ ان کا باہمی اختلاف تھا' ان کا قبلہ ایک نہ تھا _ 332
ایک ملت کہلانے کے لیے' ایک نگاہ کا ہونا بنیادی شرط ہے یا
(ایک ملت کہلانے کے لیے ایک نظریہ کا ہونا بنیادی شرط ہے) 332
نبی اکرم ﷺ کے دور کی اصل شکل وصورت جس میں
مذہبی اختلاف کی بجائے دین کا اجتماعی تصور تھا _____ 333
لفظ قیامت کا مفہوم جس روز مردہ قومیں اجتماعی طور
پر حیات کے لیے فوری طور پر اُٹھ کھڑی ہوں گی _____ 333
قرآن حکیم میں صیغہ واحد کے استعمال کے متعلق ایک
ضروری وضاحت _____ 336
قرآن حکیم جو عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے اس
کو سمجھنے کا طریقہ _____ 337
نوع انسانی کی حد تک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرآن کریم
کا ایک کھلا چیلنج _____ 337
مملکت پاکستان میں ہر ہر قدم پر پائے جانے والے
نظریاتی اختلاف کی نوعیت _____ 339
پاکستان کے آئین کے برعکس تکذیب کا عمل جاری ہے
جو خدا کے لیے چیلنج ہے جو کفر کا بھی اگلا درجہ ہے _____ 340
کفر میں منافقت نہیں ہوتی کافر تکذیب نہیں کرتا جب
کہ دین کے برعکس مذہب سراپا تکذیب کا شکار ہوتا ہے ___ 340
قرآن حکیم کے تراجم سے ہمیشہ الجھاؤ پیدا ہوتا ہے _____ 341
ذات خداوندی ایک ہی سانس میں الھادی بھی ہے اور
(معاذ اللہ) المضل بھی یعنی گمراہ کرنے والا بھی ہے _____ 341
مروجہ تفاسیر میں پیش کردہ روایات کے تحت آدم کی پشت
سے جہنمی اور جنتی روحوں کا پیدا ہونا؟ _____ 341
ایک بلا تمثیل بات مہاراج رنجیت سنگھ کے زمانے کی _____ 342
کہاں فرمان خداوندی اور کہاں یہ تفسیروں کا
اور روایات کا بیان _____ 342
دلوں پر مہر لگنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد _____ 342
توبہ کی قبولیت تعمیری پروگرام کی تکمیل کے بغیر ممکن ہی نہیں _ 343
نبوت کی طرف سے راہنمائی کے طریق کی وضاحت ____ 343
ہجرت کا عمل خدا تعالیٰ کے پروگرام کا متقاضی ہوتا ہے'
اسے کسی نبی کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا _____ 344
ہجرت کے معاملے میں حضرت یونسؑ کی اجتہادی غلطی
اور پھر واپسی کا عمل _____ 344

ایمان کی اہمیت کا اندازہ تباہ ہونے سے قبل کر لینا چاہیے ___ 345

قانونِ مکافات تو اپنا نتیجہ اندر ہی اندر مرتب کرتا چلا جاتا ہے 345

ظہورِ نتائج کے وقت عذاب کی نوعیت یہ ہے کہ قومیں

دوسروں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاتی ہیں ___ 346

نبی اکرم ﷺ کی حساس خیالی کی کیفیت ___ 347

ذاتِ خداوندی کسی کو مومن بننے کے لیے مجبور نہیں کرتی ___ 347

قدرت انسان سے اس کے اختیار وارادہ کی نعمت کو کسی

صورت واپس نہیں لیتی ___ 348

لیکن ہم خدا کے قانون کے برعکس جبراً انسان کو مسلمان

رکھنا چاہتے ہیں۔ بغداد کی گلیاں تو اس امر کی شہادت ہیں ___ 348

اس وقت کے صاحبِ اقتدار کا جرم کہ ان کا عقیدہ

صحیح نہیں ہے ___ 348

خدا کا فرمان اور جناب مودودی صاحب کا تحریری فتویٰ

یعنی مرتد کی سزا قتل ہوگی ___ 349

ہمارے یہاں غلط تراجم کی پیدا کردہ غلط فہمی کا تجزیہ ہے۔

لفظ اذن کے مفہوم کی وضاحت ___ 349

خدا پر ایمان لانے کا قانون یہ ہے کہ انسان کو عقل وفکر

سے کام لیتے ہوئے ایمان لانا ہوگا ___ 350

عقل وفکر کو ماؤف کر کے کسی بات کا منوانا تو قانون

خداوندی کے ہی خلاف تھا ___ 350

قانونِ خداوندی کا ہی یہ ماحصل ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ

بحسن وخوبی کام سرانجام دے رہا ہے ___ 351

عقلِ انسانی کی نشوونما کائناتی نظم وضبط کے مطالعہ کے

بغیر تو ممکن ہی نہیں ___ 351

قرآنی اقدار پر پختہ ایمان اور عمل پیہم ثمر بار ہوئے بغیر رہ

ہی نہیں سکتا اور یہی مومن ہونے کی پہچان ہے ___ 352

مومن کی حفاظت کرنا خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے ___ 352

کوئی غیر مسلم قوم مسلمانوں پر غالب نہیں آ سکتی ___ 353

جماعت مومنین کے لیے نبی اکرم ﷺ کی یقین دہانی ___ 353

منزلِ مقصود کے صحیح ہونے کا یقین راستے کا تعین اور

پھر حصولِ منزل کے لیے سفر کا آغاز کامیابی کی نوید ہے ___ 354

ان غلط تراجم نے قرآن حکیم کی منزہ اور مشہور تعلیم کو

چیستاں بنا دیا ہے ___ 354

سفر زندگی کے لیے قرآن حکیم کے بیان کردہ اصول وضوابط

کے موثر ہونے کی شکل وصورت ___ 355

اگر ہاتھ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا صحیح علاج نہ کیا جائے تو پھر

ہاتھ کو کاٹنے کی نوبت آ جاتی ہے ___ 355

خدا تعالیٰ اپنی سنت کو کبھی نہیں بدلتا لفظ من یش آء کے معنی

''خدا کا قانون'' کے ہیں ___ 356

آیاتِ قرآنی کے آخری الفاظ بڑے غور وفکر کے

متقاضی ہوتے ہیں ___ 356

ہر فرد اپنے عمل کے نتیجہ کا خود ذمہ دار ہوگا ___ 357

کسی شخص کو زبردستی کسی راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرنا

انسان کے اختیار وارادے کو سلب کرنے کے مترادف ہے 357

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الیونس۔ پہلا باب (آیات 1 تا 3)

قرآن حکیم کی اہمیت' افادیت اور اس کی غرض و غایت کے علاوہ اس کی ترتیب

اور پھر عقل انسان کے ساتھ اس کے رشتے کا تعلق

(الٓر) (10:1) دیکھئے وہاں جو **حسبی اللہ** کہا تھا جس کے متعلق جیسا میں نے عرض کیا تھا سورۃ عنکبوت میں ہے کہ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ یہ کتاب ہم نے دیدی انسانوں کو۔ بات یہ تھی میں نے کہا ہوا ہے نا کہ قرآنِ کریم تو الحمد سے والناس تک مربوط چلا جا رہا ہے۔ یہ تو مختلف Chapters کے اندر اس نے پڑھنے کے لیے Divide کیا ہوا ہے۔ الگ سورتیں دی ہوئی ہیں کہ یہ ابواب اس کے ہیں۔ کتاب تو یہ ساری کی ساری ایک مسلسل ترتیب کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ کیا چیز ہے جو کافی ہے؟ قرآن کافی کہا تھا نا۔ کہا یہ کہنے والا کون ہے؟ خدائے علیم و رحیم کا یہ ارشاد ہے (الٓر) ۔ اس کا ارشاد یہ ہے کہ (**تلک اٰیٰت الکتٰب الحکیم**) (10:1) یہ اس کی آیات ہیں اس کے قوانین ہیں' کتاب الحکیم۔ میں نے یہ عرض کیا تھا پہلے بھی ایک دن کہ یہ جو خدا نے اپنے لیے بھی حکیم کہا ہے اپنی کتاب کے لیے بھی حکیم کہا ہے۔ اپنی طرف سے جو نازل کیا ہے کہا ہے کہ ہم نے کتاب نازل کی حکمت بھی ہم نے ہی اس کی نازل کی۔ کتاب تو قانون کو کہتے ہیں۔ حکمت وہ غرض و غایت اور مقصد ہوتی ہے جسے Rationally Explain کیا جاتا ہے' عقل و فکر کی رو سے سمجھایا جاتا ہے۔ حکمتِ بالغہ ہمارے ہاں بھی تو لفظ یہ ہے۔ یہ تو الگ بات ہے کہ ہم نے اب حکیم کا لفظ ہی وہ طبیب کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ حکیم تو خالص یہ حکمت جسے کہتے ہیں اس کا تعلق ہی Reason سے ہے۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ خدا جیسا قادرِ مطلق اسے ضرورت نہیں تھی کہ قانون دیتا اور اس کے ساتھ سمجھاتا بھی پھرتا' ہم نے یہ کیوں دیا ہے'۔ یہ جو ابھی **بانھم** آیا ہے کہ ان کے دل پھیر دیے جاتے ہیں۔ **بانھم** کیونکہ۔ یا جہاں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ (**کتب علیکم الصیام**) یہ حکم ہے یہ۔ ایک قادرِ مطلق جو تھا اس کے لیے کافی تھا یہ کہتا کہ ہم نے تمہیں حکم دیا ہے قانون ہے ہمارا یہ کہ یہ صیام فرض ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم ہے ساتھ۔ کہتا ہے (**لعلکم تشکرون**) یہ اس لیے ہے تاکہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ تو قرآنی احکام اس کے اصول جو ہیں اس کی غایت اس کا مقصود اس کی حکمت اس کا

Reason یہ ساری چیزیں خود خدا نے Explain کردی ہیں۔تا کہ انسان جو کچھ مانے علیٰ وجہ البصیرت مانے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا رسول ﷺ کی زبان سے یہ کہلوایا کہ ان سے کہدو کہ (**ادعوا الی اللہ علٰی بصیرۃٍ**) ہم جو خدا کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہیں یہ اندھا Faith نہیں ہے جو ہم کہتے ہیں کہ صاحب اس کو تو Beleive کرنا ہوگا عقل کا تو کام نہیں ہے اس میں کوئی بھی۔**علٰی بصیرۃٍ** ہم علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں تمہیں خدا کی طرف۔(**انا و من اتبعنی**) میں بھی یہی کرتا ہوں اور جو میرے راستے پہ چلنے والے ہونگے وہ بھی یہی کریں گے۔اب اس کے راستے چلنے کے جو مدعی ہیں دعویٰ کرنے والے ہیں پہلی چیز یہ ہے کہ صاحب شریعت میں عقل کا دخل نہیں ہے۔دو چیزوں کا دخل نہیں ہوا کرتا میں بتایا کرتا ہوں کہ ''شرع اچ اک تے شرم نئیں ہوندی تے اک عقل فکرنوں کوئی دخل نہیں ہوندی''۔

روزے فرض کرنے کا مقصد اور اس کا نتیجہ جو محسوس شکل میں دیکھا جانا ضروری ہے

بہرحال بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ حکیم ہے حکمت نازل کی ہے اس نے خود۔اور آپ کو معلوم ہے کہ اس میں حکمت کیا ہے جو حکمت نازل کی ہے۔صیام فرض قرار دیے تمہارے اوپر تا کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔اب اس تا کہ کے معنی یہ ہوئے کہ یہ پرکھتے رہو کہ ایسا کرنے سے ایسا ہو رہا ہے یا نہیں۔ہم نے آگ بنائی تا کہ وہ تمہیں حرارت دے۔فقرہ سمجھ میں آ گیا نا۔تو اب اگر یہ دیکھنا ہو کہ واقعی آگ ہماری جلی ہے یا نہیں' آگ اگر تمہیں نظر نہ آ رہی ہو کسی ایسی انگیٹھی کے اندر ہو کہ نظر نہیں آ رہی اور یہ دیکھنا ہو کہ وہ جلی ہے یا نہیں اس کا طریقہ کیا ہے؟ اوپر کوئی چیز رکھ کے دیکھ لے گرم ہوئی ہے یا نہیں۔یہ ہے نا**لعلکم** ۔ہم نے آگ دی تا کہ وہ تمہیں حرارت دے۔حرارت نہیں دے گی تو نیچے آگ نہیں جل رہی راکھ کا ڈھیر ہے۔حرارت دے رہی ہے آگ جل رہی ہے ٹھیک ہے وہ مقصد پورا ہو رہا ہے جس کے لیے وہ حکم دیا گیا تھا۔یہ اس لیے خود اس نے بتا دی غایت کہ یہ غایت تم اپنے ذہن سے ہی کہیں فیصلہ نہ کرلو اور پھر یہ کہدو کہ ہاں صاحب احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں ۔یہ جتنے احکام کا اتباع ہم کر رہے ہیں مذہب کے اندر وہ میں کہتا ہوں ہوسکتا ہوں وہ اسی طریقے کے مطابق ہوں جو خدا نے بتائے ہیں۔اور پھر اس کے بعد وہ نتائج پیدا کیوں نہیں کر رہے' کیا بات ہے کہ وہ نتائج نہیں پیدا کر رہے۔اور اس کے باوجود کیا بات ہے کہ ہم اسی طرح سے لگے چلے جا رہے ہیں۔یہ اس لیے کہ ہم نے ان کے نتائج جو تھے جو خدا نے بتائے تھے وہ نہیں سامنے رکھے ان کے نتائج کے متعلق آپ فیصلہ کرلیا۔کیا فیصلہ کرلیا ہم نے؟ یہ کچھ کرے اس سے ثواب ہوتا ہے صاحب۔ثواب کیا ہوتا ہے؟ ثواب ہوتا ہے۔کوئی نہیں بتا سکتا کہ ثواب ہوتا کیا ہے۔صاحب معلوم کیسے ہو کہ ثواب ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا؟ کہتا ہے قیامت میں جا کے معلوم ہوگا۔عزیزانِ من! یہ بڑے سوچنے کی باتیں ہیں کہ یہ کہاں ہے غلطی جو ہمیں لگی یا کہاں ہے جو ہم صحیح راستے سے ادھر ہٹ گئے۔وہاں جو **لعلکم** جو تھا قرآن نے کہا تا کہ اس کا یہ نتیجہ ہو وہ چیز ہم نے نہیں قرآن سے لی۔

لعلکم ہم نے خود وضع کرلیا۔اوراس کے بعدقرآن کہتا ہے کہ پھر(**کل حزب بما لدیھم فرحون**) نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ پھر ہر فرقہ خوش ہوتا ہے کہ ہم ٹھیک اتباعِ احکامِ خداوندی کررہے ہیں۔ارے بھئی اگر وہ نتائج جو خدا نے بتائے وہ ہوتا معیار تو فوراً پرکھ ہوجاتی دونوں کے درمیان کہ یہ اس حکم کا اتباع ہورہا ہے یا نہیں ہورہا۔اس کے حکم کے مطابق آگ جل رہی ہے پتہ چل جاتا کہ اگر پانی گرم ہوا ہے یا نہیں' اس کا پانی گرم ہوا ہے جل رہی ہے اس کا پانی گرم نہیں ہوا وہ نہیں جل رہی۔جس کا نہیں گرم ہوا اس کے بعد اس کو ضرورت پیش آتی نا کہ نیچے سے سٹوو کھولتا پھر دیکھتا کہ صاحب کہاں غلطی ہوگئی۔آگ نہیں جل رہی' اگلا پوچھتا ہے او کیسے تم کہتے ہو نہیں جل رہی' کہ صاحب پانی نہیں گرم ہورہا۔اور اگر ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ نہیں صاحب اس کا تعلق اس حرارت سے نہیں ہے جو پانی میں پہنچے گی' یہ جو ہے آگ جلے گی اس سے ہوگا ثواب اس کا پتہ چلے گا جا کے قیامت میں۔جس کا سٹوو جل رہا ہے جس کا نہیں جل رہا دونوں خوش ہیں اپنی اپنی جگہ کہ ٹھیک ہے کام ہورہا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یاد آ گیا ہو کبھی کبھی میں وہ سنایا کرتا ہوں دھرم شالہ میں جو میں نہ وہ دیکھا تھا کہ خوش ہے اپنی اپنی جگہ ہر شخص کہ آگ جل رہی ہے۔سردی کے موسم میں وہاں بڑی سردی ہوتی ہے پہاڑی مقام ہوتے ہیں۔صبح ہی صبح گاؤں والے اٹھ کے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرتے ہیں اور وہ ایک جگہ لکڑیاں رکھ کے اس طرح سے الاؤ اس کا بناتے تھے پھر اس کے بعد اس میں ماچس دکھاتے تھے آگ جلاتے تھے۔آگ جلتی تھی تو وہ اس طرح سے پھر آگ تاپنے کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔تاپتے تھے' جب سورج نکل آتا تھا اس کے بعد پھر وہ اٹھ کے چلے جاتے تھے آگ بجھا جاتے تھے۔بندر بہت ہوتے ہیں ان علاقوں کے اندر' تو بندر تو نقال ہوتا ہے نا۔وہ یہ سب کچھ دیکھتے تھے۔تو وہ چلے جاتے۔یہ بندر اٹھتے ان کو یہ بھی پتہ ہے لکڑیاں کہاں ہوتی ہیں اسی طرح سے اکٹھی بھی کرتے۔یہ تو بڑا کرم ہے فطرت کا کہ بندر کو ماچس نہیں آتی جلانے۔وہ ساری لکڑیاں یہ کچھ کر کے رکھ لیتے۔اور اس کے بعد میں نے دیکھا ہے کہ ان لکڑیوں کے اردگرد انہی کی طرح اس طرح سے بیٹھ جاتے' بیٹھے ہوئے ہیں آنکھیں بند ہیں خوش ہیں۔(**کل حزب بما لدیھم فرحون**) آگ تاپنے والے بھی خوش تھے یہ بیٹھے ہوئے بھی خوش ہیں آنکھیں بند ہیں ان کی۔کیا بات ہوئی اس میں ہنسی کی کہ وہ جو تھا لعلکم اسے انہوں نے فراموش کردیا۔یہ کچھ کرو تا کہ تمہیں حرارت ملے۔اگر یہ سامنے بات ہوتی تو ایک دفعہ تو اتنی محنت کرلی تھی ان بندروں نے اور دیکھا تھا کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد تو حرارت نہیں ملتی۔یا پھر کسی طرح سے سوچتے کہ حرارت کیسے ملا کرتی ہے اور یہ چیز ان کے بس کی نہیں ہوتی تو اس کے بعد یہ اس کی زحمت ہی نہ کرتے کبھی۔وہ زحمت بھی مسلسل ہوئے چلی جارہی ہے حرارت مل نہیں رہی ہے۔

نماز و روزہ و قربانی و حج

یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

ماچس نہیں ہے عزیزانِ من!۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

سب لکڑیاں اسی طرح سے وہ لاتے ہیں اسی طرح سے کاالاؤ کھڑا کرتے ہیں اسی طرح اس کے گرد بھی بیٹھ جاتے ہیں۔(**ھم یرآء ون فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون**) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو صلوٰۃ کی غرض وغایت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ان لکڑیوں کی غرض وغایت حرارت دینا ہے' غرض وغایت سے بے خبر ہوتے ہیں غافل ہوجاتے ہیں۔پھر کیا بات مصلین کہا ان کو کیا کرتے ہیں' **ھم یرآء ون** ' وہ جو محسوس چیز دیکھنے کی ہوتی ہے اتنا کر لیتے ہیں۔لکڑیاں بھی لے آتے ہیں ان کو کھڑا بھی کر لیتے ہیں الاؤ بھی بنا لیتے ہیں ویسے بیٹھ بھی جاتے ہیں اس کے گرد۔(**فویل للمصلین الذین ھم عن صلاتھم ساھون ھم یرآء ون**) یہ سارا کچھ کر لیتے ہیں اس کے بعد اٹھ کے چلے جاتے ہیں تو عملاً کرتے کیا ہیں۔(**و یمنعون الماعون**) رزق کے ان چشموں کو جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے بہتار ہنا چاہیے تھا اس کے سامنے بند لگا کے بیٹھ جاتے ہیں مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم نے وہ کچھ کر لیا ہوا ہے۔عاقت تو سنور گئی ہوئی ہے نا۔

(**تلک اٰیٰت الکتٰب الحکیم**) (10:1) ہم نے اس کتاب کو کتابِ حکیم نہیں سمجھا عزیزانِ من! اس کی حکمت ہم نے اپنے سامنے نہیں رکھی' اس کے نتائج محسوس جو یہاں نکلنے تھے وہ سامنے نہیں رکھے۔اس نے کہا تھا کہ مومن جو ہے(**لا تھنوا و لا تحزنوا' و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین**) آؤ تمہیں بتائیں کسی وقت پرکھنا ہو تم نے کہ ہم مومن رہے ہیں یا نہیں رہے' دھوکے میں نہ رکھو اپنے آپ کو۔آؤ تمہیں ایک کسوٹی دیں پرکھ کے دیکھ لو۔کسوٹی یہ ہے کہ (**انتم الاعلون**) دنیا میں ہر بڑے سے تم بڑے ہوگے۔اعلون ہے عزیزانِ من! Supernative Degree جسے آپ انگریزی میں کہتے ہیں۔کوئی تم سے بڑا نہیں ہوگا۔کسوٹی مل گئی پرکھ مل گئی۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے

کس انداز سے بات یہ کہہ جاتا ہے صاحب۔ہر بالاتر سے بالا۔اعلون کا ترجمہ بڑا صحیح ہے 'بالائے ہر بالاترے'۔کہتا ہے کسی کا اس سے آگے جانا تو ایک طرف رہا

غیرتِ او بر نہ تابد ہمسرے

اس کی غیرت تو اس کو بھی گوارہ نہیں کرتی کہ کوئی اس کے ساتھ چلے صاحب' آگے بڑھنا تو ایک طرف رہا۔

کیوں اس نے کہا ہے کہ وہ ساتھ چلنے والے کو بھی گوارہ نہیں کرسکتا۔اس لیے کہ قرآن نے ان کے لیے کہا تھا کہ (**امامًا للناس**) نوعِ انسانی کی امامت تمہارے ہاتھ آئے گی لیڈرشپ تمہارے ہاتھ آئے گی آگے چلو گے تم زمانہ تمہارے پیچھے چلے گا۔مومن کی پرکھ کے لیے یہ کسوٹی دی تھی اس نے صاحب۔دیکھ لی یہ کسوٹی۔دوسری جگہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کفار مؤمنین کے اوپر کسی طرح سے بھی غلبہ کوئی حاصل کرلیں۔کوئی سوال ہی نہیں ہے یہ۔تو اگر ہم اس کتاب کو حکیم اور خدا کی حکمت کے سامنے رکھتے تو یہ چیزیں اس نے جو دی ہوئی تھیں تو یہ تو عزیزانِ من! محسوس ہیں اس دنیا کی چیز ہے' اعلون یہاں کی صورتیں ہیں۔سب گئیں۔اس نے کہا تھا(**وعد الله الذين اٰمنوا منكم و اعملوا الصٰلحٰت ليستخلفنهم فى الارض**) ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ یہ ہے ہم نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے یاد رکھو۔خدا کا وعدہ ہے جو کہا ہے کہ (**لا يخلف الميعاد**) کبھی ہم وعدہ خلافی نہیں کیا کرتے۔یہ ہم نے وعدہ کر رکھا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ اس دنیا کے اندر اقتدار حاصل ہو جائے گا استخلاف فی الارض ہوگا۔اب ذلیل وخوار قومیں مسلمانوں کی ہیں۔تو یہ آیت بڑی واضح ہے کہاں نکل کے بھاگا جائے۔میں نے عرض کیا تھا نا کہ وہ جو کچھ منافقین کرتے تھے کہ جو کچھ وہ کرتے تھے آ کے اس کے لیے ایک عذر ضرور پیش کرتے تھے۔اور وہ ہمارے ہاں عذر جسے میں نے کہا تھا وہ تاویلات ہیں۔بین آیت ہے صاحب۔ان سے پوچھئے کہ صاحب دوسروں کی محکومیت کے زمانے میں آپ زندگی بسر کرنے کو مومن ہی کی زندگی نہیں کہتے ہیں آپ تو مقامِ نبوت تک کی بات کر رہے ہیں۔بڑی سیدھی سی بات تھی ایک۔کہا کہ دیکھئے قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ایمان واعمالِ صالح کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔تو وہاں ہمیں استخلاف فی الارض کہاں نصیب ہوا ہے۔تو آپ اپنے پہلے ایمان کو ثابت کیجیے قرآن کی رو سے صاحب' اگلی بات تو پھر ہم کریں گے۔چلیے باقی یہ ہم تو نہ رہے مومن' ہمارے اعمال اعمالِ صالح بھی نہ رہے آپ کے تو یہ ہیں۔وہ تو کہتا ہے استخلاف فی الارض ملے گی' تم کہتے ہو دوسروں کی محکومیت کے اندر بھی یہ سب کچھ ہوگا تو یہ آیت کیا ہوئی۔کہا جی! اس کے معنی استخلاف فی الارض کے معنی روحانیت کی دنیا کے اندر خلافت ملے گی۔چلیے صاحب۔اور روحانیت کی دنیا وہ ہے کہ نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی؟؟ میں بھری رہی' اس کے لیے ماپنے کا پرکھنے کا طریقہ ہی نہیں ہے۔اس آیت کی یہاں تفسیر یہ بیان کی گئی' تفسیر نہیں ہے یہ وہی چیز ہے جو میں نے کہا تھا جسے تاویل کہا گیا ہے۔اگلے لفظ پھر نہیں آئے (**فماستخلف الذين من قبلكم**) جیسا استخلاف ہم نے تم سے پہلی قوموں کو عطا کیا تھا۔اور قرآنِ کریم میں پہلی قوموں کے متعلق دس مقام پہ یہ چیز ہے کہ وہ اس دنیا کی بات تھی اس دنیا کا اقتدار تھا اس دنیا کی مملکت تھی۔حضرتِ ابراہیمؑ کے متعلق اور ان کی اولاد کے متعلق کہا ہے کہ نبوت بھی دی اور ملکِ عظیم دیا ہم نے ان کو' مملکتیں دی ہم نے۔یہاں اس نے کہا تھا کہ جیسا پہلی قوموں کو ہم نے دیا

تھا۔قرآن تو اس کے لیے شہادت بھی محسوس لاتا ہے۔جو پہلی دنیا کو ملا تھا قوموں کو ملا تھا وہ تو آج بھی ہم تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں۔اگر یہ روحانیت کی بات ہے تو پتہ کیسے چلے صاحب کہ پہلی قوموں کو ان کو روحانیت کیسے ملی۔اور پھر وہاں تو لفظ قوم ہے قوم کو کچھ مل رہا ہے۔اور پھر دیگر مقامات کے اوپر (الذین ان مکنٰھم فی الارض) تمکن فی الارض کہا ہوا ہے۔لیکن یہ سب چیزیں یہ کہنے لگے یہ روحانی دنیا کی باتیں ہیں۔یہ ہوا ہمارے ساتھ عزیزانِ من! ہم نے نہ اس کتاب کو کتابِ حکیم سمجھا نہ اس خدا کو خدائے حکیم سمجھا۔نہ ہم نے کتاب کی حکمت قوانین کی غرض وغایت سامنے رکھی۔نہ ان کے نتائج جو خود بتائے تھے خدا نے ان کو سامنے رکھا۔نہ ان نتائج کو ہم نے اپنے لیے پرکھ کی کسوٹی قرار دیا کہ اس کے مطابق دیکھ لیں کہ ہمارے اعمال وہ نتیجہ پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔اس طرح سے ہم نے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھا۔بگڑا کسی کا کچھ نہیں' کسی کا کیا بگڑنا ہے۔خدا کا کیا بگڑنا ہے(واللہ غنی عن العٰلمین)۔یہ ہیں(اٰیٰت الکتٰب الحکیم) (10:1) کے معنی عزیزانِ من!۔

پہلی ہی بات حکمت کی جو تھی لے آیا۔جتنی چیزیں Super-natural (مافوق الفطرت) ہوتی ہیں آپ کو یاد ہے نا کہ اس میں تو حکمت نہیں ہوتی: یہ کرامات یہ شعبدہ بازیاں۔فوق الفطرت کے معنی یہ ہوتے ہیں Super Intellectual کہتے ہیں اس کو انگریزی میں' جو عقلِ انسانی سے ماوراء ہو۔یہ جتنی چیزیں آپ کو یہ شعبدے یا کرامات دکھاتے ہیں آپ اس پہ کیوں حیران سے رہ جاتے ہیں۔اس لیے کہ وہ بات عقل میں نہیں آتی۔خواہ وہ یہ عام مداری کا شعبدہ ہو کہ اس نے یوں کیا اور کابل کا سر دا اس کے ہاتھ پہ۔آپ کی عقل میں بات نہیں آتی کہ یہ ہوا کیا۔یا وہ کرامات کی بات ہو جو وہ یہ کر رہے ہیں کہ ہاں صاحب جاؤ یہ لڑکی نہیں ہے گھر جا کے دیکھو لڑکا ہو جائے گا' جا کے دیکھا حضرت صاحب کی دعا سے لڑکا ہو گیا۔یہ Super Intellectual چیزیں ہیں عقلی توجیہ نہیں اس میں آ سکتی۔حکیم کے معنی یہ ہیں کہ اس میں عقلی توجیہات جو ہیں یہ خدا کی بیان کی ہوئی ہوں۔نبی اور رسول کے متعلق شروع سے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ جو ہے یہ کچھ فوق البشر سا ہوتا ہے عام انسان نہیں ہوتا اسے عام انسانوں سے کچھ اور ہونا چاہیے۔اور دنیا کے ہر مذہب میں انہوں نے اپنے مذہب کے بانی کو عام انسان سے اونچا فوق البشر رکھا ہوا ہے: خدا کا اوتار' خدا کا بیٹا' یہاں سے اوپر چلے جانا والا' فوق البشر ضرور ہوتا ہے۔اور پھر اس سے تمام جتنے بھی افعال سرزد ہوتے ہیں انہیں معجزہ کہا جاتا ہے جہاں عقلِ انسانی عاجز آ جائے سمجھ نہ سکے کہ یہ ہوا کیسے ہے۔یہ ضروری خصوصیت مذہب میں سمجھی جاتی ہے چنانچہ یہ آپ کے ہاں بھی یہ چیز آ گئی کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہوتا ہے۔یہ موضوع آئے گا جب درس میں تو میں تفصیل میں جاؤنگا۔قرآنِ کریم نے ہر مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں کہ کوئی معجزہ دکھاؤ۔کہا گیا کہ ان سے کہو کہ یہ جو ہم تمہیں رہنمائی دے رہے ہیں احکام دے رہے ہیں ہدایت دے رہے ہیں اور یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ تم اس سے فوق العقل کوئی معجزے مانگتے ہو۔اس سے کیا بنے گا تمہارا؟ اگر میں نے یوں انگلی کر کے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا تو اس سے تمہیں حاصل کیا ہوا'

اس کے بعد وہ پھر یوں مل گیا تمہیں اس سے کیا حاصل ہوا۔ میں وہ چیزیں تمہیں دیتا ہوں کہ تم یہاں سے جا کے چاند کو مسخر کرلو گے۔ او یہ ہے معجزہ۔ لیکن نہیں۔ وہ تو انسان کا ذہن تھا اور پھر چودہ سو سال پیشتر تو آپ انسان کو جانتے ہیں' آج بھی انسان وہیں کھڑا ہے جو مذہب پرست ہے۔ کرامات مانگتا ہے عقل وفکر نہیں مانتا۔ کہا ان لوگوں کو دیکھو ہم کتابِ حکیم دے رہے ہیں۔ دیکھئے عزیزانِ من! ربط (**اکان للناس عجبًا ان اوحینا الٰی رجل منھم ان انذر الناس**) (10:2) کہا انہیں اس بات پہ تعجب آ رہا ہے کہ صاحب ہمارے جیسا ہم میں سے ایک رسول۔ وہ کہا تھا نا(**رسول من انفسکم**) تم میں سے ہی رسول۔ کہا اس چیز کے اوپر یہ تعجب کر رہے ہیں کہ واہ یہ رسول کیسا ہوا۔ اور دوسری جگہ ہے کہ یہ رسول دیکھئے صاحب بال بچے بھی اس کے ہیں کھاتا پیتا بھی ہے۔ کہا یہ ہے کہ صاحب یہ بازاروں میں جا کے سودا سلف بھی خریدتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے جتنے یہ حضرت جی ہوتے ہیں آپ نے ان کو کبھی انارکلی میں نہیں دیکھا ہوگا۔ ''اوانارکلی اچ تہاڈے ساڈے ورگے جاندے نیں نا بندے بشر''۔ عام لوگوں کا سا لباس نہیں ہے' عام لوگوں کا سا انداز چلنے پھرنے کا نہیں ہے' وضع قطع کچھ الگ ہے' تراش خراش کچھ الگ ہے' لوگوں سے ملیں گے نہیں' آہستہ آہستہ ذہنوں میں یہ بات ہوگی کہ صاحب یہ کچھ الگ تھلگ سی بات ہے۔ اور پھر جب وہ کرامتیں دکھاتے ہیں تو پھر تو پوچھو ہی نہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ ان کو دیکھئے ان کو اس پہ تعجب آ رہا ہے کہ صاحب ہمارے جیسا ہی ایک انسان رسول۔ کتابِ حکیم کے بعد عزیزانِ من! اس بات کا لانا کیا بات ہے اس کی۔ کہا یہ کتابِ حکیم ہے۔ اگر پہلی ہی بات یہ ہو جاتی کہ یہ رسول جو ہوتا وہ ایسا ہوتا جو تمہاری عقل وفکر میں نہ آتا کہ یہ کس قسم کا آیا۔ وہی حکیم نہ رہتا تو اس کی کتاب کیا حکیم ہوتی۔ وہاں بھی تم عقل وفکر کے دیے گل کرنے کے بعد اس کو مانتے رسول' اس کی ہر بات کو ماننے کے لیے بھی عقل وفکر کے دیے گل کرنے پڑتے تمہیں۔ خیر یہاں تو بات حکمت پہ ہے۔ وہ خدا حکیم اس کی کتاب حکیم یہ علیٰ وجہ البصیرت تمہیں دعوت دیتا ہے۔(**اکان للناس عجبًا ان اوحینا الٰی رجل منھم**) (10:2) کہ انہی میں سے ایک انسان ہے۔ چلئے صاحب انسان ہی بنانا تھا چلو آسمان سے تو کہیں آتا۔(**رجل منھم ان انذر الناس**) (10:2) کرتا یہ کیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے یہ لوگوں کو آگاہ کرتا ہے کہ بابا جس راستے پہ جا رہے ہو آگے راستہ خطرناک ہے سانپ بیٹھا ہوا ہے راستے میں' ڈاکو پڑتے ہیں' ٹوٹ گیا ہوا ہے بند آگے سیلاب ہوا ہے نہ جانے اس راستے پہ۔ کہنے لگے اتنی سی بات ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ نہ جانا آگے کوئی ڈاکو ہیں یا سیلاب آ رہا ہے تم اس سے کہتے ہو کہ نہیں صاحب تم اپنے بالوں میں سے دودھ نکال کے بتاؤ' کہنے لگے اس سے دونوں سے تعلق کیا ہے۔ مانتے ہو مانو نہیں مانتے نہ مانو آگے خود پتہ چل جائے گا کہ ہے سانپ بیٹھا ہوا یا نہیں۔ ''کھسما نوں کھاؤ''۔ ان دونوں باتوں کے اندر تعلق یا ربط کیا ہے کہ کچھ میں کر کے دکھاؤں تو پھر تو تم مانو کہ آگے سانپ ہے اور اگر یہ میں نہ کروں تو تم کہو کہ نہیں صاحب نہیں ہو سکتا کیونکہ تمہارے بالوں میں سے دودھ نہیں نکلتا۔ ربط نہیں ہے۔ میں آگاہ کرتا ہوں اس بات سے کہ جس

راستے پہ تم جارہے ہو آگے خطرہ ہے۔(**و بشر الذین اٰمنوا**) (10:2)

اور وہ اس بات کی بشارت دے ایمان والوں کہ تمہارے اس ایمان اور عمل کا نتیجہ۔ کیا نتیجہ ہے؟ (**ان لھم قدم صدقٍ عند ربھم**) (10:2) خدا کے قانون کے مطابق انہیں بڑے بلند مقامات حاصل ہونگے۔ عربی زبان کی رو سے بھی اس کے معنی ہیں **قدم صدق** جہاں ٹھہرے کوئی شخص' قائم رہ سکے جس مقام کے اوپر وہ یہ ہے۔ کوئی دھوکا نہیں ہے' وہ Reality ہے جو میں کہہ رہا ہوں یہ واقعی اس قسم کا ایک ٹھکانہ ملے گا جس پہ پاؤں ٹکا سکو گے تم۔ اور عربی زبان میں اس کو کہتے ہیں کہ جس پہ بلندیاں شرف اور عظمتیں جتنی ہیں سب حاصل ہو جائیں اس سے۔ یہ اس خدا کے قانون کی رو سے ہوگا جو ربوبیت کا دعویدار ہے۔ کہا یہ چیز میں کہہ رہا ہوں (**قال الکٰفرون ان ھٰذا لسٰحر مبین**) (10:2) ہمارے ہاں عام ترجمہ جو ہے اس میں آپ دیکھیں گے اس میں کہا ہوا ہے کہ لو اس کے جواب میں یہ کافر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے۔ ارے اگر تو یہ کوئی معجزے دکھاتا تو اس میں تو یہ سوال یہ پیدا کرتے کہ نہیں صاحب تم مسلمان اس کو معجزہ کہو ہم تو یہ کہیں گے جادوگر ہے' ہم نے جادوگروں کو یہ کچھ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہے نا بات' اسی صورت میں یہ ربط قائم رہتا نا بات کا کہ تم یہ کہتے کہ تمہاری نبوت کا ثبوت کیا ہے وہ اس کے لیے ایک کرامت یا معجزہ دکھا دیتا۔ معجزہ دکھاتا تو اس کے بعد ماننے والے تو جھک جاتے نہ ماننے والے اس وقت کہتے کہ صاحب یہ تو وہ جادو ہے۔ گنجائش تھی نا اس میں کہنے کی۔ یہاں وہ کہہ رہا ہے کہ نہیں میں تو تمہارے جیسا (**بشــر مثلـکم**) ہوں میں کوئی ایسی بات نہیں پیش کر سکتا تمہارے سامنے کہ جو مافوق الفطرت ہو' کوئی شعبدہ نہیں ہے' کوئی اس قسم کی چیز نہیں ہے۔ تو یہ آگے جو بات ہے کہ یہ وہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تو جادوگر ہے' کس بات پہ انہوں نے کہا جادوگر ہے۔ پہلے تو یہ بات ہے کہ یہ تو وہ خود کہتے ہیں عام انسان ہے تو جادوگر کیسا۔ دیکھا ترجمے میں کہاں بات جاتی ہے۔

ان کے ہاں بنیادی طور پر سحر بنائے ہوئے جھوٹ کو کہتے ہیں۔ دیکھئے کیسے ربط قائم ہوتا ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ صاحب کوئی معجزہ دکھایئے کیونکہ ہم نبی اسے مانیں گے خدا کی طرف سے جو کوئی مافوق الفطرت بات دکھائے۔ یہ کہتا ہے کہ نہیں میں وہ کچھ ایسی بات تو نہیں دکھا سکتا میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ تو اس کی بات یہ ہے کہ نہیں صاحب یہ بالکل جھوٹا ہے اپنے دعویٰ نبوت میں کیونکہ یہ کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا۔ ساحر کے معنی ہی یہاں جھوٹا ہے۔ جھوٹا ہے' سچا تب مانیں گے کہ یہ کوئی معجزہ دکھائے۔ ایک منٹ میں میں عرض کر دوں کہ جب پھر انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو پھر معجزہ دکھایا گیا۔ وہ معجزہ جو صرف اس وقت کے دیکھنے والوں کے لیے ہی معجزہ نہیں تھا جو وقتی اور ہنگامی معجزہ ہی نہیں تھا وہ قیامت تک کے لیے معجزہ تھا جس معجزے نے فی الواقعہ انہیں بھی عاجز کر دیا اور پھر دنیا کو آج تک بھی عاجز کرتا چلا آ رہا ہے۔ معجزہ وہی ہوتا ہے نا۔ انہوں نے کہا کہ بتاؤ تم جو دعویٰ کرتے ہو نبوت کا کہ خدا کی طرف سے مجھے یہ علم ملتا ہے اس کے لیے تمہارے پاس ثبوت کیا ہے کہ تم سچے ہو۔ کہا کہ میرے سچے ہونا کا

ثبوت اور شہادت طلب کرتے ہو تم' کہنے لگے ہاں ہم یہ طلب کرتے ہیں۔کہا(**قد لبستوا فیکم عمرًا من قبله افلا تعقلون**) میں کوئی باہر سے نہیں آیا میں نے ساری عمر تمہارے اندر گذاری ہے ایمان سے کہو کہ یہ عمر سچے کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہوتی ہے۔میرے دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے میری زندگی 'آ فتاب آمد دلیلِ آ فتاب'۔اور نہ اس زمانے کا کوئی مخاطب اس کو جھٹلا سکا آج تک کوئی اس کو جھٹلا نہیں سکا۔ عزیزانِ من! سچے کی زندگی ہوتی ہے۔ہرقل کے دربار میں ابوسفیان نے جب اتنا کچھ مخالفت کی اور یہ کچھ کہا مدد مانگنے کے لیے آیا تھا بھڑکایا بھی اسے اشتعال بھی دلایے کہ وہ تمہارے رسول کو حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا نہیں مانتا۔اس نے وہاں یہ سوال کیا کہ وہ کہیں باہر سے آیا ہے تمہارے ہاں' کہنے لگے جی نہیں ہمارے ہاں کا ہی ہے اپنا ہے عزیز ہے میرا خود بھتیجا ہے۔کہنے لگے تمہارے اندر ہی وہ رہا ہے تمہارے بیچ میں' کہنے لگے ہاں۔ کہنے لگے کہ جب یہ اس نے بات کہی تو پہلے دن سے کہی' کہنے لگے نہیں چالیس سال تک وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہماری طرح تھا اس کے بعد یہ کہنا شروع کیا۔تو اس نے کہا کہ اس سے پہلے چالیس سال کی اس کی زندگی کس قسم کی تھی سچے کی زندگی تھی یا جھوٹے کی زندگی تھی۔یہ بھی اس قوم کی خصوصیت ہے عزیزانِ من! کمینے نہیں تھے ہماری طرح۔کہا اس نے کہ صاحب وہ زندگی تو اس کی بڑی ہی پاکباز زندگی اور بڑی سچے کی زندگی تھی۔ تو اس نے کہا کہ جو نفسیات مجھے کچھ حاصل ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص چالیس سال تک کبھی جھوٹ نہیں بولتا چالیسویں سال ایک رات کے بعد صبح اٹھ کے اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا' سچا ہوگا اپنے دعوے میں۔ابوسفیان واپس آ گیا اس نے مدد نہیں کی۔یہ ہے معجزہ عزیزانِ من!۔اور وہ معجزہ کہ جو حضورﷺ نے کہا کہ میں ہی نہیں دکھاتا میرے متبعین میں سے ہر ایک کو یہ معجزہ دکھانا ہوگا۔جب بھی کوئی اس سے پوچھے کہ بتاؤ تم اپنے دعوے میں کیسے سچے ہو تو وہ کہے کہ میری کتابِ زندگی تمہارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔کھلی ہوئی کتابِ زندگی عزیزانِ من!۔اور یقین مانیے دنیا میں اسی شخص کی بات مانی جاتی ہے جس کی زندگی کی کتاب کھلی ہو اور اس میں کہیں انگلی رکھنے کے لیے گنجائش نہ نکلے۔ایک مردِ مومن ایسا آ کے سامنے آ جائے دنیا اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔اس سے بڑا معجزہ دنیا میں اور کیا ہوسکتا ہے۔ہم سورۃ یونس کی پہلی دو آیتوں تک آ گئے تیسری آیت ہم آئندہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔دوسرا باب (آیات 3 تا 6)

عزیزانِ من!

آج جولائی 1973ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی تیسری آیت سے ہو رہا ہے۔ (10:3)

پہلی دو آیات میں یہ کہا گیا تھا کہ اس ضابطہ کے قوانین دھاندلی پر مبنی نہیں علم اور حکمت پر مبنی ہیں علیٰ وجہ البصیرت انہیں دیا گیا ہے۔ ہر قانون کی ایک غرض وغایت ہے وہ ایک خاص نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔اس نے کہا کہ کتاب کی یہ کیفیت۔لیکن ان لوگوں کو اعتراض یہ ہے کہ یہ تو رسول ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ان کو اس سے تعجب آ رہا ہے کہ وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہے۔ان کے تصور کے مطابق تو خدا کے مقربین بھی مافوق الفطرت ہوتے تھے چہ جائیکہ ایک رسول ہو اور وہ عام انسانوں جیسا ہو۔تو یہ چیز ان کے لیے وجہِ تعجب تھی۔ان سے کہا گیا کہ ان سے یہ کہو کہ میں تو تمہیں یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ تمہاری غلط روشِ زندگی کے نتائج کس قدر تباہ کن ہونگے۔اور اگر صحیح راستے پر چلو گے تو شرف ونجدِ انسانیت کے کتنے بلند مقام تمہارے حصے میں آ جائیں۔میں تو فقط اتنا بتانے کے لیے تمہیں آیا ہوں۔اس میں کونسی ایسی چیز ہے جس کے لیے تمہیں کوئی خارقِ عادت خلافِ فطرت عجوبہ پرستی کے جذبے کی تسکین کرنے والے کی تمہیں ضرورت ہے۔ بہت بڑی عجیب حقیقتیں تھیں جو دو ہی آیات میں قرآن بیان کر گیا۔اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ کہنے والا وہ خدا ہے (**ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت و الارض فی ستۃ ایامٍ ثم استوٰی علی العرش**) (10:3)

کہنے والا وہ خدا ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ اس سلسلۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔یعنی تم تقاضا یہ کرتے ہو کہ کوئی چیز معجزے کے طور پہ سامنے آنی چاہیے جس سے ہماری عقل وفکر عاجز ہو جو کچھ کرنے سے ہم عاجز اور بے بس ہوں۔تو تم اس قسم کا تقاضا کرتے تھے نا۔یہی تقاضا ہے تو ذرا غور تو کیجیے کہ یہ پوری کائنات اتنی عظیم چیز کا عدم سے وجود میں آ جانا تمہارے نزدیک کوئی معجزہ ہی نہیں ہے۔اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے۔تم اتنی سی بات کو تو معجزہ مان لو گے کہ اس رسول کے ہاتھ کے اوپر ابھی کچھ نہیں تھا اس نے کہا اور ایک سردا اس کے ہاتھ پہ آ گیا' وہ جو عام مشہور باتیں ہیں۔اسے تو تم معجزہ مانو گے اور وہ یہ کائنات جو پہلے تھی ہی نہیں اور اتنی عظیم الشان کائنات وجود میں آ گئی یہ تمہارے نزدیک کوئی معجزہ ہی نہیں ہے۔قرآن چلتے چلتے یہ اشارے کرتا چلا جاتا ہے' کوئی سائنس کی کتاب تو ہے نہیں کہ ان چیزوں کی تفصیل میں جائے۔لیکن جو اشارے بھی وہ کرتا ہے سائنس کی عظیم سے عظیم تحقیقات بھی اس کو کبھی آج تک نہ غلط ثابت کر سکی ہیں نہ غلط ثابت کریں گی۔ (**فی ستۃٍ**) (10:3) کے متعلق کہا۔بس ہمارے ہاں تو ایام کا ترجمہ دن ہوا اور اس کے بعد ان آیتوں کا ترجمہ ہو گیا کہ چھ دنوں میں پیدا کیا چھ دنوں کی تفسیر کی تورات کی رو سے۔یہودیوں کے ہاں تورات میں یہ چیز ہے نا کہ خدا نے کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ہفتے کے چھ دن۔یعنی

دن اس کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے موجود ہوئے نا۔اور دن تو کہتے ہی اس کو ہیں سورج کے طلوع ہونے کے بعد غروب ہونے تک یا دوسرے دن طلوع ہونے تک۔تو یہ جب تک یہ زمین یہ سورج یہ اس کی گردش یہ چیز نہیں ہوگی یہ اس قسم کا چوبیس گھنٹے کا تو دن ہی ظہور میں نہیں آئے گا۔لیکن بہرحال یہ بات ان کی تھی ہمیں کیا ضرورت ہے ان سے کہیں' ہم تو یہی کہیں گے کہ بتائیں تو سہی یہ کوئی خدائے علیم یہ کہے گا کہ کائنات ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ہم نے ان کو ہفتے کے چھ دن یعنی سوم منگل بدھ جمعرات جمعہ ہفتہ یہ موجود تھے پہلے سے اور کائنات بعد میں وجود میں آئی۔یہ ان کے ہاں کی بات تھی' ہمارے ہاں بھی یہی کہا جارہا ہے۔اُنہوں نے پھر اس کے بعد یہ کہا کہ چھ دن یہ وجود میں لایا اس کو تو تھک گیا تو ساتواں دن جو ہے وہ آرام کا دن ہے سبت کا دن Saturday یہودیوں کے ہاں۔قرآن نے ان کے اس تصور کی بھی تردید کی کھلے الفاظ میں۔کہیں اس نے یہ کہا کہ (**لا تـاخـذوا سينة و لا نوم**) تم خدا کو پہچانتے ہی نہیں ہو۔وہ تھک نہیں جایا کرتا وہ سو نہیں جایا کرتا اُسے اونگھ تک بھی نہیں آتی۔اور دوسری جگہ یہ کہا کہ اس کائنات کو تم کہہ رہے ہو وہ چاہے تو ان جیسی ہزاروں کائناتیں وجود میں لے آئے۔وہ اس کائنات کو بنا کر تھک نہیں گیا۔یہ جو الفاظ قرآن میں اس قسم کے آتے ہیں ان کے لیے اس پس منظر کی ضرورت ہے دیکھنے کی کہ یہ خاص لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔وہ دیگر مذاہب کے کسی نہ کسی باطل تصور کی تردید کے لیے یہ چیز آتی ہے۔جہاں یہ کہا ہے کہ وہ سو نہیں جاتا وہ نیند ہی نہیں اُسے آتی اونگھ تک بھی نہیں آتی۔

یہ ہندوؤں کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات حقیقت میں اپنا وجود نہیں رکھتی یہ ایشور برہما سو رہا ہے اور اسے یہ خواب آرہا ہے۔تو سو رہا تھا کا تصور موجود تھا تو قرآن نے اس کی تردید کی کہ خدا کو نیند نہیں آتی۔پُرانوں کے اندر ان کے یہ چیز ہے کہ یہ خدا نے ایک ڈرامہ ایک کھیل ہے یہ کائنات بنانے میں جو اس نے رچا رکھا ہے اور وہ خود بھی اس کا ایک ایکٹر ہے۔(معاذ اللہ)۔اور چونکہ وہ چیف ایکٹر ہے اس لیے ان کے ہاں خدا کا یعنی برہما کا ایک نام ہے نٹ راجن۔تقسیم سے پہلے آپ لوگوں نے شاید مدراسی جو آیا کرتے تھے سیکرٹیریٹ میں ان کے ناموں کے ساتھ آپ نے یہ سنا ہوگا نٹ راجن لکھا ہوتا تھا۔نٹ راجن ان کے ہاں یعنی نٹوں کا راجہ۔وہ جسے آج کی اصطلاح میں چیف ایکٹر کہیں گے۔وہ اس لیے کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ یہ سارا ڈرامہ ہے جو ایک کھیلا جارہا ہے۔اور اس ڈرامے کا چیف ایکٹر خود خدا ہے۔قرآن نے جہاں یہ کہا ہے نا کہ ہم نے اس کو بحیثیت لھو ولعب کے پیدا نہیں کیا ہے یہ کھیل تماشہ نہیں ہے وہاں ان کے اس عقیدے کی تردید مقصود تھی۔

یہ جو قرآن نے (**ستة ايام**) (10:3) کہا ہے عربی زبان میں ایام کسی لمبی مدت کے پیریڈ کو کہتے ہیں کوئی زمانہ جو ہوا سے کہتے ہیں Ages کو کہتے ہیں Stages کو کہتے ہیں مراحل کو کہتے ہیں۔اور آپ حیران ہونگے کہ آج سائنس کی تحقیق اس طرف جارہی ہے کہ یہ کم از کم ارض کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اور ابھی تو اسی کے متعلق ہوسکتی ہے۔تو یہ As a Finished Product یعنی مکمل بنی بنائی ہوئی چیز ایک ہی دفعہ وجود میں نہیں آگئی تھی بلکہ یہ ابتدائی ہجولے سے جسے Nabula کہا جاتا ہے جو Gases کی شکل میں تھا۔اور قرآن نے

اسے دخان کہا ہے ایک سورۃ کا ہی نام ہے ہمارے ہاں تو دخان۔ اسے دخان کہہ کے پکارا تھا قرآن نے کہ وہاں سے پھر سے پگھلے ہوئے مائع کی شکل میں یہ چیز آئی۔ آگے آئیں گی یہ چیزیں تو میں عرض کرونگا کہ چلتے چلتے وہ اشارہ ایک کر جاتا ہے اور اس اشارے کے اندر کتنے بڑے سائنس کے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں جن کی صداقت کی شہادت سائنٹفک تحقیقات کر رہی ہیں۔ یعنی اس کا یہ کہنا کہ پھر یہ ہجولا جو تھا اپنے بنیادی ہجولے سے دور دور پھینکا گیا جیسے گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جو آج سائنس بتا رہی ہے۔ ابتدائی اس ہجولے سے جسے وہ شمس کا کہتے ہیں تیزی سے جب وہ چکر میں آیا ہے تو چھینٹے اڑے ہیں۔ سمجھانے کے لیے گوپھئے میں سے پتھر کا نکل کے جانا۔ اور پھر اس کے بعد قرآن کا یہ کہنا کہ اپنے اوپر جو کچھ ہے اسے لیے ہوئے یہ اسی طرح سے چکر میں ہے آج تک۔ یہ ساری چیزیں قرآن کے اندر موجود ہیں۔ تو **ستة ایـام** کے معنی یہ ہفتے کے چھ دن نہیں ہیں بلکہ چھ مراحل پیریڈ (Stages) ہیں جن میں اس شکل میں یہ چیز پہنچی ہے۔ اور یہ کچھ اس تخلیق کے بعد (**ثم استوی علی العرش**) (10:3)

پھر وہی ہمارے ہاں تو قدیم تصور یہی ہے کہ وہاں سے اوپر سات آسمانوں کے اوپر ایک مقام ہے جس میں خدا کا عرش سچ مچ کا بچھا ہوا ہے اور پھر اس کے اوپر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ یہ تو تصور غلط ہے۔ (**ھو ما کم اینا ما کنتم**) وہ تو یہ کہتا ہے تم جہاں بھی ہو وہاں خدا کو تم پاؤ گے۔ یہ پھر دوسری چیز آ جائے گی سامنے۔ یہ عرش میں نے پہلے بھی بتایا تھا جیسے آپ کے ہاں تختِ حکومت بولا جاتا ہے اقتدار کے لیے بولا جاتا ہے انہیں معنوں میں عربی زبان میں بھی عرش کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ وہ جو ملکہ سباء کا تخت اٹھا لائے تھے الٹ دیا گیا تھا وہ کوئی تخت پوش نہیں تھا۔ تختہ الٹ دیا آج بھی ہم کہتے ہیں نا یہ۔ تو یہ (**استـوی علـی العـرش**) (10:3) قرآن کی خاص اصطلاح ہے کہ پھر اس نے کائنات کا مرکزی کنٹرول سنبھال لیا۔ صرف تخلیق نہیں ہے کہ اس بنانے کے بعد وہ فارغ ہو کر بیٹھ گیا ہے اب اسے کچھ تعلق نہیں رہا۔ تخلیق اور اس کے جو قوانین یہاں جاری کیے گئے تھے ان کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ ایک تصور یہ بھی ہے کہ یہ کائنات خدا نے بنا دی اور جس طرح سے ایک گھڑی کو ایک دفعہ کوک دیدی جائے تو وہ چلتی رہتی ہے۔ بنانے کے بعد اس نے اس میں ایک کوک دیدی ہوئی ہے اب یہ خود بخود چلتی جا رہی ہے خدا کا اس میں کوئی واسطہ تعلق نہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ (**استـوی علـی العرش**) (10:3) کنٹرول ہے اور وہ کا ہے کے لیے کنٹرول ہے؟ (**یدبر الامر**) (10:3) کس طرح کڑیوں میں کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے صاحب۔

تدبیرِ امور کر رہا ہے وہ۔ اور تدبیر کا لفظ یہاں بتا رہا ہے کہ وہ جو حکیم کہا تھا شروع میں کتاب الحکیم خود تدبر کا لفظ اس کی شہادت دے رہا ہے۔ یہ تو دبر سے ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کہ پیچھے تک جا کر یہ دیکھنا کہ اس شے کا اب انجام پھر کیا ہونا ہے' Destination اس کا کیا ہے' آخر الامر اس نے کیا بننا ہے کیا بنانا مقصود ہے اس کا۔ اس چیز کو پیشِ نظر رکھ کر پھر اس کے لیے مختلف نظم و نسق کی کڑیوں کو مرتب کرتے چلے جانا۔ تو یہ چیز تو وہی کر سکتا ہے جو ایک پلان کے مطابق کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اسے معلوم ہے کہ آخر الامر اس کا کیا بنانا مقصود ہے۔ اور وہ اسے اس

انجام تک پہنچانے کے لیے تدبیری کڑیاں وجود میں لاتا چلا جاتا ہے اوران پہ کنٹرول اپنا رکھتا ہے۔اوراس کے بعد تو یہ ہے کہ (**یزید فی الخلق ما یشآء**) یہی نہیں ہے کہ یہ جتنی بن گئی ایک دفعہ وہ بن گئی' وہ اس تخلیق میں اضافے کرتا رہتا ہے۔جو بنادیا ہے اس کو اس کے آخری درجے تک Destination تک پہنچانے کے لیے تدبیرِ امور کرتا رہتا ہے۔اوراس تخلیق میں اضافے کرتا چلا جارہا ہے۔تو اب اس قسم کا خدا اُسے یہ کہنا کہ ایک دفعہ بنانے کے بعد اس گھڑی کو کوک دیدی اس نے اوراس کے بعد پھر وہ آرام سے سو گیا اسے کچھ تعلق ہی نہیں رہا کائنات۔ یہ تو(**سبحٰن اللہ تعالٰی عما یصفون**) خدا اس سے بہت بلند اور دور ہے۔(**یدبر الامر**) (10:3) تدبیرِ امور کرتا رہتا ہے پھر وہ' تخلیقی اضافے کرتا رہتا ہے اس کے ساتھ وہ۔اس کے بعد ایک بڑا عجیب اگلی آیت میں یہ چیز آئی۔(**ما من شفیع الا من بعد اذنہ**) (10:3)

اب شفیع کے معنی تو ہمارے ہاں شفیع المذنبین ہے گناہوں کا بخشوانے والا۔اور وہ رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کی جاتی ہے شافع روزِ محشر۔معنی اس کے سفارش کرنے والا لیے جاتے ہیں' شفاعت کے معنی ہی یہ لیے جاتے ہیں۔شفاعت کے معنی ہی یہ لیے جاتے ہیں کہ سفارش کرنے والا۔یہ تو جب شفاعت کی بات آئے گی تو وہاں میں عرض کرونگا کہ کس قدر غیر قرآنی تصور ہے یہ۔اور ویسے بھی آپ اگر غور کریں عزیزانِ من! تو آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ تصور کہ مجرم کا جرم ثابت ہونے کے بعد یہ سارا جتنا قرآن تشبیہی انداز میں بیان کرتا ہے کہ عدالت لگی ہے قیامت میں میزان کھڑی ہوئی ہے ذرہ ذرہ تل رہا ہے حساب کتاب ہو رہا ہے۔پھر خدا کے قانون کے مطابق فیصلہ رہا ہے یہ مجرم ہے سزا کا مستحق ہے۔اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد خدا کا ایک مقرب سفارش کرتا ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے اور اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ روایات کی رو سے تو؟؟ چھوڑ دیے جاتے ہیں پورے کے پورے جہنمی جو ہیں۔ذرا سوچئے کہ یہ تصور کیا ہے۔کبھی فٹ ان بیٹھتا ہے خدا کے اس تصور کے ساتھ کہ جو قرآن نے دیا ہے: قانونِ مکافاتِ عمل کا تصور۔پہلے دن سے خدا کے ہاں سے سلسلۂ رشد و ہدایت آئے وحی آئے انبیاء آئے انہوں نے آکے یہ سارا نظام دیا لوگوں کو سمجھایا اس کے مطابق چلو گے تو یہ ہوگا خلاف ورزی کرو گے تو یہ ہوگا۔یہ بالحق ہیں قانون اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا' یہ سنت اللہ خدا خود نہیں اسے بدلتا۔اسی کے لیے حیاتِ آخرت کا تصور کہ جو ایسے اعمال بھی تم سے سرزد ہوئے جن کی سزا یا جن کا بدلہ یہاں سامنے نہیں آیا تو زندگی ختم نہیں ہوجاتی یہ آگے بھی چلے گی اور یہ سلسلہ بھی آگے چلے گا۔اوراس کا تشبیہی تصور قیامت کی تصور میں لایا گیا۔ذرہ ذرہ آپ کے سامنے اعمال کا تولا گیا۔یہ سارا کچھ کر چکنے کے بعد انجام یہ ہوگا کہ پھر جو تو اپنے اعمال کے حساب سے جنت میں چلے گئے وہ تو چلے گئے۔اور جو مجرم قرار پائے جہنم میں ہیں وہ کسی کی سفارش سے وہاں سے نکال کے جنت میں بھیج دیے گئے۔غور کیجیے گا یہ۔اور پھر سفارش کا تو آپ عزیزانِ من! یہاں کے نظام میں جب آپ یہ بولتے ہیں اس لفظ کو' کسی نظام کو بدترین شکل میں Condemn کرنا ہو تو وہاں کہا جاتا ہے کہ صاحب یہاں تو اب قاعدہ قانون کوئی رہا ہی نہیں ہے یہاں تو صرف سفارش چلتی ہے۔تو یہاں کی سفارش کے متعلق تو آپ کا یہ عقیدہ اور یہ تصور ہے اور عدالتِ خداوندی میں خدا جیسا ایک جج اور پھر رسولِ اکرم ﷺ ان کے متعلق یہ کہ یہ

سفارش جا کے کریں گے۔اور سفارش سے یہ نہیں کہ ابھی ملزم کی حیثیت سے ہیں جو مجرم ثابت ہو چکے ہیں جن کے جرائم سفارش سے چھوڑ دیے جائیں گے۔ یہ تصور غلط ہے۔ میں عرض کرونگا کہ یہ کیا چیزیں ہیں جو قرآن نے کہی ہیں۔ بہر حال۔

شفع کے ہوتے ہیں وتر کے مقابل میں یہ لفظ آتا ہے وتر کے معنی ہوتے ہیں اکیلا اور شفع کے معنی ہوتے ہیں کسی کا کسی کے ساتھ دو ہوجانا۔اور یہ جو عشاء کی نماز کے بعد وتر پڑھتے ہیں نا تو وہ اس لیے ہوتا ہے نا کہ یا وہ ایک رکعت ہوتی ہے یا وہ تین رکعتیں ہوتی ہیں۔ طاق نمبر جسے آپ کہتے ہیں نا اس کے لیے یہ آتا ہے۔ شفع کسی کے ساتھ دو ہوجانا۔ اسی لیے یہ جب گواہ جاتا ہے عدالت میں اسے کہتے ہیں شفیعؔ وہ اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے مجرم یا ملزم اکیلا نہیں رہتا۔ وہ جو صفائی کا گواہ جاتا ہے اس کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے عربی زبان میں شفاعت شہادت کے لیے بھی لفظ آتا ہے کسی کے ساتھ کھڑا ہوجانا۔ بات تو یہ ہے کسی کے ساتھ کھڑے ہوجانا ایک سے دو ہوجانا۔ یہاں یہ چیز جو آئی ہے تخلیقِ ارض وسما استوٰی علی العرش تدبیرِ امورؔ اس کے ساتھ یہ آیا ہے(ما من شفیع الا من بعد اذنہ) (10:3) ظاہر ہے کہ یہاں یہ شفیع یا شفاعت اس معنی میں تو آ ہی نہیں سکتے۔ ربط ہی کوئی نہیں یہاں جن معنوں میں ہم گناہوں کی شفاعت کا لفظ لیتے ہیں۔ یہاں تو تدبیرِ امور ہو رہی ہے یہاں تو یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس تخلیقی سلسلہ میں آگے بات بڑھتی کیسے ہے۔ پوچھیئے سائنسدانوں سے وہ کیا کہتے ہیں۔

وہ کہہ یہ رہے ہیں یہ قرآنِ کریم کا ہی اعجاز ہے اور بہت بڑا یورپ کا ایک مفکر یہ بات کہتا ہے کہ ہماری زبان انگریزی زبان اس اعتبار سے بڑی Poor ہے کہ اس میں تخلیق کے لیے صرف ایک ہی لفظ ہے Creation۔ اس نے کہا کہ عربی زبان اور قرآنِ کریم اس اعتبار سے ہم سے زیادہ Advantages پوزیشن میں ہیں کہ دو لفظ ان کے ہاں آتے ہیں: امر آتا ہے اور خلق آتا ہے۔ اس نے کہا کہ Creation کی وہ سٹیج کہ جب ابھی وہ اس شکل میں شے نہیں آتی جہاں ہماری محسوس گرفت میں آجائے اس سے پہلے جتنے مراحل ہوتے ہیں اس میں بھی وہ تخلیق کی طرف آرہی ہوتی ہے۔لیکن وہ ابھی Physical Laws کے تابع نہیں آتی۔ وہ جو پہلا مرحلہ اس کے لیے ہمارے ہاں کوئی لفظ نہیں ہے۔ قرآن نے اس کے لیے امر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہر بات میں سے بات تو نکلتی چلی جاتی ہے قرآن کی تو عزیزانِ من! یہ امر جسے ہم کہتے ہیں اور اس کے بعد پھر ہمارے ہاں امارت کا لفظ آیا امیر کا لفظ آیا۔ اور پھر امیر تو ہمارے ہاں اور ہی معنوں میں ۔دیکھئے الفاظ کی بھی سرگذشت عجیب ہوتی ہے۔ یہ امر: عربوں کے ہاں تو صحرا تھا وہاں کونسی سڑکیں بنی ہوئی تھیں کہ کلکتہ سے چلے تو جی ٹی روڈ پشاور تک پہنچا دے آپ کوؔ نشانات تک بھی نہیں ہوتے تھے۔لیکن قافلوں کو نشاناتِ راہ کی تو ضرورت ہوتی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر لے کے تو وہ راستے میں ان کو رکھتے جاتے تھے تا کہ ان کے کچھ نشان رہیں۔ یہ جو راستہ متعین کرنے کے لیے نشاندہی کی راہنمائی تھی اسے امر کہا جاتا تھا۔ یہ جو حضرتِ عمرؓ نے کہا تھا کہ امیر المؤمنین کا خطاب بہت ٹھیک ہے تو اس کے معنی یہ ہیں جماعتِ مؤمنین کے صحیح راستے کی نشاندہی کرنے والا۔ اب اس کے بعد آپ کے ہاں پھر دیکھئے یہ لفظ کن کن معنوں میں آیا۔ امیر کن معنوں میں آیاؔ مامور کن معنوں میں آپ کے ہاں استعمال

ہوا' امارت کے کیا معنی آپ کے ہاں ہو گئے۔اور پھر تو یہ خاص ڈکٹیٹر شپ کے معنوں کے اندر یہ لفظ آنا شروع ہو گیا۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ ایک چیز جو ہمارے سامنے محسوس شکل میں آتی ہے اس سے پیشتر وہ چلی آ رہی ہوتی ہے نشاندہی کرتی ہوئی اپنی اس منزل تک پہنچنے کے لیے۔یہ منزل ہے جسے امر کہتا ہے(**لہ الخلق و الامر**) امر میں بھی اسی کا اقتدار ہے اور خلق کے عالم میں بھی اسی کا اقتدار ہے۔اور پھر جب وہ یہ محسوس شکل کے اندر نمودار ہوتی ہے اسے خلق کہا جاتا ہے۔اور خلق کے بنیادی معنی ان کے ہاں ہیں یہ جہاں سے اخلاقِ حسنہ اور خلق اور یہ چیز آپ کے ہاں آئی ہے یہی بنیاد ہے اس کی۔اس کے معنی ہوتے ہیں مختلف چیزوں کے خاص تناسب (Proportion) کے ساتھ ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا۔تخلیق ہوتی اس طرح سے ہے۔یہ جو نت نئی چیزیں آپ بناتے چلے جاتے ہیں نا اس میں صرف اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کس چیز کو کس چیز کے ساتھ ملا دیا جائے۔آکسیجن الگ ہائیڈروجن الگ' اب ان دونوں کو ساتھ ملا دیا جائے تو پانی۔یہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے والی بات ہے ناغور کیجیے گا اس آیت سے کہاں بات چلی گئی۔(**خلق السمٰوٰت و الارض فی ستة ایام ثم استوٰی علی العرش**) (10:3) وہ اس کو وجود میں لے آیا چھ مراحل سے طے کر کے' کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔اب تدبیرِ امور ہوتی چلی جاتی ہے۔(**یدبر الامر**) (10:3) عالم امر کے اندر اور مزید تدبیریں ہوتی چلی جاتی ہیں اشیاء کی۔اب جو نئی نئی چیزیں وجود میں آ رہی ہیں وہ کیسے آ رہی ہیں۔وہ آ رہی ہیں یہ مختلف چیزیں جو ہیں جن کو Elements آپ کہتے ہیں الگ الگ ایک ایک چیز۔ان دو کے اکٹھے ہو جانے سے ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔لیکن Heath Heatidly اکٹھا ہو جانے سے' خاص قانون کے مطابق اکٹھے ہو جانے سے۔اس قانون کے مطابق اگر ان منفرد چیزوں کو ایک ایک کو وتر کو اگر یہ شفیع کر دیا جائے دو کر دیا جائے ان کو تو اس سے ایک اضافہ ہو جاتا ہے تخلیق کے اندر۔اب پڑھیے اس کو صاحب۔(**خلق السمٰوٰت و الارض فی ستة ایام ثم استوٰی علی العرش یدبر الامر ما من شفیع الا من بعد اذنه**) (10:3) یہ جو ایک کے ساتھ دوسری چیز اب کھڑی ہو جائے گی لگ جائے گی امتزاج ہو جائے گا دو چیزیں اکٹھی ہو جائیں گی اس سے تخلیقات کے اندر اضافے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔لیکن Heath Heatidly نہیں ہو گا(**من بعد اذنه**) اس کے قانون کے مطابق یہ کرو گے پھر نئی چیز وجود میں آئے گی۔آکسیجن اور ہائیڈروجن کو یوں ملاتے چلے جایئے کچھ نہیں بنتا۔اس کی ایک Proportion ہے H_2O اس کا ایک قانون ہے جس کے مطابق ملنا ہے اس نے۔یہ ہے ان دو چیزوں کا آپس میں ایک Proportion کے مطابق ملنا جو یہاں شفاعت کا لفظ اس میں آیا ہے۔اب سمجھ میں آئی کہ یہ بات یہاں ہے اس میں ربط کتنا گہرا ہے۔ورنہ وہ معنی اگر لیے جائیں تو بات ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ تخلیقِ وارض وسما استوٰی علی العرش تدبیرِ امور اور مامن شفیع الامن بعد اذنہ۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواء ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

وہ خود بتا رہا ہے۔

(ذٰلکم اللہ) (10:3) یہ بات بھی عزیزانِ من! قرآن نے ہی بتائی ہے۔ساری بات دین کی ساری عمارت اس بنیاد پہ کھڑی ہوتی ہے کہ خدا کا تصور کیا ہے یہیں سے بات چلتی ہے۔؟؟ نے تو یہ کہا تھا تم کسی قوم کا بھی پہلے زمانے کے کسی قبیلے کے مطابق مجھے صرف یہ بتا دو کہ انہوں نے اپنی پرستش کے لیے کس قسم کا معبود تجویز کر رکھا تھا میں اس پورے قبیلے اور قوم کی تہذیب تمہیں بتا دونگا کہ کیا ہے۔اس لیے کہ اس سے ان کی ایک بنیادی ذہنی فکر مرکز جو ہے فکر کا وہ پتا چل جاتا ہے۔تو اس نے تو کہا تھا نا کہ تجویز کر رکھا تھا جنہوں نے کیونکہ وہ قومیں تو اپنے لیے معبود تجویز کرتی تھیں نا۔سوچئے تو سہی کہ جو قوم اپنے لیے دیوی اور خدا بھیرے ماتا اور کالی دیوی تجویز کرے۔ یہاں ہمارے ہاں کی نئی نسل نے تو دیکھی نہیں ہے وہ' جنہوں نے ہندو اور ان کے مندر دیکھے تھے انہیں معلوم یہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔سب سے بڑی دیوی پرستش جس کی کی جاتی تھی بہت بڑے مندر کے اندر جو تصویر ان کے ہاں اس کی ہوتی تھی' بنگالیوں کے ہاں کالی دی ان کے ہاں بھیرو ماتا۔اس کی کیفیت یہ تھی کہ اس کی پہلی چیز یہ کہ پورا مجسمہ سیاہ رنگ کا ہوتا تھا نہایت بھیانک ڈراؤنی شکل' پورا منہ سرخ خون سے' اتنے اتنے بڑے دانت' اتنی بڑی اس میں سرخ زبان نکلی ہوئی' چھ ہاتھ' ہاتھوں کے اندر اس کے بڑے بڑے نیزے' گلے کے اندر انسانی کھوپڑیوں کی مالا۔جو قوم اپنے لیے اس قسم کا معبود تصور کرتی ہے اگر وہ قوم وہ نہ ہو جو آج کا ہندو ہے تو اور قوم وہ کیا ہو سکتی ہے۔اس نے صحیح کہا تھا مجھے صرف اتنا بتا دو کہ اس قوم نے اپنے لیے اپنی پرستش کے لیے معبود کس قسم کا تجویز کر رکھا ہے میں اس قوم کی پوری ذہنیت بتا دونگا۔اس قسم کے معبود کی پرستش کرنے والی آپ کو معلوم ہے کہ پھر یہ قوم کس قسم کی انتقام جو بربریت اور درندگی کا مجسمہ ہوگی۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اس کو ناخن نہیں ابھی ملے ہوئے تھے قوت ابھی اس کے پاس نہیں تھی۔ایسی قوم کو قوت اگر نصیب ہو جائے تو اس کے بعد آپ دیکھئے تو سہی۔انہوں نے معبود یہ تجویز کر رکھا تھا اپنے ہاں۔سوال سارا یہ ہے کہ جسے معبود جسے الہ جسے خدا کہا جاتا ہے وہ کس قسم کا ہے کسی قوم کے پاس۔وہاں تو وہ فکرِ انسانی کا تراشیدہ ہوتا تھا یہاں تو فکرِ انسانی سے ماوراء ایک سرچشمۂ علم جو تھا اس نے بتایا ہے نا کہ خدا کیسا ہے۔ورنہ انسانی فکر میں تو کسی محدود فکر میں لامحدود آ ہی نہیں سکتا۔ برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔لہٰذا خدائے حقیقی ہے کس قسم کا' اسے خود خدا ہی بتا سکتا تھا۔انسانی محدود فکر اس لامحدود کا تصور ہی نہیں کر سکتی تھی۔وحی نے یہی کیا اور وحی اپنی منزہ شکل میں قرآنِ کریم کے اندر ہے۔تو قرآنِ کریم کی بنیادی چیز جو ہے وہ یہ ہے کہ اس نے خدا کا تصور جو دیا ہے الہ کا تصور جو دیا ہے پہلے یہ تصور ہی دنیا کی کسی اور مذہب کی کتاب کے اندر نہیں آپ کو ملے گا۔اور اگر آپ قرآنِ کریم سے خدا کا تصور پورا سامنے لے آئیں اور اس کے بعد؟؟ کو یہ تصور دیدیں تو پھر یہ بتائے گا کہ جو قوم اس قسم کے خدا کو اپنا الہ مانتی ہے اس کی ذہنیت فکر تہذیب تمدن کس قسم کی ہو سکتی ہے۔اور یہیں اگر ان آیات میں دیکھئے تو اس خدا کے تصور کا ایک ہلکا سا گوشہ سامنے آیا ہے نا۔کتاب دینے والا خدا' قانون دینے والا۔قانون آمریت کا نہیں ہے ڈکٹیٹر شپ کا نہیں ہے کتاب الحکیم ہے حکمت کے مطابق قانون دینے والا۔میں کہتا ہوں یہ دو ہی لفظ اگر صرف

ہوتے سوچئے کہ خدا کا یہ تصور کہ ہر شے قانون کے مطابق ہے قانون حکمت پر مبنی ہے۔ جو قوم ایسے خدا کو اپنا الہ تصور کرے یعنی سٹینڈرڈ اپنے سامنے رکھے اپنے ہاں کے نظام کا۔ آپ سوچئے اس کا نظام کیسا ہوگا' یکسر قانون پہ مبنی' قانون حکمت پر مبنی۔ پھر اس میں کوئی چیز عجوبہ پرستی کی نہیں ہے' اگلی آیت جو تھی کہ انہیں اس کے اوپر تعجب ہو رہا ہے۔ قانون سمجھ میں آ جانے والا تمہاری۔ اور پھر وہ خالقِ ارض وسماء یا بدیع السمٰوٰت و الارض یا فاطر السمٰوٰت والارض' پہلی چیز اس خدا کی یہ ہے کہ وہ محتاج نہیں ہے کہ میٹریل اس کے پاس کوئی ہو تو اس سے کوئی چیز بنائے۔ عدم سے وجود میں لے آنے والا' اتنی بڑی قوتوں کا مالک۔ لیکن جب وہ یہاں لے آیا ہے وجود میں تو وہ پھر وہ خلق ہوگئی ہے وہ شے' وہ قانون کے پابند ہوگئی ہے۔ اور پابندیٔ قانون کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سنت اللہ ہے (**ولن تجد لسنة الله تبديلًا**) ہم اپنے قانون کو بدلا نہیں کرتے۔ لا منتہا قوتوں کا مالک خدا اور وہ کہے اپنے متعلق یہ کہ ہم اپنی سنت کو اپنے قانون کو بدلا نہیں کرتے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ جو قرآن میں کہیں کہیں آیا ہے (**كتب عليه نفسه**) انسانوں کے متعلق بھی اس نے کہا ہے نا (**كتب عليكم**) تمہارے اوپر یہ واجب کیا گیا ہے ماننا ہوگا۔ تو گویا ایسی کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں نا۔ خدائے قادرِ مطلق ہر شے کے اوپر قدرت رکھنے والی Absolute Power Authority کا مالک وہ کہتا ہے (**كتب عليه نفسه**) ہم نے اپنے اوپر بھی کچھ پابندیاں واجب کر رکھی ہیں۔ دیکھتے ہیں خدا کا تصور کیا آتا ہے۔ اس قسم کے خدا کے تصور کو ماننے والی قوم' کبھی اس میں لاقانونیت آ سکتی ہے؟ کبھی دھاندلی آ سکتی ہے؟ کبھی آمریت آ سکتی ہے؟ کوئی قانون ایسا بن سکتا ہے جو حکمت پر مبنی نہ ہو؟ تخلیق کے بعد کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنا' تدبیرِ امور کرتے چلے جانا۔ Scientific Discoveries کے نئے نئے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے یہ تصور خدا کا۔ (**يزيد في الخلق ما يشاء**) کا تصور۔ کائنات کی تخلیق۔ یعنی وہ بدیع السمآء یا فاطر السمآء جو ہے اس میں تو کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب وہ تخلیقی مرحلہ آتا ہے وہاں وہ کہتا ہے خدا کے متعلق کہ (**احسن الخالقين**) ہے اور بھی خالق ہو سکتے ہیں وہ خالقین میں سے سب سے زیادہ حسن کارانہ تخلیق اس کی ہے۔ وہ مکمل ترین خوبصورت ترین The Most Perfect خالقین میں سے۔ اب ظاہر ہے یہ Animal World میں تو کوئی خالص ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان ہی ہے نا جو نیچے خدا کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق یہ خالق ہوگا' یہ تخلیقی اضافے کرتا چلا جائے۔ تخلیقی اضافے کس طرح سے کرے گا؟ یہاں Indication دیدی عزیزانِ من! ۔ قرآن پہ غور کرنے والی قوم جو ہوتی وہ یہاں سے بات لے لیتی۔ (**ما من شفيع الا من بعد اذنه**) (10:3) ان اشیائے کے ساتھ ایک کے ساتھ دوسری چیز جو ملانی ہے اس قانون کے مطابق کرتے چلے جائیے۔ یہ چار پانچ آیتوں کے بعد ہی یہ کہا کہ (**ذٰلكم الله**) (10:3) میں کہتا ہوں کیا بات ہے ذٰلکم اللہ کہنے کی۔ یہ ہے تمہارا اللہ۔ اور بھی مختلف مقامات پہ آیا ہے۔ جہاں اس قسم کی ایک نہج اور گوشے کی صفات لایا ہے وہ اپنی' اس کے بعد کہا ہے (**ذٰلكم الله**) یہ ہے اللہ تمہارا۔ اس کے بعد یہ ہے کہ علیٰ حدِ بشریت یہ اس کی صفات جو ہیں منعکس کرو اپنے اندر' یہ کچھ ہوتا چلا جائے گا۔ (**ذٰلكم الله ربكم**) (10:3) کیا بات ہے اس رب کی!!! رب تو آپ کو معلوم ہے' کسی شے کو

اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج نشوونما دیتا ہوا تکمیل تک پہنچانے والا۔ یہ ہے جسے رب کہا جاتا ہے عربی زبان میں۔(ربکم) سب کا نشوونما دینے والا' انتہا تک لے جانے والا۔اب یہ ربوبیت جو ہے یہ بھی ایسی اس کی صفت آئی جو انسانی حدود کے اندر اس کو خدا ماننے والوں کے لیے یہ چیز ایک واجب ہوگئی۔(ربکم) ۔اب آگے یہ بات آئی کہ یہ سارا کچھ کیوں بتایا کہ ایسا ہے وہ رب تمہارا؟ کیا مقصد تھا اس کا؟ اتنی سی بات تھی کہ ذہنی طور پہ ہم نے مان لیا کہ ہاں صاحب ہمارا خدا اس قسم کا ہے؟ یا مناظرہ کرنے کے اندر ہم جیت گئے آریوں سے کہ تمہارا خدا تو ایسا ہے ہمارا خدا ایسا ہے اور اس کے بعد پھر ایک جلوس نکالا فتح کا گھر میں اپنے آ گئے شروع ہو گئے ہمارا خدا ایسا ہے۔بات آگے چلو نا کہ ایسا خدا ہونے سے کیا بات ہے۔بات وہ ہے جو؟؟ نے کہی تھی کہ جس قسم کا خدا کا تصور اس قسم کی اس قوم کی فکری ذہنیت تخلیقی کارنامے۔کس طرح سے یہ ہونگی؟ (ذٰلکم اللہ) کے بعد(ربکم) کہا' مقصد یہ ہے ربوبیت۔تمہارے متعلق ایسا خدا ماننا اس کا مقصد کیا ہے؟ کہا مقصد یہ ہے کہ (فاعبدوہ) (10:3)

اب پھر ترجمہ انہی تصورات کے مطابق ہوا جنہوں نے صرف پرستیدہ مانا اس کا ترجمہ پرستش کیا تو آگے بات یہ ہوگئی کہ اس خدا کی پرستش کرو۔پرستش تو فارسی کا لفظ ہے۔فاعبدوہ ہمارے ہاں بھی پھر عبادت کا ترجمہ ہی پرستش کیا۔عربی زبان میں قرآنِ کریم میں یہ آتا ہے آپ دیکھئے گا اس کے معنی ہیں کسی کی محکومیت اختیار کرنا' کسی کے قوانین کی اطاعت کرنا ان کے مطابق چلنا۔اب بات آ گئی سامنے کہ یہ ہیں وہ جو بتایا چلا جا رہا ہے جو یہ سارا قصہ اور آپ دیکھتے ہیں کس طرح سے قانون کی کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جا رہی ہیں۔

اب جو قوم اس قسم کے خدا کے ان احکام وقوانین کی اطاعت کرتی چلی جائے گی اس سے یہ چیزیں ظہور میں آتی چلی جائیں گی۔اس کا قانون ہوگا تو حکمت پہ مبنی ہوگا تخلیقی امور میں وہ نت نئے اضافے کرتی چلی جائے گی' تدبیرِ امور کرے گی وہ' کنٹرول رکھے گی اپنے ہاتھ کے اندر کہ وہاں انارکی نہ پھیلنے نہ پائے۔یہ سارا جو کچھ کرے گی غرض وغایت کیا ہوگی؟ (ربکم) کے ماتحت ربوبیتِ عالمینی اس نظم ونسق کا منتہا اور مقصود ہوگا۔اور یہ قائم کس طرح سے رہے گا؟ (فاعبدوہ) کہ قوانین کی اس کے احکام کی اطاعت کرتے چلے جاؤ۔یہ ہے تمہارا اللہ۔اور یہ کہنے کے بعد کہا(افلا تذکرون) (10:3) کہو بات سمجھ میں آئی' کرو گے نا ایسا۔

یہاں تک تو چیز ایسے نظر آ رہا تھا کہ جیسے طبعی امور کی بات ہے Physicsl Laws کی ہی گفتگو کچھ ہو رہی تھی نا' یوں نظر میں آ رہا تھا۔لیکن انسانی زندگی میں اس نے یہ کہا کہ اس سے آگے بھی بات ہے۔انسان کا ہر عمل یہی نہیں کہ وہ طبعی دنیا یا Physical Laws کے اندر ہی نتیجہ خیز ہوتا ہے۔اس کی دنیا اس سے کچھ اونچی بھی ہے جسے انسانی دنیا کہا جاتا ہے۔ Physical Laws یا طبعی امور کے تابع تو حیوانات بھی ہوتے ہیں۔انسان کی خصوصیت ایک اور بھی ہے جو ان سے اونچی ہے بات۔اور جیسا کہ اب آپ احباب کو معلوم ہے وہ انسان کی ذات ہے یہ خصوصیت انسان ہی کو عطا کردہ ہے خدا کی عطا کردہ۔ربوبیت کے اندر اس کی جسمانی نشوونما اور اس کی ذات کی صلاحیتوں کی

نشوونما بھی آ جاتی ہے۔صرف Physical Laws یا طبعی امور کے مطابق زندگی ختم ہو جاتی ہے طبعی موت کے ساتھ۔معاملہ ختم ہو گیا۔طبعی زندگی اچھی گذار لی اچھی گذری اس کے بعد معاملہ ہی کچھ نہیں ہے اس کا۔جس طریقے سے بھی جی چاہا دولت حاصل کی جس طریقے سے جی چاہا اسے خرچ کر لیا۔طبعی زندگی افراد کی ہو یا اقوام کی ہو معیار ہی ان کے نزدیک یہی ہوتا ہے: طبعی خوشگواریاں۔مسئلہ ہی ان کے ہاں روٹی کا ہوتا ہے' اکنامک پرابلمز ہوتی ہیں۔بنیادی یہ ہوتی ہیں پھر ان کے ساتھ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس کے لیے سیاسی نظم ونسق ہوتا ہے۔الجھنیں بڑھ جاتی ہیں ان کے سلجھانے کے لیے پہلے مذاکرات جسے کہتے ہیں' نہیں سلجھتے تو میدانِ جنگ میں آ جاتے ہیں۔مسئلہ سارا ان کے ہاں طبعی ہوتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ انسانیت کی زندگی تو اس سے اونچی ہے۔؟؟ بھی ضروری ہے یہ تو انسان کے لیے اس عرض کا مستقر ہے' یہاں اس نے پاؤں ٹکانے ہیں تو ٹھوس چیز ہونی چاہیے جس پہ پاؤں ٹکا سکے یہ۔لیکن یہ انتہا نہیں ہے زندگی کی۔اس لیے مقصود صرف Physical Laws تک نہ اپنے آپ کو رکھو اس سے آگے بھی ہے۔(**الیه مرجعکم جمیعًا**) (10:4)

یہ جو اس کی طرف لوٹنے کی بات قرآن جو کہا کرتا ہے یہ الفاظ متعدد مقامات پہ آتے ہیں(**انا لله و انا الیه راجعون**) والی بات۔ افراد کے لیے بھی اقوام کے لیے بھی پوری انسانیت کے لیے بھی۔تو یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ کوئی خاص مقام ہے جہاں جانا ہے خدا تو زمان و مکان سے آزاد ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنے تمہارا اعمال افکار حتیٰ کہ دل میں گذرنے والے خیالات' قرآن کے الفاظ میں نگاہ کی خیانتیں دل کی بدنیتیاں یہ سارے کے سارے یہ نہ سمجھو ہو گئی ہیں اور یہاں فضا میں یہ اڑ گئیں۔یہ بات نہیں ہے۔ان پہ بھی اس کا کنٹرول ہے۔ان میں سے ایک ایک شے اس کے قانونِ مکافات کی طرف پہنچائی جاتی ہے اس کے مطابق یہ نتیجہ خیز ہوتی ہیں۔ابھی اگلی آیت پوری ہو لینے دیجیے پھر بات سمجھ میں آئے گی یہ کیا کہہ گیا ہے قرآن۔بڑی عظیم آیت آ رہی ہے عزیزانِ من!۔یہ ہے(**الیه مرجعکم جمیعًا**) (10:4) یہ نہیں ہے کہ موت کے ساتھ تمہارا خاتمہ ہوا' ایک ایک عمل اور ایک ایک خیال اور ایک ایک ارادہ تک جو ہے یہ کہیں منتشر نہیں فضا میں ہو گیا تمہارے جسم کے اجزاء کی طرح۔اس نے تو جانا ہے اس عدالت کی طرف جہاں اس میزان کے مطابق فیصلے ہونے ہیں ان تمام امور کے۔(**وعد الله حقًا**) (10:4)

جیسے اس طبعی زندگی کے اندر یا طبعی کائنات کے اندر تم دیکھ رہے ہو کہ اس کے قوانین بالکل حق ہیں۔ٹھوس حقیقتیں' حق کے معنی ہوتے ہیں۔اسی طرح سے یہ جو ہم نے کہا ہے کہ انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کا خیال تک بھی ہمارے قانون کے تابع نتیجہ خیز ہو گا یہ بھی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے یونہی شاعری نہیں کر رہے ہم۔شاعری تو وہ کہتا ہے کہ ایک رسول کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔(**وعد الله حقًا**) (10:4) آگے آیئے صاحب۔یہاں بھی یہ آیت آئی ہے اور مقامات پہ بھی آئی ہے بڑی ہی عظیم آیت ہے۔ابھی تک میں دیکھ رہا ہوں کہ اس پہ عمل تو ایک طرف رہا فکری طور پہ بھی اس کے متعلق سوچا نہیں گیا۔ہے بڑی عظیم چیز ایک۔(**انه یبدؤا الخلق ثم یعیده**) (10:4)

اس نے اس عالمِ خلق کی ابتداء کی' وہی(**بدیع السمٰوٰت و الارض**) اسے وہ وجود میں لایا عدم سے وجود میں لایا۔ابتداء ہے یہ ۔آگے جو کہا جاتا ہے نا(**یعیدہ**) پھر لوٹائے گا اس کو۔صرف لوٹانا نہیں بلکہ وہ یہ کہ جو وجود میں لایا اس کو پھر وہ گردشیں دے رہا ہے۔ان گردشوں کے اندر سے یہ چیز نکھرتی ہے سنورتی ہے وہ المصور بھی ہے الباری بھی ہے۔باری کے معنی ہوتا ہے جو حشو وزوائد کو الگ کرتا چلا جائے۔صور جو ہوتا ہے جو اس کو ایک فارم دیتا چلا جائے۔عظیم ہیں یہ صفاتِ خداوندی عزیزانِ من! ایک مصور کا ہی آپ کو معلوم ہو کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے۔ ارسطو کا سارا فلسفہ اس کے اوپر Base کرتا تھا۔وہ پلیٹو سے Differ کرتا ہے اپنے استاد سے کہ وہ یہ کہتا تھا کہ یہ ساری چیز عالمِ خیال کی ہے۔بات دوسری طرف چلی جائے گی لیکن کیا عرض کروں وہ تو لے جانی پڑتی ہے۔کہ یہ خیالات کی دنیا تھی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ ہیں Pletonic Philosphy والے۔اسی کا شاگرد جو تھا اس نے کہا کہ یہ غلط ہے۔یہ جتنی چیزیں تصوراتی ہیں۔اس نے کہا تھا کہ خدا المصور بھی ہے وہ اس کو فارم بھی دیتا ہے اور جب وہ فارم دیتا ہے تو وہ تخلیق کے درجے کے اندر آجاتی ہے۔دیکھتے ہیں کہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔اس فارم کو دینے کے لیے ایک پراسیس جو ہے الباری کا ہے۔**بـــری بـــریة** تو آپ کو معلوم ہے نا اس کے معنی ہیں ان چیزوں کو حشو وزوائد کو الگ کرتے چلے جانا۔یہ بڑی بڑی چیزوں کو بنتے تو ہم نے دیکھا نہیں ہے' ہماری نئی نسل کے بچوں نے تو وہ چاک بھی نہیں دیکھا'' چک کمہیار دا جنوں کیندے ہیگے'' کمہار کا چاک۔وہی اگر دیکھا ہو تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کرتا کیا ہے۔؟؟ کو تو وہ گردش دیتا ہے یہ ہے**یعیـدہ** ۔وہ کرتا کیا ہے؟ Farmless مٹی کا ایک اتنا سا وہ ٹکڑا لیتا ہے اس کی کوئی شکل نہیں ہوتی اور اس کو اس کے اوپر یوں کر کے رکھ دیتا ہے بغیر فارم کے۔چلاتا ہے' کونسی فارم دینی ہے یہ اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔یہ ہنڈیا بنے گی یہ لوٹا بنے گی یہ پیالہ ہوگا یہ آبخورہ ہوگا یہ اسکے ذہن میں ہوتا ہے۔گردش دیتا چلا جاتا ہے اور کرتا اس میں یہ ہے کہ یہ جتنی زائد مٹی ہوتی ہے وہ اس سے نکالتا چلا جاتا ہے نکالتا چلا جاتا ہے اور کچھ ہاتھ سے یوں کرتا چلا جاتا ہے۔اور اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہی جو Farmless مٹی کا ایک گولا سا تھا وہ پیالہ بن کے سامنے آجاتا ہے۔ایسا پیالہ جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ

جامِ ؟؟ سے تو میرا جامِ سفال اچھا ہے

بڑے خوبصورت پیالے بناتا ہے وہ صاحب۔امراء کے گھروں کے اندر تو ان کی؟؟ کے اوپر ڈیکوریشن کی چیزیں رکھی ہوتی ہیں یہ لائلپوری اور ملتان کے پیالے۔یہ کیا ہے؟ (**الباری المصور**) جو ہے اس کی لامنتہا صفاتِ خداوندی' محدودیت کے اندر وہ آئی ہوئی ہیں۔ اور آپ حیران ہونگے یہ تخلیقی چیزیں اس وقت جتنی بھی بن رہی ہیں خواہ وہ مشینوں سے بن رہی ہوں خواہ وہ ان کے ہاں کی لیبارٹریز میں بن

رہی ہوں اس میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلے وہ ایک پلان بناتے ہیں اس میں ایک فارم ہوتی ہے۔ پھر وہ دیکھتے یہ ہیں کہ یہ جو ہم نے میٹریل اس کے لیے لیا ہے یہ مسالہ جو لیا ہے اس میں زائد چیزیں کون کون سی ہیں۔ زائد چیزوں کو نکالتے چلے جاتے ہیں اس پلان کے مطابق ان کی شکل ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ وہ المصوریت کے ماتحت ایک خاص شے بن جاتی ہے۔ یہ ہے اس طرح سے انسان خالق ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن احسن الخالقین تو وہی رہتا ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ (**انه يبدؤا الخلق ثم يعيده**) (10:4)

ابتداء تو ہے وہی جو میں نے کہا تھا وہی کمہار کا وہ میٹریل جیسا مٹی کا اتنا بڑا وہ تھوبڑا اور پھر وہ گردشیں دے کے وہ باری اور المصور۔ (**هو الخالق البارى المصور**) دیکھتے ہیں خالق کے ساتھ باری اور مصور آ رہا ہے۔ (**ذٰلكم الله**) **عزیزانِ من!** یہ آگے ہے بات جو میں نے کہا تھا بڑی عظیم چیز ہے جس پہ ابھی تک ریسرچ نہیں ہوئی۔ اور وہ یہ کہ (**ليجزى الذين اٰمنوا و عملوا الصٰلحٰت بالقسط**) (10:4)

یہ سلسلۂ کائنات یہ عظیم کارگۂ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ انسانوں کو ان کے اعمال کا بدلہ انصاف کے ساتھ دیا جاسکے۔ یعنی مقصود جو ہے اس کائنات کی تخلیق اور ان گردشوں کا وہ یہ ہے کہ انسان کے اعمال صحیح نتیجہ مرتب کرسکیں۔ آپ غور کیجیے وہ جو Man is the measure of everything کہا تھا کسی یونان کے فلاسفر نے' کیا عجیب بات تھی کہ یہ سارا کچھ انسان کے لیے نظر آتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سارا سلسلۂ کائنات جس کی ابتداء اس نے کی اب جو گردشوں کے اندر چلا جا رہا ہے یہ ہے (**ليجزى الذين**) یہ بڑی چیز ہے۔ تاکہ انسان کے اعمال اس کے قانون کے مطابق نتیجہ خیز ہوتے چلے جائیں۔ یہ تو ساری کائنات اس لیے گردش میں ہے۔ وہ اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی تھی یہ بہت سوچنے والا تھا اس نے جو کہا تھا نا کہ

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

سات آسمانوں کی گردش سے وہ کہتا تھا کہ ہو رہے گا کچھ۔ گیا تھا خیال اس کا بھی ادھر' لیکن یہ بات تو وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ہو کیا رہے گا۔

اور پھر ہمارے ہاں جب یہ مجوسیت کا اثر آیا ہے مجوسیت تو تقدیر ہے نا۔ تو ان کے ہاں تو اس چیز کو انہوں نے گردشِ افلاک سے تعبیر کر دیا۔ آسمانوں کی گردش سے انسانوں کی تقدیر وابستہ ہوگئی۔ آپ دیکھتے ہیں بگڑا ہوا دین جو ہے وہ مذہب میں تبدیل ہو کر کچھ پہلے دھندلکے سے نقشے تو اس میں ہوتے ہیں لیکن بعد میں بات کچھ اور بن جاتی ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ چیز ان کے ہاں بھی جو وحیِ آسمانی آئی ہوگی ان کے پہلے پیغمبر پر اس میں یہ چیز ہوگی کہ یہ جو ہے (**يبدؤا الخلق ثم يعيده ليجزى الذين**) (10:4) یہ وہاں بھی ہوگی کہ یہ جو گردش ہے کائنات کی یہ اس لیے ہے کہ انسانوں کے اعمال نتیجہ خیز ہوں۔ بڑی عظیم حقیقت ہے۔ وہ آگے چل کے اس نے یہ فکری شکل اختیار کر لی کہ یہاں انسانوں

کی دنیا میں جو ہوتا ہے یہ گردشِ افلاک سے ہوتا ہے۔ دیکھا دھندلکا سا نقشہ وہی ہے شکل بگڑ گئی۔ اور بگڑنے کے بعد ہوا کیا؟ اپنے ارادے و اعمال کا مختار انسان' مجبور ہو کے رہ گیا۔ مجبور بھی کس کا ہو کے رہ گیا؟ افلاک کا مجبور ہو کے رہ گیا۔ اقبالؒ بار بار اس چیز کو کہتا ہے کہ اس سے زیادہ انسانیت کی تذلیل کچھ اور بھی ہو سکتی ہے کہ ستارے جو خود بیچارے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مجبورِ محض ہیں انہیں انسان کی قسمت کا؟؟ کرنے والا تسلیم کر لیا جائے' مجبور کا مجبور' معنی کیا ہیں؟۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

یہ خاکِ زندہ ہے وہ تو خاکِ مردہ ہے۔ دیکھ آیا نا ایک قدر کو تو کم از کم' جسے دنیا کی حسین ترین محبوبہ چاند کہا جاتا تھا خاکِ مردہ ہے۔ اب چاند کی گردش کے متعلق کہنا کہ وہ زندہ انسان کی تقدیریں بنا رہا ہے۔ لو۔ کہہ میں یہ رہا تھا خدا کی طرف سے ملا ہوا دین تو حقائق دیتا ہے۔ پھر انسانوں کے خیالات کی آمیزش ہوتی ہے تو وہ دین مذہب بن جاتا ہے حقائش افسانوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دھندلے سے اس پہلے دین کے تصور اس میں ہوتے ہیں وہ نتائج کے اعتبار سے بالکل اس سے متضاد ہو جاتا ہے۔ کہا اس نے یہ تھا کہ یہ ساری گردشیں کائنات کی وہ اس لیے ہیں تا کہ وہ انسان کو وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کیے' ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دے۔ (**والذین کفروا لھم شراب من حمیم و عذاب الیم بما کانوا یکفرون**) (10:4) اور جو ان صداقتوں سے انکار کرے ان کا نتیجہ تباہی ہو۔ اس کے لیے (**یبدؤا الخلق ثم یعیدہ**) ۔

اعمال انسان ہی کے ہیں یہ اپنے اختیار و ارادے سے یہ سارے اعمال کرتا ہے۔ وہی عمل جزآء یا سزا کا مستوجب ہوتا ہے عزیزانِ من! جس میں انسان کو اختیار و ارادہ شامل ہو۔ مجبور کا کوئی عمل نہ نیک ہوتا ہے نہ بد ہوتا ہے۔ پہلی چیز جو عام عدالت میں بھی Determine کی جاتی ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بالجبر تو نہیں ہوا' یہ مجبور تو نہیں تھا۔ وہ جبر اور استبداد یہی نہیں کہ طبعی نہ ہو۔ شراب پینے والے کی عقل مجبور ہوتی ہے اس کا کوئی بیان قابلِ سماعت نہیں ہوتا' مجبور ہوتا ہے وہ' فکری طور پہ مجبور۔ فکر کا آزاد ہونا بھی تو بڑی ضروری چیز ہے خواہ یہ شراب کے نشے سے مفلوج ہو تقلید کی؟؟؟؟؟؟؟ ۔ کہ یہ لغو قسم کی تمہاری قسمیں جو یونہی تم کھا لیتے ہو یہ ایسی قابلِ مواخذہ نہیں۔ لیکن وہ ہیں قابلِ مواخذہ جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔ تو یہ اعمال جتنے ہیں جس میں انسان کا اپنا اختیار و ارادہ شامل ہے ان کے نتائج مرتب کرنے کے لیے کائنات کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! اس پہ کوئی ریسرچ آج تک ابھی نہیں ہوئی۔ ہے بڑا عظیم موضوع یہ کہ انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں اس کائناتی نظم و نسق اور کارگۂ کائنات کا کیا تعلق ہے۔ ہماری تو یہ صورت ہے کہ ہم نے یہ طبعی کائنات کے اوپر ہی غور کرنا چھوڑ دیا ہے' سوال ہی نہیں ہے۔ یورپ جو اس کائنات پہ غور کر رہا ہے وہ صرف زندگی ہی Materialist یا مادی یا طبعی

سمجھ رہا ہے۔اس لیے یہ اس کے موضوع میں بھی بات کبھی آئے گی نہیں کہ ایمان واعمال کا خوشگوار نتیجہ اور انکار کا اور کذب کا یہ تباہ کن نتیجہ۔ یہ اعمال جو انسان نے اپنے اختیارات سے سرزد کیے ہیں ان کے نتیجے میں خارجی کائنات کا نظم ونسق یہ کیا پارٹ پلے کرتا ہے۔ یہ ہوگا عظیم موضوع انسان کے لیے۔اور ظاہر ہے کہ یہ تو کبھی کوئی مسلمان طبعی سائنٹسٹ آپ کہیں گے مومن جسے کہیں گے یعنی وہ جو اس چیز پہ ایمان رکھے۔ایمان رکھے قانونِ مکافاتِ عمل پر کہ انسان کے دل میں گذرنے والا خیال بھی اس کے لیے ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔حالانکہ طبعی قانون کے مطابق تو وہ باہر کی دنیا میں تو کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتا۔جو اس صداقت پر ایمان رکھنے والی جماعت یا قوم ہوگی وہ اس موضوع پہ ریسرچ کرے گی جو قرآن بار بار کہتا ہے۔حوالے کئی ہیں اس کے لیے۔بہرحال ایک اور آیت جو ہے بالکل اسی قسم کی وہ پیش کر رہا ہوں۔(**و لله ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض**) (53:31)

جملہ کائناتِ ارضی وسماوی کے اوپر خدا ہی کا کنٹرول ہے(**لله**) اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے یہ سرگرمِ عمل ہے۔اور وہ ہے کیا؟ پھر یہاں وہی آیا ہے(**لیجزی الذین اسآء وا بما عملوا و یجزی الین احسنوا بالحسنٰی**) (53:31) یہاں دونوں چیزیں آئی ہیں: غلط کار جو ہیں ان کے اعمال کا بھی نتیجہ ملے گا' صحیح روش پہ چلنے والے ان کے افعال وکردار کا بھی نتیجہ مرتب ہوگا۔تو یہ چیز کہ یہ خارجی کائنات کے اس نظم ونسق اور گردش کا انسانی اعمال کے نتیجہ پیدا کرنے میں اس کا تعلق کیا ہے۔میں نے کہا ہے کہ یہ بہت ہی عظیم اور گہرا موضوع ہے جو ابھی تک محتاجِ تفتیش اور کاوش ہے اس پہ بھی غور وفکر بھی ابھی تک نہیں ہوا۔یہ جب انسان کے سامنے آئے گا معلوم نہیں کیا کیا دروازے نئے کھلیں اس کے سامنے۔اور یہ تو کتاب (قرآن) قیامت تک کے انسانوں کے لیے دعوتِ غور وفکر ہے' کسی ایک دور والے کے لیے تو نہیں ہے۔اور اس کا طریق اس نے خود بتایا ہوا ہے کہ ہم عالمِ انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔(**حتٰی یتبین لھم انه الحق**) اور اس طرح سے یہ حقیقت واضح ہو کے سامنے آجائے گی کہ قرآن کا ایک ایک دعویٰ حقیقتِ ثابتہ ہے۔یہ بھی تو اس کا دعویٰ ہے کہ یہ جو خارجی کائنات کی گردشیں ہیں انسانی اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں یہ بھی اپنا پارٹ پلے کرتی ہیں۔یہ بھی حقیقت اس وقت سامنے آئے گی جب انفس اور آفاق میں چھپے ہوئے اسرارِ کائنات ان پر سے مزید پردے اٹھیں گے تو پھر یہ عروسِ حقیقت مسکراتی ہوئی سامنے آئے گی۔عظیم دور ہوگا عزیزانِ من!۔بہت پہلے پیدا ہوگئے۔پھر وہ آیا ہے اسی کی طرف کہ یہ خدا ہے تمہارا۔دیکھئے درمیان میں غایت بتادی کہ کہیں تم اس کو اسی طرح سے نہ پڑھتے چلے جاؤ کہ ہاں صاحب یہ جیسے کہ فزکس کا ایک استاد لیبارٹری میں کھڑا ہوا کوئی لیکچر دیتا ہے۔محدود ہے اس کا سارا دائرۂ علم اور جو کچھ وہ سکھا رہا ہے جو کچھ یہ سیکھ رہے ہیں صرف طبعی دنیا کے اوپر۔درمیان میں ایک آیت وہ لے آیا کہ نہیں اس کا تعلق تمہارے اعمال سے ہے۔پھر اس کے بعد وہ اسی طبعی کائنات کے اوپر آیا۔(**ھو الذی جعل الشمس ضیآء و القمر نورًا و قدره منازل لتعلموا عدد السنین و الحساب**) (10:5)

ہاں جی کہا تھا ناڈ لکم اللہ۔ تخلیقِ ارض وسما' تا کہ تمہارے اعمال نتیجہ خیز ہوں۔ وہ خدا کہ جس نے چاند اور سورج تمہارے لیے پیدا کیے۔ پیدا نہیں کیے یہاں کہا ہے (**جعل الشمس ضیآء و القمر نورًا**) (10:5) وہ ٹھیک کہا تھا رتنجل؟؟ پیٹی سن نے جس نے کہا ہے کہ عربی زبان بہت Advantages پوزیشن میں ہے کہ اس میں الفاظ جو ہیں۔ یاد رکھیے جنہیں مرادفات آپ کہتے ہیں جیسا میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں مرادف کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ Exactly وہی معنی ہوتے ہیں اس کے' یہ تو زبان کا نقص ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ ہیں لیکن ہر لفظ کے معنی دوسرے سے کچھ شیڈ کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ ضیا اور نور دونوں کے معنی لائٹ ہیں روشنی ہیں۔ قرآن ہے عزیزانِ من! ہم آپ اسے کیا Appreciate کریں گے۔ پوچھئے ان سے کہ جو کائنات کے ان رموز اور قوانین پہ غور وفکر کرتے ہیں کہ بات کیا کہہ گیا ہے۔ سائنس کی تحقیق آج کی یہ بتا رہی ہے نا کہ سورج کے اندر تو اپنی روشنی ہوتی ہے وہ خود بجائے خویش روشن بھی ہے حرارت بھی اس میں اپنی ہوتی ہے۔ یہ چاند جو ہے یہ خود اس کے اندر اپنی روشنی نہیں ہوتی یہ سورج کی دی ہوئی روشنی ہے جسے ہم کہیں گے۔ یعنی اس کی چمک اس کے اوپر پڑتی ہے۔ وہ جسے ہم تابندہ مہتاب کہتے ہیں تابندگی اس کی ساری مستعار ہوتی ہے۔ جیسی ہماری فکریں ساری مستعار ہیں مغرب کی۔ لیکن بہر حال چمکتا ہوا حسین چاند روشنی اپنی نہیں ہے دوسرے سے لی ہوئی مانگی ہوئی' کہہ دوں کہ میک اپ کیا ہوا ہے۔ بات یہ ہے دوسرے سے لی ہوئی روشنی۔ اور ایک مقام پہ تو وہ عجیب مقام ہے جس میں یہ کہا ہے قرآن نے کہ یہ چاند کو دیکھئے سورج کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے روشنی کی بھیک مانگتا ہوا۔ لیکن یہ بات وہ کہہ گیا کہ روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔ یہاں کہا ہے کہ شمس کو ضیا اور قمر کو نور بنایا۔ عزیزانِ من! ضیا کہتے ہیں بذاتِ خود روشن کوئی چیز ہو' نور کہتے ہیں اس روشنی کو جو دوسرے سے لی ہوئی ہو۔ کیا کتاب ہے صاحب!!!۔ اور یہ سامنے ایک محاکاتی انداز میں بات پیش کرنا کہ یہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے تا کہ اس سے روشنی کی بھیک مانگے کتنا حسین انداز ہے بات بیان کرنے کا۔ یہاں دو لفظوں میں بات کہہ گیا ہے۔ شمس ضیا ہے قمر نور ہے۔ ٹھیک ہے ملتی ہے اس سے روشنی بھی' کہتا ہے اس سے اور بھی کام اس سے ہوتے ہیں۔ (**قدرہ منازل**) (10:5)

یہ ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دی ہیں' یہ پہلی رات کا چاند باریک وہ بال سا باریک۔ شاعروں کو تو موضوع ملتے ہیں نا محبوب کا ناخن تراشا ہوا آسمان پہ جا کے پہلی رات کا چاند بن گیا۔ بہت اچھا جی۔ اب پتہ چلے گا ان کو جب وہ اس کی شکلیں محبوب کی سامنے آئیں گی۔ خیر۔ پہلی رات کا چاند' پھر وہ منازل ہیں اس کی وہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ طبعی دنیا کے اندر تو اس کے متعلق آپ کو وہ بتائیں گے کہ یہ کیا ہوا ہے۔ کہا کہ تمہاری دنیا میں بھی اس کا ایک فائدہ ہے۔ فائدہ کیا ہے عزیزانِ من!؟ آج تو آپ کے ہاں حساب کے قاعدے یہ علم یہ ساری چیزیں اتنی عام ہو گئیں کہ کلینڈر کے مطابق سارا حساب آپ کرتے ہیں دنوں کا مہینوں کا سالوں کا گھنٹوں کا پلوں کا سیکنڈوں تک کا۔ یہ علم کی رو سے آپ حساب متعین کر رہے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے کے دن بھی متعین کر سکتے ہیں ہزاروں سال آنے والے بعد کے دن بھی متعین کر سکتے ہیں۔

قاعدے مقرر ہیں اس کے لیے۔ میں نے کہا ہے قاعدے مقرر ہیں' میرے آپ کے یا حساب دانوں کے یا کلینڈر بنانے والوں نے بنائے نہیں ہیں یہ قاعدے' انہوں نے اُنہیں Discover کیا ہے صرف۔ بنائے ہوئے تو اسی خدا کے تھے جس نے متعین کی ہیں منازل۔ یہ جو دن آپ کہتے ہیں یہ ہوتا کیا ہے؟ متعین ہے سورج اتنے بج کر اتنے منٹ پہ نکلے گا اتنے بج کر اتنے منٹ پہ غروب ہوگا۔ یہ متعین ہے اس کا نام آپ نے ایک دن رکھا ہے یا چوبیس گھنٹے اس کو لے لیجیے۔ سال میں یہ جو گردش ہے زمین کی سورج کے گرد' یہ تو گردش ہے زمین کی اپنے محور کے گرد جس میں چوبیس گھنٹے کا دن ہے' سال میں سورج کے گرد ہے یہ تین سو پینسٹھ اور کچھ پوائنٹ ہوتا ہے وہ چوتھے سال جو ایک دن بڑھا کرتا ہے فروری کا۔ متعین ہے یہ گردش اس کی۔ پہلی چیز تو یہ کہیے جو اس نے کہا (**قدرہ منازل**) دیکھا تقدیر کا لفظ کہاں سے نکلا ہے یہ۔ ہم نے متعین کر دیے ہیں اس کے لیے یہ منازل' یہ ایک پیمانے اس کے لیے متعین کیے ہوئے ہیں' قانون بنا دیا ہے اس کے لیے۔ اگر یہ بدل جانے والی چیز ہو اور سورج کی مرضی پہ چھوڑ دی جائے اور ایک صبح وہ کہے کہ میں رات دیر سے سویا ہوں تھکا ہوا ہوں ذرا اور سو لینے دو یار۔ وہ جو صبح ہم ویسے الارم لگا کے بھی سوتے ہیں ضروری جانا ہوتا ہے دفتر میں یا کام پہ' سوتے ہیں دیر سے۔ اور وہ جو ٹر کر کے ہمیں جگانے والا ہوتا ہے پہلا کام ہم یہ کرتے ہیں کہ لحاف میں سے ہم نے ہاتھ نکالا اور اس کے اوپر یوں مارا اس کا گلا دیا دبا۔ سمجھ لیا کہ ہم نے اس کی آواز جو بند کر دی ہے تو سورج نکلے گا ہی نہیں۔ وہ تو سیکنڈ کا کروڑواں حصہ بھی عزیزانِ من! اپنے میں فرق نہیں پیدا کرتا' نہ آپ کے جلدی جاگنے سے سحر جلدی ہو سکتی ہے نہ دیر میں سونے سے سورج دیر میں چڑھ سکتا ہے۔ (**قدرہ منازل**) (10:5) اور یہ متعین ہے اس کا جو طلوع و غروب ہے کہ جس سے یہ سارا آپ کا کلینڈر کا کاروبار جو ہے اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ اتنے بج کر اتنے منٹ کے اوپر فلاں جہاز فلاں جگہ آئے گا فلاں ریل فلاں جگہ سے پاس کرے گی۔ کچھ حساب میں ایک منٹ کا فرق پڑتا ہے تو وہ ٹکراؤ ہوتا ہے آپس میں ان کا۔ وہاں تو یہ ہوتا ہے' زمین اور چاند کا چاند اور سورج کا ان کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس لیے نہیں ہوتا کہ (**ثم استوٰی علی العرش**) اس کا کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ آج تو علم کی رو سے ریاضی کی رو سے حساب رکھنا کچھ مشکل نہیں۔ وہ آج سے بہت پہلے کی Primitive Age کی قومیں جہاں حساب کتاب کچھ نہیں تھا آتا ہی نہیں تھا انہیں۔ وہ اپنے حساب کس طرح سے رکھتی تھیں؟ پھر خاص طور پہ عرب کے صحرانشین جہاں کوئی آبادیاں ہی نہیں ہوتیں کہ کسی دوسرے سے پوچھ لے کہ تاریخ کیا ہے آج۔ وہ بتانے والا بھی کس طرح سے بتائے کہ تاریخ کیا ہے۔ ان کے پاس کوئی طریقہ ہی نہیں تھا۔ ان تمام کے پاس ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ چاند کو دیکھ کے بتا دیتے تھے۔ اتنی مشق بہم پہنچا رکھی ہے انہوں نے اب بھی' ستاروں کی گردش سے راستے متعین کرنے' چاند کی ان منازل سے یعنی وہ کتنا بڑھا ہے بڑھتے ہوئے کتنا چھوٹا ہے نہایت آسانی سے وہ تاریخیں بتا دیتے تھے۔ ''آج چانی رات ہیگی اے''۔ یہ چیز تو میں نے اپنے ہاں بچپن میں اپنے ہاں کی دادی دادا والدہ مرحوہ جو ابھی ان کا انتقال ہوا ہے ان کی کیفیت یہ تھی ان کے وقت میں یہ گھڑیاں ابھی شاید نہیں تھیں یا وہ نہیں رکھتے تھے۔ یوں دیکھ کے چاند کو اندازہ بتا دیتے تھے۔ جیسے یہ

ستاروں سے وہ بتاتے تھے کہ ''اینی کورات باقی ہیگی''۔ یہ بڑی چیز تھی چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کا یہ پیمانہ۔ کہا کہ اس سے کم از کم یہ فائدہ تو تمہارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ تم اس سے (**عدد السنین و الحساب**) (10:5) گنتی اور حساب رکھتے ہو۔ لیکن عزیزانِ من! یہ تو قرآن ہے ۔ چاند کی رو سے حساب رکھنے کی محتاج وہی قومیں ہیں جن کے ہاں ابھی یہ ریاضی کا علم نہیں آتا۔ ریاضی کا علم آنے کے بعد کچھ مشکل نہیں ہے کہ سورج کے حساب سے بھی آپ اپنا کلینڈر رکھ لیں۔ قرآنِ کریم نے صرف چاند ہی کے متعلق نہیں کہا کہ یہ حساب رکھنے کے لیے ہم نے بنایا ہے ۔ دوسری جگہ ہے (**و الشمس و القمر حسبانًا**) (6:97)۔ چودہ سو سال پہلے کے عربوں کو یہ کہنا کہ سورج سے بھی حساب رکھا جا سکتا ہے ۔ ان کی سمجھ میں تو نہیں بات آ سکتی تھی لیکن قرآن انہی کے لیے تو نہیں تھا قرآن ہمارے لیے بھی تھا آنے والے دوروں کے بھی تھا۔ اور یہ کہہ کے اس نے یہ کہہ دیا کہ یہ کوئی ہماری طرف سے فریضہ اور پابندی نہیں ہے کہ چاند ہی کے ذریعے سے تم نے حساب رکھنا ہے۔ چاند سورج دونوں حساب کے لیے ہم نے بنائے ہیں جو بھی تمہیں جس میں آسانی نظر آئے اس کے مطابق تم اپنا حساب رکھ سکتے ہو۔ یعنی بات قرآن کا منتہا مقصود تو انسانی ذات کی راہنمائی ہے مسائلِ حیات معاملات کے متعلق۔ یہ باتیں جو ضمناً آتی جاتی ہیں اس میں' آپ اس میں دیکھئے کہ ضمناً بھی کتنی کتنی باتیں وہ کرتا چلا جاتا ہے ایک ایک لفظ سے۔ کوئی ایسا فریضہ نہیں ہے نہ کائناتی حساب سے نہ ہماری طرف سے کہ تم صرف سورج ہی کو رکھو یا چاند ہی کو رکھو۔ (**الشمس و القمر حسبانًا**) (6:97) دونوں حساب کے لیے ہیں۔ اس کا حساب آسان ہے اس کے لیے ریاضی کے علم کی ضرورت نہیں ہے یوں رکھنا چاہتے ہو یوں رکھو۔ یوں رکھنے کے اندر کچھ کمی بھی واقع ہوتی ہے۔ چاند کے حساب سے زمین پورے ایک سال میں گردش پوری نہیں کرتی سورج کے گرد' دس دن کا فرق رہ جاتا ہے۔ چاند کے بارہ مہینے کے دن گننے سے وہ تین سو چون پچپن کے قریب آتے ہیں' وہ پینسٹھ کے قریب آتے ہیں۔ اسی لیے یہ قمری سال جو ہے دس دن چھوٹا ہوتا ہے شمسی سال سے۔ اور اسی لیے یہ صورت ہے کہ وہ ایک دفعہ آپ کی عید مثلاً سولہ نومبر کو آتی ہے اگلے سال وہ سولہ نومبر کو نہیں ہوتی چھ نومبر کو آ جاتی ہے۔ کیونکہ نومبر جو ہے ہم نے وہ سورج کے حساب سے رکھا ہے عید چاند کے حساب سے ہے چاند دس دن پہلے پورا ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے قمری سال آپ کے جو ہیں وہ ہر چھتیس سال کے بعد ایک سال پیچھے رہ جاتا ہے شمسی سے' تیسرے سال ایک مہینہ پیچھے رہ جاتا ہے' ہر سال دس دن پیچھے رہ جاتا ہے اس سے۔ یوں دونوں میں تفاوت ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال میرا مقصد اس سے یہ کہنا نہیں۔ قرآنِ کریم کی ان آیات کو سامنے لانا ہے کہ حساب قمری بھی رکھا جا سکتا ہے حساب شمسی بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اب ان میں سے کسی ایک حساب کے متعلق مصر ہو جانا کہ صاحب یہی اسلامی ہے اور دوسرا غیر اسلامی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ اس نے شمس اور قمر دونوں کو حساب کے لیے کہا ہے کہ ہم نے بنایا ہے۔ جس میں بھی آپ کی آسانی ہو آپ اسے رکھ سکتے ہیں۔ (**عدد السنین و الحساب**) (10:5)۔ اور اس کے بعد وہی بات (**ما خلق الله ذٰلک الا بالحق**) (10:5) یہ یونہی تخیلاتی چیزیں نہیں ہیں کہ خیالات کی دنیا کے اندر یہ کچھ ہو رہا ہے حقائق کی دنیا ہے۔

یہ کئی دفعہ یہ بات آ چکی ہے یہ حق جو ہے کتنی جامع اصطلاح ہے قرآنِ کریم کی بھی عربی زبان کی بھی۔ اور ایک بات تو اس کے اندر بنیادی ہے کہ یہ الحق ہے یا حق جو ہوتا ہے یہ صرف ذہنی چیز نہیں ہوتی یہ ایک ٹھوس حقیقت ہوتی ہے۔ دوسری طرف چلی جائے گی بات۔ حق تو وہی ہے جس کا ترجمہ Real بھی کیا جاتا ہے ہمارے ہاں۔ وہاں سے جو Verb بنایا ہے نا انگریزی والوں نے' Realize۔ معنی وہاں بھی آج اس کے کچھ اور ہوتے ہیں Realize کے معنی محسوس ہونا ہے۔ Realize کے معنی ہوتا ہے کسی شے کو Real بنا دینا اور Real ٹھوس چیز ہوتی ہے۔ عربوں کے ہاں کسی مجرد حقیقت کو Abstract Truth جو ذہنی ہوتا ہے وہ جب کوئی محسوس شکل اختیار کرتا ہے تو اسے کہتے ہیں اس کا حق یا اس کی حقیقت۔ اس ذہنی نظریے کی حقیقت یہ ہے۔

وہ جو حضرتِ عمرؓ کے عہد میں وہ؟؟ نے پوچھا تھا ایک سپاہی سے آپ کے' کیا بات تھی ان سپاہیوں کی وہ تو ہر ایک ان میں سے مومن ہوتا تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ دیکھئے الفاظ کے معنی اور اس زمانے میں عربی زبان کے الفاظ کے معنی۔ کلمہ کا معنی آپ نے دیکھ لیا یہاں نظریہ' ایک Abstract چیز' اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے وہ ایک محسوس شکل میں سامنے آتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ہر کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے' تمہارے ہاں جو کلمہ ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ ہمارے ہاں آج پوچھا جاتا تو ہم یہ فلسفیانہ بحث میں الجھ جاتے ۔ پہلے تو کلمہ ہی ہمارے ہاں کلمہ ہوتا' پھر حقیقت ہمارے ہاں تو حقیقت تو ہمارے ہاں Abstract ہوتی ہے مجرد ہوتی ہے ٹھوس حقائق سے تو اس کو واسطہ ہی نہیں ہوتا وہ تو ہم مدت ہوئی چھوڑ آئے ہوئے ہیں پیچھے۔ وہ یہ بات پوچھتا ہے سپاہی سے پوچھتا ہے کہ تمہارے کلمہ کی حقیقت کیا ہے۔ عزیزانِ من! جواب سنیے اور دیکھئے کہ یہ لوگ تھے جو قرآن کو پہچانتے تھے۔ اُس نے کہا کہ یہ چالیس ہزار شہر اور قلعے جو ہم نے فتح کیے ہیں ہمارے کلمہ کی حقیقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اللہ اکبر۔

ولایت پادشاہی علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

یہ اس کلمہ کی آپ کے ہاں کے کلمہ کی حقیقتیں ہیں۔ آپ کے ہاں کا ایک سپاہی یہ بات کہتا ہے کہ اس نے کیا پوچھا ہے۔ اور اسے معلوم تھا کہ میرے اس کلمہ کی حقیقت کیا ہے۔ جس کلمہ میں مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ لا الہ الا ہو اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ اس کلمہ کی حقیقت یہی ہوگی کہ اس کلمہ کا ماننے والا اس کے سامنے دنیا میں کوئی صاحبِ اقتدار نہ ہو سوائے اس کے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ شہر اور قلعے اور مملکتیں کسی انسان کے اقتدار میں نہ رہیں اس کے اقتدار میں آتی چلی جائیں۔ یہ تھی کلمہ کی حقیقت۔ اللہ اکبر۔ مگر اب یہی کلمہ کیا ہے اقبالؒ کے الفاظ میں۔ یہ کلمہ وہ کہتا ہے کہ اب یہ آپ کے ہاں علمِ کلام کا ایک مسئلہ بن گیا ہے 'اک مسئلہِ علمِ کلام'۔ انہیں پتہ تھا حقیقت کیا ہے۔ (ما خلق اللہ ذٰلک الا بالحق) (10:5) یہ Reality ہے اور جب یہ مشہود شکل میں یہ چیزیں سامنے آتی ہیں تو وہ محسوس حقیقتیں ہوتی

ہیں نظر آ جاتا ہے کہ یہ بالحق پیدا کیا۔(**ذٰلک الا بالحق یفصل الاٰیٰت لقوم یعلمون**) (10:5)**یفصل الاٰیٰت** ۔

آپ دیکھئے گا کہ وہ کہتا ہے کہ ہم تو نکھار کر بیان کرتے ہیں۔ یہ کتاب مبہم نہیں ہے یہ کتاب مجمل نہیں ہے وہ تو اس کو تفصیل سے بیان کرتا ہے نکھار کر بیان کرتا ہے۔لیکن کن لوگوں کے لیے ہے یہ اس کی تفصیل اور نکھار(**لقوم یعلمون**) (10:5) جو علم سے کام لیتی ہے۔اور آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے خود علماء کی جو Definition دی ہے وہ بعینہٖ وہ ہے جو آج لفظ سائنٹسٹ کے لیے آپ استعمال کرتے ہیں ۔دوسرے وقت میں عرض کرونگا جہاں وہ لفظ آیا۔(**لقوم یعلمون**) یہ ان کے لیے ہے۔ایک ہی لفظ اور ہے دو منٹ میں وہ بات عرض کر دوں ۔اور آپ کو تو معلوم ہے میں نے عرض کیا ہوا ہے ہمارے ہاں متقی کسے کہتے ہیں۔ سنیے۔(**ان فی اختلاف الیل و النھار و ما خلق اللہ فی السمٰوٰت و الارض**) (10:6) شمس وقمر کی بات آ گئی اختلافِ لیل ونہار کی بات اب آ گئی۔جو کچھ بھی ہم نے پیدا کیا ہے آسمان وزمین کی ان پستیوں اور پہنائیوں کے اندر' یہ(**لاٰیٰت**) (10:6) ان میں ہر ایک شے ایک دلیل ہے علامت ہے نشانی ہے ایک حقیقت تک پہنچنے کی۔اسے آیت کہتے ہیں یا قوانین کے لیے بھی آیت آتا ہے۔کس کے لیے ہے؟ (**لقوم یتقون**) (10:6) متقیوں کے لیے ہے۔ وہاں عالم کی Definition دیدی ہے **لقوم یعلمون**' یہاں متقین کی وضاحت کر دی کہ یہ کون ہیں۔وہ جنہیں معلوم ہے کہ یہ اختلافِ لیل ونہار کیوں ہے یہ تقدیرِ شمس وقمر کیوں ہے' یہ تخلیقِ ارض سماء کیسے ہوئی ہے' کائنات میں اضافے کیسے ہو رہے ہیں' یہ انکشافات سائنس کے کس طرح سے ہو رہے ہیں۔یہ ساری چیزیں ان کا علم اور اس کے بعد یہ علم کہ پھر انسان کو اس کے اعمال کے لیے جو مکلّف ٹھہرایا گیا ہے یہ نتیجہ خیز کس طرح سے ہوتی ہے۔عالم اور متقی انہیں کہا گیا ہے عزیزانِ من!۔سورۃ یونس کی چھ آیت تک ہم آئے ساتویں آیت سے اگلے درس میں ہم لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔تیسرا باب (آیات 7 تا 14)

عزیزانِ من!

آج اگست 1973ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 7ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (10:7)

سابقہ آیات میں قرآنِ کریم نے تخلیقِ کائنات' اختلافِ لیل ونہار' تنویم وتکویرِ شمس وقمر گویا فطرت کے مختلف مظاہر کو بیان کیا تھا۔ اور وہ بیان کرنے کے بعد کہا تھا کہ (وما خلق اللہ فی السمٰوٰت و الارض لاٰیٰت لقوم یتقون) (10:6) اور جیسا کہ میں نے درس کے آخری الفاظ میں یہ عرض کیا تھا نہ صرف یہ کہ یہ آیہ جلیلہ بڑی حسین حقیقت کی مظہر ہے بلکہ قرآن کا یہ ایک خصوصی پہلو ہے ایک گوشہ ہے اسکی تعلیم کا جو نہ صرف یہ کہ مذہب کی دنیا میں کہیں اور آپ کو ملتا نہیں ہے بلکہ پورے مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔اور ایک یہ چیز بھی تھی جس کی وجہ سے میں نے اپنی کتاب کا نام بھی "Islam a challenge to religion" رکھا تھا۔

اسلام سے پہلے یا نزولِ قرآنِ کریم کے وقت ساری دنیا کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اس محسوس کائنات کو محض ایک فریبِ نگاہ' سراب' مایا یہ قرار دیتے تھے۔آپ میری کتاب 'انسان نے کیا سوچا' اس میں اس کی تاریخ دیکھئے۔افلاطون (Pleto) یونان کے حکماء میں سرِ فہرست اس کا نام آتا ہے اس نے یہ تخیل دیا کہ یہ کائنات موجود فی الخارج جو ہے یہ موجود ہی نہیں ہے اس کی حقیقت ہی کچھ نہیں ہے یہ وجود ہی کچھ نہیں ہے یہ ہمارے تخیلات ہیں اصل کائنات عالمِ امثال ہے کسی دوسری دنیا میں۔اور یہ تو یوں سمجھئے جیسے کسی شے کا سایہ ہو۔گویا بتایا یہ گیا کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ جب کسی کی وجود کی کوئی حقیقت نہ ہو تو پھر وہ قابلِ التفات ہی نہیں ہو سکتی اس کی اہمیت ہی کیا ہو سکتی ہے ۔یہی چیز تھی فکری دنیا میں آگے آئی ۔تو اگرچہ فلسفہ کے اعتبار سے ہی سہی اسکندریہ میں یہودیوں نے اس کو اپنے ہاں لیا' New Platonism اسے کہتے ہیں نو افلاطونی تصور۔اور وہاں سے یہ عیسائیت کا مذہب کا جزو بن گیا۔یوں ایک فلسفیانہ بحث میں مذہب کی حیثیت اختیار کی اور وہ اس طرح کہ انہوں نے یہ کہا کہ مادہ (Matter) میٹریل ورلڈ فزیکل یونیورس یہ طبعی کائنات' اُس نے تو کہا تھا اس کا وجود ہی نہیں' انہوں نے یہ کہا کہ یہ قابلِ نفرت شے ہے یہ پلید چیزیں ہیں ناپاک چیزیں ہیں کیچڑ ہے دلدل ہے۔اصل شے اس کے مقابلے میں Spirit ہے جس کا ترجمہ پھر روح کیا گیا۔اور میٹریل مادی کے مقابلے میں Spirtual ایک اصطلاح انہوں نے ایجاد کی جس کے معنی روحانی ہو گیا۔تو عیسائیت میں بھی یہ چیز تھی کہ یہ مادی دنیا قابلِ نفرت ہے۔اسی لیے رہبانیت ان کے ہاں مذہب کی اصل قرار پا گیا یعنی ترکِ دنیا ترکِ مادہ دنیا سے دور بھاگنا ان آلائشوں سے اپنے آپ کو پاک اور صاف رکھنا۔گویا دنیا اور محسوس کائنات جو ہے اس سے نفرت اس سے دور رہنا اس سے الگ رہنا یہ ان کے ہاں مذہب کی بنیاد قرار پا گیا۔یہی چیز تھی جو ہمارے پڑوس میں انڈیا میں جو اس زمانے کا دھرم تھا اس میں

بھی اس ساری کائنات کو مایا یا فریب کہا گیا سراب کہا گیا۔ اور وہی عیسائیت کا تصور یعنی Platonic نظریہ یہاں بھی کہ ان کا وجود کوئی نہیں ہے۔ وہی مادے سے نفرت وہی یہاں سے بھاگ جانا۔ ان کے ہاں بھی اصلِ دھرم پہلی زندگی کے بعد جو گھریلو زندگی تھی اس کے بعد بن باس کی زندگی سنیاس کی زندگی اُسے انہوں نے دھرم کی زندگی اصل زندگی آتما کی زندگی قرار دیا۔ گویا وہی تصور یہاں تھا۔ ساری دنیا میں اس زمانے میں یہ تصور تھا کہ یہ کائنات ایک تو یہ کہ یہ Real نہیں ہے حقیقی نہیں ہے یہ عالمِ تصور ہے عالمِ خیال ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ سارا یہی تصور ہے۔ آگے چل کے میں عرض کرونگا کہ آپ کے ہاں کا تصوف بھی پھرا نہی خیالات کا مظہر ہے جن کو مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت ساری دنیا میں کائنات کے متعلق یہ تصور تھا۔ اور وہ جو میں نے کہا ہے نا 'A Challenge to religion' قرآن نے اس تصور کے خلاف ایک چیلنج پیش کیا۔ اس نے کہا کہ (**ما خلق اللہ ذٰلک الا بالحق**) (10:5) بڑی عظیم حقیقت ہے صاحب۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت کا بھی چھوٹا سا ٹکڑا اس کا ایک چھوٹا سا لفظ جو ہے۔ یہ بیک گراؤنڈ اگر آپ کے سامنے ہو کہ اس زمانے میں عالمِ فکر اور یہ دنیائے مذہب جو تھی وہ اس کائنات کے متعلق کیا سمجھتی تھی کیا عقائد رکھتی تھی پھر بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کہہ کیا گیا ہے۔ اس ایک لفظ سے یا چار لفظ جو ہیں (**ما خلق اللہ ذٰلک الا بالحق**) (10:5) ان تمام فکری تصورات مذہبی عقائد کی تردید کر گیا قرآن کہ یہ غلط ہے۔ کائنات کو بالحق پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد آپ دیکھئے قرآنِ کریم میں۔ یعنی یہ جو میں ایک فقرے میں کہا کرتا ہوں کہ دین نام ہے اس چیز کا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرنا۔ قرآن نے اسے دین کہا ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا۔ یہاں سے وہاں تک سارے ہی قرآن میں آپ دیکھئے (**سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض ، سخر کم الشمس ، سخر کم القمر**) تسخیرِ کائنات۔ اور پھر کائنات کی ایک ایک شے کے اوپر غور وفکر کی اس نے دعوت دی' انہیں مؤمنین کا فریضہ قرار دیا۔ یعنی یہ فکری دنیا کی چیز نہ رہی یہ ایک سائنٹسٹ کا الگ شعبہ نہیں رہا۔ قرآن میں یہ ایمان کا تقاضا بتایا گیا مؤمنین کا فریضہ بتایا گیا کہ وہ فطرت کی قوتوں کے متعلق غور وفکر سے پہلے ان کو Study کریں قوانینِ فطرت کو پھر عملاً ان قوتوں کو مسخر کریں۔ یہ ایمان کا تقاضا ہے مومن کا فریضہ ہے متقی کی Definition ہے۔ جوں جوں آگے ہم بڑھیں گے اور یہ آیتیں آتی جائیں گی درسوں میں' میں آپ کو تفصیل سے عرض کرونگا۔ میں کہتا ہوں اگر صرف یہ جتنی آیات فطرت کے قوانین کے متعلق اور قوتوں کے متعلق قرآن نے بیان کی ہیں یکجا کی جائیں تو ایک اچھا خاصا کتابچہ بن جاتا ہے وہ۔ بنیادی نقطہ ہی اس کی تعلیم کا یہ ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ علماء کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ تو علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے انہیں تو چھوڑ دیجیے۔ ایک ہی مقام پہ باقی اب رہ گیا جس میں یہ ہمارے علماء اسلام کے بعد جن کو علماء کہا جاتا ہے۔ تو پہلے تو آپ ذہن

میں رکھیے کہ آپ کے ہاں علمائے کرام کنہیں کہا جاتا ہے۔'ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی'۔ مجھے بھی معلوم ہے آپ کو بھی معلوم ہے۔ آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے علماء کن کو کہا ہے؟ سنیے کنہیں وہ علماء کہتا ہے۔(**الم تر ان الله انزل من السمآء مآء**) (35:27)

تـــــر غور وفکر کے لیے آتا ہے ایسا غور وفکر جو محسوس چیزوں کے متعلق ہو نظر میں آجانے والی چیزیں خالی فکری چیزیں نہیں ذہنی نہیں عقائد کی دنیا سے متعلق نہیں بلکہ عالمِ محسوسات سے جو چیزیں متعلق ہوں۔(**الم تر**) کیا دیکھا نہیں۔تم نے دیکھا نہیں ہے تم نے غور نہیں کیا اس چیز کے اوپر کہ خدا نے بلندیوں سے بارش برسائی بادلوں میں سے پانی برسایا۔(**فاخرجنا به ثمرٰت مختلفًا الوانها**) (35:27)اور اس سے پھر زمینِ مردہ سے کس کس قسم کی کھیتیاں فصلیں پھول پھل درخت اس سے پیدا کر دیے۔کیا کبھی تم نے اس پہ بھی غور کیا ہے؟۔اب جتنے یہ علوم جن کا تعلق زراعت سے ہے باغبانی سے ہے بارش سے ہے وہ تمام کے تمام اس میں آ گئے۔ایک شعبہ زندگی کا سائنس کی پوری ایک برانچ اس میں Cover-up ہوئی۔بارش کے سلسلہ میں الگ اور اس کے بعد زمین کی پیداوار کے سلسلہ میں دوسرا شعبہ۔(**و من الجبال جدد بیض و حمر مختلف الوانها و غرابیب سود**) (35:27) یہ چودہ سو سال پہلے کی بات کہی جارہی ہے جس زمانے میں ابھی آپ کے ہاں کی طبعی علوم (Physical Sciences) بھی ابھی اس تصور تک نہیں پہنچی تھیں۔کہ یہ جو ایک پہاڑوں کی چٹانوں کے اندر مختلف لائنیں آپ کو نظر آتی ہیں مختلف رنگ کے پتھر نظر آتے ہیں کوئی سفید ہے کوئی سرخ ہے کوئی سیاہ ہے۔یہ مختلف رنگ کیسے ان کے ہو گئے کیا کیا ان کے اندر کیمیائی تبدیلیاں واقع ہوئیں کن کن ارتقائی منازل سے یہ چیزیں گذری ہیں اور یہ بن گئیں۔قرآن نے کہا ہے کہ یہ کائنات اسی طرح سے ایک Accomplished Factor کی حیثیت سے بنا بنایا مکمل نہیں آ گیا تھا۔وہ تو ایک گوشہ الگ آ جائے گا اگر میں عرض کروں کہ قرآنِ کریم اس تخلیقِ کائنات کے متعلق کس طرح Evolutionery منازل (ارتقائی منازل) اس کی بتاتا چلا جاتا ہے کہ کیا کیا تبدیلیاں اس میں ہو رہی تھیں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی چلی جارہی تھیں۔وہ جو(**یبدؤا الخلق و یعیده**) (10:4) وہ کہتا ہے کہ وہ ابتداء کرتا ہے اور پھر اس کے بعد گردشیں دیتا ہے۔(**انه یبدؤا الخلق و یعیده**) (10:4) تخلیق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر انہیں گردشیں دیتا ہوا آگے بڑھاتا ہوا ان میں تغیرات کرتا چلا جاتا ہے ان میں اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔کہا ان چیزوں پہ تم نے کبھی غور وفکر نہیں کیا۔پہاڑوں کے متعلق کہ کیا کیا تبدیلیاں تھیں جن کی بناء پر یہ چیزیں یہ پہاڑوں کی چٹانیں اور ان میں مختلف تہیں یہ کس طرح وجود میں آئیں کیا کیا تغیرات ہوئے جن سے یہ مختلف رنگوں کے پہاڑ وجود میں آئے۔میں نے عرض کیا ہے کہ جس زمانے میں سائنس کی تحقیقات کی ابتداء بھی ہوئی تھی ان کی نگاہ بھی اور چیزوں کی طرف گئی تھی۔یہ پہاڑوں کے متعلق تو بڑا Recent ہے علم آپ کا۔یہ Geology کا علم جو ہے علم الارض یہ بڑا Recent ہے ان میں تو ابھی شروع ہوئی ہیں تحقیقات ان کی۔اور عجیب وغریب چیزیں ان کے سامنے آ رہی ہیں۔یہ چودہ سو سال پہلے بتا رہا ہے کہ کبھی اس گوشے کے اوپر بھی تم نے غور وفکر کیا ہے کہ یہ تغیرات کس طرح سے نمودار ہوئے۔پہلی آیت میں تین چیزیں آ گئیں۔بارش کیسے ہوتی ہے کہا

کبھی غور کیا' بارش سے یہ مختلف چیزوں کی پیداوار اور روئیدگی یہ کیسے ہوتی ہے کبھی اس پہ بھی تم نے تحقیقات کی ہے۔ کبھی تم نے پہاڑوں کو بھی دیکھا ہے کہ ان کے یہ تغیرات کس طرح سے نمود میں آئے ہیں کیسے ظہور میں آئے کیسے یہ بن گئے۔ پہلی آیت۔

(و من الناس) (35:28) کبھی تم نے انسانوں پر بھی غور کیا ہے کہ یہ انسان انسان کیسے بن گئے جو وجود میں آ گئے ہیں۔ آپ دیکھتے چلے جایئے اور نام رکھتے چلے جایئے سائنس کی مختلف Branches کا۔ بائیالوجی میں الگ انسان کے متعلق جو سائنس اس کو الگ کرتی ہے انسانوں پہ غور کیا تم نے۔ **(والدو آب)** (35:28) انسانوں کے علاوہ یہ جو باقی جاندار اشیاء ہیں رینگ کر چلنے والے دو پاؤں پہ چلنے والے اڑنے والے یہ سارے اس میں آ جاتے ہیں۔ **(والانعام)** (35:28) یہ مویشی چوپا ہے جنہیں آپ کہتے ہیں **(مختلف الوانه كذلك)** (35:28) ان کی مختلف Species مختلف انواع ان کی۔ انسانوں کی دنیا' Animals کی لائف' ان کے علاوہ باقی تمام جاندار چیزیں ان میں سے ہر ایک ایک الگ الگ نوع ان کی اقسام ان کی Species۔ عام لوگوں سے کہا کہ تم نے ان پہ کیا غور کرنا ہے۔ اور جو ان پہ غور و فکر ہی نہیں کرتا وہ خدا اور اس کے قوانین کی عظمت کو کیا پہچان سکتا ہے۔ کہا تو یہ ہے کہ ان کی عظمت کو کون پہچانتا ہے اور پہچاننے والوں کی کیفیت کیا ہوتی۔ **(انما يخشى الله من عباده العلمؤ)** (35:28)

اس کے بندوں میں سے علماء کی جماعت جو ہے وہ ان کے اوپر غور و فکر کرتی ہے اور غور و فکر کے بعد ان کی کیفیت یہ ہے کہ خدا کی عظمت کے سامنے تھرتھرا اٹھتے ہیں صاحب وہ۔ اللہ اکبر۔ کیا بات تھی تھرتھرانے کی۔ **(ان اللہ عزیز غفور)** (35:28) یہ دیکھ کر کہ کتنی قوتوں کا مالک ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کائنات کی حفاظت کا انتظام بھی اس نے کیسے کر رکھا ہے۔ اس کائنات کے اندر جو قوتیں پنہاں ہیں میں نے عرض کیا تھا کہ جو کششِ ثقل ہے ان کروں کے مابین ان میں اگر کبھی ایک کروڑویں حصے کا بھی فرق پڑ جائے کسی ایک کرے کی کشش کے اندر تو یہ سارے کرے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں۔ یہ ہے وہ غفور کہ اتنی قوتوں کے مالک کروں کو قانون کی زنجیروں میں یوں جکڑا ہوا ہے کہ اتنا سا فرق بھی ان میں نہیں آ سکتا۔ یہ سامانِ حفاظت ہے اس کا۔ اور عزیز اتنا بڑا ہے' پھر تو سیدھی سی بات ہے کہ جو اتنی عظیم کائنات کو اس طرح کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے تو وہ تو اتنا بڑا صاحبِ عزت صاحبِ قوت خدا ہے۔ کہنا یہ تھا کہ **(انما يخشى الله من عباده العلمؤا)** (35:28) اب یہاں عالم کی Definition ہو گئی آپ کے سامنے کہ عالم کہتے کسے ہیں علماء ہوتے کون ہیں پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ مغرب کے سائنٹسٹ جنہیں ہم عام طور پہ دہریہ یا Etheist کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے ان کی Etheism سمٹ کے اتنی رہ جاتی ہے کہ وہ پادری کے بتائے ہوئے خدا کو تو نہیں مانتے لیکن اپنے اپنے شعبہ میں تحقیق کے بعد جس نتیجے پہ پہنچتے ہیں اور جس خدا کو وہ مانتے ہیں اس کی عظمت کے سامنے فی الواقعہ وہ سربسجود ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی میں ایک کتاب کا حوالہ دیا کرتا ہوں "The great design" اس میں اس کے ایڈیٹر نے کیا یہ تھا کہ یہ جتنے مختلف

Branches ہیں سائنسز کی یا اس کائنات کے مختلف گوشے اور شعبے جو ہیں ان کی ریسر چز کے جو بڑے بڑے آئمہ ہیں اس وقت سائنٹسٹ ۔اس نے ان سے کہا تھا کہ تم اپنی تحقیق کے بعد کس نتیجے پہ پہنچے ہو کہ یہ کائنات یونہی اتفاقیہ Heath Hesidly وجود میں آ گئی یا اس کے پیچھے کوئی ڈیزائن اور پلان بھی ہے کوئی حکمت اور غایت بھی ہے کوئی ربط اور تناسب بھی ہے۔اس نے کہا تھا کہ آزادانہ میں جواب مانگتا ہوں۔تو انہوں نے تو دیناہی آزادانہ جواب تھا۔تو اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق اس نے اس کو اکٹھا کر دیا ہے۔لکھنے والوں میں وہ بھی ہے جن میں سے ایک نے درخت کے ایک پتے کے متعلق لکھا ہے اور جیمز جینز بھی ہے جس نے فلکیات کے متعلق لکھا ہے۔ان تمام شعبوں کے علماء جو ہیں آئمہ جو ہیں ان کی تحقیقات کا نچوڑ ان کے اپنے الفاظ میں لکھا ہے۔اور ہر سائنٹسٹ اپنی تحقیق کے بعد اس مقالے کے آخر میں اس نتیجے پہ پہنچا ہے کہ میں تو اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی بڑی عظیم قوت حکیم ہے جو خاص نظم وضبط اور خاص Scientific طریقے سے اس کو چلائے چلی جارہی ہے۔یہ سائنٹسٹ عیسائیت ہندویت اور یہودیت کے اس خدا کو کیا مانتی کہ جس کے متعلق یہ تھا کہ چھ دن میں اس نے کائنات پیدا کی ساتویں دن تھک کے سو گیا۔یہ کائنات جو مادی پیدا بھی کی اس نے چھ دن میں تو ایسی قابلِ نفرت کہ اسے چھوڑ کے بھاگ جانا چاہیے۔ملاحظہ فرماؤ۔معاف رکھیے گا ''بقول اوہنا دے ایہڈا کم کِتا''یعنی سارا کارِنمایاں اس کا یہ کہ وہ کائنات وجود میں لایا اور کائنات ایسی کہ وہ جس سے بھاگ جانے میں ہی انسان کے شرف ہے۔قابلِ نفرت' یا تو وہ ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو قابلِ نفرت۔یہ ہے کارنامہ اس خدا کا۔وہ اس خدا کو مان کے کرتے کیا۔یہ تھا تصور جو انہوں نے دیا ہوا تھا خدا کا' اس کا نتیجہ دہریت ہوسکتا ہے اس کے سوا دہریت ہو کیا سکتا ہے کہ یہ تو نے کیا کیا۔اور سارا کچھ خدا کی تخلیق کا مظہر یہی بتایا جاسکتا ہے نا ساری کائنات کے متعلق یہ تصور یا ہے ہی نہیں اگر ہے تو قابلِ نفرت ۔تو وہی بات جو میں نے ابھی کہی ہے کہ اس خدا کو وہ لے کے کیا کرتے۔وہ کہتے کہ یہ خدا ہے اس نے کیا کیا ہے''کِتا کی اے' اے بنایا کی اے''۔معاف رکھیے پھر وہ سردار جی یاد آ جاتے ہیں۔جنگل میں چلے جارہے تھے سامنے سے ان کو نظر آیا بہت بڑی کوئی خارقِ فطرت ہستی۔ان سے پوچھا سردار جی نے کہ جی آپ کون ہیں' اُنہوں نے کہا کہ میں واگرو۔اچھا۔''تے پوچھن لگے سردار جی پئی تسی کردے کی ہیگے او' او کہن لگے اسی بندے بنانے ہیگے آں' کہن لگا ایہو جئے بنادے ہو شرم نئیں اوندی'فٹے منہ تہاڈا''۔بڑی عظیم حقیقت کہہ گیا ہے وہ۔پورا یہ تصور جتنا بھی تھا نا آپ کے ہاں کی اس عیسائیت کا اور رہبانیت کا اور یہ تصوف کا' عجیب تنقید کر گیا ہے۔میں کہتا ہوں عزیزانِ من! کبھی سوچئے تو سہی کہ خدا کا یہ تصور کہ شاہکار اس کا ماحصل اس کا جسے کہا جاسکتا ہے یہ کائنات اور یہ کائنات ایسی کہ جو ناپاک ہے پلید ہے قابلِ نفرت ہے۔وہ تو ان کا بس نہیں چلتا' شہروں سے بھاگ کے جنگلوں کی طرف چلے جاتے ہیں وہ بھی یہی کائنات ہے۔لیکن خدا کے شاہکار کے متعلق ایک ہی چیز ہمارے سامنے ہے نا یہ کائنات اس کی' کائنات کے متعلق کہ یہ اس قابل ہے کہ چھوڑ کے بھاگ جائے آدمی۔پوچھیے تو سہی پھر اس خدا کو وہ مانا کاہے کے لیے جائے''بندے بنانداں اے تے ایہو جئے بناندا ایں''۔(معاذ اللہ معاذ اللہ)۔یہ تھا وہ دنیائے فکر اور عالمِ مذاہب کی کیفیت

نزولِ قرآن کے زمانے میں عزیزانِ من!۔کوئی انسانی فکراس زمانے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ نہیں۔(**ما خلق اللہ ذٰلک الا بالحق**) (10:4) کوئی انسانی فکر یہ بات کہہ سکتا تھا۔فکر سے متعلق ہوتا تو وہ ساری فکر تو یونان کی چلی آ رہی تھی' مذہب سے متعلق ہوتا تو مذاہب تو یہ کہتے چلے آ رہے تھے۔کونسا انسان اپنی فکر سے یہ بات کہہ سکتا تھا اس دور میں کہ نہیں صاحب۔

اوراس کے بعداس نے یہ کہا کہ قرآن پہ ایمان لانے والے مومن جو ہیں ان کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ وہ اس کائنات کی تخلیق پر اختلافِ لیل ونہار پر کھڑے بیٹھے لیٹے غور وفکر کرتے چلے جائیں گے۔(**یتفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض**) اوراس کے بعداس نتیجے پہ پہنچیں گے کہ (**ربنا ما خلقتا ھٰذا باطلًا**) اے ہمارے نشوونما دینے والے یہ حقیقت ہے ہم اپنی ذاتی تحقیق کے بعداس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ تو نے اس کارگہٗ کائنات کو باطل پیدانہیں کیا۔یہ وہ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ اس کائنات پہ تحقیق وتفتیش وانکشافات کے بعداس نتیجے پہ پہنچیں اعلان کریں کہ تو نے خدایا اس کائنات کو باطل پیدانہیں کیا یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔یہ تھی قرآن کی تعلیم اور یہ تھے وہ لوگ جن کو اس نے علماء کہا تھا۔انہی کو اس نے مومن کہا ہے متقی کہا ہے۔یہاں بھی تو یہی کہا ہے۔(**ان فی اختلاف الیل و النھار و ما خلق اللہ فی السمٰوٰت و الارض لاٰیٰت لقوم یتقون**) (10:6)۔

اب آ جایئے آغاز پہ اس کتاب کے پہلا ورق الٹ کے۔(**ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ ھدًی للمتقین**) (2:2) پ نے غور فرمایا کہ یہ کون ہیں جن کے سامنے یہ راستے کی کشاد کرتی چلی جاتی ہے۔جو ہمارے راستے میں جدوجہد سے کام لیتے ہیں ان کے سامنے ہم بہت سے راستے کھولتے چلے جاتے ہیں۔(**لاٰیٰت لتقوم یتقون**) (10:6)۔اقدارِ خداوندی یا قوانینِ خداوندی جو ہیں ان کی نگہداشت کرنے والے۔متقی کی تو قرآن نے Definition مختلف مقامات پہ کی ہے۔تقویٰ کے تو معنی ہی ہیں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والے۔قوانینِ خداوندی کے دو شعبے قرآن نے گنا دیے کہ ایک کا تعلق عالمِ محسوس سے خارجی کائنات سے ہے اور دوسرے کا تعلق خود انسانوں کی اپنی زندگی سے ہے۔یہ وہ گوشہ ہے کہ جہاں وحی کی راہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔اوراس وحی کی راہنمائی کا محاصل جو ہے نقطۂ ماسکہ جو ہے وہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل یا زندگی کا تسلسل' آخرت پر ایمان۔کائنات کی ان تمام چیزوں پہ غور وفکر' کائناتی قوتوں کو مسخر کرنا اگلا حصہ اس کا یہ ہے کہ انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرنا۔اور کہا یہ کہ یہ وہ لوگ کرسکیں گے کہ جن کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہوگا آخرت کی زندگی پر ان کا یقین ہوگا۔پھر وہ ان قوتوں کو انسانیت کی تباہی کے لیے استعمال نہیں کریں گے' وہ استحصال کے لیے Exploitation کے لیے غصب کے لیے سلب ونہب کے لیے انہیں استعمال نہیں کریں گے بلکہ وہ انسانیت کی بہبود کے لیے ان کی سطح کو بلند کرنے کے لیے ان کی منفعت کے لیے وہ ان چیزوں کو ان مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔لیکن یہ وہ کریں گے جو اس چیز پہ ایمان رکھیں گے۔اب دیکھئے تین کیٹگریز یہی ہوگئیں: ایک تو وہ ہیں جنہیں تقویٰ شعار کہا کائنات کی قوتوں پہ غور وفکر کے بعد ان کو مسخر کرنا اور انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق

استعمال کرنا۔ یہ ہوگئے ایک گروہ جنہیں متقین کا کہا مؤمنین کا کہا۔

کہا(**ان الـذیـن لا یرجون لقآء نا و رضوا بالحیٰوۃ الدنیا و اطمانوا بھا**) (10:7)ان کے برعکس وہ لوگ ہیں کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ نہیں زندگی انسان کی بھی یہی Physical Life (طبعی زندگی) اسی دنیا کی زندگی ہے۔ وہ آخرت کے منکر ہیں۔ آخرت کے منکر کے معنی ہوتا ہے قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار کرنے والا۔ یہ چیز کہ جو کچھ انسان کرتا ہے یہاں کی سوسائٹی کے قوانین کے مطابق ہو تو ٹھیک ہے خلاف ہو سوسائٹی کا گرفت کر لیتی ہے یہاں کچھ سزا مل جاتی ہے۔ اور جو اعمال جو ارادے ان کی گرفت میں نہیں آتے ان کو کوئی پوچھتا نہیں مرنے کے ساتھ انسان ختم ہو جاتا ہے۔ آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ سوسائٹی کیا کہتی ہے وہ گرفت میں لیتی ہے مواخذہ کرتی ہے یا نہیں۔ میرے ہر عمل بلکہ میرے ہر ارادے اور ہر نیت کا بھی ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے جو مجھے بھگتنا ہے۔ اس زندگی میں وہ بھگت جاؤں یا اس کے بعد کی زندگی میں میرے سامنے آئے اسے حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک وہ لوگ ہیں کہ کائنات کی ان قوتوں کو تو مسخر کر لیتے ہیں لیکن وہ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ اسی حیاتِ دنیا کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں(**و اطمانوا بھا**) (10:7)اور مطمئن ہوتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے جس روش پہ ہم جا رہے ہیں۔ یہ دوسرا گروہ ہوا کہ فطرت کی قوتوں پہ تو غور و فکر کیا انہیں مسخر بھی کیا لیکن اس گوشے کے اوپر ان کا ایمان آخرت پہ نہیں تھا۔ دو آ گئیں کیٹگری: پہلی کیٹگری فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا ایمان بالآخرت بھی رکھا یہ تو ہوئے مومن اور متقی۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا اور یہ ایمان بالآخرت اور اقدار پہ ایمان نہ ہوا حیاتِ دنیا کے لیے ان کو صرف کیا یہ آ گئے مغرب کے Materialist جسے آپ کہتے ہیں۔ اور تیسری کیٹگری ہے

(**و الذین ھم عن اٰیٰتنا غٰفلون**) (10:7) وہ لوگ کہ جو نہ ان قوانین پہ غور و فکر کرتے ہیں نہ ان قوتوں کو مسخر کرتے ہیں۔ ان میں کون شامل ہیں؟ ہماری بات ہو رہی ہے یہ۔ سوئی تک کے لیے محتاج' کن کے محتاج؟ انہیں دہریوں کے۔ یعنی کھڑے ہوئے ہیں صبح شام برسرِ منبر انہیں گالیاں دے رہے ہیں ان کا ایجاد کردہ لاؤڈ سپیکر سامنے ہے' ان کی ایجاد کردہ بجلی کے زور پہ چل رہا ہے۔ اس میں نقص واقع ہو جائے واعظ کا گلا بیٹھ جاتا ہے غریب کا' تمہید کے ذرائع ہی مسدود ہو جاتے ہیں۔ گالیاں بھی دے رہا ہے استعمال بھی کر رہا ہے۔ آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! دو آیتوں کے اندر کہہ کیا گیا ہے قرآن۔ ایک متقین کی کیٹگری کہ قوانین فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت ساتھ رکھتا ہے۔ یہ تو الگ ہو گئے۔ اور دو کیٹگریز الگ ہیں۔ ایک وہ وہ کہ جو ان آیات کے اوپر غور و فکر کرتا ہے قوانینِ خداوندی پہ غور و فکر کرتی ہیں یہ قومیں' یہ ان قوتوں کو مسخر بھی کرتی ہیں۔ لیکن اقدارِ خداوندی کے اوپر ایمان نہیں رکھتی ہیں۔ اور ایک وہ ہیں کہ جو ان قوانین ان فطرت کی قوتوں سے بالکل بے خبر رہتے ہیں مذہب پرست دنیا۔ ان دو کے متعلق کہا کہ (**اولئک ماوٰھم النار بما کانوا یکسبون**) (10:8) دونوں جہنم میں جانے والے۔ اُنہوں نے قوتیں مسخر کیں غلط استعمال کیا' اِنہوں نے قوتیں مسخر ہی نہیں کیں یہ تو آدمی کی سطح پہ بھی نہ

آئے انسانیت کی سطح تو بڑی اونچی ہوتی ہے۔اس لیے کہ (**و علم اٰدم الاسمآء کلھا**) اشیائے کائنات کا علم آدمی کو ودیعت کر کے دے دیا گیا تھا۔تو جو اشیائے کائنات کا علم ہی حاصل نہیں کرتا تو وہ تو آدمی کی سطح پہ بھی نہیں آتا۔انسانیت کی سطح تو وہ ہے جسے آپ مومن کی سطح کہتے ہیں ۔یہ انسانیت کی سطح پہ کیا آئے گا جو سطح آدمیت پہ بھی نہیں آیا۔وہ کہتا ہے (**اولئک کالانعام**) حیوان کی سطح ہے۔وہ قوتیں تو مسخر نہیں کرتا۔کہا کہ نہیں (**بل ھم اضل**) ان سے بدتر ہے وہ اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق تو زندگی بسر کرتے ہیں۔تو یہ کیٹگری ہے (**و الذین ھم عن اٰیٰتنا غٰفلون**) (10:7) اب دیکھئے میں ان آیات کا ترجمہ یہی کیے چلا جا رہا ہوں اس لیے کہ یہاں تو خود قرآن نے یہ کہا ہے (**یفصل الاٰیٰت لقوم یعلمون**) (10:5)۔یہ آیات قوانینِ فطرت نہیں ہیں تو اور کونسی آیات ہیں یہ۔اور یہاں جو کہا ہے (**ھم عن اٰیٰتنا غٰفلون**) اسی Context میں کہتا چلا جا رہا ہے۔یہی تو آیات ہیں قوانینِ فطرت کہ جن سے یہ غافل ہیں جن سے یہ بے خبر ہیں۔یہ تیسری کیٹگری ہے۔لہٰذا مغرب کے سائنٹسٹ کہ جنہوں نے قوانینِ فطرت کو؟؟؟؟ کی رو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر بھی کر لیا لیکن اقدارِ سماوی کے تابع ان کو نہ رکھا۔ کیفیت ان کی (**ماوٰھم النار**) ۔پھر وہی اقبالؒ کے انداز' اس جہنم کو اقبالؒ کیسے بتاتا ہے۔ہے نا ہمارے ہاں بھی کہ قبر میں بچھو ہونگے اور سانپ ہونگے اور سب کچھ ہوگا۔عقل کی رو سے جو قوتوں کو دریافت کیا ان کو وحی کے تابع نہ رکھا۔نتیجہ اس کا یہ کہ

عشق نا پید و خرد می ؟؟ صورتِ ما

ساری دنیا میں پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا' زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا'۔لیکن عزیزانِ من! بہرحال فطرت کی قوتیں تو مسخر کر کے اس دنیا کی زندگی میں ہی سہی وہ تو کچھ خوشحالی میں بسر کر لی۔یہ جو کیٹگری (**و الذین ھم عن اٰیٰتنا غٰفلون**) (10:7) کہ جو ان قوانین سے بالکل بے خبر ہی رہے انہوں نے اس کے متعلق کبھی صفحہ ہی نہیں الٹ کے دیکھا یہ تو ان سے بھی بدتر رہے۔یہ بھی جہنم کے اندر۔(**اولئک ماوٰھم النار بما کانوا یکسبون**) (10:8)۔اور اِن کے برعکس (**ان الذین اٰمنوا و عملوا الصٰلحٰت**) (10:9) جو خدا کی آیات پر ایمان لائے۔اب یہ دونوں قسم کی آیات آ گئیں اس کے اندر۔فطرت کے قوانین وہ آیات' انسانی زندگی کے متعلق وحی کی دی ہوئی اقدار یہ آیات۔جو ان پہ ایمان لانے والے اور **عملوا الصٰلحٰت** ایسے پھر کام کرنے والے جو ان کی صلاحیتوں کو زیادہ برومند اور بیدار کرتے چلے جاتے ہیں۔یہ ہوتے ہیں عملِ صالحات۔آپ کی دنیا میں آپ کو پتہ ہے صالحین کن کو کہتے ہیں۔ (**یھدیھم ربھم بایمانھم**) (10:9) کہا جاتا ہے نا کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ان کے ایمان کی اس یقین کی بناء پہ جو ان کو ان چیزوں کے اوپر ہے ان کے سامنے کشادگی کی راہیں کھولتا چلا جاتا ہے۔کتنے راستے ہیں زندگی کے جو اس ایمان کی وجہ سے کھلتے چلے جاتے ہیں۔اقبالؒ کے کلام کو اس انداز سے آپ پڑھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ ان چیزوں کی ہی تصحیح کرتا چلا جاتا ہے۔

؟؟ فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیر ہے

(**یھدیھم ربھم بایمانھم**) (10:9)۔ہوتا کیا ہے؟ ان کے معاشرے کی کیفیت یہ ہے کہ (**تجری من تحتھم الانھٰر فی جنّٰت النعیم**) (10:9) شادابیاں سیرابیاں سرفرازیاں ثمرباریاں ان کے معاشرے کے ان کے ہاتھوں لگائے ہوئے درخت پھلوں سے جھکے پڑتے ہیں۔؟؟؟ قرآن نے کہا تھا سدا بہار سارا سال پھل دیتے چلے جائیں' خزاں نا آشنا۔ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔جب وہ یہ معاشرہ قائم کرتے ہیں فطرت کی قوتوں کو سورج کی کرنوں کو مسخر کیا اور پھر زندگی کی شبِ تاریک کو سحر کیا اس کو۔جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کے بعد وہ جو خدا کے متعلق پہلا یقین کہ کائنات کو باطل پیدا کیا قابلِ نفرت پیدا کیا۔کہتے ہیں یہ سب کچھ عملاً کرنے کے بعد اس کے نتائج ان کے سامنے آتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ (**دعوٰھم فیھا**) (10:10) ان کی پکار اس کے اندر ہوتی ہے کہ (**سبحٰنک اللھم**) (10:10) اے پروردگار تو اس سے بڑا دور ہے جو اس قسم کی کائنات پیدا کرے جیسا یہ لوگ کہتے ہیں۔(**سبحٰنک اللھم**) تردید کر دی ان تمام عقائد کی جو اس زمانے کے مذہب میں پھیلے ہوئے تھے ان تمام فکری تصورات کی جو عالمِ؟؟ کے اندر اس زمانے کے اندر عام تھے۔کہا کہ نہیں! تیرے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (**سبحٰنک**) دور ہے تو ان چیزوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔'جو یہ لوگ کہتے ہیں' میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے (**سبحٰن اللہ تعالیٰ عما یصفون**) یہ لوگ جو اپنے ذہن سے خدا کی صفات بیان کرتے ہیں تصور دیتے ہیں خدا کا کہ وہ ایسا ہے وہ اس سے بہت دور ہے۔

ہمیشہ سرسبز و شاداب رہنے والا معاشرہ۔اس میں ان دونوں کے امتزاج سے کائنات کی قوتیں اقدارِ خداوندی کے تابع رکھنے سے۔ وہ چیز جسے قرآن نے کہا ہے کہ یاد رکھو خدا الٰہ السمآء بھی ہے الہ الارض بھی ہے۔سما اور ارض کے اس امتزاج سے جو معاشرہ وجود میں آیا تو اس کے نتائج کو دیکھ کے بے اختیار پکار اٹھے۔؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

(**و تحیتھم فیھا سلٰم**) (10:10) ایک دوسرے کے ساتھ ان کا جو باہمی تعلق ہے۔دو لفظ ہیں اس میں **تحیتھم** دوسرا ہے **سلٰم** ۔ویسے تو تحی جو ہے تحفہ کو کہتے ہیں اس کے بعد عام طور پہ Greetings کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے' یہ ہمارے تصورات ہیں۔عربوں سے پوچھئے کہ کہاں سے وہ لیتے تھے۔مادہ تو اس حیات ہے نا۔تحی کے معنی ہوتا ہے دوسرے کو جاں بخش تحائف دینا جس سے ان کی زندگی بڑھے۔عجیب قوم تھی یہ عزیزانِ من! ہم انہیں عہدِ جاہلیہ والے کہتے تھے۔یاد رکھئے عہدِ جہالت نہیں ہے وہ' جاہلیہ اور جہالت میں بڑا فرق ہے۔جاہلیہ کے معنی ہیں اقدارِ سماوی سے جو ناواقف تھے۔یہ قوم اسے جہالت کی قوم کہتے ہو؟ جو Greetings کے لیے لفظ اس کے ہاں آتا ہے بڑی وسیع زبان آپ لے آئے نا انگریزی' Welcom ہی اس کے ہاں ہے نا صرف' کیا ہے اس کے اندر۔یہ ان پڑھ قوم وہ جو اپنے ہاں سلام کے لیے یا Greetings کے لیے استعمال کر رہی ہے **تحیتھم** زندگی بخش آرزو۔کیا کہا **سلٰم** میری طرف سے

امن اور سلامتی تیرے لیے میں تو تیری زندگی کا خواہاں ہوں میری طرف سے خطرہ کیا بھائی۔ خدا کے متعلق یہ تصور کہ جو کچھ عالمِ انسانیت میں؟؟ فکر کی دنیا نے تیرے متعلق تصور دیا تھا اے ہمارے نشو ونما دینے والے تو اس سے بڑا بلند ہے بڑا غلط تھا وہ تصور۔ باہمی انسانوں کے متعلق ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کی کیفیت یہ کہ ان کا ملنا ایک دوسرے سے اس بات کے لیے اس مقصد کے لیے کہ وہ **سلٰم سلٰم** جو قرآن میں ہے ہر طرف سے آواز آئے گی سلامتی سلامتی' کوئی خطرہ نہیں۔ **تحیتھم** حیات بخش آرزوئیں اور ان کے ساتھ سلامتی۔ کہتے ہیں یہ ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کے تابع رکھنے سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں خدا کا تو یہ تصور قائم ہوتا ہے اور باہمی انسانیت کا تصور ایک دوسرے کے ساتھ یہ قائم ہوتے ہیں۔ اور ان تمام کا محاصل کیا ہوتا ہے کہ دنیا پکار اٹھتی ہے (**و اٰخر دعوٰھم**) (10:10) ان کی اس دعوت کا محاصل انجام مآل یہ ہوتا ہے آخری' دنیا پکار اٹھتی ہے (**ان الحمدلله رب العلمین**) (10:10) بھئی ان کا بتایا ہوا خدا فی الواقعی تمام حمد وستائش کا مستحق ہے۔ کیونکہ یہ تو ساری کائنات کی ربوبیت کر رہا ہے اس کو کہیں تخریب کے لیے تو نہیں اس نے پیدا کر دیا ناحق تو نہیں پیدا کیا اس نے قابل نفرت تو نہیں پیدا کیا اس نے۔ کس چیز کو دیکھ کے یہ دنیا پکار اٹھے گی کہ واقعی حمد وستائش کا مالک ہے۔ اس معاشرے کو دیکھ کے جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ زندگی رقص کر رہی ہوگی مسرتیں ناچ رہی ہونگی اس میں' ایک انسان دوسرے انسان سے ملے گا حیات اور سلامتی کا پیام لیتے ہوئے ملے گا وہاں۔ اس میں (**و اٰخر دعوٰھم ان الحمدلله رب العلٰمین**) (10:10) ان کی اس دعوت اور پکار کا انجامِ مآل یہ ہوگا کہ وہ جہاں سے بات شروع کی تھی قرآن نے اپنی (**الحمد لله رب العلٰمین**) دنیا پکار اٹھے گی کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے تصور کا دیا ہوا خدا واقعی ہر قسم کی حمد وستائش کا وہی مستحق ہے۔ اس لیے کہ وہ ربوبیتِ عالمینی کیے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ غور فرمایا عزیزانِ من! قرآنِ کریم کس زمانے میں یہ باتیں کہہ رہا ہے۔ آپ نے غور فرمایا ایمان کسے کہتے ہیں تقویٰ کیا ہوتا ہے علم کسے کہتے ہیں علماء کی Definition اس نے کیا دی ہے۔ تو پھر اس کے بعد جو اس نے کہا ہے کہ وہ جو پھر ہمارے قوانین کے ذریعے سے قوت حاصل کر کے اسے غلط استعمال کرتے ہیں وہ بھی اور وہ جو ان قوانینِ فطرت سے غافل رہتے ہیں وہ بھی دونوں جہنم میں جائیں گے۔ کس قدر صحیح بات اس نے کہی ہے۔ وہ اس قسم کی جہنم میں' ہم اس سے ذلیل قسم کی جہنم میں ہیں۔ یعنی اندازہ لگائیے کبھی سوچتا نہیں کھڑا ہو کے' مذہب تو پہلے فکر کے دروازے بند کر دیتا ہے نا۔ یہ وہ قومیں ہیں کہ جن کو رات کوستے رہتے ہیں مغرب زدہ فرنگ زدہ ملحد دہریے سارا کچھ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! دہریہ بے دین انسانیت کی سطح سے گرا ہوا اور اس کے بعد عزیزانِ من! ان کے دروازے پہ جھولی پھیلا کے جو روٹی مانگنے والا ہے وہ کس جہنم میں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جہنم کے دروازے کا جو داروغہ ہے قرآن نے اس کے لیے مالک کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو کسی اور کی ملکیت ہے جہنم وہ ہے کہ جس میں انسان دوسرے انسان کی ملکیت میں ہوتا ہے۔ اور یہ محکوم قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے۔ اور پھر وہ نظری اعتبار سے بھی ان کے مستعار لیے ہوئے نظریات کے پیچھے چلنے والی۔ 'جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر'

اقبالؒ کہتا ہے۔روٹی کے لیے بھی محتاج نظریات کے لیے بھی محتاج' ہر چیز مستعار اور مانگی ہوئی۔اوران کی مانگی ہوئی جن کو صبح شام گالیاں دیتے ہیں۔اس سے بڑا جہنم اس سے بڑی ذلت بھی کوئی ہوسکتی ہے۔اسی لیے تو اس نے ماتھا پیٹ لیا تھا اقبالؒ نے یہ وعظ سننے کے بعد کہ میں کیا بتاؤں اسے اس سے زیادہ بدبخت بھی کوئی اور ہوسکتا ہے کہ 'جہنم بمقامِ دیگراں گفت' جہنم کے اندر کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ جہنم والے اور ہیں کوئی۔کہنے لگا اس کی میں بات کیا سن کے آؤں۔کیا عجیب ہے۔سوال پیدا ہوا کہ جی اگر یہ ایسے ہی ہیں وہ جیسے بتایا گیا ہے یہ جہنم میں جانے والے ہیں تو صاحب وہ تو بڑے خوشحال رہتے ہیں بڑے مرفع البال رہتے ہیں۔آپ اتنا کھاتے ہیں کہ ان کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں ہمارے جیسی قوموں کے کام آتی ہیں۔پھر وہ ایسے خوشحال کیوں۔کہا ٹھیک ہے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے۔قانونِ مکافاتِ عمل کی ایک چیز تمہارے سامنے نہیں ہے۔(**و لو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر**) (10:11)

کہنے لگے یہ ٹھیک ہے تم چاہتے یہ ہونا کہ ادھر کسی نے غلط قدم اٹھایا اور اس کا ہم نے ٹینٹوا دبا دیا ختم کر دیا۔تم یہ چاہتے ہونا کہ ایسے ہونا چاہیے مکافاتِ عمل کی صورت یہ ہو۔؟؟ نے یہ کہا ہے کہ جس طرح انسان اپنے لیے اپنے نفع کے لیے اپنی منفعت کے لیے جلدی مچاتا ہے یہ بھی سمیٹ لوں وہ بھی سمیٹ لوں۔اگر اس کے مکافاتِ عمل کے نتیجے میں بھی ایسی ہی عجلت سے اور جلدی سے کام لیتے تو یہ ساری کائنات کا معاملہ مدتوں ہی ٹھپ ہو چکا ہوتا۔اگر تمہارے معیار کے مطابق یہ کچھ ہوتا۔کہا کہ قانونِ مکافاتِ عمل میں ایک چیز رکھی گئی ہے اور وہ ہے انسان کا غلط روش کو چھوڑ کے صحیح روش کی طرف آ جانے کا امکان۔ہوسکتا ہے کہ یہ جب اس کی تباہی کے آثار کو دیکھے یا ذرا آگے بڑھے غلط روش کے اوپر تو اسے محسوس ہو جائے کہ روش غلط ہے تو اس کا امکان ہونا چاہیے کہ وہ صحیح روش کی طرف آ جائے۔تو ہم نے اس سے کوئی انتقام نہیں لینا۔انتقام لینے والا تو اس موقعہ کی تلاش میں رہتا ہے نا ذرا کسی کا قدم غلط اٹھا اور اس نے فوراً جھپٹ لیا کہ بس اب قابو آیا یہ۔کہا سوال یہ نہیں ہے کہ ہم نے انتقام لینا ہے۔ہمارا مقصد تو بچانا ہے انسانیت کو۔غلط روش کی طرف چلتے ہیں اتنی عجلت سے ان کو ہم پکڑ نہیں لیتے۔بیج کے بونے میں اور اس کے پھل لانے میں ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔پہلی کونپلیں جب نکلتی ہیں زمین سے اگر اسی وقت دیکھ لے کسان کہ غلط بیج بویا ہے تو کہا اس وقت ابھی وقت ہوتا ہے کہ وہ صحیح بیج بو لے۔پھر اس کی محنت بھی بچ جاتی ہے اور آخرالامر وہ اس کو جس تباہی سے سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے بھی وہ بچ جاتا ہے وہ فوراً دوسرا بیج بو سکتا ہے۔اور اگر یہ مہلت کا وقفہ ہی درمیان میں نہ ہو تو انسان تو اتنا جلد باز واقع ہوا ہے تو پھر تو کوئی انسان بچ ہی نہیں سکتا۔اسی لیے ہم نے یہ مہلت کا وقفہ رکھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ باز آ جائے۔آپ دیکھئے گا وہ آیت جس میں کہا ہے کہ خدا نے اپنے اوپر رحمت کو فرض واجب قرار دے رکھا ہے۔(**کتب علٰی نفسہ رحمۃ**) بڑی عظیم آیت ہے۔رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے اس نے۔اور معلوم ہے کہ پھر یہ رحمت کیا ہے۔اس آیت کے یہ پہلے چار لفظ ہیں اگلے لفظ ہیں کہ تاکہ جو لوگ غلط روش پر چلنے کے بعد محسوس کر لیں کہ یہ روش غلط ہے۔ان کے لیے باز آفرینی کا امکان جو ہے یہ ہے خدا نے جو اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔یوں ہے وہ رحیم۔غلط روش کے بعد باز آفرینی کے

امکان کے لیے مہلت کا وقفہ۔ یہ ہے رحمت اس کی اور یہ بڑی چیز ہے۔ بیماریوں سے علاج آپ کے ہوتے ہیں اسی وقفے کی بناء پہ ہوتے ہیں نا کہ بیماری اور موت میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ ورنہ اگر یہ ہونے لگ جائے کہ جونہی آپ نے زیادہ ٹھنڈا پیا اور گلے میں ہوئی خراش اور آخری سانس آئی اور آپ ختم ۔ وقفہ ہوتا ہے مہلت کا ' رحمت سے تعبیر کیا ہے اس نے ۔ ؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

اور وہ اپنے متعلق یہی مذہب کا تصور کہ جی دیکھئے نا یہاں بڑے دین دار ہیں لوگ نمازیں پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں یہ سب کچھ ہے اس کے باوجود یہ دیکھئے کتنی تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں غریبی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یعنی نیک لوگ اس دنیا میں تنگی کی بسر کرتے ہیں وہ لوگ جو بد ہیں وہ بڑے خوشحال ہیں۔ آپ نے ان آیات میں عزیزانِ من! کہیں بھی یہ نماز روزے کا ذکر دیکھا ہے۔ وہ تو کہہ یہ رہا ہے کہ یہ جو کائنات کے اندر قوانینِ فطرت ہیں اور فطرت کی قوتیں ہیں ان کو مسخر کرنا ہے ان کو مسخر کرنے کے بعد آگے ان کے استعمال کا سوال آتا ہے۔ مسخر کرنے کے بعد قوانینِ خداوندی کے تابع ان کو استعمال کرو تو زندگی یہ بھی خوشحال آنے والی زندگی بھی خوشحال۔ ان کو اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرو تو یہ زندگی بہر حال خوشحال۔ اور ان کو تم نہیں؟؟؟؟؟؟ تو یہاں بھی ماند وہاں بھی ماند۔ وہ تو پہلے کیٹگری بنا دی اس نے۔ تم اپنے ہی معیار کے مطابق رزق کی تقسیم کرنے لگ جاؤ کہ صاحب وہ دیکھئے نا کتنے خوشحال ہیں اور یہاں دیکھئے نیک آدمی اللہ کے بندے وہ تو ان کو متقی کہہ رہا ہے۔ وہ جنہیں ہم جس طرح سوچتے ہیں ان کے لیے بھی خدا کی رحمت ہے۔ اور وہ رحمت یہ ہے مہلت کا وقفہ جو درمیان میں دے رکھا ہے۔(**فنذر الذین لا یرجون لقآء نا فی طغیانھم یعمھون**) **(10:11)**

ٹھیک ہے راستہ بھولا ہوا ہے۔ **عمیون** اور **عمھون** میں بڑا فرق ہوتا ہے ان کے ہاں۔ وہ تو اندھا ہوتا ہے اور یہ صحرا میں راہ گم کردہ آنکھوں والا ہوتا ہے۔ کوئی بات نہیں صحرا میں راستہ گم کر گیا ہے' آنکھیں ہیں دیکھ سکتا ہے۔ اگر پہلے ہی قدم کے اوپر ہم اس کا ٹینٹوا دبا دیں تو صحیح راستے پہ کیسے آئے گا۔ کشورِ خرام پھر رہا ہے سرگرداں پھر رہا ہے تلاشِ حقیقت کا اس میں جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور آنکھیں ہیں اس لیے اس کا امکان ہے کہ صحیح راستے پہ آ جائے۔ یہ وجہ ہے جو اتنا وقت تم دیکھتے ہو کہ ان کو اتنا وقت لگ جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے ہاں کا قانونِ مکافاتِ عمل میں مہلت کا جو وقفہ ہم نے رکھا ہے۔ لیکن ہوتا یہاں یہ ہے کہ (**و اذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہٖ او قاعدًا او قآئمًا**) **(10:12)** مصیبت میں جب یہ پھنستا ہے تو اس کی اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ کھڑے بیٹھے لیٹے یا اللہ یا اللہ ہو رہا ہے صاحب گڑ گڑا رہا ہے۔ وہ خدا تو ایک طرف رہا وہ بڑے بڑے مٹی اور پتھر کے سومے جو ہیں ان کے اوپر جا کے یہ؟؟ کر رہا ہے۔ مصیبت میں جو پھنسا ہوا ہو اس کی کیفیت دیکھی جو کہہ رہا ہے (**دعانا لجنبہ او قاعدًا او قآئمًا**) کھڑا بیٹھا لیٹا اس کی کیفیت یہ ہے یا اللہ یا اللہ ہو رہی ہے۔ یہ سارا کچھ ہے۔(**فلما کشفنا عنہ ضرہ**) **(10:12)** مصیبت رفع ہو جاتی ہے۔(**مر کان لم یدعنا الٰی ضر مسہ**) **(10:12)** تو اس کے بعد یوں نکل جاتا ہے

جیسے کبھی خدا کو یاد ہی نہیں کیا تھا اس نے تھا ہی نہیں وہ۔ جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے نا تو پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ جب ہوا نا تو میں نے صاحب اس کے لیے ایسی تدبیر کی ایسی سکیم لڑی ایک ایسی چال چلی اس کے لیے' یہ کیا صاحب اور وہ ایسے ہو گیا۔ یہی جو اس کی عجلت پسندی انسان کی ہے نا کہتا ہے یہ تو یوں پھرتا رہتا ہے اس کی تو یہ کیفیت ہے۔ لیکن ایمان رکھنے والا جو ہے وہ یہ نہیں کرتا۔ وہ تو پوری زندگی ایک؟؟ سے گذارتا ہے صحیح راستے پہ چلا جا رہا ہے اس کے قوانین کی صداقتوں پہ یقین ہے (**ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا**) استقامت رکھے ہوئے۔ کرتا وہ کیا ہے۔ یہاں اس کی کوشش کے نتائج حسبِ حال نہیں نکلتے یہاں وہ خدا کو کوسنے نہیں لگ جاتا۔ وہ وہاں کھڑا ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے اس کی تعلیم کے سمجھنے میں کہیں غلطی کی ہے اس کو Apply کرنے میں کہیں غلطی میں نے کی ہے۔ پھر سے Repeat کرتا ہے اپنے تجربے کو۔ اس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی جو ابھی یہ کہا گیا ہے بھاگ رہا ہے دوڑ رہا ہے اور اس کے بعد خدا فراموشی ہو جاتی ہے۔ استقامت ایمان کی شرط ہے۔ کسی تجربے کا نتیجہ حسبِ حال نہیں نکلتا تو کھڑے ہو کے سوچتا ہے اور پھر دوبارہ اس کو Repeat کرتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہے کہ قانون وہ بالکل برحق ہے جس کے مطابق میں یہ کر رہا ہوں یہ اس میں کہیں غلط نہیں ہے کہ یہ نتیجہ اس کے مطابق برآمد نہیں ہوا' میری کہیں غلطی ہوئی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جو آیاتِ خداوندی یعنی قوانینِ فطرت کا علم رکھنے والے ہیں ان کی کیفیت کیا ہے۔ نہ زمین پہ نہ آسمان پہ جسے کہتے ہیں فضا میں معلق کھڑے ہیں صاحب یہ' دو مہینے وہاں گذاریں گے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق۔ وہاں سے شکایت ہو رہی ہے کہ تکلیف ہو گئی ہے اس دفعہ' کام نہیں چل رہا یا جو پہلا وہ سکائی لیب تھا کہ اس کے اندر حرارت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ یہاں یہ نہیں کہتے کہ نہیں صاحب اس کائنات میں یہاں کوئی اور قانون ہے وہاں کوئی اور قانون ہے گھپلا ہی مچ رہا ہے صاحب یہ کیا کیا جائے۔ بالکل نہیں۔ وہ اپنے لیبارٹری میں سوچنے بیٹھ جاتے ہیں کہ کہیں غلطی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے کہا ٹھیک ہے ہوئی ہے؟؟ میں یہ غلطی ہوئی تھی پیچھے سے دو آدمی اور بھیج دیتے ہیں وہ جا کے ٹھیک کر آتے ہیں۔ یہاں ان کو تکلیف ہوئی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ تین چار دن تک انتظار کرو۔ یوں کرو یہ نہیں یہ کرو' وہاں یہ غلطی ہو گئی ہے یہ کر کے دیکھو' ایسا نہیں ہو گا تو دو آدمی ہم اور بھیج رہے ہیں وہ کچھ کریں گے۔ یوں بھی نہیں ہو گا تو کوئی بات نہیں واپس لوٹائیں گے اور ہم دیکھیں گے کہاں کہاں غلطی رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ ہونا نہیں چاہیے یہ اس خدا کا قانون ہے جس نے کہا ہے (**ولن تجد لسنة الله تبديلًا**) ہمارے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ اسے ایمان کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ نہیں صاحب قانون ہی غلط ہے۔ کہا یہ ہے کہ (**ربنا ظلمنا انفسنا**) ہم نے غلطی کی ہے۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں (**ومن اتبع هدای فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون**) پھر سوچو ہماری رہنمائی کا پھر تم اتباع کرو گے پھر وہی تمہارا نتیجہ نکل آئے گا جو تم نکالنا چاہتے تھے نتیجہ۔ کیفیت انسان کی یہ ہے کہ مصیبت پڑتی ہے تو یہ کیفیت ہو جاتی ہے مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر کہاں کا خدا کہاں کا اس کا قانون پھر وہی اپنی من مانی۔ (**كذٰلك زين للمسرفين ما كانوا يعملون**) (10:12) یہ ایک؟؟ سی چیز آتی ہے قرآن میں اور بڑی اہم ہے وہ۔ عام

طور پہ یہ وہاں آتی ہے جہاں پھر تباہیاں آ جاتی ہیں انسان کے اوپر۔ایک تو کیفیت یہ ہے کہ برائی ہو اور اسے برائی سمجھے' برائی بھلائی بن کے نہ دکھائی دے۔یہ وہاں ہوتا ہے کہ جہاں عام معاشرہ تو بھلائی پہ چل رہا ہو کوئی ایک فرد اس کے اندر غلط اقدام اٹھائے۔معاشرہ بھی اس کو ٹوکتا ہے ملامت بھی وہ کرتا ہے اس کے بعد پھر اس کو یہ ندامت بھی ہوتی ہے کہ نہیں میں ہی غلط ہوں۔اور یہ اب سارا معاشرہ ہی غلط رو ہو جائے تو اس کے بعد پھر ہوتا کیا ہے؟ پھر ہوتا یہ ہے کہ صاحب یہ اس نے اتنی چار سو بیس کی ہے اور اس نے اس میں اتنا کمایا ہے میں اس سے زیادہ دوگنا کرونگا چار گنا زیادہ میں کماؤنگا۔دوڑ یہ شروع ہو جاتی ہے صاحب۔برائی' برائی بن کر دکھائی نہیں دیتی۔قرآن نے کہا ہے کہ جب کسی قوم کو سوئے عمل جو ہیں غلط کام جو ہیں ان کو خوشنما بن کر دکھائی دینے لگیں تو پھر انہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔یہ زین اور زینت کے لفظ کتنے عجیب ہیں۔کتنی کشش اور جاذبیت ہے آپ کے ان غلط کاموں کے اندر جو معاشرے میں ہو رہے ہیں۔وہ اتنی بڑی کشش ہے کہ وہ چھوٹی قوت کا لوہا تو بیچارہ اپنے مقام پہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ٹھہرا بھی ہوتا ہے تو قطب نما کی سوئی کی طرح پھڑ پھڑا ہوتا ہے بیچارہ۔بڑے Solid فولاد کی ضرورت ہے ایسے معاشرے کے اندر اس کشش سے بچنے کے لیے عزیزانِ من!۔اسی لیے تو دعا اس کو سکھائی گئی(؟؟ **ربنا ثبت اقدامنا**) یا اللہ ہمارے قدموں کو جمائے رکھنا کششیں بڑی زبردست ہیں جاذبیتیں بڑے زور کی ہیں مقناطیس بڑے بھاری ہیں۔یہ کہاں ہوتے ہیں؟ جس معاشرے میں برائی' برائی نہ رہے اتنی عام ہو جائے کہ صاحب کسی سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں''سارے ای ایہو کچھ کردے ہیگے نے میں؟؟ رہ گیا ہیگا آں جیہڑا مینوں کینا پیاں ہیگا جا جا کے اوہناں نوں نئیں کیندا ہیگا' میں کی کِتا ہیگا آ میں تے روپئے چارای نیں ناجیہڑے ایں کر کے؟؟ہیگے' اوراتوں رات لکھاں پتی ہو گئے اوہناں نوں نئیں کیندے کچھ' دولت مند ہے ناوڈا ہے نا ایسے واسطے اوہدے خلاف نئیں کہیا جاندا''۔کہیں ندامت نہیں ہوتی کہ وہ بھی غلط کار ہے میں بھی غلط کار ہوں۔یہ ہے وہ مقام یہاں قرآن میں آپ دیکھئے گا بڑے مقامات میں یہ کہا ہے اس نے کہ شیطان اس طرح سے مزین کر کے دکھا دیتا ہے غلط اعمال کو۔(**کذٰلک زین للمسرین ما کانوا یعملون**) (10:12) جو کچھ وہ کر رہے ہوتے ہیں ہے غلط لیکن بڑا خوشنما بن کر دکھائی دیتا ہے۔انہیں مسرفین کہا ہے قرآن نے۔ہمارے ہاں اسراف سمٹا کے یہی آ گیا کہ صاحب فضول خرچی کے معنی میں آ گیا۔چل بھئی۔یہی ہے نا آپ کے ہاں اسراف نہ کرو۔یہاں کہا ہے مسرفین۔آپ نے غور کیا کیا بات چلی آ رہی ہے۔ قوانینِ خداوندی اور قوانینِ فطرت کی رو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا اور انہیں اقدارِ خداوندی کے تابع سرف نہ کرنا۔فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہ کرنا ان قوانینِ کے اوپر غور و فکر ہی نہ کرنا۔قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہ رکھنا' یہ مذہب پرست دنیا کی کیفیت ہے نامصیبت پڑنے کے اوپر دعائیں مانگنا نذریں منتیں نیازیں وغیرہ یہ سب کچھ کر کرا دینا۔اور جب وہ مقصد حاصل ہو جائے اس کے بعد سوال ہی نہیں ہے خدا کا۔برائیوں کا اتنا عام ہو جانا کہ بھلائیاں بن کر دکھائی دینے لگیں مزین بن جائیں۔کہا(**و لقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا**) (10:13) ان سے کہو کہ جب اس سے پہلے بھی اقوام میں یہ کیفیت عام ہو گئی تھی تو پھر وہ قومیں تباہ ہو گئی تھیں۔غور فرمایا آپ نے اقوامِ عالم کی

تباہی کے اسباب قرآن کیا بتا رہا ہے۔ پھر وہ قومیں تباہ ہوئیں۔(و جآء تھم رسلھم بالبینٰت) (10:13) صحیح راستے کی نشاندہی کرنے والے خدا کے پیغامات پہنچانے والے ان کے پاس آئے۔(و ما کانوا لیؤمنوا) (10:13)اس لیے کہ برائی' برائی ان کو نظر ہی نہیں آتی تھی۔اس قسم کے غلط کوش اور غلط کار معاشرے میں کوئی خدا کا بندہ اگر کسی برائی کو برائی کہتا ہے آپ دیکھئے تو سہی اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مذاق نہ بھی اڑائیں اگر جہاں یونہی تھوڑا سا تکلفاً' تو مانتا تو کوئی نہیں ہے اس کی بات کہ ٹھیک ہے میاں ایماندار بن کے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہ دیکھا نا اس نے ایمانداری سے دوکان چلانی شروع کی تھی دیکھ لیجیے وہ بیٹھا ہوا ہے' گھر کی پونجی بھی ختم کر بیٹھا ہے۔کہا خدا کے پیغامبر آئے تھے انہوں نے آ کے کہا تھا کہ غلط روش ہے۔(و ما کانوا لیؤمنوا) (10:13)اس کے بعد ہوا تھا(ولقد اھلکنا القرون) (10:13)۔اب ختمِ نبوت ﷺ کے بعد کیا صورت ہوگی۔رسلھم کہا ہے نا پیغامات لائے تھے نا وہ۔اور اگر پیغام موجود ہو تو وہی مقصد حل ہو گیا۔انہوں نے پیغام ہی لا کے دیا تھا نا۔ پیغام اگر مکمل غیر متبدل محفوظ وہ موجود ہو تو اس کے بعد سوال ہی نہیں کسی رسول یا نبی کے آنے کا۔اب تو وہ بات اس پیغام کے پہنچانے کی رہ جائے گی نا۔ پہنچانے کا فریضہ تو ہر وہ شخص ادا کر سکتا ہے جو اس کے اوپر ایمان رکھتا ہے اور اپنا یہ فریضہ سمجھتا ہے۔یعنی وہ جو پیغام پہنچانے کا فریضہ تھا نا اسی لیے نبی اور رسول دو الگ چیزیں کہی ہیں۔نبوت تو پیغام پانا ہے خدا کے ہاں سے پیغام جسے ملتا ہے' وہ پیغام تو اب نہیں پا سکتا وہ پیغام ختم ہو گیا مکمل ہو گیا وہ ہے جو ختم ہوئی ہے چیز۔اگلی بات پیغام پہنچانا ہے۔ نبی اس میں دونوں چیزیں یہ ہوتی ہیں پیغام خدا سے پاتا ہے پیغام کو پہنچاتا ہے۔ پیغام پانا ختم ہو گیا ختمِ نبوت ﷺ سے کہ جو کتابِ محفوظ و مکمل و غیر متبدل دیدی گئی۔ پیغام پہنچانے کی ذمہ داری جو تھی وہ اس امت کے سپرد کر دی گئی۔تو آپ سوچئے کہ جن کے ذمہ دوسروں تک یہ پیغام پہنچانا تھا وہ خود ہی اس پیغام کو فراموش کر بیٹھے۔اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ یہ دہرا جہنم ان کے لیے ہوگا اس قوم کے لیے۔ان کے جرم اور ان قوموں کے جرائم جو ہیں وہ بھی ان کے ذمہ لگائے جائیں گے کہ تمہارے پیغام نہ پہنچانے کی وجہ سے ان کی یہ کیفیت ہوئی ہے۔ یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔عزیزانِ من! چھوٹی بات نہیں ہوتی کسی کا پیغام لے کے ''میرا سنیا او تھے پہنچا دئیں بھئی' پتہ آیا ہیگا او ہدی بیماری دی خبر آئی ہیگی'' یہ اس کو پڑیا جا کر دیدنا وہ بچ جائے گا ۔آپ ذمہ داری لے لیتے ہیں اس کو پہنچانے کی اور نہیں پہنچاتے۔ٹھیک ہے وہ تو اس نہ پہنچنے کی وجہ سے مر گیا اس کے نہ ہونے کی وجہ سے۔آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے دہرا جرم کیسے یہ عائد ہو گیا۔ دہرا ہی جرم ہے نا جس لیے دہرے عذاب میں ہم مبتلا ہیں۔قرآن نے کہا ہے ہوا ہے دہرا عذاب۔اپنے ہاں بھی ہم ذلیل دوسروں کی نگاہوں کے اندر بھی ذلیل۔ دہرا عذاب ہے عزیزانِ من!۔ان کے ہاتھوں سے ذلیل عزیزانِ من! ۔وہ پھر یاد آیا کرتی ہے مجھے اس پہلوان کی بات۔ پہلے دن جب اس کا شاگرد چلا ہے کشتی لڑنے کے لیے تو اس نے کہا تھا اپنے شاگرد سے' اُس نے کہا کہ استاد جی کوئی نصیحت کر دو' کہنے لگا بیٹا ایک ہی نصیحت ہے دعا یہ مانگنا'' کہ یا اللہ جے میں ڈٹھنا ہیگا اے تے کسے ایسے دے ہتھوں ڈٹھا جنے پہلے وی کسے نوں ڈھایا ہووے' جس پورنے نے پہلی واری مینوں ڈھایا ہووے گا ڈٹھنا تے ہیگا او ہدی کمینگی جیہڑی ہووے گی او قابلِ

برداشت نئیں ہووے۔عزیزانِ من! تسی اوہناں دے ہتھے ڈٹھے ہو جناں نیں دنیا اچ کدی اپنی تاریخ اچ کسے نوں نئیں سی ڈھایا: اسرائیل اور ہندو‘‘۔ یہ جہنم ہے۔کہا سن لیا اقوامِ عالم کے ساتھ کیا ہوا ہے‘ تاریخ آ گئی سامنے تمہارے‘ معلوم ہوا کہ قوموں کے ساتھ کیا ہوا کرتا ہے‘ پہنچ گیا پیغاماتِ خداوندی تم تک۔ یہ کب کہا تھا عزیزانِ من! قرآن نے۔غور سے میری بات سنیے یہاں‘ کب کہا تھا قرآن نے۔قرآن نے اس چیز کو کہا تھا چودہ اگست 1947ء کو‘ کہا تھا(**ثم جعلنکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون**) (10:14)

اب ہم تمہیں ایک مملکت دیتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کیا کرتے ہو۔ چودہ اگست 1947ء کے دن یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ عزیزانِ من! قرآن کو اس طرح سے پڑھا کیجیے۔ یہ چودہ سو سال پہلے آیت نہیں نازل ہوئی تھی۔ دیکھتے ہو کس Context میں یہ آیت آئی ہے کیا چیزیں پیچھے سے چلی آ رہی ہیں۔ملا کے بس کی بات نہیں اس قرآن کو سمجھنا کہ جو کہتا ہے بے ربط ہے۔کس Context میں چلا آ رہا ہے‘ کیا کیا گناتا چلا آ رہا ہے۔اب دیکھا پھر قومیں کیسے تباہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا چودہ اگست کا اعلان کہ اے مسلمانانِ پاکستان سن لو آج(**ثم جعلنکم خلٰئف فی الارض من بعدھم**) (10:14)ان تباہ ہونے والی قوموں کے بعد تمہیں ہم نے اب ایک مملکت دی ہے۔ہم نے سمجھا جشنِ مسرت منانے کے لیے۔اس نے مبہم نہیں رکھا اس بات کو کہ کیوں یہ مملکت ملی ہے۔عزیزانِ من! چار لفظ ہیں(**لننظر کیف تعملون**) (10:14) تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔جنہیں یہ سب کچھ بتا دیا جائے ان کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ مہلت کا وقفہ بھی کچھ یہ لمبا نہیں رکھتا۔ان کے لیے ہی لمبا رکھتا ہے جن کو کچھ بتایا ہوا نا ہو‘ پہلے بتاتا ہے پھر اس کے لیے مہلت کا وقفہ دیتا ہے۔ جنہیں یہ چیز بتا دی گئی ہو ان کے لیے مہلت کا وقفہ بھی لمبا نہیں ہوتا۔(**لننظر کیف تعملون**) (10:14)۔

عجیب آیت پہ آج کا درس ختم ہوتا ہے چودہ اگست 1947ء‘ ہر چودہ اگست کے اوپر ہم جشنِ آزادی مناتے ہیں۔ چودہ اگست تو منگل کو آئے گی بارہ اگست کو اتوار آئے گا ہمارا درس کا دن آئے گا۔اگلا درس کا دن جو ہے اتوار بارہ اگست اسی یومِ آزادی کا نسبت سے اس میں میں نے ایک خصوصی درس اپنا رکھا ہے اور اس کا عنوان میں نے رکھا ہے‘ کیا ہم آزاد ہیں‘ قرآن کی روشنی میں۔آپ کو معلوم ہے میں تو عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیتا میں تو قرآن کا طالبعلم ہوں قرآن کا مبلغ ہوں مجھے تو ہر معاملے کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ٹھیک ہے چودہ اگست کو ہمیں ایک مملکت ملی ہم آزاد بھی ہوئے‘ ٹھیک ہے ہم سیاسی اعتبار سے آزاد بھی ہیں۔ایک اور بھی تو گوشہ ہے دیکھنے کا اور ہمارے لیے تو وہی گوشہ تھا ہمارے لیے تو وہی شمع تھی جس میں ہمیں دیکھنا چاہیے تھا کہ ہم آزاد ہیں یا نہیں ہیں۔وہ کسے آزادی کہتا ہے کیا ہم قرآن کے معیار کے مطابق بھی آزاد ہیں؟۔ مجھے اس آزادی سے انکار نہیں مجھے اس مملکت سے انکار نہیں۔ میں اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لیے جان تک دینے کے لیے بھی تیار ہوں یہ سب کچھ ہے۔ مجھے طالبعلمِ قرآن ہونے کی جہت سے یہ دیکھنا مجھ پہ ضروری ہے کہ کیا قرآن کی رو سے بھی ہم آزاد ہیں۔اور یہ عنوان ہوگا عزیزانِ من! اگلے اتوار کے خصوصی درس کا۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔تیسرا باب(آیات 14 تا 17)

عزیزانِ من!

آج اگست 1973ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی آیت 14 سے ہو رہا ہے۔ (10:14)

سابقہ اتوار آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں خصوصی درس تھا مسلسل نہیں تھا۔

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ (**ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا و جآء تھم رسلھم بالبینٰت و ما کانوا لیؤمنوا کذٰلک نجزی القوم المجرمین**) (10:13) کہ اس سے پیشتر بہت سی قومیں آئیں انہیں تمکن حاصل ہوا مملکت ملی سلطنت ملی حکومت ملی لیکن انہوں نے ظلم کیے۔ایک جامع لفظ۔کہا کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے پیغامبر بھی آئے انہوں نے انہیں بتایا بھی کہ یہ روش غلط ہے اس کا نتیجہ تباہی ہوا کرتا ہے لیکن انہوں نے ان کی بات نہ مانی۔اور اس کے بعد تباہی لازم تھی وہ قومیں تباہ ہوگئیں۔(**کذٰلک نجزی القوم المجرمین**) (10:13) اب یہاں یہ اصول اور کلیہ آ گیا۔پہلے ٹکڑے میں تو صرف یوں تھا جیسے امِ گذشتہ کی سرگذشت بیان ہو رہی ہے کہ وہ قومیں آئیں تمکن حاصل ہوا۔انہوں نے عدل کی جگہ ظلم کرنا شروع کیا استبداد کرنا شروع کیا حقوق میں کمی کرنی شروع کی لوگوں کے۔بتانے والوں نے انہیں بتایا بھی کہ یہ غلط ہے لیکن اس پہ بھی وہ باز نہ آئے۔(**ولقد اھلکنا**) (10:13) وہ قومیں تباہ ہوگئیں۔تو یہ حصہ تو ہوا جیسا ماضی کی کوئی داستانیں ہیں جو ان اقوام کی بیان ہو رہی ہیں اور اس کے بعد ہوا اس کا اصول جس مقصد کے لیے یہ چیز بیان کی گئی کہ (**کذٰلک نجزی القوم المجرمین**) (10:13) بات یہ کوئی پرانی نہیں ہو رہی ان کے قصے نہیں ہم دہرا رہے۔بلکہ ہمارا اصول یہ ہے جو قوم بھی جرائم کی مرتکب ہوتی ہے اس کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔اب یہ ایک اصول آ گیا ایک قانون آ گیا۔آج کی اصطلاح میں اسے قانونِ استبدال واستخلافِ قومی کہا جاتا ہے وہ قوانین یا وہ قانون یا وہ اصول جن کی رو سے ایک قوم تباہ ہوتی ہے۔تباہی کے معنی ہوتے ہیں کہ اس سے وہ تمکن چھن جاتا ہے حکومت مملکت چھن جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے دوسری قوم کو تمکن حاصل ہو جاتا ہے۔قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ یہ چیزیں یونہی اتفاقی نہیں ہوتیں دھاندلی یہاں نہیں ہوتی بلکہ ان کے لیے اصول مقرر ہیں قانون مقرر ہیں۔ان قوانین کے مطابق ہی تمکن اور قوت حاصل ہوتی ہے' انہیں کی خلاف ورزی سے یہ چیزیں چھنتی ہیں۔اور دوسری قوم جس میں صلاحیت ہوتی ہے اس تمکن کی وہ ان کی جگہ لے لیتی ہے۔اصول بیان کیا کہ (**کذٰلک نجزی القوم المجرمین**) (10:13) اس طرح سے یہ انجام ہوا کرتا ہے اس قوم کا کہ جو جرائم کی مرتکب ہو جاتی ہے۔تمکن ملنے کے بعد یہ اصول ہوا۔اور اب تخاطب ہوا وہ جو سامنے قوم ہے اس سے۔اور تخاطب کیا ہے کہ (**ثم جعلنکم خلٰٓئف فی الارض من بعدھم**) (10:14)

ان قوموں کے بعد پھر تمہیں تمکن حاصل ہوا۔ کاہے کے لیے یہ تمکن تمہیں دیا گیا؟ یہیں ایک ساری بات واضح کر دی دو لفظوں میں (**لننظر کیف تعملون**) (10:14) یہ دیکھنے کے لیے کہ اب تم کیا کرتے ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کس قدر منطقی کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں ایک اصول کی۔ اُنہوں نے جو کیا تھا وہ تو تم دیکھ چکے کہ اس کا انجام کیا ہوا تھا۔ ہم نے بتا دیا تھا کہ یہ چیز ہنگامی واقعہ نہیں تھا جو By Chance کسی قوم کے ساتھ ہو گیا' بھئی ان کے ساتھ ہو گیا ہے ہر ایک ساتھ تھوڑا ہوتا پھرتا ہے۔ کہا بالکل نہیں۔ بات یہ ہے (**کذٰلک نجزی**) (10:13) اسی طرح سے ہر اس قوم کا یہ انجام ہوا کرے گا کہ جو یہ کیا کرے گی۔ اور اس کے بعد کہا کہ اب تمہیں تمکن حاصل ہوا ہے اور یہ اس لیے ہوا ہے کہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ جو چیز کہی گئی یہ چودہ سو سال پہلے کی نبی اکرم ﷺ کی قومِ مخاطب کے لیے ہی نہیں تھی۔ یاد رکھئے قرآنِ کریم قیامت تک کے لیے تمام اقوامِ عالم کے لیے ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس میں اب مستقل غیر متبدل قوانین دیے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ابدی غیر متبدل قانون ہے کہ جو قوم بھی تمکن حاصل کرنے کے بعد ظلم اور جرم کا ارتکاب کرے گی اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ یہ ایک ابدی ازلی غیر متبدل قانون ہے۔ اور یہ قانون ہے کہ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے یہ قانون لاگو رہے گا۔ لہٰذا جب قرآن یہ کہتا ہے کہ تمہیں تمکن حاصل ہوا تا کہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو تو یہ چودہ سو سال پہلے کی قومِ قریش یا جماعتِ مؤمنین کے لیے ہی نہیں تھا۔ بلکہ یہ اصول ہے قیامت تک کے لیے کہ کوئی پہلی قوم جس سے کہ یہ سطوت اور حکومت چھنتی ہے' چھنتی ہے اس لیے کہ اس نے یہ کچھ شروع کیا۔ اور اس کے بعد کسی دوسری قوم کو ملتی ہے' تو ملتی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ قوم کیا کرتی ہے۔ اگر وہ بھی وہی کچھ کرتی ہے جو پہلی قوم نے کیا تھا اس کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو اس قوم کا ہوا ہے۔ تو گویا یہ چیز جو یہ اصول بیان کیا ہے یہ کسی خاص زمانے میں خاص قوم کے لیے نہیں قیامت تک کے لیے ہر ملک ہر قوم ہر زمانے کی قوم کے لیے یہ ہے۔ اور جیسا میں نے اس دن آخری فقرے میں کہا تھا کہ یوں کہیے کہ ہمارے لیے یہ قانون 1947ء میں نازل ہوا یا ہمارے سامنے آیا۔ جب یہ کہا گیا کہ (**ثم جعلنکم خلٰٓئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون**) (10:14) پھر ان کے بعد تمہیں تمکن حاصل ہوا یہاں پاکستان کی مملکت ملی اور یہ اس لیے ملی کہ اب دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔ یہ دیکھا جائے کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ خدا کو (معاذ اللہ) علم نہیں ہوتا۔ انداز ہے بات بیان کرنے کا کہ اصول ہم نے دیدیا اب اس کے بعد اگر تم اس اصول کے مطابق چلو گے تمکن حاصل رہے گا اس کی خلاف ورزی کرو گے تو جیسا پہلی قوموں کے ساتھ وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ جرائم اور ظلم' دو ہی چیزیں یہاں بتائی ہیں۔ وہ ایک ہی بات ہے۔ ان چیزوں کے ارتکاز سے ہوتا کیا ہے قرآن نے بڑی تفصیل سے مختلف اقوام کی داستانیں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بتایا کہ چھوٹے چھوٹے جھٹکے آتے ہیں اس کے بعد کافی زوردار زلزلے بھی آتے ہیں قوموں کے اندر۔ ان کو تنبیہ کی جاتی ہے تاکید کی جاتی ہے ۔ یوں الفاظ اگر نہ ہم استعمال کریں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جب ان غلط کاموں کو شروع کرتی ہے تو چھوٹے چھوٹے پیمانے کے اوپر تباہیاں ان کی آتی ہیں۔ آتی ہیں سنبھل جاتے ہیں' پھر انہیں کا ارتکاز کرتے ہیں اس کا نتیجہ Accumalative Effect اور زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ پھر بھی

وہ باز نہیں آتے اس کے بعد اور زیادہ شدید ہوجاتا ہے وہ۔ تو آخر الامر کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ آیت یہاں تو ضمناً آئی ہے جب وہ آیات آئیں گی جہاں استبدالِ قومی کے قوانین قرآن نے دیے ہیں تو میں بتاؤنگا کہ کس طرح سے یہ چیز خاص منطقی انداز میں قانون کے مطابق ہوتی چلی جاتی ہے آہستہ آہستہ۔ اس وقت میں صرف یہ بتاؤنگا کہ آخر میں پھر ہوتا کیا ہے۔ دو بنیادی چیزیں بتائی ہیں قرآن نے قوم کے لیے۔ ایک لفظ تو دونوں کے لیے یا پوری جدوجہد کے لیے ہی جہاد کا لفظ ہے' مسلسل کوشش سعی وپیہم۔ یہ ہے جس سے قومیں زندہ رہتی ہیں افراد بھی تو اسی طرح سے زندہ رہتے ہیں۔ کسی وقت بھی آپ سانس لینا چھوڑ دیجیے موت واقع ہوجاتی ہے۔ یہ جو عمل ہے یہ عملِ مسلسل جسے آپ کہتے ہیں یہ جہاد ہوتا ہے۔ یہ کسی خاص ہنگامی وقت کی بات نہیں ہے کہ کسی وقت آپ نے سانس لے لیا یا پانی پی لیا یا کھانا کھالیا تو ٹھیک ہے پھر اس کے بعد زندہ رہے۔ یہ تو مسلسل یہ کرنا پڑتا ہے آپ کو یہ جہاد ہے زندہ رہنے کے لیے۔ اسی طرح سے قوموں کے زندہ رہنے کے لیے بھی اسی طرح سے مسلسل جہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد دو شقوں کے اندر قرآن نے اسے بانٹا ہے اصولی طور پر۔ جزئیات تو اس کی بہت زیادہ ہیں اصولی طور پہ اس نے کہا ہے کہ ایک تو یہ جہاد بالمال جسے کہا ہے زیادہ سے زیادہ محنت کر کے وہ قوم کمائے اور زیادہ سے زیادہ وہ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے اسے خرچ کرے۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ یہ انفاق اس انداز کا ہو کہ کم از کم جس دائرے کے اندر اس نے ذمہ داری لے رکھی ہے اس مملکت نے' اس دائرے میں تو رات کو کوئی بھوکا نہ سوئے۔ یہ انفاق ہے' مال کا کھلا رکھنا افرادِ معاشرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے۔ یہ انفرادی چیز نہیں ہے کہ ہر چیز خیرات کے طور پر یہ کچھ کرتا جائے بلکہ نظام مملکت کا ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ یہ ہے انفاق۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ جب اس مملکت پر کہیں خارج سے کوئی حملہ ہو خطرہ ہو اس خطرے سے نمٹنے کے لیے اگلا قدم آجائے گا جسے آپ جہاد بالسیف کہیں گے تلوار کے ذریعے سے جہاد جسے قتال یا جنگ کہا جاتا ہے۔ یہ جان کا جہاد کہلاتا ہے کہ جب اس مقصد کے لیے جان تک بھی دیدینے کی ضرورت پڑے تو جان دیدی جائے۔ یہ دو ہی اہم بنیادی گوشے ہیں جس سے بتایا کہ قوموں کا تمکن باقی رہتا ہے وہ آگے بڑھتی ہیں مستحکم ہوتی ہیں اور ان کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ اگر ان گوشوں میں وہ تغافل برتتی ہے قوم تو اس تغافلِ مجرمانہ سے پہلے چھوٹی چھوٹی تباہیاں آتی ہیں۔ اور بالآخر کیا ہوتا ہے؟ دو آیتیں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں انفاق کے متعلق۔ (**ھٰانتم ھٰؤلآء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ**) (48:38) کہا کہ کیا تم وہ قوم ہو کہ تمہیں کہا جاتا ہے۔ یہ فی سبیل اللہ کا لفظ بڑا جامع ہے۔؟؟؟ کے جو قرآن نے بتائی ہے اللہ کی راہ میں جسے کہا جاتا ہے اس مقصد کے لیے کہا یہ ہے کہ تم اپنے اموال کو کھلا رکھو۔ (**فمنکم من یبخل**) (48:38) لیکن تم میں وہ لوگ ہوجاتے ہیں کہ وہ صرف اپنی ذات کے لیے کما کے اپنی ذات کے لیے سمیٹ کر اس کو رکھتے ہیں۔ (**و من یبخل فانما عن نفسہٖ**) (48:38) کہا کہ جو اس طرح سے دوسروں کو محروم کر دیتا ہے ان چیزوں سے جن کو سمیٹ کے رکھ لیتا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس نے دوسروں کو محروم کیا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ کو اس سے محروم کر رہا ہے۔ وہ کیسے اپنے آپ کو محروم کر رہا ہے؟ اس نے تو اور زیادہ حفاظت سے

اپنے لیے ان کو رکھ لیا۔ کہا کہ وہ اس طرح سے کہ جو فی سبیل اللہ کہا تو کہا کہ یہ معنی اس کے نہیں ہیں کہ خدا کو ضرورت ہے تمہارے اس پیسے کی۔ اُسے ضرورت نہیں ہے (**واللہ الغنی و انتم الفقرآء**) (48:38) وہ تو بے نیاز ہے ان چیزوں سے۔ (**و ان تتولوا یستبدل قومًا غیرکم**) (48:38)

؟؟؟؟ تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔؟؟؟؟؟؟؟؟؟ (**ثم لا یکونوا امثالکم**) (48:38) پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی تمہارے جیسی قوم تو تمہاری جگہ لے ہی نہیں سکتی وہ تو بہر حال تم سے بہتر ہوگی تو جگہ لے گی نا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ آخری چیز کس قدر Catagorically قرآن بتا رہا ہے متعین طور پر بتا رہا ہے۔ (**یتسبدل قومًا غیرکم**) (48:38) تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی وہ پھر تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یہ ہوئی ہلاکتِ امم' اس قوم کی تباہی کے یہ معنی ہوئے کہ ان سے یہ تمکن یہ چھن جائے گا اور ان کی جگہ دوسری قوم اس تمکن کو حاصل کر لے گی۔ اور یہ استبدالِ قومی جسے میں نے کہا ہے اس قانون کے تابع ہوگا۔ پہلی چیز یہ کہ اگر تم نے یہ روش اختیار کی کہ جو کچھ کسی کے پاس ہے وہ بھی اپنے لیے جمع کر کے رکھا اور دوسروں کا بھی لوٹ کھسوٹ کر لے گئے۔ یہ جو دوسری چیز میں نے کہی ہے عربی زبان میں جرم کے بنیادی معنی یہ ہیں' دوسروں کے پھل کو کاٹ کر اپنے گھر میں لے جانا' اسے جرم کہتے ہیں۔ وہ قوم المجرمین کہا تھا نا کہ جو کچھ اپنے پاس ہے اسے بھی اپنی ہی ذات کے لیے رکھنا اور دوسروں کا لوٹ کھسوٹ کر بھی لے کر چلے آنا۔ اس کا آخری نتیجہ استبدالِ قومی' تم سے یہ چھن جائے گی مملکت دوسری قوم کو مل جائے گی۔ اور دوسری چیز تھی جسے میں نے کہا ہے جہاد بالسیف' جان کا جہاد جسے کہا جاتا ہے۔ کہا کہ اس کے لیے جب ضرورت پڑے جنگ کے لیے نکلو۔ (**الا تنفروا یعذبکم عذابًا الیمًا**) (9:39)

اگر تم جنگ کے لیے نہیں نکلو گے تو یاد رکھو تمہیں بڑا دردناک عذاب' عذاب کے معنی سزا ہو جائے گی تباہی ہو جائے گی۔ بڑی الم انگیز تباہی ہوگی جو تم پر مسلط ہو جائے گی۔ کیا ہوگا وہ؟ (**و یستبدل قومًا غیرکم**) (9:39) تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی۔ (**ولا تضروہ شیئًا**) (9:39) خدا کو تم کوئی نقصان نہیں اس سے پہنچا سکو گے کہ اس نے یہ کر دیا۔ (**واللہ علٰی کل شیءٍ قدیر**) (9:39) اس نے تو قوانین مقرر کر دیے ہیں اس کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری چیز یہاں یہ آ گئی کہ اگر جہاد کے لیے نہیں نکلو گے قتال کے لیے نہیں جنگ کے لیے عند الضرورت نہیں نکلو گے تو پھر بھی تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ یہ ہے ہلاکتِ امم جسے کہا گیا ہے' قوموں کی ہلاکت۔ قرآن نے بتایا یہ کہ اس طرح سے اقوامِ سابقہ کی تباہی آئی پھر کہا کہ یہ ہنگامی بات نہیں تھی یہ ایک قانون ہے جس کے مطابق پہلے بھی ہوا ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ ان قوموں کے بعد تمہیں تمکن حاصل ہوا یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کیا کرتے ہو۔ اگر تم نے بھی یہ روش اختیار کی۔ یہ بتا دیا خود قرآن نے تا کہ یہ نہ ہو کہ ہم خود اس کی تحقیق کرتی پھریں کہ صاحب قومیں کس طرح سے تباہ ہوا کرتی ہیں۔ متعین طور پہ بتا دیا کہ یاد رکھو اس طرح سے وہ قومیں تباہ ہوئی تھیں اسی طرح سے ہر وہ قوم تباہ ہوگی جو یہ روش اختیار کرے گی۔ لیجیے تمکن تمہیں مل گیا ہے اب اس کے بعد دیکھنا ہے کہ تم کیا

کرتے ہو۔ یہ تھی وہ چیز جس کے لیے جو میں نے کہا کہ 1947ء میں استبدالِ قومی جو ہوا ہے ایک قوم کے تمکن کی جگہ دوسری قوم جو تھی اس کو تمکن یہ حاصل ہوا تو یہ اس لیے حاصل ہوا۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اصول دیے ہوئے ہیں قرآن نے۔ ظلم و جرائم وہ چیز ہے جس کے بدلے میں پہلے تو آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے جھٹکے آتے ہیں اور آخری چیز یہ ہوتی ہے کہ پھر کوئی دوسری قوم آ کے جھپٹ کر لے جاتی ہے۔ کسوٹی موجود ہے کوئی نظری کوئی ذہنی چیز نہیں ہے کہ اس کے متعلق متعین طور پہ آپ سمجھ نہ سکیں کہ معلوم نہیں غیر محسوس طور پہ جو کہا جائے گا کہ یہ کچھ ہو رہا ہے ہمیں معلوم نہ ہو کہ ہم وہ کچھ کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے۔ کہا کہ ظلم اور جرائم وہ چیزیں ہیں کہ جن کا انجام تباہی ہے اور تباہی کے معنی ہیں کہ یہ مملکت حکومت سلطنت تمکن تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم آ کے لے لے گی۔ کتنی واضح صاف بات ہے۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ یہ کوئی نظری چیز بھی نہیں ہے محسوس شے ہے ہر وقت پرکھا جا سکتا ہے اس کو کہ یہ اس کا انجام ہو کر رہے گا۔ قرآن نے کہا (**کذٰلک نجزی القوم المجرمین**) (9:13) ہر وہ قوم جس میں یہ جرائم ہوں جس میں یہ ظلم ہو استبداد ہو اس کا نتیجہ ہمیشہ ہر زمانے میں ہر قوم کے لیے یہی ہوگا کہ اس کی جگہ پھر بالآخر دوسری قوم لے لے گی۔ کہا اس لیے تمہیں یہ دیا گیا۔ اور یہ ضابطۂ قوانین دیدیا گیا جس میں بتایا گیا کہ اس کے مطابق اگر تمہارا تمکن رہا تمہارا نظام رہا تمہاری زندگی رہی تو اس کے معنی ہونگے کہ تم ظلم نہیں کر رہے جرائم نہیں کر رہے۔ اگر اس کے خلاف تم گئے تو پھر سمجھا جائے گا کہ تم سے جرم اور جرائم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ اب یہاں یہ بات بھی واضح کر دی کہ خود ہی ہم اپنے رو سے یہ فیصلہ نہ کر لیں کہ ظلم نہیں ہو رہا۔ اور جیسا کہ اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ میں نے عرض کیا ہے بڑی عجیب چیز قرآن نے کہی ہے کہ مغالطے میں نہ رہے کوئی قوم۔ قوموں کے ہاں ہوتا یہ ہے کہ اگر ملک کا کوئی فیصلہ ملک میں رائج شدہ قانون کے مطابق ہوتا ہے تو اسے عدل کہا جاتا ہے' اگر اس کے مطابق فیصلہ نہیں ہوتا تو اسے ناانصافی یا ظلم کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ چیز ہے اور ساری دنیا میں جسٹس کی Definition ہی یہ ہے کہ وہ رائج الوقت قانون کے مطابق فیصلہ اگر عدلیہ کرے اُسے عدل کہا جاتا ہے اسے جسٹس کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن اگر وہ قانون ہی عدل پر مبنی نہیں ہوگا تو اس کے مطابق فیصلے کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اسی لیے اس نے کہا کہ اس نظام کے اندر عدل کی Definition یہ ہوگی کہ وہ الحق کے مطابق قانون بنے گا اور اس قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ (**و بہ یعدلون**) الحق کے مطابق فیصلہ جو ہے وہ عدل کہلائے گا۔ گویا اس نے قانون ہی کو پہلے بندش کر دی کہ ہر قانون جو تم بنا دو گے اس کے مطابق فیصلہ عدل نہیں کہلائے گا۔ بلکہ قانون بناتے وقت ہی یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ الحق کے مطابق قانون بنا ہے یا نہیں۔ اسے اس نے عدل کہا ہے۔ اور قانون اگر الحق کے مطابق نہیں ہے تو اس قانون کے مطابق فیصلے بھی ظلم ہونگے۔ اب اس نے بات صاف کر دی کہ یہ ہے ضابطۂ حیات یہ ہے ضابطۂ قوانین۔ اس کے مطابق تمہاری زندگی چلے گی انفرادی بھی اور اجتماعی بھی اور نظام مملکت تو چلے گا ہی اس کے مطابق۔ (**و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکٰفرون**) بار بار یہ آیت آتی ہے سامنے' بنیادی آیت ہے کہ جو بھی قرآن کے مطابق خدا کی نازل کردہ

کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ سیدھی سی بات اس نے یہ بتادی۔ آ گیا اب قرآن سامنے۔ یہ کیا چیز ہے قرآن؟ آپ جو کچھ من مانی کرنا چاہتے ہیں اس کے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ہر شخص اپنے دائرہ اختیار میں من مانی کرنا چاہتا ہے وہ چھوٹا سا دائرہ ہو وہ دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے' گھر کی چھوٹی سی زندگی انفرادی زندگی وہاں سے بات شروع ہو' گھر کے اندر' مالک اور گھر کا نوکر اور اس کو وسیع تر لے جائیں مملکت کے حاکم اور رعایا۔ معاملہ پڑے گا نا دوسروں کے ساتھ۔ اب یہ جو وسیع تر بات ہوئی اس میں ہوا کیا؟ انسان کو اپنے اختیارات پر پابندی۔ پابندی کس نے لگائی؟ خدا کے قانون نے لگائی پابندی' قرآنِ کریم نے پابندی لگائی۔ اب جو یہ کہا گیا کہ صاحب حکومت مملکت اس کے مطابق چلے گی تو وہاں یہ بات ہوئی کہ ارے ارے رے مارے گئے۔ یہ تو قدم قدم کے اوپر حدود اللہ جسے کہتے ہیں وہ جو Limitations with in the limitations prescribed by God لکھا ہوا ہے ہمارے ہاں۔ یہ حدود کے معنی یہ ہیں۔ یہ حدود ہیں کہ تمہارے اختیارات لامحدود نہیں رہ سکتے یہ ان حدود کے اندر تم ان کو Exercise کر سکتے ہو۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ بات یہ نظامِ حکومت تک ہی نہیں ہے بات انفرادی طور پر گھر کے اندر کی بھی ہے۔ تمہارے اختیارات' میاں بیوی کے باہمی تعلقات' باپ اور بچوں کے تعلقات' مالک اور نوکر کے تعلقات (معاف رکھیے عام اصطلاح میں مالک میں کہتا ہوں ورنہ یہ تو کہتے ہوئے جگر کانپ اٹھتا ہے' ایک انسان کا مالک دوسرا انسان' لیکن کیا کریں گودام میں لفظ ہی دوسرا نہیں ہے) یہاں جو مل کا آپ کا سرونٹ ہے اس کے ساتھ بھی آپ کے تعلقات۔ پھر آگے چلیے دوکاندار ہے تو اس میں کارندوں کے ساتھ تعلقات' دفتر میں افسر ہے تو ماتحتوں کے ساتھ تعلقات۔ یہ اختیارات ہیں ناجن کو آپ Exercise کرتے چلے جارہے ہیں۔ کرتے چلے جائیے آخر الامر حکومت اور رعایا کے درمیان۔ اختیارات جو ہیں ان پر حد بندی یہ ہے جسے آپ حکومت کہتے ہیں۔ حکم کے معنی ہی ہوتا ہے اس ریوڑ کو ادھر ادھر نہ بکھرنے دینا راستے کے درمیان چلانا' اسے بنیادی معنی میں کہتے حکومت یا حکم۔ عجیب قوم تھی یہ صاحب۔ وہ ادھر اُدھر نہیں ہونے دیتے تھے۔ دیکھا ہے آپ نے یہ ریوڑ بکریاں ہانکنے والے کو وہ کیا کرتا رہتا ہے' بھاگتے ہوئے اس کو ادھر سے اُس کو اُدھر سے کر کے وہ بیچ میں لاتا ہے۔ یہ جو ہے ان کو اس طرح سے بیباک نہ ہونے دینا انسانی اختیارات کو اسے حکومت کہتے ہیں۔ ماانزل اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جو اس نے Prescribe کی ہیں حدود متعین کی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے اختیارات کے اوپر کنٹرول ایک دیدیا اس نے۔ یہ ہے وہ چیز۔ اور یہ ہے وہ چیز کہ جو انسان من مانی کرنا چاہتا ہے اس پہ یہ چیز بڑی گراں گذرتی ہے۔ یہ ہے اصل لم اس چیز کی۔ تو یہ لوگ چاہتے کیا ہیں پھر؟ کھلے بندوں انکار تو کر نہیں سکتے کہ نہیں صاحب ہم تو اسے نہیں مانتے اس کے مطابق نہیں کریں گے۔ بہرحال اس معاشرے کے اندر ہیں جنہیں اسلام کہا جاتا ہے مسلمان کہا جاتا ہے جو اس کتاب کو مانتا ہے جرآت یہ نہیں ہوسکتی کہ کھلے بندوں یہ کہا جائے۔ عزیزانِ من! غور کیجیے کیا کہہ گیا ہے قرآن۔ پڑھتے ہیں ہم آیتیں ہم نے سمجھا یہ ہے کہ اچھا اس زمانے میں کچھ لوگ تھے جو یہ کہا کرتے تھے۔ جب اوپر سے ہم چلے آرہے ہیں کہ یہ تو قیامت تک کے لیے یہ ہر قوم کے لیے ہر

زمانے کے لیے یہ چیز ہے۔جس قوم کو بھی مملکت ملتی ہے اختیار ملتا ہے اس کے لیے یہ چیز ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔تو اس کے بعد یہ جو چیز میں نے کہی ہے یہ کسی خاص زمانے کی خاص قوم کے لیے نہیں ہے کہ وہاں یہ ہوتا تھا۔بات یہاں آ رہی تھی کہ حکومت کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اختیاراتِ مطلق حاصل ہوں۔قرآن یہ کہتا ہے کہ مطلق نہیں ہو سکتے مقید ہو سکتے ہیں ان کے اوپر کنٹرول رہے گا کس کا رہے گا؟ کسی انسان کا کنٹرول نہیں رہے گا۔خدا کے قوانین کا کنٹرول ہوگا اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کے اندر اختیارات کو Exercise کیا جائے گا۔انکار نہیں کر سکتے۔میں زور اس لیے دے رہا ہوں کہ بڑی اہم چیز ہے عزیزانِ من! جو آ رہی ہے۔زور تو نہیں اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا مشکل ہے۔کہیں گے کیا؟ (و اذا تتلٰی علیھم اٰیاتنا بینٰتٍ) (9:15)

جب ان کے سامنے یہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔(قال الذین لا یرجون لقآء نا) (9:15) بنیادی بات یہاں کہی۔کہا جنہیں تو یہ معلوم ہے کہ ہمارا ہر عمل خدا کے قانون کے مطابق نتیجہ پیدا کرے گا وہ تو ایسا نہیں کرتے۔جن کے ذہن سے یہ بات اٹھ جاتی ہے کہ ہم بھی کسی کے سامنے Accountable ہیں ہم بھی اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں مسئول ہیں' وہ تو کبھی یہ نہیں کریں گے۔یہ ذہن سے بات نکلے گی تو پھر یہ بات گراں گذرے گی کہ ہمارے اختیارات کے اوپر کوئی تحدید ہو رہی ہے کوئی Limits Prescribe ہو رہی ہیں بڑی سخت ہی یہ جو Limits ہیں۔تقاضا کیا ہوگا؟ سنیے عزیزانِ من! تقاضا یہ ہوگا (ائت بقراٰنٍ غیر ھٰذا او بدلہ) (9:15) کہیں گے کہ یا تو بھئی اس ضابطۂ قوانین کی جگہ کوئی اور ضابطہ قانون کا لاؤ یہ نہیں ہمارے بس کی بات' اس کے تابع نہیں چلا جا سکے گا۔اور اگر اتنا Drastic Action اگر کہا جائے کہ ارے توبہ صاحب کیا کہہ رہے ہو تو کہہ یہ رہا ہے کہ اچھا یوں نہ کرو کچھ تبدیلی کرو اس کے اندر۔غور فرما رہے ہیں آپ۔اسلام کی مدعی قرآن کو ماننے والی قوم کی تیرہ سو سالہ تاریخ ہی اتنی ہے کہ یا اس قرآن کو بدلو یا کم از کم تبدیلی تو ضرور کرو۔بدل بھی نہیں سکتے تھے کہ اس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔یہ باتیں کئی دفعہ آ چکی ہیں۔اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔لیے رہو' بدل دیں گے ہم اسے۔کیسے بدل دیں گے ہم اسے؟ عقیدہ وضع کر لیا کہ ایک یہ قرآن اور اس کے ساتھ مثلہ معہ ایک اور۔اس کی مثل اس کے ساتھ اور وہ ہیں روایات۔جنہیں نہ رسول اللہ ﷺ نے محفوظ مدون شکل میں امت کو دیا کہ بابا لو اس کے ساتھ یہ' نہ کہیں صحابہؓ نے ایسا کیا کہ اس کے ساتھ یہ دیا۔اس لیے کہ یہ دور تو وہ تھا کہ جس میں وہی اپنے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھتے تھے ان کے تو حیطۂ تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی نا۔یہ تو آگے جا کے آئی نا جب ملوکیت آپ کے ہاں آئی کہ اختیارات کے اوپر کنٹرول نہیں ہونا چاہیے۔اب چلا سلسلہ کہ اس کی مثل اس کے ساتھ اور لگی بننے پھر وہ ساری روایات۔ان کی حفاظت کا ذمہ بھی کسی نے نہیں لیا ہوا' وہ مدون ہی نہیں تھیں تو حفاظت کا ذمہ کیا لیا جاتا۔اور دھڑا دھڑ بنی ہوئیں صاحب لاکھوں کی تعداد کے اندر۔ہر قسم کی جو حد اس نے قائم کی تھی ان کو توڑا گیا اسکے اندر۔آہستہ آہستہ جرآتیں اتنی بے باک ہو گئیں کہ یہ چیز عقیدے میں داخل ہو گئی کہ یہ روایت جس کا نام حدیثِ رسول اللہ ﷺ رکھ لیا۔اور بڑا غلط رکھ لیا یہ۔وہ رسول اللہ ﷺ کی بذاتِ خود باتیں نہیں ہیں باتیں

منسوب کی ہوئی ہیں رسول ﷺ کی طرف۔ Definition ہی یہ ہے حدیث کی۔ اقوال منسوب الی الرسول' حضور ﷺ کی طرف منسوب کیے گئے اقوال ہیں۔ ان کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ حدود ٹوٹ گئے۔ کہاں تک یہ ٹوٹی۔ سیدھی سی بات ہے السلطان ظل اللہ علی الارض' بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے سارے خدائی اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن کی جگہ یہ چیز آ گئی۔ وہ بیزاریوں نہیں ہوئے تھے اُنہوں نے کہا تھا کہ ہم مانتے ہی نہیں اسے۔ جو حکم قرآن کا آیا اس کے ساتھ وہ دوسری چیز آ گئی آپ کے ہاں۔ جس قسم کی اس کے اندر استثنٰی چاہتے ہو وہ موجود ہے' جتنی تبدیلی چاہتے ہو موجود ہے۔ غور فرمایا آپ نے کیا ہوا۔ کبھی سوچئے گا اس کے اوپر بھی کہ یہ جو بھی آواز یہ دیتا ہے کہ بھئی قرآن کے مطابق ہونا چاہیے اس کی کیوں مخالفت ہوتی ہے۔ جذباتی طور پہ عوام کو بھڑکانے کے لیے تو بڑی سیدھی سی بات ہے کہ صاحب یہ منکر ہو گیا ہے سنت کا رسول کا۔ ان کو کیا پتہ بیچاروں کو کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ٹھیک ہے صاحب منکر ہو گیا ٹھیک ہے کھال کھینچ دو کاٹ دو۔ ہوتا کیا ہے؟ وہ قرآن کی پابندیاں جو ہیں اس میں Relaxation نہیں ہوتی وہ حدود نہیں ٹوٹ سکتی۔ اختیارات کی وسعتیں لامحدود اس میں ہوتی ہیں اور وہ دونوں کے لیے ہوتی ہیں۔ آپ کے ہاں پتہ ہے نا دو مملکتیں ہوتی ہیں ایک تو بادشاہ کی مملکت ہوتی ہے حکومت ہوتی ہے' ایک آپ کے ہاں شریعت کی مملکت ہوتی ہے جو فتوے والوں کے پاس ہوتی ہے۔ دونوں کے اختیارات کے اوپر قرآن حد بندی عائد کرتا ہے۔ اس کے خلاف نہ مملکت قانون بنا سکتی ہے نہ کوئی مفتی فیصلہ دے سکتا ہے۔ وہ دونوں ان اختیارات کو توڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے قرآنِ خالص کی طرف کوئی نہیں آتا۔ یہ ہے وہ چیز۔

ان کا تقاضا یہ کہ ایسا کر دیجیے۔ (قل) (10:15) خدا کی طرف سے حکم ہے رسول کو' اعلان کر دو کہ دو ان کو برملا۔ (**ما یکون لی ان ابدلہ من تلقآئی نفسی**) (10:15) میرے بس میں ہی نہیں ہے کہ میں اس میں کوئی تبدیلی کر سکوں میں تو اس میں اپنی طرف سے ایک؟؟ بھی گھٹا بڑھا نہیں سکتا۔ میرے یہ اختیار میں ہی نہیں ہے۔ جس رسول کی حدیثوں کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہیں اس سے خدا کہلواتا ہے کہ کہہ دو میرے اختیار میں ہی نہیں ہے کہ میں اس میں کوئی تبدیلی کر سکوں۔ سوچئے عزیزانِ من ! ہم کس مقام پہ ہیں اور کیا ہوا ہے ہمارے ساتھ اس تیرہ سو سال کے اندر۔ میں نہیں اپنی طرف سے اس میں سے بدل سکتا۔ اب یہاں یہ چیز آئی کہ (**تلقآئی نفسی**) (10:15) اپنی طرف سے نہیں بدل سکتا۔ ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب وہ جتنی یہ احادیثیں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی طرف سے نہیں ہیں وہ بھی خدا کی طرف سے ہیں۔ اب وحی کی دو قسمیں اب ہو گئیں۔ ایک وحی خفی ہے ایک جلی ہے' ایک متلو ایک غیر متلو ہے۔ وہ ایک قسم کی وحی جو ہے قرآن کے اندر ہے' مثلہ معہ اسی قسم کی دوسری وحی ان کے اندر ہے۔ کہا کہ دیکھ لیجیے صاحب وہ (**من تلقآئی نفسی**) کہا تھا نا کہ خود نہیں بدل سکتا میں' تو خود نہیں بدلی۔ وحی کا درجہ؟؟ ہو گیا اس میں۔ کہا رسول اللہ ﷺ سے کہہ دو کہ میں نہیں بدل سکتا۔ (**ان اتبع الا ما یوحی الی**) (10:15) میں خود اسی کا اتباع کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پہ وحی آتی ہے۔ جب میں

اس کا اتباع کرتا ہوں تو مجھے یہ اختیار کیسے کہ خدا کی وحی میں تبدیلی کر دوں۔ میں تو اسی کی اطاعت کرنے کے لیے آیا ہوں' میں اسی کا اتباع کرتا ہوں۔ جو حد بندیاں اس نے میرے اختیارات پہ عائد کی ہیں میں ان میں بھی Relaxation نہیں کر سکتا نہیں توڑ سکتا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ (**انی اخافت ان عصیت ربی عذاب یومٍ عظیمٍ**) (10:15) میں بھی اگر وحی کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی ڈرتا ہوں خدا کے عذاب سے۔ غور فرمایا آپ نے۔ قرآنِ کریم میں کئی اور مقامات میں بھی ہے یہ چیز آئی ہوئی ہے کہ یہ لوگ بہت چاہیں گے کہ تمہیں اس سے کسی طرح سے تھوڑا سا ہی پھسلا دیں' کچھ تھوڑا سا ہی تم جھک جاؤ ان کی طرف' کچھ ان کی خاطر سے اس کے اندر ذرا سی کچھ تبدیلی مداخلت جسے کہتے ہیں Compromise تھوڑی سی کر لیجیے مداہنت ہی کچھ کر لیجیے (مداہنت پھسل جانے کو کہتے ہیں یہ دوہنیت ہوتی ہے نافرش کے اوپر تیل گر جائے تو جو کیفیت پیدا ہو جائے) کہ اتنا سا ہی ہو جائے۔ کیا چیز تھی جو ان پہ گراں گذرتی تھی۔ کم از کم ایک آیت تو دیکھ لیجیے اس وقت۔

گراں بات یہ گذرتی تھی (**و اذا ذکرت ربک فی القراٰن وحدہ ولوا علٰی ادبارھم نفورًا**) (17:46) یہ بات گراں گذرتی تھی کہ صرف خدائے واحد کے قانون کا اتباع کیوں' اس کے ساتھ اور کیوں نہیں شریک کرنے دیتے۔ یہ تھی چیز۔ توحید کے معنی یہ ہیں صرف خدا کی اطاعت۔ اور جیسا کہ بات واضح ہے خدا کی اطاعت کا عملی طریقہ تو اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔ کہتا ہے یہ نہیں چاہتے تھے۔ ساتھ کچھ اور ملانے سے۔ اور وہ کہتا ہے (**لا یشرک فی حکمہٖ احدًا**) وہ اپنے ان حکموں میں کسی اور کو شریک ہی نہیں کرتا۔ ساری کشمکش یہ ہے عزیزانِ من! جو چلی ہے۔ قرآن میں کچھ مداہنت کرو کچھ Compromise کرو۔ دو ایک حوالے آپ لکھ لیجیے انہیں دیکھ لیجیے گا (11:113, 17:74, 68:9)۔ کہا یہ جو اس طرح سے تقاضے کرتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ کچھ اور ساتھ۔ (**اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتٰب یتلٰی علیھم**) (29:51) او کیا یہ کافی نہیں ہے جو کتاب ہم نے ان کے ساتھ نازل کی ہے۔ اتنی عظیم چیز ہے۔ او یہ کافی نہیں ہے۔ یہ چیز کہ یہ کتاب نا تمام ہے اس کے ساتھ کچھ اور ہونا چاہیے۔ عام آپ سنیں گے نا کہ جی یہ مجمل ہے کتاب اصل میں' اس میں تفصیل ہے نہیں اس لیے اس کے ساتھ اور ہونا چاہیے۔ وہ کہتا ہے (**اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتٰب یتلٰی علیھم**) (29:51) او یہ کافی نہیں ہے ان کے لیے یہ جو کتاب ہم نے نازل کر دی۔ (**ان فی ذٰلک لرحمۃً و ذکرٰی لقومٍ یؤمنون**) (29:51) یہ ہے وہ کتاب جس کے اندر رحمت بھی ہے نصیحت بھی ہے لیکن کن کے لیے ہے؟ انہی کے لیے ہے جو اس قرآن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ تو جو اسے کافی نہیں سمجھتا اس کا تو ایمان ہی نہیں قرآن پہ۔ آج حسبنا کتاب اللہ جس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب کافی ہے ہمارے لیے' یہ کہنے والا جو ہے اس کے خلاف کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ یہ ہے وہ نظام قرآنِ کریم نے جو دیا ہے عزیزانِ من!۔ عدل کے لیے اصول یہ دیا کہ الحق کے مطابق قانون بنائیں۔ الحق کہا ہے خدا کی کتاب کے اندر ہے۔ یہ کتاب مکمل ہے مفصل ہے غیر متبدل ہے محفوظ ہے۔ جو اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا اس کا اس پر ایمان نہیں ہے۔ اور تو اور نبی بھی اس کے اندر تبدیلی نہیں کر سکتا تھا اپنی طرف سے۔ اور ختمِ نبوت ﷺ کے بعد سوال ہی نہ پیدا ہوا پھر

۔جب پھر نبی نہیں تو اس میں تبدیلی کون کرسکتا ہے۔ نبی نہیں کرسکتا تھا تو بعد میں تو نبوت بھی ختم ہوگئی۔ یہ تھا وہ ضابطۂ ہدایت جو اس قوم کو دیا جسے تمکن حاصل ہو دنیا میں' جس نے حکومت قائم کرنی ہو۔

یہ کہا گیا 1947ء میں ہمیں کہ (**جعلنٰکم خلٰٓئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون**) (10:14) جو تمہیں حکومت اب مل رہی ہے دیکھتے ہیں ہم تم کیا کرتے ہو۔ بتایا یہ گیا کہ یاد رکھو اصولی چیز ہم نے تمہی بتا دی ہے یہ ضابطۂ ہدایت یہ ہے قانون۔اور عزیزانِ من! غور کیجیے تو اس میں تو جسے ہم اصطلاحی طور پہ مسلمان یا غیر مسلم کہتے ہیں اس کا بھی سوال نہیں ہے۔ یہ اصول ایسے ہیں کہ دنیا کی ہر قوم کے اوپر ان کا اطلاق ہوگا۔اس نے جب کہا ہے کہ جو قوم ظلم کرے گی اور جرائم پہ اتر آئے گی اس سے تمکن چھن جائے گا۔تو وہ قوم مسلمان کی قوم ہو یا غیر مسلم قوم ہو وہ تو ایک ہی بات ہے۔ظلم کہتے کس کو ہیں جرم ہوتا کیا ہے یہ چیز قرآنِ کریم کے اندر دیدی۔اور اگر آپ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اس میں بھی کوئی خاص مسلمان کی خصوصیت نہیں ہے وہ انسانیت کے خلاف جرائم ہیں انسانیت کے خلاف ظلم ہے۔اور اس کا اطلاق دنیا کی ہر قوم پہ ہوگا۔ جو قوم بھی اس طرح ظلم کے اوپر اتر آئے گی اس سے تمکن چھن جائے گا۔ پہلی چیز قرآن نے کہا ہے فساد پیدا ہو جائے گا معاشرے میں۔ظلم کے معنی ہوتا ہے کوئی شے اس اپنے مقام پہ نہیں رہے گی جس پہ اسے ہونا چاہیے۔ یہ عربوں کے ہاں یہ ترجمہ تھا ظلم کا' جس شے کو جس شخص کو جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو'۔خواہ آپ اسے اونچا چڑھا دیجیے وہ بھی ظلم ہے خواہ اس سے نیچا کر دیجیے یہ بھی ظلم ہے۔ جرم ہے دوسرے کے پھل کو کاٹ کے اپنے گھر میں لے جانا۔اسے ہی تو آپ Exploitation اور استحصال آج کہتے ہیں۔تو یہ چیز تو مختص نہیں ہے کسی ایک خاص قوم کے لیے۔ پوری انسانیت کے لیے یہ چیز ہے۔اسی لیے اسے (**ذکـــــــر للعٰلمین**) کہا ہے قرآن کو' تمام اقوامِ عالم کے لیے اس میں ضابطۂ ہدایت ہے۔خوبی اس کی یہ ہے کہ Abstract Talk نہیں کرتا' متعین بات کرتا ہے۔ظلم کہتا ہے تو اس کی Definition دیتا ہے جرم کہتا ہے تو اس کی تفصیل بتاتا ہے۔تاکہ کسی وقت کوئی قوم کسی مغالطے میں نہ رہے کہ ظلم کر رہی ہو اور سمجھے ظلم نہیں ہو رہا۔قانون کے مطابق فیصلے کر رہی ہو اس کی عدلیہ تو وہ سمجھیں کہ عدل ہو رہا ہے۔ جب اس نے کہا کہ پہلے قانون کو تو دیکھو کہ حق کے مطابق ہے یا نہیں ہے تو اب اس میں مغالطہ نہ رہا۔اگر یہ نہ کہا جاتا تو اس میں یہ مغالطہ رہتا۔جیسا کہ ساری دنیا نے اپنے لیے جسٹس کی Definition یہ تجویز کر لی' قانون سازی کا اختیار دیدیا ایک خاص ادارے کو' عدل کے معنی ہوئے ان کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق احکام نافذ کرتے چلے جاؤ۔ وہ اپنے کسی مسئلہ کے مطابق قانون بناتی چلی جاتی ہے یہ اس کے مطابق فیصلے کرتے چلے جاتے ہیں۔اس کا نام رکھ لیا عدل۔اور دنیا میں کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرے گا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔غور فرمایا قرآن کرتا کیا ہے۔ یہ متعین کر دیتا ہے ان تمام چیزوں کو جس سے مغالطے میں انسان رہ سکتا ہے یا فریب دے سکتا ہے۔ یہ فریب نہیں دینے دیتا۔کہا یہ کہ یہ ضابطۂ قانون جس کے متعلق تم مجھ سے کہتے ہو کہ اس میں بھئی کچھ تبدیلی کرو کہا تم سمجھے ہی نہیں ہو کہ یہ کیا ہے۔

یہاں کہانا کہ میں اپنی طرف سے تبدیلی نہیں کرسکتا۔ کیوں نہیں کرسکتا؟ اس لیے کہ (**قل لو شآء اللہ ما تلوتہ علیکم و لا ادرٰکم بہ**) (10:16) او یہ میرا بنایا ہوا ہی نہیں ہے۔ کیا بات ہے صاحب!!! جسے قانون سازی کا اختیار ہے اسے ہی قانون میں تبدیلی کا اختیار ہے۔ بات ٹھیک ہے۔ کہا کہ بھئی تم تو نبی ہو اتنے بلند مقام پر ہو او تمہارے لیے کیا مشکل ہے اس میں کچھ تبدیلی کرو۔ کہا مشکل یہ ہے کہ جو قانون بنانے کا اختیار رکھتا ہے وہ تبدیلی کرسکتا ہے میں تو بنانے کا ہی اختیار نہیں کرتا۔ اگر خدا کی مشیت میں یہ نہ ہوتا تو میں یہ قوانین تمہارے سامنے پیش ہی نہ کرتا۔ یہ تو ہوا پیش کرنا۔ عزیزانِ من! غور کیجیے قرآن کے الفاظ' الفاظ کیا ہیں حقائق کے سمندر ہیں۔ (**ما تلوتہ**) (10:16) میں تمہارے سامنے انہیں پیش نہ کرتا۔ گویا نبی نے اپنے متعلق کہا یہ ہے کہ میں تو اتنا ہی کرتا ہوں کہ مجھے ملتے ہیں تو پیش کر دیتا ہوں ۔ میں یہ نہ کرتا۔ (**و لا ادرٰکم بہ**) (10:16) خدا تمہیں اس کا علم ہی نہ دیتا ادراک ہی نہ دیتا۔ یعنی ان حقائق اور قوانین کا ادارک جو ہے یہ میں نہیں دے رہا خدا کی طرف سے دیا جا رہا ہے یہ۔ میں تو انہیں پیش کرتا ہوں۔ قرآن ہے عزیزانِ من! ایک فقرے میں چار ایک آیتوں میں یہ لفظ ہیں آپ دیکھئے کہ ان کے اندر اس لفظ فاعل کے بدلنے سے کتنی بڑی دو حقیقتیں پیش کر دیں۔ (**و لا ادرٰکم بہ**) (10:16) یہ جو ادراک ہے حقائق کا وحی کے ذریعے سے یہ خدا کرتا ہے۔ میں کیا کرتا ہوں؟ (**تلوتہ**) (10:16) انہیں پیش کرتا ہوں۔ تو میرا تو یہ منصب ہی نہیں ہے کہ میں یہ چیزیں اپنی طرف سے۔ میں تو ادراک نہیں ان کا کرا سکتا تھا تمہیں خدا نے کرایا ہے۔ چہ جائیکہ یہ سمجھا جائے کہ ان کا واضع قوانین ہوں مجھے یہ اختیار حاصل ہے' مجھے تو وہ بھی اختیار نہیں۔ اُس نے ہی ان کا ادراک تمہیں دیا ہے اس نے ہی اس کا یہ تمہیں علم دیا ہے' میں تو یہ پیش کرنے والا ہوں صرف میں اس میں تبدیل کیسے کرسکوں۔ اب اگلی بات یہ کہ بھئی یہ جو چیز ہے بہت بڑا دعویٰ ہے یہ کہ تم انہیں نہیں بناتے تمہاری فکر کا یہ نتیجہ نہیں ہے خدا کی وحی ہے تمہاری طرف آتی تم صرف اسے پیش کرتے ہو۔ بڑی لطیف سی بات ہے اس کے اندر جو وہ کہیں کہ یہ بات تو نہیں ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ) میاں کرتے بناتے تو تم خود ہی ہو بس بڑا بننے کے لیے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو اس کو (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ یہ ہے نا چیز جو ذہن میں آ سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا ثبوت تو کوئی ہے نہیں نا۔ وہ آگے میں عرض کرونگا کہ اس کا پھر ثبوت کیا ہے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہے ماورائے فکرِ انسانی سرچشمہ جو ہے وہاں سے آیا ہے۔ وہ لمبی بات ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ جو ذہن میں ان کے آیا کہ بھئی یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ نہیں صاحب یہ میری فکر نہیں ہے' کہیں ہماری اس بات سے بچنے کے لیے تو نہیں ہے جو ہم نے کہا تھا کہ ہماری خاطر سے کچھ اس میں تبدیلی کر دو تو تم نے کہا کہ پیچھا چھڑاؤ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ کہہ کے بھائی صاحب کہ یہ میرا ہے ہی نہیں ہے میں کیسے اس میں تبدیلی کر دوں۔ یعنی ان کا ذہن جو ہے یوں Work کر رہا ہے یہ کہنے کے لیے کہ یہ اس بات میں تم (جسے افتراء کہتے ہیں جسے جھوٹ کہتے ہیں) کہ اپنی طرف سے تم بنا رہے ہو کہہ رہے ہو یہ' جھوٹ بول رہے ہو فریب دے رہے ہو۔ یہ ہے نا جو اعتراض آیا۔ معلوم ہے اس کا جواب کیا دیا گیا۔ جواب عزیزانِ من! نہ تو فلسفہ میں دیا نہ کسی معجزے کی رو سے دیا۔ جواب یہ دیا ہے جس سے میں کہتا ہوں ہر سوچنے

والا کانپ اٹھے۔کہا یہ تمہارے ذہن میں بات آ رہی ہے کہ میں خود اس کو وضع کرتا ہوں خدا کی طرف منسوب کرتا ہوں بڑا بننے کے لیے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہوں یہ فریب دے رہا ہوں۔کس سے کہہ رہے ہو؟ (**فقد لبثت فیکم عمرًا من قبله افلا تعقلون**) (10:16) میں کہیں باہر سے نہیں آیا ہوا میں نے ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے' سوچو تو سہی عقل سے کام لے کے مجھے بتاؤ کیا میری زندگی یہی ہے اس سے بیشتر بھی تم نے جھوٹ بولتے دیکھا ہے مجھے فریب دیتے دیکھا ہے۔خاموش ہو گئے عزیزانِ من! سب۔

عزیزانِ من! مجھ پہ ایک دور گذرا تھا۔قدامت پرستی کے ماحول سے میرا پہلا زندگی کا دور گذرا اسی طرح سے مذہب کو سمجھا اسی طرح سے قرآن کو سمجھا۔تنقیدی جب دور آیا ناقدانہ نظروں سے ان چیزوں سے گذرا۔شکوک اور تذبذب کا ایک غبار۔ برس ہا برس تشکیک کی وادیوں میں سرگرداں رہا' کسی چیز پہ یقین نہیں بیٹھتا تھا' اکثر ایسا ہوا کہ بالکل الحاد کے کنارے کے اوپر انکار کے کنارے کے اوپر جا کھڑا ہوں۔صرف ایک چیز تھی اس سارے دوران میں جس نے میری کشتی کو لنگر کا کام دیا سنبھالے رہا اور وہ تھا صرف یہ قرآنِ کریم رسول اللہ ﷺ کا یہ دعویٰ کہ (**فقد لبثت فیکم عمرًا من قبله**) (10:16) یہاں میں کھڑا ہو کے سوچتا تھا کہ اتنی عظیم شخصیت کہ جو دشمنوں کے نرغے میں یہ آ کے کہتی ہے ان کے سامنے کہ میں نے اپنی عمر گذاری ہے تمہارے اندر۔ بتاؤ یہ سچے کی عمر ہے یا جھوٹے کی عمر ہے۔ یہ چیز میرا حوصلہ بندھاتی تھی کہ جلدی نہ کرو انکار کرنے میں۔جس شخص کی یہ کیفیت ہے وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔صرف یہ ایمان تھا عزیزانِ من!۔جب رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا ہے کہ یہ میری فکر کی تخلیق نہیں ہے غلام احمد جلدی نہ کرو بڑی عظیم شخصیت ہے۔جھوٹے کی زندگی ایسی نہیں ہوتی' حضور ﷺ کی سیرت پر میرا ایمان تھا جو مجھے واپس لایا ہے قرآن پر ایمان کے لیے عزیزانِ من!۔لکھونگا کبھی میں اپنا یہ کچھ دور' کیا گذری تھی مجھ پر اور کس چیز نے مجھے بچایا تھا۔صرف اس چیز نے بچایا تھا کہ نہیں حضور ﷺ جیسی بلند سیرت و کردار کا انسان جھوٹ نہیں بول سکتا۔دوسری چیز ذہن میں یہ آتی تھی جھوٹ نہ بولے فریب کھا سکتا ہے۔حضور ﷺ کی زندگی جیسا انسان نہ فریب خوردہ ہو سکتا ہے نہ فریب دینے والا ہو سکتا ہے۔ یہ ایمان تھا میرا جو مجھے بچا گیا عزیزانِ من! جو آپ سامنے آج قرآن پیش کر رہا ہوں۔ساری عمر جس کے بعد پھر قرآن اور قرآن لیے جا رہا ہوں۔صرف یہ ایمان میرا جو تھا حضور ﷺ کی سیرت کے اوپر کہ حضور ﷺ جھوٹ نہیں بول سکتے جلدی نہ کرو حضور ﷺ جھوٹ نہیں بول سکتے۔بچاتا تھا یہ' جب بھی زور کا دھکا لگتا تھا یقین پہ' شکوک ابھرتے تھے ایک چیز بچاتی تھی کہ نہ جس نے یہ قرآن دیا تھا اس کی سیرت میرے سامنے تھی' حضور ﷺ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔عزیزانِ من! یہ وہ معجزہ تھا میں اپنے متعلق یہ کہتا ہوں کہ جس نے اس زمانے کے مخالفین کی بھی زبانیں بند کر دیں۔ عزیزانِ من! تیئس سال حضور ﷺ نے یہ دعویٰ کیا جس کے متعلق مخالفین یہ کہتے رہے کہ نہیں یہ چیز خدا کی نہیں ہو سکتی یہ کرو' کسی ایک شخص نے آپ کی سیرت کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔معجزہ یہ ہے۔اور دنیا میں اپنی بات کے سامنے وہی سر جھکوا سکتا ہے دوسرے کا جو اپنا کریکٹر اس طرح سے پیش کرے۔کوئی منطق دوسرے کو قائل نہیں کر سکتی عزیزانِ من!۔اور میں تو آج بھی جس کے سامنے قرآن پیش کرتا ہوں پہلے رسول

اللہ ﷺ کی سیرت پیش کرتا ہوں۔ کہتا ہوں کہ جاؤ اپنے Sources سے تم تحقیق کرو اور دیکھو کہ کیا سیرت تھی اس شخصیت ﷺ کی۔ پھر آؤ اس مقام کے اوپر کہ ہاں ایسا شخص فریب خوردہ بھی نہیں ہوسکتا اور فریب دہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس قدرِ مشترک کے بعد پھر اس سے گفتگو آگے کرتا ہوں کہ آؤ اب تمہیں میں بتاؤں کہ یہ فکرِ انسانی کی تخلیق کیسے نہیں ہوسکتی۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ کتنی عظیم چیز ہے جو قرآن دے رہا ہے۔

مملکت دی تمہیں دیکھنے کے لیے کہ تم کیا کرتے ہو۔ تم نے بھی اگر اسی طرح سے ظلم اور جرائم کی باتیں کیں تو یاد رکھو جھٹکے آئیں گے اور آخرالامر پھر تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تیار ہوگئے اس کے لیے کہ ہاں ہم اس کے مطابق حکومت قائم کریں گے۔ مفاد پرستیاں ابھریں تقاضا یہ ہوا کہ اس سے انکار نہیں ہم کرسکتے لیکن اس میں کچھ تبدیلی کردیں کچھ مداہنت کوئی Compromise تھوڑا سا تبدیلی اس میں کردیجیے۔ جواب ملا یہ میرے اختیار کی بات نہیں ہے میں کر ہی نہیں سکتا اس کے اندر تبدیلی۔ اس لیے کہ میں اس کا واضع قوانین ہوں نہیں' یہ تو مجھے ملے ہیں کہیں سے' وہ پیش کررہا ہوں۔ یہ اگلی آیت آ گئی کہ میں تو صرف انہیں پیش کررہا ہوں۔ خدا کی مشیت نہ ہوتی تو اس کا علم ہی نہ وہ تمہیں دیتا۔ وہ تمہیں اس کا علم نہ دیتا جنہیں میں پیش کررہا ہوں۔ کیا بات ہے دو لفظوں کی عزیزانِ من!۔ اور اس کے بعد پھر اگلی چیز یہ کہ یہ بات کہ تمہاری فکر کا نتیجہ نہیں تم خود انہیں نہیں بنا رہے ان قوانین کو صرف پیش کررہے ہو ثبوت اس کا کیا ہے۔ کہا کہ ثبوت یہ ہے میری عمر تمہارے اندر گذری ہے۔ اللہ اکبر۔ (فمن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبًا) (10:17) کہا اس کے بعد سوچو عمر میری پہ نگاہ رکھو۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو خود جھوٹ کو وضع کرے اور خدا کی طرف اسے منسوب کرے۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے خدا کی طرف منسوب کرے اپنی بات۔ تو کیا تم سمجھتے ہو میری پچھلی سیرت سے جو تمہارے اندر میں نے زندگی اپنی گذاری ہے کہ میں اتنے بڑے ظلم کا مرتکب ہوسکتا ہوں اس افتراء کا اس جھوٹ کا۔ کوئی چھوٹی بات ہے یہ جو تم کہہ رہے ہو۔ اس سے بڑا ظالم اور کون ہوسکتا ہے۔ اور جب یہ چیز آ گئی تمہارے سامنے تو پھر آگے سن لو۔ (او کذب بایٰتہ) (10:17)

پھر اس کے بعد اس سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے پھر جو اس کی آیات کی تکذیب کرے۔ وہ جو جھوٹ بول کے کہے کہ یہ خدا کی آیات ہیں یہ کہہ کے پیش کرے درآں حالیکہ اپنی ہوں۔ اور جس کے سامنے خدا کی آیات پیش ہوں اور وہ ان کی تکذیب کرے وہ۔ کہو ان سے زیادہ ظالم کون ہوگا۔ میں اور تم دونوں شامل ہوگئے۔ کہا ہوگا انہوں نے کہ اچھا بھئی دیکھ لیں گے۔ اگلی بات اب یہ آئی دعویٰ تو اتنا بڑا یہ کردیا اس کا ثبوت کیا ہے کہ ظالم اور مجرم جو ہیں وہ تباہ ہوجاتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں ظالم نہیں ہوں ہمیں کہتے ہو کہ ہم ظالم ہیں' تم نہیں ہو کیونکہ تم افتراء نہیں کرتے خدا کے خلاف' یہ تمہارا دعویٰ ہے۔ ہمیں کہتے ہو کہ تم خدا کے قوانین کو سچا تسلیم نہیں کرتے تم ظالم ہو تم مجرم ہو۔ یہ تمہارے دعوے ہیں ثبوت کیا ہے۔ آگے آیئے قرآن کی طرف عزیزانِ من!۔ ثبوت کسی دعوے کا کیا ہوتا ہے۔ یہ دوائی لے جایئے دیجیے تین گھنٹے کے بعد آپ دیکھیں گے بخار اتر جائے گا۔ کیا ثبوت ہے اس دعوے کا۔ ثبوت سیدھا سا ہے دوائی دیجیے تین گھنٹے کے بعد دیکھئے۔ کیا ثبوت ہے اس

بات کا کہ یہ جو میٹھا اتنا ڈالیے تو چائے میٹھی ہو جائے گی۔اس میں ڈالیے چمچی اور پی کے دیکھئے۔اسے کہتے ہیں Pragmatic Test آج کی اصطلاح میں' دعوے کا ثبوت نتائج سے۔کہا تم نے یہ دعویٰ ہے کہ ظالم اور مجرم جو ہیں یہ تباہ ہوتے ہیں۔تم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تم نہیں ظالم اور مجرم۔تم نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم ہیں ظالم اور مجرم۔اس کا ثبوت کیا ہوگا؟ کہا ثبوت اس کا یہ کہ (**قل یٰقوم اعملوا الا مکانتم انی اعملوا**) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو جو نظام تم دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہو یہ ظلم کا یہ جرم کا یہ استحصال کا یہ استبداد کا ان کی خلاف ورزیوں کا یہ تم کرو۔(**انی اعمل**) میں ان کے مطابق نظام وضع کرتا ہوں۔(**کیف تعلمون**) اس کے بعد نتائج خود بتا دیں گے کہ دعویٰ کس کا سچا ہے۔اور دعویٰ میرا یہ ہے کہ (**انہ لا یفلح المجرمون**) (10:17) تم دیکھ لو گے کہ مجرم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھا کرتی۔کتنی عجیب چیز منطقی چلی آ رہی ہے۔کس قدر Practical Religion ہے دین ہے یہ۔کوئی چیز یونہی اعتقاداً نظری طور پہ نہیں منوا رہا۔عملاً کر کے دیکھ لو بھائی۔کہیں اس نے کہا کہ (**انہ لا یفلح الظٰلمون**) ظالم کی کھیتی نہیں پنپ سکتی۔کہیں مجرمون کہا' جرائم جہاں عام ہو جائیں وہاں کھیتیاں نہیں پکا کرتیں۔وہ تو دوسرے ہی کاٹ کے لے جاتی ہیں پکے گی کیا۔کہا یہ ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہاں تم نے دیکھ لینا پھر۔اور اس کے بعد عزیزانِ من! عرصہ ہی کونسا تھا وقت ہی کتنا تھا حضورﷺ کے پاس۔اس زمانے میں جب نہ یہ وسائلِ رسل و رسائل اتنے عام تھے نہ مواصلات کا کوئی سلسلہ تھا۔ایک جگہ سے پیغام دوسری جگہ بھیجنے والی بات ہوتی تھی تو تین سو میل کا فاصلہ تو مکے اور مدینے میں تھا۔تیز رفتار سواری گھوڑا یا اونٹ ہی ہو سکتی تھی نا۔آپ سوچئے تو سہی ان حالات میں اتنے سے وقت کے اندر مدینے میں جا کے یہ نئی زندگی شروع ہوئی ہے نا ' اتنے سے وقت میں ان حالات کے ماتحت دس لاکھ مربع میل زمین کے اوپر مملکت قائم کی۔کہہ سکتے ہو کہ مملکت تو چنگیز بھی اتنے میں قائم کر سکتا ہے۔لیکن وہ قائم اس طرح کی تھی کہ جو حضورﷺ نے فرمایا کہ فرق یہ ہے اس میں اور رومن اور ایرانیوں کی مملکت کے اندر کہ اس مملکت کے اندر یمن سے ایک عورت تنہا سونے میں لدی پھندی ہوئی ان صحراؤں اور جنگلوں اور میدانوں اور پہاڑوں میں تنہا یہاں یمن سے چلے شام تک پہنچے راستے میں اس کو خوف کا وسوسہ تک دل میں نہ آئے۔قربان جائیں اس کہنے والے کے اوپر بھی۔بات بھی عورت کی کہی کہ جس کو دنیا میں سب سے زیادہ کمزور گنا جاتا ہے۔زیورات بھی پہنا دیے کہ اتنی بڑی Attraction عزیزانِ من! دو Attractions ہو گئیں یہاں' زن اور زر کی دو Attractions جمع کر دی حضورﷺ نے اس میں۔چلایا بھی بستیوں میں سے نہیں ہے کہ وہاں سپاہی اور گارڈز اور فوجیں کہیں ہوں۔صحراؤں سے جنگلوں سے چلاتے چلے جا رہے ہیں اتنا لمبا عرصہ۔یہ نہیں ہے کہ کسی نے آ کے ہاتھ نہیں ڈالا' اس کے دل میں خیال تک نہ گذرے کہ مجھ پہ کوئی خطرہ آ سکتا ہے۔اور جن کے سامنے دعویٰ کیا تھا انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کے پروگرام کے مطابق جو کچھ انہوں نے کیا۔سات برس تک انہوں نے کچھ کمی نہیں کی' پوری پوری کوششیں کر دیں کہ یہ پروگرام کامیاب نہ ہونے پائے۔لیکن حق کے تو اندر اتنی قوت ہوتی ہے عزیزانِ من! بس اس کو تو تھوڑی سی سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لیے کہ اس نے بہرحال اس محسوس دنیا کے اندر نتائج پیدا

کرنے ہوتے ہیں نا۔تو محسوس دنیا میں محسوس اسباب تو ضروری ہوتے ہیں اس کو دینے۔بس اتنے سے اسباب دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ اس پروگرام کی حقانیت وہ خود ابھرتی ہے۔وہ جو قرآن نے کہا ہے عظیم چیز ہے وہ جب میں وہاں آؤنگا سورۃ ابراہیم میں ہے غالباً کہ خوشگوار نظریۂ حیات کلمہ جسے کہا ہے قانون' (**یصعدوا علیه**) اس میں یہ صلاحیت خود موجود ہوتی ہے کہ وہ ابھر کر اوپر کی طرف اپنے اس نصب العین کی طرف خدا کی طرف جسے کہتے ہیں وہ اس کے اندر یہ چیز ہوتی ہے۔جیسے ہر اچھے بیج کے اندر صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نمود سے کونپل بنتا ہے ابھرتا ہے۔یہ اس کے اندر صلاحیت ہوتی ہے یہ ہے حق کی صلاحیت۔اور آگے ہے(**و العمل صالح یرفعه**) اور صلاحیت بخش کام جو ہیں انسانوں کے پھر وہ تیزی سے اس کو اوپر لے جاتے ہیں۔عربی جاننے والے جانتے صعد پہلے کہا ہے رفع دوسری جگہ کہا ہے۔کیا بات ہے صاحب اس زبان کی اور کیا بات ہے اس قرآن کی۔کلمۂ طیبہ یصعد واعلیہٗ عملِ صالح یرفعہ۔بس اتنا سا چاہیے۔نمود کی اور نمو کی تو صلاحیت اس کے اپنے اندر ہوتی ہے۔بس عملِ صالح جو انسان کا ہے وہ اس کے ارتفع میں مدد دیتا ہے۔جیسے یہ کسان کی محنت جو ہے زمین تیار کرتا ہے اس کے اندر کھاد ڈالتا ہے پھر میلائی کرتا ہے اس کی خس وخاشاک کو اس سے دور کرتا ہے حفاظت کرتا ہے پانی دیتا ہے دیکھتا ہے کہ روشنی صحیح اور دھوپ آجائے۔یہ سارے عملِ صالح ہیں۔اس بیج میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اگ پڑے۔کسان کے یہ اعمالِ صالح اس کو ارتفاع بخشتے ہیں ۔قرآن ہے عزیزانِ من! اس کی تشبیہات بھی' یہ سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔یہ اس لیے تھا جو چیلنج دیا تھا کہ ٹھیک ہے تم یہ کہتے ہو کہ جو میں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہمارا پروگرام ناکام رہے گا تمہارا پروگرام حق پہ مبنی ہے کامیاب ہوگا۔دعویٰ کیا ہے۔یہ ٹھیک ہے تم نے یہ کہہ دیا ہم لاجواب ہوگئے کہ تمہارا کریکٹر تو ایسا ہے کہ تم نے جھوٹ نہیں بولا۔لیکن یہ بات کہ اس میں واقعی یہ صلاحیت ہے اس کا ثبوت کیا ہے۔کہا ثبوت یہ ہے تم اپنی جگہ اس کے خلاف قائم کرنا چاہتے ہو نا ایسی حکومت قائم کرلو وہ تو ہے تمہارے ہاں اپنا معاشرہ۔میں اس نظام کے ماتحت اس ایک معاشرہ قائم کرتا ہوں۔(**سوف تعلمون**) تمہارے سامنے یہ بات آجائے گی کہ کون کامیاب ہوتا ہے۔(**انه لا یفلح المجرمون**) (10:17) تم دیکھ لو گے کہ جہاں جرائم ہوتے ہوں وہ معاشرہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔بات پھر یفلح کی کہی ہے۔تشبیہ میں بھی لفظ لاتا ہے قرآن تو اسی کا لاتا ہے۔ فلاحت یا فلح تو کاشتکاری کو کہتے ہیں نا۔فلاح آج بھی آپ نے سنا ہوگا مصر میں کاشتکاروں کو کہتے ہیں ابھی تک۔یفلح لفظ لایا ہے کامیابی کے لیے یہاں۔کھیتی نہیں پنپ نہیں سکتی' کر کے دیکھ لو کہا۔اور اسکے بعد پھر قرآن کی حقانیت کا بھی ثبوت مل گیا میری صداقت کا بھی ثبوت مل گیا جو تم چاہتے ہو صاحب۔اور یہ مل گیا پھر یہ کہنے کے بعد کہ سن رکھو تمہیں ہم نے مملکت دی تاکہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔اگر اس کے مطابق یہ کچھ کرو گے تو یاد رکھو سربلندیاں سرفرازیاں حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔ظلم اور استبداد اور جرم اور استحصال یہ کچھ تمہارے ہاں عام ہوگا پہلے چھوٹے چھوٹے جھٹکے آئیں گے چھوٹی چھوٹی تباہیاں ہوتی چلی جائیں گی۔اور یہ کچھ نہیں ہوگا تو اس کے بعد(**یستبدل قومًا غیرکم**) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے لے گی۔(**ثم لا یکونوا امثالکم**) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔سورۃ یونس کی آیت 17 تک ہم آگئے عزیزانِ من!

آیت 18 سے ہم اگلی دفعہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ پانچواں باب (آیات 18 تا 23)

عزیزانِ من!

آج اگست 1973ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 18 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (10:18)

لیکن آج میری صورت یہ ہے کہ سینے میں جذبات کا اتنا تلاطم ہے کہ اس میں میں دیکھتا ہوں کہ فکر کے پاؤں کہیں ٹکنے ہی نہیں پا رہے۔ میں طبعًا کافی سہار اور برداشت کا انسان ہوں' ذاتی حوادث اور مصائب کا تو کبھی میں ذکر نہیں کیا کرتا۔ اجتماعی اور ملی حوادث کی کیفیت یہ' 12-1911 میں؟؟ وار ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں عمر میری چھوٹی سی تھی لیکن احساسات اسی وقت سے بیدار ہو چکے تھے۔ وہاں سے یہ جو اس ملتِ مرحومہ پر حوادث کی یلغار دیکھنی شروع کی تو گویا ساٹھ برس ہو گئے اس واقعہ کو۔ مسلسل اور پیہم اسے انہی آفات کا شکار پایا۔ یہ دور ہی وہ ہے جس میں سے ہم گذر رہے ہیں کہ اس امت پر تو خوشیوں کا دن شاید ہی کوئی آتا ہو اس کی تو عید بھی غم میں گذرتی ہے۔ لیکن ان چیزوں کو برداشت کیے چلا آ رہا تھا۔ گذشتہ دو سال سے جو کچھ ہم پر بیت رہی ہے وہ ایسا تھا کہ اس کا ایک مجموعی تاثر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا چلا گیا۔ یہ مملکت جیسا کہ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں میرے ایمان کے تقاضے کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ آدھی مملکت چلی گئی' باقی آدھا حصہ جو ملک کا رہ گیا اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جا سکے کہ اس حصۂ ملک میں بھی شاید ہی کوئی فرد ہوگا جو اطمینان کی نیند سو سکتا ہو۔ یہ آج کی حالت ہے اور مستقبل اس سے بھی تاریک تر نظر آتا ہے۔ لیکن وہ جو اس نے کہا تھا کہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یہ مرگِ ناگہانی اس سیلاب کی شکل میں ہم پر مسلط ہو گئی۔ ایسا عالمگیر سیلاب کہتے ہیں تاریخ میں کہیں اِدھر نہیں آیا۔ آگ سے بھی تباہی ہوتی ہے لیکن آگ سے تو اس کے رخ سے ذرا پیچھے انسان ہٹ جائے تو محفوظ ہو جاتا ہے۔ زلزلے کی تباہی بڑی ہی شدید ہوتی ہے لیکن وہ ایک مقام کی تباہی ہوتی ہے۔ اس تباہی کی تو کیفیت یہ ہے کہ یوں کہیے کہ جہاں سے مغربی پاکستان کا میدانی علاقہ شروع ہوتا ہے وہاں سے لے کے جہاں یہ علاقہ ختم ہوتا ہے میدانی علاقہ دریاؤں کے پاس کو کہا جاتا ہے۔ سارا ملک پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور ہر صبح جو نئی خبریں آتی ہیں وہ پہلی خبروں سے بھی زیادہ اندوہ ناک اور افسردہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ ابھی کچھ اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس تباہی کی شدت اور وسعت کتنی زیادہ ہے۔ لیکن ایک چیز جس سے میرے ان زخموں پر نمک چھڑکا جاتا ہے وہ اور ہے۔ ان علاقوں کے لوگ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں بے کس بے بس مجبور۔ اور ان کے متعلق کہا یہ جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا مل رہی ہے' یوں ان گناہوں کی پاداش میں یہ کچھ ہو رہا ہے۔ دنیا تو ان کی یوں

تباہ ہوئی تھی اوران مرنے والوں کے کان میں اگر آخری لفظ یہ ڈالا جائے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہورہا ہے تمہارے گناہوں کے بدلے میں ہو رہا ہے گویا بڑے ہی گناہگار تھے تم جس کی وجہ سے یہ سزا پارہے ہو۔سوچو تو سہی کہ ان کے اوپر کیا بیتی ہوگی یہ سن کر۔کوئی نہیں اتنا یہ سوچتا کہ کیا یہ سارے گناہ شکر گڑھ سیالکوٹ سے لے کے اور درمیانی علاقے لاہور سے جو اس پار شاہدرہ پھر شرق پور شیخوپورہ اور یوں گذرتے ہوئے آگے پھر سکھر اور دادو اور یہ۔سارے ملک کے گناہ جو تھے وہ سمٹ کے ان علاقوں کے لوگوں کے حصے میں آئے تھے۔راوی کے اس پار شاہدرہ والے جتنے تھے سارے فاسق اور فاجر اور ہم بڑے متقی اور پرہیز گار۔کیونکہ ان پر تو یہ عذاب آیا ہم تو عذاب یہ نہیں آیا۔سوچئے ذرا کہ یہ بات کہاں پہنچتی ہے ان پر کیا بیتی ہے جن سے یہ کہا جاتا ہے۔کیا فرق ہے ان میں اور ہم میں۔وہ راوی اگر اپنا رخ شرق پور اور شیخوپورہ کی طرف نہ کر لیتا اور ادھر کا بند ٹوٹ جاتا ہم بھی اسی عذاب کے اندر مبتلا ہو جاتے۔تو آج جو ہم بچے ہوئے ہیں تو کیا ہم اپنی نیکیوں کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں؟ اور وہ جو تباہ ہوئے ہیں وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے تباہ ہوئے ہیں؟۔میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ چیز کیا ہے۔ٹھیک ہے الفاظ تو یہ استعمال ہوتے ہیں ان کے مفہوم غلط ہیں۔اور اس میں ایک سازش ہے۔یہ طبعی حوادث ارضی اور سماوی یہ زمین کے رہنے والوں کے گناہوں کی وجہ سے نہیں آتے۔یہ طبعی قوانین ہیں فطرت کے' یہ ان کے مطابق سب کچھ رونما ہوتا ہے۔سیلاب کیا ہے۔عام Average اور اوسط سے زیادہ بارشیں خاص علاقے میں ہوئیں اوپر کا علاقہ جنہیں کہا جاتا ہے' وہ پانی حدِ اعتدال سے بڑھ گیا' دریاؤں کے سواحل میں اس کی سمائی نہ ہوئی وہ بپھر کر ادھر اُدھر پھیل گیا۔یہی ہے نا جسے سیلاب کہا جاتا ہے۔اس میں ان گناہوں کا کیا دخل ہے۔

دنیا کے جن ممالک نے ان چیزوں کا انتظام کر رکھا ہے ان کے ہاں بارشیں برستی ہیں سیلاب بھی آتے ہیں۔ابھی میں عرض کرونگا تباہیاں نہیں آتیں۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہالینڈ کا ملک سطحِ سمندر سے نیچے ہے' سمندر کے ساتھ واقع ہوا ہے اس کی سطح سے نیچے ہے۔سمندر کی' کسی جھیل کی دریا کی نہیں۔انہوں نے بند باندھا ہوا ہے انہوں نے زمین ہی اپنی سمندر سے کھینچ کے لی تھی۔سوچئے تو سہی کہ اس قسم کے بند کے نیچے جو زندگی گذار رہے ہوں کس قدر خطرہ مول لے رکھا ہے۔لیکن ایک قطرہ پانی کا اس میں سے نہیں ٹپکتا۔یہ نہیں کہ ہالینڈ کے رہنے والے ہماری اصطلاح کے مطابق بڑے نیک واقع ہوئے ہیں۔طبعی حوادث' ان حوادث کے متعلق تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ (**سخر لکم ما فی السمٰوٰت و الارض جمیعًا**) یہ شے کیا ہیں یہ بارش اور بارش کا پانی' وہ تو کہتا ہے کہ ارض وسما کے اندر یہ نظام جو ہے اس کے اندر جتنی قوتیں ہیں ہم نے انسان کے تابع فرمان کر رکھا ہے ان کو' مسخر کر رکھا ہے اپنے قانون کی زنجیروں میں۔جو قوم بھی ان قوانین کا علم رکھتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرتی ہے یہ پانی یہ ہوائیں یہ جھکڑ یہ زلزلے یہ آندھیاں یہ سارے مسخر ہوتے ہیں۔جاپان کی سرزمین' ہر آئے دن وہاں زلزلے آتے تھے۔زمین کے نیچے جو زلزلہ آتا ہے اس پہ تو اختیار نہیں تھا۔زمین کے اوپر تباہی مچتی تھی نا۔مدت العمر وہ تجربے کرتے رہے اور سوچتے رہے اور اس کے بعد ایسے مکانات انہوں نے ایجاد کر لیے کہ زلزلے آتے ہیں اور کوئی مکان گرتا ہی نہیں۔وہ ان لوگوں کے مقابل میں

زیادہ نیک نہیں ہیں کہ جن کے ہاں زلزلے تباہیاں اب بھی مچا رہے ہیں۔ جسے تباہی کہا جاتا ہے وہ ہوتی کیا ہے۔ یہی سیلاب کا پانی جہاں سے آیا تھا وہ پہاڑوں سے گذرتا میدانوں سے گذرتا جنگلوں سے گذرتا لیکن ان علاقوں سے گذرتا جن میں کوئی انسان نہیں بستا تھا۔ تو گذر کے راستے اپنے راستے پہ چلتا اور چلتا چلتا سمندر میں جا گرتا' یہ تباہی تو ایک طرف رہی کسی ایک فرد کو بھی یہ ہلاک نہ کرسکتا۔ تباہی اس وقت یہ کہی جاتی ہے جب اس کی زد میں انسان آتا ہے۔ اور انسان وہ اس کی زد میں آتا ہے جس کے پاس حفاظتی تدبیر نہیں ہوتی۔ اسی کو تباہی کہتے ہیں نا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سیلاب کی تباہی تمام تباہیوں سے زیادہ عالمگیر اور شدید ہے۔ اور اسی لیے قرآنِ کریم نے جن تباہیوں کا ذکر کیا ہے اس میں سب سے پہلے طوفان ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس طوفان سے بچنے کی تدبیر کیا بتائی۔ حضرتِ نوحؑ اور ان کے ساتھی جو تھے ان کے مومن اور نیک ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ محض نیک ہونا اگر ان طوفانوں سے بچا سکتا تو انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہا یہ گیا حضرتِ نوحؑ پیغمبر سے کہ طوفان آنے والا ہے کشتی بناؤ اس سے بچ جاؤ گے۔ ایک پیغمبر اور اس کی اولیں امت جو ایمان اور عملِ صالح کے مجسمے ہوتے ہیں وہ بھی اگر اس حادثے سے اس طوفان سے بچے ہیں حفاظتی تدبیر کی رو سے بچے ہیں۔ حفاظتی تدابیر نہ ہوں تو یہ تباہیاں لاتے ہیں حوادث' حفاظتی تدابیر موجود ہوں تو یہ کوئی تباہی نہیں لاتے۔ قرآن نے یہ واقعہ ذکر کرکے بتادیا ہمیں کہ یہ حوادث آتے رہیں گے ان سے بچنے کی تدبیر یہ ہوگی۔ ان لوگوں کے سامنے حضرتِ نوحؑ کشتی بنا رہے تھے وہ مذاق اڑا رہے تھے اس چیز کا' یہ تھی ان کی سرکشی یہ تھی ان کی معصیت۔ اگر وہ اپنی جذبات کی تاریکیوں میں نہ ہوتے ضد نہ کرتے کہ جو کچھ یہ کرے گا ہم نے اس کے خلاف کرنا ہے۔ دیکھ رہے تھے سامنے کہ یہ کچھ کر رہا ہے بتا بھی وہ رہے تھے کہ یہ اس لیے کر رہا ہوں۔ اگر وہ بھی کشتیاں بنا لیتے وہ بھی بچ جاتے۔ یہ جو گناہ ہے جس کی پاداش میں وہ ڈوبے یا ہم ڈوبے اور ڈوبنے والے ڈوبتے ہیں وہ جو نیکی جس سے بچنے والے بچے بچ سکتے ہیں۔ جہاں تک یہ فطرت کے حوادث کا تعلق ہے میں وہاں تک گفتگو کر رہا ہوں۔ وہ یہی ہے کہ جو قوم صحیح تدابیر نہیں کرتی ان پہ تباہی آجاتی ہے' جو ان کے لیے تدبیریں کرلیتی ہے وہ تباہیوں سے بچ جاتی ہے۔ جسے گناہ کہا جاتا ہے گناہ کا لفظ نہ استعمال کیجیے کہ ہمارے ذہنوں میں اس سے خاص قسم کا تصور آتا ہے' نیکی کے متعلق بھی ہمارا تصور محدود ہوگیا ہے۔ کہیے کہ یہ تباہی آتی ہے قوم کے اس اجتماعی جرم کے بدلے میں کہ اس نے اس سے بچنے کی تدبیریں اختیار نہیں کی تھیں۔ جرائم کہیے عزیزانِ من! گناہ نہ کہیے۔ کہ یہ سارے بچنے والے معتبر ایک طرف ہو کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان مرنے والوں کے کان میں آخری وقت میں یہ ڈال دیتے ہیں کہ تم گناہگار تھے تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں یہ کچھ ملا۔ آواز یہ بلند ہونی چاہیے کہ جو ذمہ دار افراد تھے ان کے مجرمانہ تغافل کی بناء پر یہ سب کچھ ہوا' جرائم کی وجہ سے یہ ہوا اور جرائم یہ ہیں۔ غالباً 1955ء میں یہاں عالمگیر سیلاب آئے تھے۔ میں یہاں سے دور تھا اس زمانے میں کراچی میں تھا' اتنا قریب ہو کے نہیں دیکھا تھا۔ 55 کے بعد یہ 18 سال کا عرصہ ہوگیا۔ مجھے پہلے علم نہیں تھا معلوم ہوا ہے کہ اس زمانے میں Flood Control Commission مقرر کیا ہوا تھا اور وہ آج تک مقرر ہے۔ 18 سالہ کا عرصہ کچھ کم عرصہ نہیں ہوتا اس عرصے میں یہ

بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہمارے ہاں سیلاب کیوں آتے ہیں اور اکثر آتے رہتے ہیں۔ان کی شدت میں کمی بیشی ہوتی ہے اکثر آتے رہتے ہیں۔ دریاؤں کے راستے میں جو بھی ملک ہوگا وہاں امکان ہے اس چیز کا کہ سیلاب آجائیں۔ان کے آنے کی وجوہات ہوتی ہیں' طبعی وجوہات (Physical Causes)' انہیں معلوم کیا جائے۔اس کے بعد ایک Plan بنایا جائے لمبے عرصے تک کے لیے کہ تجھ پہ قابو نہیں دل پہ تو ہے قابو اپنا۔اس بارش پہ قابو اگر ہمارا نہیں ہے جہاں یہ برستی ہے وہ بارش جو تباہیاں لاتی ہے اس تباہیوں کے لیے تو حفظِ ماتقدم کے طور پر تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔اس پندرہ سال کے عرصے میں اگر ہم پچھلے Flood سے ان طوفانوں سے ایک سبق حاصل کرتے اور اس دوران میں اس کے لیے یہ تدابیر اختیار کی جاتیں تو یہ تباہیاں کبھی نہ آتیں۔سیلاب آتا تباہیاں نہ آتیں۔جس نسبت سے ہماری تدبیریں ہوتیں اس نسبت سے تباہیاں کم ہوتیں۔ یہ مجرمانہ تغافل تھا جس کی وجہ سے یہ عالمگیر تباہی ہوگئی ہمارے ہاں۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ الفاظ خاص طور پہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہمارے دورِ ملوکیت کے اندر وضع ہوئیں یہ سازش تھی۔ جب بھی اس قسم کا کوئی ارضی یا سماوی حادثہ پیدا ہوا۔ یہ راجہ اور برہمن کی ملی بھگت' بادشاہ اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ۔انہوں نے مساجد میں خانقاہوں میں میدانوں میں شروع کر دیا چلانا' قوم کو رعایا کو اس زمانے میں یہ کہنا کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے یہ ہوتا ہے۔تاکہ کسی کی توجہ ادھر اٹھنے نہ پائے کہ یہ جو ذمہ دار بیٹھے ہوئے ہیں اوپر یہ ان کے جرائم کی وجہ سے ہوتا ہے۔تم توبہ کرو تم استغفار کرو تم نفل پڑھو تم خدا کے حضور گڑگڑاؤ۔لگا دو انہیں اس طرف تاکہ ان میں سے کوئی اٹھ کے اس سے نہ پوچھے جو تخت کے اوپر بیٹھا ہوا ذمہ دار ہے کہ تم نے جو اس خطۂ زمین کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کے لیے کیا کیا تم نے' تم مجرم ہو تم ملزم ہو توبہ تمہیں کرنی ہوگی۔اور تبوہ کے معنی یہ ہیں کہ پہلی دفعہ اگر ہوا ہے تو اس کے بعد یہ توبہ کرو کہ دوبارہ نہیں ہوگا دوبارہ اگر ہوگا تو بخشے نہیں جاؤ گے۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! ان الفاظ کے معنی اب کیا ہوگئے۔ کہنے کی بات یہ تھی۔انہوں نے توجہ ہی ادھر نہیں مڑنے دی۔ ہماری ساری تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ جو جن تباہیوں کے ذمہ دار تھے توجہ اس طرف نہیں اٹھنے دی۔ بھوکے مر رہے ہیں صاحب دنیا مر رہی ہے بھوکی' وعظ پر وعظ ہو رہے ہیں کہ کوئی نہیں رزق تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ بھوکے مر رہے ہو اُس سے جا کے پوچھو' اِس سے نہ پوچھو جو ذمہ دار بن کے بیٹھا ہوا ہے جس کی بدنظمی کی وجہ سے یہ بھوک اور پیاس آ رہی ہے۔ بیماریاں پھیل رہی ہیں صاحب' خدا کی طرف سے یہ تازیانۂ عبرت برسائے جا رہے ہیں کوڑے' غضب ہے خدا کا' عذاب ہے اس کا۔ یہ ذمہ دار نہیں ہے جو اقتدار کی کنجیاں ہاتھ میں لیے تخت پر بیٹھا ہے۔ نگاہوں کا رخ اُدھر آنے نہیں دیتے۔ یہ ہوتی ہے ابلیسی ملوکیت' یہ ہوتی ہے اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کی سازش کہ اصل Cause اور سبب کی طرف نگاہ نہ اٹھنے دے۔بھوک ہو افلاس ہو' رزق خدا کے ہاتھ میں ہے ہر مصیبت اس کی طرف سے آتی ہے ہر عذاب اس کی طرف سے آتا ہے اِن کی وجہ سے نہیں آتا۔وجہ تمہارے گناہ ہوتے ہیں۔تدبیر: گڑگڑاؤ روؤ تم توبہ کرو' اِسے جو کچھ کرتا ہے کرنے دو۔یہ ہے عزیزانِ من! وہ چیز کہ جس سے یوں کہیے کہ ہم تو اتفاق سے بچ گئے یا جوان میں سے اپنی تدبیر سے بچتے ہیں یعنی انہوں نے تدبیریں یہ

کی ہوتی ہیں کہ ایسے حوادث آئیں بھی تو ہم بچ جائیں۔ایک تو ہم اس تباہی سے بچ جاتے ہیں پھر اپنے ذہن میں غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم گناہگار نہیں ہیں۔ یہ خدا کا عذاب تو گنہگاروں پہ آتا ہے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے آتا ہے یہ مرنے والے جو ہیں یہ سارے کے سارے یہ گناہگار ہیں فاسق ہیں فاجر ہیں گناہگار ہیں۔قرآنِ کریم' عزیزانِ من! نگاہوں کا زاویہ بدل دیتا ہے وہ ہر حادثے اور ہر واقعہ کے سبب کی طرف پہلے رخ کو موڑتا ہے۔ یہ پتہ لو کہ یہ کیوں ہوا ہے۔خدا بار بار کہتا ہے کہ ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے' یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتیں ہوتی ہیں۔تو پہلی چیز یہ ذہن کے اندر قرآن راسخ کر دیتا ہے کہ جب بھی کوئی مصیبت آئے تو یہ دیکھو کہ وہ ہاتھ کونسے ہیں جن کی لائی ہوئی یہ مصیبت ہے۔اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ یہ ہمارے ہاتھوں کی لائی ہوئی نہیں ہے اُس کی طرف سے یہ کسی طرح آتی ہے۔اس کی طرف سے آنے کے معنی ہوتے ہیں اس کے قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔قوانین کہیے۔قانون اس کا یہ ہے کہ اگر سیلاب کے راستے میں پانی کے راستے میں مکان بناؤ گے اور حفاظتی تدبیر نہ کرو گے تو پانی تمہارے مکان کو بہا کر لے جائے گا۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ یہ مکان والا اگر اس پانی کی رہگذر میں مکان بناتا ہے حفاظتی تدبیر نہیں کرتا' پانی آتا ہے بہا کے لے جاتا ہے۔تو جب یہ کہا جائے گا کہ خدا کی طرف سے یہ ہوا' کہو کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا یہ نتیجہ ہوا۔اور قانون یہ تھا کہ سیلاب کی رہگذر میں یا تو بستی بساؤ نہیں' بساؤ تو اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کریں کہ پانی کی موجیں آئیں سر ٹکرا کے دوسری طرف چلی جائیں۔انسان کو تو بلا بنایا ہے اس نے' ساری کائنات وہ کہتا ہے کہ تابع تسخیر ہے تمہارے ہاں۔ یہ جو چیز تھی کہ کائنات کی قوتوں کو جو قوم مسخر نہیں کرتی وہ خدا کی معصیت کرتی ہے وہ گناہگار ہے۔

ہم نے خدا کے ان قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ جو قوانینِ فطرت ہیں ان کے متعلق تو سمجھا یہ ہے کہ یہ کسی اور کے بنائے ہوئے ہیں۔قوانینِ فطرت کا اتباع کرنے والی قومیں ملحد ہیں بے دین ہیں دہریے ہیں یہ ہیں وہ ہیں ایک دم Condemn۔دوسرا حصہ ہے وہ خدا کے قوانین کا جنہیں ہم اپنے ہاں نیکی اور بدی کا معیار قرار دیتے ہیں۔عزیزانِ من! یہ دونوں قوانین خدا کے ہیں ان دونوں قوانین کی صداقت پر ایمان لانا ایمان اور مومن بناتا ہے۔ان دونوں کا اتباع کرنا عملِ صالح ہے۔ان دونوں کی معصیت کرنا خدا کی معصیت ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کے اندر جب ان کو الگ الگ آپ رکھ دیتے ہیں یہ شرک ہو جاتا ہے۔وہ قومیں کہ جنہیں دہریہ ملحد بے دین کہتے ہیں وہ یہ جو حصہ ہے خدا کے قوانین کا وہ ان کی صداقت پر تو ایمان رکھتے ہیں ان کی معصیت نہیں کرتے ان کی اطاعت تو کرتے ہیں۔لیکن وہ جو دوسرا حصہ ہے خدا کے قوانین کا جس کا تعلق عالمِ انسانیت سے ہے اس کا انکار کرتے ہیں اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ وہ خود تو محفوظ رہ جاتے ہیں ان کے ہاتھوں سے باقی انسانیت محفوظ نہیں رہتی۔اور مومن وہ ہے کہ جو ان دونوں قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے ان کے مطابق اپنا نظام قائم کرتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان قوانینِ فطرت کی اطاعت سے تدابیر ایسی محکم کر لیتا ہے کہ خود ان سے محفوظ رہتا ہے اور وہ

جواقدارِسماوی کہلاتی ہیں انسانیت کے متعلق قوانین جنہیں میں نے کہا ہے ان کی اطاعت سے باقی انسانیت بھی ان کے ہاتھوں محفوظ رہتی ہے۔ مومن کہتے وہ ہیں جوامن دینے والا ہے۔ یہ معنی ہی کبھی ہمارے سامنے نہیں آئے۔ وہ جوخدا نے اپنے آپ کوالمومن کہا ہے تو اگر مومن کے معنی ایمان لانے والا ہی صرف ہوتو یہ خدا کس چیز پہ ایمان لاتا ہے جو اپنے آپ کوالمومن کہا ہے۔ تو المومن اس نے کہا ہے کہ وہ امن دینے والا ہے کائنات کو۔ اسی طرح اس کے بندے جومومن کہلاتے ہیں وہ ٹھیک ہے کہ اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لانے والے آپ کہہ لیجیے۔ نتیجے کے اعتبار سے خدا کی صفت جو ہے المومن ہونے کی یہ عالمِ انسانیت میں اس صفت کے عملاً ظہور میں لانے کے موجب بنتے ہیں امن کے ذمہ دار ہوتے ہیں علمبردار ہوتے ہیں انسانیت کے امن کے۔ تو انسانیت کو امن تو وہی دے سکیں گے جوخود امن میں ہوں۔ جوخود بھوکی قوم ہو وہ دوسروں کو کیا کھلائے گی۔ جسے پانی جیسی چیز کہ جس پہ مدار ہے زندگی کا وہ ان کی موت کا باعث بن جائے وہ دوسری قوموں کو کیا حیات بخش چیزیں دے گی۔ یہ ہے چیز عزیزانِ من! جس طرف توجہ کا رخ جانا چاہیے۔ یہ ہیں خدا کے قوانین جن کی معصیت ہم نے کی۔ تو ایک قوم تو وہ ہوگئی کہ جوفطرت کے قوانین کو بھی مسخر کرتی ہے اور انہیں پھر جیسا میں کہا کرتا ہوں اقدارِسماوی کے تابع ان قوتوں کو سرف کرتی ہے۔ خود بھی امن میں رہتی ہے دنیا کو بھی امن میں رکھتی ہے۔ یہ ہیں جنہیں مؤمنین کی جماعت کہا جاتا ہے جو قرآن تیار کرتا ہے۔ ان سے نیچے وہ قومیں ہیں جو فطرت کے قوانین پر ایمان رکھتی ہیں ان کے مطابق اطاعت کرتی ہیں۔ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں دوسرا حصہ چونکہ اس پہ ایمان نہیں ہوتا ان کا' انسانیت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہتی لیکن خود تو کم از کم محفوظ ہوتے ہیں' فطرت کی قوتوں سے خود تو بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک تیسری قوم ہے کہ جوان دونوں قوانین میں سے کسی پہ بھی ایمان نہیں رکھتی نہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے۔ اور جوفطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی وہ اقدارِسماوی کے ماتحت ان کا استعمال کیا کرے گی وہ تو مسخر ہی نہیں کرتی۔ جسے کہا جائے گا کہ اپنے خرچ میں اعتدال رکھو' اسے کہا جائے گا نا جس کے پاس کچھ ہو۔ جس کے پاس ہی کچھ نہیں ہے اس کو یہ حکم کیا کہ صاحب اس میں اسراف نہ کرو اپنے خرچے میں' وہ کہے کہ میرے پاس تو پیسہ ہی ہے نہیں۔ جوقوم فطرت کی قوتوں کو بھی مسخر نہیں کرتی اقدارِسماوی کے ساتھ اس کا تعلق ہی کچھ نہیں ہوتا۔ (**خسر الدنیا والاٰخر**) یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! جہاں ہم کھڑے ہوئے ہیں۔ الفاظ باقی رہ گئے ہمارے پاس' وہ بھی اب دھوکا دینے کے کام آتے ہیں ان بیچاروں کو جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب ہماری قوم کی مجرمانہ تغافل ایک بلا لاتی ہے ایک سیلاب لاتی ہے انہیں کھڑے ہو کے ہم کہتے ہیں کہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے یہ کچھ آیا' ہم بڑے نیکوکار ہیں۔ عزیزانِ من! قوم پوری کی پوری گناہگار ہوتی ہے۔ یہ جرائم قومی کہلاتے ہیں اجتماعی کہلاتے ہیں ملی کہلاتے ہیں۔ اور یہی ہیں جن کی وجہ سے قرآن نے یہ کہا تھا کہ بچو اس فتنے سے کہ جب وہ آیا کرتا ہے تو (**خاصة للظٰلمین**) نہیں رہا کرتا پھر' ساری قوم اس کے اندر مبتلا ہوتی ہے۔ یہ کبھی کسی نے کہا تھا کہ سیلاب نہ پرسد کہ درِخانہ کدہ مست''؟؟ اے پچھدا ہیگا کہ جی گھر دا دروازہ تہاڈا کدھر ہے میں کدھروں دی آواں جی ذرا دسنا' اندروں کنڈی تے کھولو' وہ نہیں پوچھتا یہ۔ اور جب وہ نہیں پوچھتا

عزیزانِ من! تو وہ سیل بلا آتا ہے تو وہ مندر اور مسجد میں بھی تمیز نہیں کرتا دونوں کو بہا کے الگ چلا جاتا ہے۔ بلکہ اگر مندر کی عمارت زیادہ مستحکم ہے تو وہ بچ جاتی ہے مسجد کے بھی مقابلے میں۔ فطرت کے حوادث کے سامنے یہ چیز کوئی شے نہیں ہے۔ مسجد تو ایک طرف رہا کعبہ بھی جلا وہ بھی سیلاب کی زد میں آیا جب حفاظتی تدابیر نہیں کی گئیں تھیں' ہم کس بلا کی مٹی ہیں۔ یہ حوادث عزیزانِ من! فطرت کے کائنات کے جو قوانین ہیں ان کی رو سے آتے ہیں۔ ان کے متعلق علم حاصل کرنا قرآن ماننے والوں کا اولیں فریضہ ہے۔ پھر علم حاصل کرنے کے بعد ان کی روک تھام کا انتظام کرنا حفاظتی تدابیر کرنا اعمالِ صالح کا پہلا حصہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد اتنا صاحبِ قوت اور صاحبِ تدابیر ہونا کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی اس قسم کی کوئی مصیبت آئے وہاں جا کے اپنے سینہ سپر ہو کے کھڑے ہو کے ان کو بھی روکنا۔ میں نے کہا ہے نا کہ یہ سیلاب تو نہیں فرق کرتا مسجد اور مندر میں۔ مومن کے متعلق کہا گیا کہ سیلاب ان کو تباہ کرنے میں فرق نہیں کرتا' تم ان کو محفوظ رکھنے میں فرق نہ کرنا۔ یاد نہیں قرآن کی وہ آیت جس میں اس نے کہا ہے سورۃ حج میں کہ اگر ہم اس قسم کی جماعت تیار نہ کریں جسے جماعتِ مؤمنین کہا جاتا ہے نہ یہودیوں کے سومے بچیں نہ عیسائیوں کے گرجے بچیں نہ ہندوؤں کے مندر بچیں نہ تمہاری مسجدیں بچیں۔ یہ ہے وہ قوم۔ پھر قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ پہلے دوسرے مذاہب کے عبادت کدوں کو لیا آخر میں مسلمانوں کی اپنی مسجد کا ذکر کیا۔ اور جو قوم اپنے گھر کو بھی نہیں بچا سکتی وہ دوسروں کی عبادت گاہوں کو کیا بچائے گی۔ پہلی چیز تو عزیزانِ من! یہ ہے ان حوادث کے متعلق یہ تدابیر اختیار کرنا یہ بھی اطاعت ہے قوانینِ خداوندی کی۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ جب یہ حادثہ آ جائے تو پھر اس سے نمٹا کس طرح سے جائے۔ یہاں آتے ہیں وہ دوسرے اقدارِ خداوندی جسے میں نے کہا ہے۔

ہمارے صدرِ اول کی تاریخ میں بھی یہ حادثہ آیا بلکہ بیک وقت دو سماوی آفات تھیں۔ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں قحط بڑا شدید پڑا طاعون بڑی شدت سے ہوا۔ طاعون کے متعلق تو ساری بات حضرتِ عمرؓ کے ایک فقرے میں سمٹ کے آ گئی۔ وہ فقرہ کہ جس کی مثال میں یونان کے Plato سے لے کے آج تک کے برگسان کے ہاں کہیں نہیں پاتا۔ علیٰ وجہ البصیرت یہ بات دعوے سے کہہ رہا ہوں۔ جب آپ وہاں پہنچے ہیں شام کے امواس کے قریب وہ طوفان پھوٹا تھا۔ وہاں کہا گیا آپؓ سے کہ آگے نہ جایئے' آپؓ نے بیٹھ کے مشورہ کیا وہ آگے علاقہ آتا ہے جہاں طاعون ہے وہاں جانا چاہیے یا واپس چلے جانا چاہیے۔ فیصلہ آپؓ نے یہ کیا کہ نہیں واپس چلے جانا چاہیے اُس علاقے میں جہاں طاعون نہیں ہے۔ اعتراض کرنے والوں نے اعتراض یہ کیا انہوں نے کہا کہ عمرؓ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو۔ بظاہر وزنی اعتراض نظر آتا ہے۔ سنتے ہیں آپ جواب کیا ملا۔ کہا ابوعبیدہؓ سن لو' میں خدا کی ایک تقدیر سے خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ زاں کہ تقدیرات حق لا انتہا۔ اس کی ایک تقدیر یہ ہے کہ جہاں یہ وبا پھوٹ رہی ہو وہاں چلے جاؤ گے تو متعدی مرض ہے تمہیں بھی لگ جائے گا۔ اس کا دوسرا قانون یہ ہے کہ جہاں یہ نہیں ہے اگر وہاں رہو گے تو اس سے بچ جاؤ گے۔ کہا یہ دوسرا قانون بھی تو میرا نہیں بنایا ہوا یہ بھی تو اسی خدا ہی کا ہے جس کا وہ قانون ہے کہ اگر جاؤ گے متعدی امراض میں تو اس میں گرفتار ہو جاؤ گے' اس سے صاف علاقے میں نکل جاؤ گے تو بچ جاؤ گے۔ دونوں

قوانینِ خداوندی ہیں ۔سوال صرف یہ ہے انسان کے تدبر کا کہ وہ یہ دیکھے کہ بیک وقت جب دو ممکنات اس کے سامنے آئیں Two Possibilites ان کے سامنے آئیں ان میں سے کونسی اختیار کرنی چاہیے۔کہنے لگا اس وقت مومن وہ اختیار کرتا ہے جس میں امن میں رہتا ہے وہ۔اور جب قحط آیا ہے تو آپ سوچئے عرب جیسا اور یہ وادیٔ غیر ذی زرع مکہ اور مدینہ کا علاقہ جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔لیکن بہر حال مدینہ کیپٹل تھا وہاں Provision رکھی جاتی تھی۔قحط پڑا ہے تو ارد گرد کی باہر کی ساری آبادیاں صحراؤں کے جتنے لوگ رہنے والے تھے کوئی متبادل صورت ہی اس کے سوا نہیں تھی کہ وہاں سے اُمڈ کے آجاتے اور مدینے آجاتے۔اور وہ جوق در جوق آ گئے۔ٹھیک ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ فوراً ہی ان کے لیے باہر رہنے کا انتظام کر دیا گیا خیمے لگا دیے گئے ٹھیک ہے آتے جایئے۔یہاں سے پھر وہ نگاہِ فاروقؓ سامنے آتی ہے۔ آتے ہی فوراً تو یہ چیز ہوئی کہ یہ جو آئے مدینے سے پکا ہوا کھانا یہاں بھیجا گیا اُنہوں نے کھایا۔لیکن نگاہِ فاروقؓ نے یہ بھانپ لیا کہ وہاں سے پکا ہوا کھانا جب ان کے پاس آتا ہے تو ان میں احساس ایسا پیدا ہوتا ہے کہ ہم ان لوگوں کے دست نگر ہیں خیرات کا کھانا کھاتے ہیں' امت کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے۔کیا کیا؟ سارے مدینے والوں سے یہ کہدیا کہ تمہارے گھر میں سارے شہر میں کوئی چولہا نہیں جلے گا۔ سب باہر آؤ ان کے ہاں' ایک دسترخوان ہوگا' جو کچھ اندر ہے سب لے آؤ' ایک جگہ پکے گا ایک جگہ کھائیں گے۔اللہ اکبر۔اور انہی میں عمرؓ خود بیٹھا ہوا تھا۔جو ملتا تھا مساوی سب کھاتے تھے۔مساواتِ محمدی ﷺ کا نام آجاتا ہے۔محمدی ﷺ تو بہت بلند مساوات ہے مساواتِ عمرؓ ہی کو تو دیکھو وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔بعض چیزوں کے نہ کھانے کی عمر بھر ایک کیفیت ہوتی ہے انسان کی طبیعت پہ ان کا اثر ہو جاتا ہے۔آپ تیل نہیں کھایا کرتے تھے' صحت کے حساب سے صرف' لذت اور عیاشی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔اتنی بڑی آبادی کے لیے میسر ہی تیل آ رہا تھا ان کے اندر خود بیٹھے ہوئے وہی تیل کھایا کرتے تھے۔ابنِ عمرؓ بیٹا کہہ رہا ہے کہ چہرہ جھلس گیا ہے آپ کا رنگت سیاہ پڑ گئی ہے جھریاں پڑ گئیں پیٹ میں ہر وقت درد رہنے لگا۔تو کہتے ہیں کہ جب یہ زیادہ گڑگڑاتا تھا درد سے تو آپؓ اسے کہا کرتے تھے کہ تیری گڑگڑاہٹ سے میں دھوکے میں نہیں آ سکتا کہ باقی امت تو تیل کھائے اور تیری وجہ سے عمرؓ گھی کھانے لگ جائے' عمرؓ فریب میں نہیں آ سکتا' اپنے پیٹ کے فریب میں بھی نہیں آ سکتا ۔اُنہوں نے کہا ہے کہ دن بھر کیفیت یہ تھی کہ ان کیمپوں کے اندر پھر رہے تھے ایک ایک کی ضرورت کے مطابق وہاں پہنچاتے تھے۔ایک وہ علاقہ تھا جہاں کے معذور بچے وغیرہ آ نہیں سکتے تھے وہاں کی ذمہ داری خود آپؓ لے لی تھی کہ ان کی نگرانی میں کرونگا۔دن بھر یہ ہوتا تھا اور جسے رات بھر اب ہم کہتے ہیں دعاؤں میں گذارتے تھے رات بھر پلاننگ اسکے لیے ہوتی تھی مجلسِ مشاورت بیٹھتی تھی۔رات سوتے نہیں تھے دن یہ کچھ کرتے تھے۔تو یہ چیز ہمارے ہاں تاریخ میں ہے ساتھیوں کی یہ بات کہ ہمیں فکر تھی کہ اگر یہ قحط کچھ عرصہ اور رہا تو قحط سے یہ قحط زدگان تو بچ جائیں گے عمرؓ زندہ نہیں بچے گا۔حادثہ آتا ہے عزیزانِ من! اُسے نپٹایا اس طرح سے جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس قحط میں ایک فرد بھی ہلاک نہیں ہوا تھا۔جو ملتا تھا اسے یوں برابر بانٹا جاتا تھا۔اسی قحط ہی کا واقعہ ہے نا کہ ایک دن اپنے پوتے کو دیکھا کہ وہ کوئی فروٹ پھل کی قسم کی چیز کھا

رہا تھا۔ایک دم بیٹے کو بلایا کہ یہ کیا ہے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور عمرؓ کا پوتا فروٹ کھا رہا ہے۔اُنہوںؓ نے کہا سرکار عمرؓ کا پوتا بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو دوسروں کو ملتا ہے' صبح ناشتے میں جو کھجوروں کی گٹھلیاں بچوں کو ملیں کسی کا شتکار کا بچہ کوئی تھا اس کے پاس ککڑی تھی عمرؓ کے پوتے نے اپنے حصے کی کھجوروں کے ستو اس کو دیدیے اور اس نے وہ ککڑی اس کو دیدی یہ وہ ککڑی کھا رہا تھا فروٹ نہیں کھا رہا تھا۔حادثہ آتا ہے تو پھر نپٹا یوں جاتا ہے۔یہ حادثہ درحقیقت ان کا حادثہ نہیں ہوتا جن کے اوپر براہِ راست بلا گرتی ہے یہ حادثہ ان کے لیے ہوتا ہے جو ابھی محفوظ ہوتے ہیں۔وہ جو میں نے ایک دن بے ساختہ اس مرحوم دوست کا مصرع سنایا تھا آج بار بار یاد آتا ہے کہ میرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔پتہ نہیں کس عالم میں یہ کہہ گیا تھا۔یہ جو مرنے والے ہوتے ہیں حوادث میں عزیزانِ من! ان کا مرنا ہم جینے والوں کے خلوص کی آزمائش ہوتا ہے۔گناہگار وہ نہیں تھے جو اس سیلاب کے اندر مر گئے۔پہلے گناہگار وہ تھے کہ جنہوں نے حفاظتی تدبیریں ان کے لیے نہ کیں اور اس کے بعد گناہگار ہم ہیں جو حادثے کے شکار ہیں ہوئے اور ان کے لیے کچھ نہیں کر رہے یا جتنا کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہے۔یہاں اگر عمر کے پوتے میں اور بدو کے لڑکے میں تمیز ہو جائے گی یہ ہوگا وہ گناہ جو بخشا نہیں جائے گا جسے کوئی توبہ بخش نہیں سکے گی۔انسانوں کے گناہ تو انسان بخشا کرتے ہیں عزیزانِ من! خدا نہیں بخشا کرتا۔اور انسانوں کے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ قرآن نے یہ گنایا ہے کہ یاد رکھو جس شخص کے ہاتھوں کوئی ایک متنفس بھی ضائع ہو گیا ناحق' جرم کے اعتبار سے سمجھ لو کہ اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ایک فرد بھی عزیزانِ من! جو بچ سکتا ہے ہمارے کچھ کرنے سے' اگر وہ ہلاک ہو گیا ہے ہمارے اس نہ کرنے سے' خدا کی میزان میں یہ جرم ہے کہ ہم نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔سوچ سکتے ہیں اس کی سزا کیا ہوگی۔یہ ہے وہ غضب جسے ہم کہتے ہیں خدا کا آیا کرتا ہے یہ ہیں وہ جرائم جن کی وجہ سے یہ سزائیں ملتی ہیں۔نگاہ کا رخ اس طرف رکھو عزیزانِ من! پھر بات بھی سمجھ میں آ جائے گی اور پھر آئندہ کے لیے ہم ان تباہیوں سے بھی بچ جائیں گے۔ورنہ اگر ہم یہی پکارتے رہے کہ یہ مرنے والے اپنے گناہوں کی پاداش میں مر گئے' جینے والے ہم اس لیے جئے کہ ہم بڑے مقربین بارگاہِ الٰہی تھے۔آئندہ ہم اسی طرح ان کی زد میں آ جائیں گے۔سوال اس وقت یہ ہے کہ آج ہم بچنے والوں کے خلوص کی جو آزمائش ہو رہی ہے اس میں ہم کس حد تک پورے اتر رہے ہیں۔ہمارے مجرمانہ تغافل کی وجہ سے جو بیچارے مر گئے ہیں جو تباہ ہو گئے ہیں ٹھیک ہے ان کی اس تباہی کی سزا بھی ہمیں ملے گی۔قومی حیثیت سے ساری قوم کو میں کہتا ہوں اس میں ہم شامل ہیں۔لیکن جو بچ گئے ہیں ان کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے اگر ہم کہ جو اس سیلاب سے اس تباہی سے بچ گئے ہیں اگر ہم سے کوتاہی ہوگی تو یہ اگلا جرم ہوگا جس جرم کی سزا ہمیں الگ ملے گی۔حفاظتی تدابیر کی طرف سے تغافل برتنے میں پوری قوم کی قوم کو وہ سزا اور ان کے لیے جو کچھ کر سکنا ہے اسے نہ کر سکنے کی ہمیں سزا جو ہم زندہ ہیں۔اور

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

یہ فطرت کی تعزیریں ہیں نا جو ہم پہ آ رہی ہیں۔آج ہم میں سے ایک ایک کو یہ سوچنا چاہیے کہ میں جو اطمینان سے محفوظ اپنے گھر میں بال بچوں

میں بیٹھا ہوا اسی طرح سے وقت کے اوپر کھار ہا ہوں پی رہا ہوں۔اس لیے کہ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اس پانی نے اپنا رخ ادھر موڑ لیا تھا' میری اور کوئی کاریگری نہیں تھی۔وہ جو اس سے بچنے کے لیے درختوں کی شاخوں پر لٹکے رہے تباہ ہونے والے گھروں کی چھتوں کے اوپر بیٹھے رہے ان گذرگاہوں کے اندر کسی نہ کسی طرح سے بچ گئے۔وہ جو اس وقت سانس لے رہے ہیں اس دھوپ کے اندر سڑی ہوئی دھوپ کے اندر بغیر کسی قسم کے سایے کے' سڑکوں پر' ریلوں کی پٹڑیوں پر' ٹیلوں پر۔اور جب بارش ہوتی ہے تو اس کے بعد بارش سے بچنے کا کوئی سامان نہیں' پیچھے جانے کا کوئی سامان نہیں کہ جو کچھ پیچھے تھا وہ تو سارا ختم ہو گیا۔آگے کوئی جگہ نہیں ہے کہ ابھی کوئی بستی بسی نہیں کہ جہاں جا کے وہ بس جائیں ۔وہاں پڑے ہوئے ہیں۔کس جرم کی پاداش میں؟ کہ ہم نے ان کی حفاظت کا قبل از وقت انتظام نہیں کیا تھا۔آج ہم بچے ہوئے ہیں تو اپنی کسی کاریگری کی وجہ سے نہیں بچے ہوئے ہیں۔غنیمت سمجھنا چاہیے عزیزانِ من! کہ ہم کسی طرح سے اس سے بچ گئے ہیں۔کم از کم اس بچنے کا صدقہ ہی اتنا دو کہ ایک فرد ایک کو تو بچا لے کسی طرح سے۔اس سیلاب کی تباہی میں اتنے نہیں تباہ ہوئے جو اس کے بعد ان بچنے والوں میں تباہ ہونگے بھوک سے پیاس سے موسم کی شدت سے بیماریوں سے دوائیاں نہ ملنے سے کھانے کے لیے نہ ملنے سے کسی شیلٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے ۔اور پھر انسانوں کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ سے۔افوہ۔پانی کے ہاتھوں لٹنے کا تو اتنا صدمہ نہیں ہوتا عزیزانِ من! جتنا صدمہ اس میں ہوتا ہے کہ ایک دوست شاہدرہ کی بستی سے جان بچا کے اپنے بچوں کو ننھے بچوں کو لے کے یہاں چلا آیا۔غریب آدمی تھا' پانی تھما تو اس نے کہا کہ میں جا کے دیکھو کہ اس میں سے کوئی دو چار برتن لے آؤں کہ جس میں ہم کم از کم گلاس ہی ایک مل جائے کہ میں بچوں کو پانی پلا سکوں۔جب وہ گیا ہے تو پانی اتر چکا تھا اور گھر میں سے سب کچھ لٹ چکا تھا۔اور یہ قوم جو ہے یہ بچ جائے گی خدا کے عذاب سے جسے آپ کہتے ہیں۔غریب کے گھر میں تھا کیا' ایک گلاس موجود نہیں تھا کہ جس میں لا کے اپنے بچے کو پانی پلا سکے۔اور یہ جو بچے ہوئے اول تو خیال ہی نہیں آ رہا تھا خیال آتا ہے تو ان کو جا کے ایسے دیتے ہیں جیسے کسی بھکاری کو گداگر کو خیرات کا ٹکڑا دیتے ہیں۔عزیزانِ من! خدا کے لیے ان کی جان تو اس عذاب نے لی تھی ان کی غیرت کو تو تم نہ خریدو۔آج تک اس واقعہ کو نہیں بھول سکتا 1965ء کی جنگ میں جو یہاں سے ہمارے ہاں جنگ کی وجہ سے خاک بدر ہوئے تھے کچھ لوگ وہ یہاں آ کر ادھر بس گئے ہوئے تھے۔ان گاؤں کے لوگ شہر میں آ گئے تھے۔ان کی لڑکیاں جوان لڑکیاں تھی ان میں سے ایسی بھی تھیں جن کی شادی کے دن بھی جسے کہتے ہیں مقرر ہوئی ہوئی تھیں تاریخیں۔یہاں کے رہنے والوں میں سے کچھ گھرانوں نے یہ کیا تھا کچھ انتظام کیا کہ یہاں اچھا ہے ان کے ہاں کے وہ خاوند یا ان کے سسرال کے لوگ بھی آ گئے ہوئے تھے یہ بھی تھے کہ ان کا نکاح پڑھا دیا جائے بچیوں کی عصمت محفوظ رہ جائے گی۔یہاں کے رہنے والے ان گھرانے والوں کو اللہ ان کو خوش رکھے اُنہوں نے انتظام اس طرح سے کیا کہ بچیوں کو اس طرح سے وِدا کیا جائے کہ جیسے گھروں سے ماں باپ وِدا کرتے ہیں۔یہ ٹھیک ہے معیار تو وہ نہیں تھا نہ ہو سکتا تھا لیکن ان کو خالی ہاتھوں نہیں جانے دیا تھا۔ایک سہاگن ایک دلہن کی طرح جیسے وِدا کرتے ہیں اتنا کچھ تو کم از کم اسے دیدیا تھا۔میرے حصے میں اتنی سعادت تھی

علاوہ اور چیزوں کے بہرحال جو میں کر رہا تھا کہ ایک نکاح پڑھانے کی چیز تھی وہ بھی میرے ہاں ہوتی تھی۔ ایک بچی کا نکاح پڑھایا اور اسے دینے کے لیے جہیز کی کچھ چیزیں جو تھیں وہ رکھی گئیں۔ بچیاں میرے لیے میری بیٹیاں تھیں مجھے بھی بابا جی اپنا کہتی تھیں۔ ایک بچی نے گھونگھٹ میں سے روتے ہوئے مجھے کہا کہ بابا جی مجھے یہ چیزیں نہ دیجیے۔ میں حیران تھا کہ اس بچی نے یہ کیوں کہا۔ کہا یہاں تک ٹھیک ہے جو آپ نے کیا ۔گاؤں کے لوگ وہاں تھے میں نے ان سے پوچھا کہ اس بچی کی خاص بات کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ ہمارے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی ہے باپ بھی وہاں شہید ہو گیا بھائی بھی رہ گئے ماں وغیرہیں۔ نمبردار کی بیٹی ہے اس کی شادی انہی دنوں میں ہونے والی تھی نمبردار نے سات گاؤں کے لوگوں کو دعوت دی ہوئی تھی اور اس کے لیے بھینسیں اور گھوڑیاں اور گائے۔ ہمارے ہاں یہ کچھ بھی دیتے ہیں بیٹی کو یہ بھی دے رہا تھا۔ اور پھر ایک نیکی کے بدلے میں گاؤں کی ایک یتیم لڑکی تھی وہ اس کی بھی شادی کر رہا تھا اس کے لیے بھی اس نے کچھ جہیز بنایا ہوا تھا۔ ٹھیک ہے بیٹی کے پیمانے کا تو نہیں ہوتا تھوڑا ہوتا ہے۔ وہ جہیز اس یتیم بچی کے دینے کے لیے تھا۔ یہ بچی جس کو ہم وداکر رہے تھے اس کی نگاہ جب ان چیزوں کے اوپر پڑی تو اس نے محسوس کیا کہ یہ اس قسم کی اور ویسے ہی انداز کی خیرات کی چیزیں ہیں جس طرح میرا باپ میری شادی میں ایک یتیم لڑکی کو دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اس احساس کو برداشت نہیں کر سکی اس نے کہا کہ بابا جی مجھے یہ چیزیں نہ دیجیے خدا کے لیے مجھ پہ رحم کیجیے۔ انسانی غیرت اور حمیت تو یہ چیز ہوتی ہے عزیزانِ من! اسے نہ خریدیے اس کا سودا نہ کیجیے۔ دینا ہے کسی نے تو اس طرح سے دو۔

؎ یوں بھیک دے کہ دستِ عطا کو خبر نہ

خیرات کی طرح سے نہ دو۔ عزیزانِ من! ہمارے بھائی بند ہمارے ہی جیسے ہیں۔ ہم سب ایک مشترکہ مصیبت کے اندر گرفتار ہیں' ہمارے پاس کچھ بچ گیا ہے ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔ دو بھائیوں میں بانٹ کے کھانے والی جو کیفیت ہے اس انداز سے کچھ کرو۔ یہ کرو تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس دنیا میں بھی آپ کو امن مل جائے گا اور اگر ایمان ہے تو اس کے بعد کی زندگی میں بھی اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ یہ ہے عزیزانِ من! آج کرنے کا کام اس قوم کے لیے۔ اور اس کے بعد قوم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ہر وقت نگاہ رکھے اور پوچھتی رہے کہ ذمہ دار ارباب نے کیا کیا کہ آئندہ کے لیے ایسی تباہی اس ملک پہ نہ آئے۔ بجائے اس کے کہ کچھ لوگ اقتدار پر آ جائیں جو باقی رہ جائیں ان کی کوشش یہ ہو کہ کسی طرح سے اقتدار ان سے چھن کے ہمارے پاس آ جائے۔ مسئلہ ہی سارا یہ رہ جائے۔ بجائے اس کے کہ اس کے اندر یہ سارے کے سارے ذمہ دار ارباب قوم کے ابنائے قوم جنہیں کہتے ہیں وہ اس کے اندر سارے کے سارے آ جائیں۔ اس کی بجائے ان سے ہر وقت پوچھئے کم از کم اس سیلاب کے بعد یہ ایک سوال تو پوچھتے رہیے۔ جو بھی تمہارے پاس آئے مخالف میں آئے موافق میں آئے پوچھئے یہ کہ آپ نے کیا تدابیر اختیار کیں کہ آئندہ کے لیے قوم اس ہلاکت کا شکار نہ ہو۔ یہ پوچھئے عزیزانِ من! ہر لیڈر بننے والے سے پوچھئے' ہر نعرہ لگانے والے سے پوچھئے' ہر جلوس نکالنے والے سے پوچھئے اور ہر ووٹ مانگنے والے سے پوچھئے کہ آپ نے اس قوم کی حفاظت کے لیے کیا

تدابیر اختیار کی ہیں۔اوراس معیار کے مطابق یہ جائزہ لیجیے کہ یہ اس قابل ہے کہ اس کی کوئی بات مانی جائے۔اگرعزیزانِ من! عوام کی بات آج کچھ معنی رکھتی ہے کہ جسے ہروقت کہا جاتا ہے۔عوام کی بات کے معنی یہ ہونگے کہ اب یہ جینے والے عوام یہ پوچھیں اوران میں سے ہرایک سے پوچھیں کہ اس دفعہ ہم تو بچ گئے ہیں۔آپ نے کیا انتظام کیا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ ہلاکت ہمارے سر پہ مسلط نہ ہوجائے۔یہ صرف کسی کے وعدے پہ نہ رہیے۔وعدہ تو اس انداز کا ہونا چاہیے میں نے پہلے بھی ایک درس میں یہ چیز کہی تھی۔وعدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے کئی مقامات کے اوپر خدا کا وعدہ بھی یہ کہا ہے ہم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے ہم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے۔اوراس کے ساتھ اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہم تو بڑے؟؟القول واقعہ ہوئے ہیں بات کے سچے(**لا یخلف المیعاد**) کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔اس کی تاکید کوزیادہ نمایاں کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ ہمارا وعدہ بھی وہ ہے کہ اگر تم کسی وقت دیکھو نہیں پورا ہوا تو ہم سے بھی پوچھ سکتے ہو کہ کیوں پورا نہیں ہوا۔اللہ اکبر اللہ اکبر۔(**ان وعد ربک کان مسئولًا**) ۔وعدہ تو وہ چیز ہے عزیزانِ من! یہ سارے وعدے ہیں ناجوایسے وقتوں میں کیے جاتے ہیں۔اس کے بعد فریضہ ہوجاتا ہے وعدہ کرنے والا کہ وہ بتائے کہ میں یوں پورا کررہا ہوں۔اورفریضہ ہوجاتا ہے اس کا کہ جس کے ساتھ وعدہ کیا جائے کہ وہ اس کے بعد پوچھے کہ یہ وعدہ جو کیا تھا وہ پورا کیوں نہیں ہوا کیوں وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔اوراس چیز کوسب سے پہلا بنیادی جرم قرار دو۔یہ ہے عزیزانِ من! بچنے کی بات۔اس معلمِ صادق ﷺ نے جوقوم کوتعلیم دی تھی وہ تو ایک قدم آگے لے گیا تھا قوم کو۔

شام کے صحرا میں حضرتِ عمرؓ نے واپسی پہ دیکھا تھا نا اپنے معمول کے مطابق کہ وہ بذاتِ خود جا کرایک ایک کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔اپنے اخبارات پر ہی بھروسہ نہیں کیا کرتے تھے خود جا کر معلوم کیا کرتے تھے کہ حال کیا ہے۔ایک بوسیدہ سے خیمے میں گئے وہاں ایک بڑھیا تنہا بیٹھی تھی۔اس سے پوچھا(آپ کی زبان میں کہونگا) کہ مائی کیا حال ہے تمہارا۔اس نے کہا کہ تمہیں میں حال کیا بتاؤں جس کو حال پوچھنا چاہیے جب اسے ہی اس کی پرواہ نہیں ہے تو میں کسی دوسرے کو حال بتانے کو تیار نہیں ہوں۔کہا کہ مائی وہ کون ہے کہ جس کے ذمہ تمہارا حال پوچھنا تھا۔کہا کہ وہ جو زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں کے بیٹھ گیا ہے وہ جس نے پہلے اپنے خطبے میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پہ عائد ہوگی۔یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ میری مصیبت کا پوچھتا۔میں سمجھتا ہوں اتنے سے ہی کچھ کم اوس نہیں پڑی ہوگی کہ آپؓ نے اگلی بات بھی کہدی کہ مائی تم نے اپنی مصیبت کا حال اس تک پہنچایا تھا؟ اورآگے جواب عمرؓ کی زبانی سنیے جوساری عمر دہراتے رہے اس جواب کواور روتے رہے۔کہا کرتے تھے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ یہ خلافت کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے' اُس نے کہا کہ یہ اس تک حال پہنچانا میرا فریضہ نہیں تھا یہ اس کا فریضہ تھا کہ وہ ایک ایک فرد کے متعلق باخبر رہتا۔اورآگے کہا کہ اس نے کہا تھا کہ جوخدائے خبیر کے نام پر ہم سے اطاعت لیتا ہے اسے اتنا خبیر ہونا چاہیے کہ ہر فرد کی خبر اس کے پاس موجود ہو۔کہتا ہوں کیا تعلیم حضور ﷺ دے گئے تھے اس قوم کو' کیا قرآن سمجھا گئے تھے اس قوم کو۔یہ لفظ تو ہمارے ہاں متواتر چلا آیا خدا کے نام پر حکومتِ الٰہیہ جسے ہم کہتے ہیں خدا کے نام

پر حکومت قائم کرنا۔ پوچھو اس بڑھیا سے کہ وہ کیا بات سمجھی تھی۔ خدا کے نام پر حکومت قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں انسانوں کے متعلق وہ ذمہ داریاں ان کے ہاتھوں سے پوری ہونگی۔ وہ خبیر ہے وہ خدا' ان کی ذمہ داری ہے کہ یہ خبیر ہوں ساری مملکت کے لیے۔ ساری عمر روتے رہے حضرتِ عمرؓ اس کے بعد' کہا خلافت کی ذمہ داری اس بڑھیا نے مجھے سمجھائی تھی کہ یہ ہونا چاہیے۔ اور یہ جو بات میں نے کہدی ہے کہ خدا نے جو ذمہ داریاں لے رکھی ہیں وہ ان کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں' ان کی ذمہ داریاں وہ ہو جاتی ہیں۔ یہ چیزیں بھی کوئی ہمارا بعد کا تراشیدہ فلسفہ نہیں عزیزانِ من! یہ بھی تو قرآن ہی سے حاصل کردہ بصیرت اور علم ہے اسے بھی تو عمرؓ نے ہی سمجھایا تھا۔ یہ چیز کہ خدا براہِ راست ذمہ داریاں پوری نہیں کیا کرتا۔ وہ تو دیگر آیات کے علاوہ سورۃ یٰسٓ کی تو وہ آیت سامنے لائیے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ بھوکوں کی روٹی کا کچھ انتظام کرو تو یہ کہتے ہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ رزق کی ذمہ داری تو خدا نے لے رکھی ہے اگر اسے یہ مقصود ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں روٹی کیوں نہ دیتا۔ تم کیا کہتے ہو اس کی ذمہ داری کو ہم پورا کریں۔ کہا یہ آگے سے جواب دیتے ہیں۔ کہا کس قدر گمراہی میں مبتلا ہیں کہ انہیں پتہ نہیں ہے کہ خدا براہِ راست کسی کے منہ میں آ کے لقمہ نہیں ڈالا کرتا۔ وہ ذمہ داری ان کے ہاتھوں ہی پوری ہوا کرتی ہے جو خدا کے نام پر خدا کی اطاعت لیتے ہیں لوگوں سے۔ یہ چیز تھی۔ اور وہ بات جو میں ابھی کہہ رہا تھا کہ یہ بات بھی عمرؓ نے ہی ہمیں سمجھائی۔ پہلی بات تو میں نے تقدیر کے معاملے میں کہی تھی میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس کی مثل ایک فقرہ نہیں جانتا۔ یہ جو دوسری چیز ہے اس نے تو یقین مانئے عمر بھر کے لیے مجھے ایک عجیب وجد کی کیفیت میں رکھا ہوا ہے۔ جب پہلی دفعہ یہ سامنے آئی تھی میں عرض نہیں کر سکتا کہ کتنے دنوں تک مجھ پہ ایک محویت کا عالم رہا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی اس سے پیشتر کہ خدا نے یہ چیز کہی ہوئی ہے کہ (**اجیبوا دعوۃ الداعی اذا دعنی**) ہر پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اعتراض دل میں سے یہ اٹھتا تھا کہ روز پکارتے ہیں وہ تو پکار کا جواب نہیں ملتا۔ مصیبت زدہ مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں بھوکے بھوکے رہتے ہیں۔ یہ کہاں سے جواب ملتا ہے یہ۔ حضرتِ عمرؓ نے سمجھا دیا۔ اور یہ تو میں کبھی تفصیل میں عرض کرونگا اسلام کا صحیح نظام تو میں نے سمجھا ہی حضرتِ عمرؓ سے ہے۔ سیرتِ انسانیہ کی معراجِ کبریٰ نبی اکرم ﷺ سے سمجھی۔ حوادث کے زمانے میں دین کو مستحکم کس طرح سے رکھا جا سکتا ہے صدیقِ اکبرؓ سے سمجھا۔ اور استحکام کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد یہ نظامِ خداوندی کیسے عملاً متشکل کیا جاتا ہے سیرتِ فاروقیؓ سے سیکھا میں نے۔ سنیے کہ وہ اس مشکل ترین آیت کو سمجھاتے کس طرح سے ہیں۔

خدا سے دعا ہم کب کرتے ہیں؟ جب کوئی ہماری ضرورت رکی ہوئی ہوتی ہے جب کوئی مصیبت آتی ہے جس کا حل نہیں ملتا۔ جب یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں مشکلات کے حل آتے چلے جائیں ضرورت نہیں پڑتی ہے پھر۔ سنیے ان کا فقرہ۔ کہا کہ خدا نے مجھے یہ ذمہ داری خلافت کی اس لیے سونپی ہے۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے گا یہ الفاظ۔ اس لیے سونپی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں راستے میں روک لوں۔ اگر تمہاری کوئی دعا خدا تک پہنچ گئی تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ میری شکایت ہوگئی کہ جو ذمہ داری اس نے پوری کرنی تھی اس نے نہیں

کی اس لیے ہمیں تمہارے ہاں آنا پڑا۔ کہا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ ذمہ داری اس لیے دی گئی ہے۔ چار لفظ ہیں عزیزانِ من! سوچئے کیا کچھ کہہ گئے ہیں یہؓ۔ یہ اس لیے دی گئی ہے کہ میں تمہاری کسی دعا کو خدا تک نہ پہنچنے دوں وہاں تک پہنچی تو میری شکایت ہو جائے گی۔ یہاں بات عزیزانِ من! کسی آئین میں لکھ دینے سے نہیں ہے کہ کائنات کا اقتدارِ اعلیٰ خدا کا ہے ریاست کا مذہب اسلام ہوگا خدا کی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ سب کچھ کریں گے۔ ٹھیک ہے آئینی طور پر اس کا اعلان ضروری ہے۔ لیکن اس اعلان کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد خبیر ایسا ہونا پڑے گا جیسا اس بڑھیا نے شام کے دشت میں عمرؓ سے کہا تھا۔ اور اس کے بعد ذمہ دار ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جو اس ذمہ داری کے احساس کرنے والے نے یہ کہا تھا کہ مجھے یہ ذمہ داری اس لیے سونپی گئی ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک نہ پہنچنے دوں۔ تمہاری اگر کوئی ضرورت رکی رہے تو پلا پکڑ لو میرا' راستے میں کھڑے ہو جاؤ گریبان پہ ہاتھ ڈال دو گلا دبا دو کہ عمرؓ یہ کیوں نہیں ہوا۔ او جو عمرؓ اعلان کرتا ہے کہ دجلہ کے کنارے' مدینے میں بیٹھا ہوا دجلہ کے کنارے' مملکت کا آخری سرا تھا نا اس دور میں' کوئی انسان بھی نہیں کہ انسان مر جائے' کتا بھی اگر بھوک سے مر گیا۔ اس لیے کہ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ خدا کے ذمہ رزق ہے وہاں صرف انسان نہیں کہا (**وما من دآبة فی الارض الا علی الله رزقها**) کوئی متنفس کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پہ نہ ہو۔ اور یہ ذمہ داری پلٹ کے آ جاتی ہے ان کے اوپر جو خدا کے نام پر یہاں مملکت قائم کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نے انسان نہیں کہا تھا کتا بھی کہا تھا۔ اور پھر یہ ذمہ داری کی یہ صورت نہیں ہے بھوک سے نہ مر جائے۔ ٹھیک ہے بھوک اور بھوک مٹانے کا فرق ہوتا ہے۔ ہم اگر اپنی میز پہ بیٹھے ہوئے چار چار دس دس؟؟ چیزیں کہتے ہیں ان میں کھانا کھائیں یہ بھی تو بھوک مٹانا ہے۔ اور وہاں جو بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لیے اگر ہم اوپر سے تھیلی میں چنے اور اچار لٹکا دیں یہ بھی بھوک سے بچانے کی صورت ہے۔ اس ذمہ دار کی یہی شکل ہوگی بھوک سے بچانے کی؟ ان کی شکل کچھ اور ہوگی۔

شکل وہ ہوگی کہ جب وہ شام کا قاصد حضرتِ عمرؓ کے ہاں آ کے بیٹھا ہے تو اسی وقت کھانے کا وقت آ گیا۔ وہاں یہ کسی قسم کا حجاب اور تکلف تو ہوتا نہیں تھا کہ اگر باہر سے کوئی آ کے بیٹھ کے باتیں کر رہا ہے کھانے کا وقت ہو رہا ہے تو ہم نہ اٹھ کے جاتے ہیں نہ وہاں کھانا منگاتے ہیں۔ وہاں آ گیا اور وہیں وہ کھانا آ گیا۔ وہ کھانا اس نے دیکھا جو کی روٹی تھی تھوڑا سا زیتون کا تیل تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنینؓ آپ جو کی روٹی کھا رہے ہیں اب تو مملکت میں اتنا ہوتا ہے کہ آپ گیہوں کی روٹی کھا لیں۔ آپؓ نے کہا کہ اقبا! مجھے اس وقت یہ تو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو جو کی روٹی مل رہی ہے' کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ ہر فرد کو مملکت میں گیہوں کی روٹی بھی مل رہی ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں یہ تو میں یقین نہیں دلا سکتا۔ تو کہا کہ پھر مملکت کے امیر المؤمنین پر گیہوں کی روٹی اس وقت جائز ہو سکتی ہے جب مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی ملے۔ اسے وہ آخری شخص ہونا چاہیے کہ جو گیہوں کی روٹی کھائے جب تک پہلے باقیوں کو نہ مل جائے۔ جو کی مل رہی ہے اس کا مجھے اطمینان ہے میں نے کر لیا اطمینان۔ یہ کہ گیہوں کی مل رہی ہے اس کا ابھی انتظام و اطمینان مجھے نہیں ہوا۔ تم نے یہ کہا ہے کہ وہاں کھا رہے ہو تم لوگ' ٹھیک ہے بڑی خوشی

کی بات ہے وہاں کھا رہے ہو۔ میں تو اس دن کھا سکونگا کہ جب مجھے یقین ہو جائے کہ ملت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ مساواتِ محمد یﷺ کہا گیا ہے۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ حوادثِ ارضی وسماوی آتے رہتے ہیں جب تک آدم اس مقام پہ ابھی نہیں پہنچتا اسے تو کہا تھا نا کہ اسمآء کلھا بتا دیے گئے تھے کہ کائنات کے ہر قانون کا علم جب تک ابھی یہ حاصل نہیں کرتا بہت سے گوشے ابھی ایسے ہونگے فطرت کی قوتوں کے جو ہنوز اس کی؟؟ سے باہر ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ علم بڑھتا جائے گا ان میں سے ایک ایک فرشتہ اس کو سجدہ کرتا چلا جائے گا آدم کو۔ لیکن جب تک یہ پورا علم حاصل نہیں ہوتا یا جس نسبت سے کسی قوم کو یہ علم حاصل ہوتا ہے یہ ارضی اور سماوی آفات وحوادث تو آتی رہیں گی۔ سوال آگے یہ ہوگا پھر کہ ان حوادث سے ہم نپٹتے کس طرح سے ہیں کہ یہ کوئی تباہی برپا نہ کریں۔ اور یہ ہے قرآنِ کریم کی تعلیم عزیزانِ من! جو اس نے ہمیں دی۔ پہلی چیز یہ دی کہ یاد رکھو کائنات کی ہر وقت تابع تسخیر ہم نے تمہارے کر دی ہے۔ مطمع نگاہ تو یہ ہے کہ اس طرح سے ان کو کنٹرول کو اپنے لاؤ ان قوتوں کو' کوئی قوت بھی تمہارے اختیار سے باہر نہ ہو۔ طبعی قوانین کے متعلق میں عرض کر رہا ہوں' مومن کا مقام تو بہت بڑا ہے۔؟؟؟ یہ کتاب آئی تھی۔ چین میں یہ دریائے زرد جو ہے اس کی طغیانیوں کا اور ہلاکت سامانیوں کا یہ عالم تھا عام طور پہ ہر سال برسات کے موسم میں اس کا پاٹ قریباً تیس میل تک چوڑا ہو جاتا تھا۔ اور اس نے جب سے تاریخ بنی تھی اس ملک کی کوئی سال امن سے گذرتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ کوئی خاص متعین اس کا رخ نہیں تھا Banks نہیں تھے سواحل نہیں تھے۔ وہ ہر سال اپنا رخ بدلتا تھا اور پھر اس قسم کا بپھرا ہوا دریا جب اپنی مرضی کے مطابق رخ بدلے تو اس کے بعد تو 'نہ تیرا منزلِ باشد نہ میرا' کوئی محفوظ ہی نہیں رہ سکتا تھا ملک میں۔ Times Unkonwn سے یہ تباہیاں چلی آ رہی تھیں اس ملک میں اور اس قوم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ صاحب یہ ہمارا مقدر ہی ایسا ہے۔ افیون زدہ قوم تھی۔ اقتدار جب انہوں نے سنبھالا ہے کہ جنہوں نے فطرت کے قوانین کا مطالعہ کر کے اس کی قوتوں کو مسخر کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو وہ بڑا Dramatic انداز ہے کہ جس میں ماؤزے تنگ نے جا کے وہاں سیلاب کے زمانے میں اس کا فقرہ ہے اس کی تقریر کا کہ دریائے زرد تم تاریخ انسانیت کی ابتداء سے من مانی کر رہے ہو اب بھی تمہاری یہ صورت ہے کہ تم کسی پابندی کے قائل نہیں ہو۔ اس لیے کہ اب تک اس قوم کے اندر بھی کسی قانون اور ضابطے کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ اب یہاں اقتدار اس قوم کے ہاتھ میں آیا ہے جو قاعدے اور ضابطے کی پابند ہے۔ زرد دریا اس کے بعد تمہیں بھی قاعدے اور ضابطے کا پابند رہنا پڑے گا' آئندہ سال سے تمہیں ساحلوں کے اندر بہنا ہوگا ساحل سے باہر نہیں جا سکتے۔ اور آئندہ سال دریائے زرد ساحلوں کے اندر بہتا تھا۔ اب وہ انسان کے مقرر کیے ہوئے راستے میں بہہ رہا ہے۔ انسان تو وہ بلا ہے۔ اس نے جہاں سے دریا نکلتا تھا اور جہاں جا کے گرتا تھا راستے میں جتنی آبادیاں تھیں ان کے حصے میں ٹکڑے کر دیے دریا کے اس حصے کے ایک ایک میل دو دو میل کے۔ ان کے ذمہ یہ لگا دیا کہ تمہاری روٹی کا ذمہ ہمارے اوپر ہے' تمہارا ذمہ یہ ہے کہ اس کے ساحل ایسے بنا دو کہ جتنا جی چاہے بپھر جائے توڑ نہ سکے

ان کو۔اور آئندہ برسات تک دریائے زرد کو لگام دیدی گئی عزیزانِ من!۔اس میں ابھی ان اقدارِ سماوی پر ایمان کا ذکر نہیں آ رہا کہیں' صرف فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا ذکر آتا ہے جس کے لیے قرآن نے آدم کہا ہوا ہے مومن نہیں وہاں کہا ہوا۔ یہ مقامِ آدمیت ہے ابھی جہاں فطرت کی قوتیں اس کے تابع تسخیر ہوتی ہیں۔ ہر وہ متنفس جو آدمی کے مقام کے اوپر ہے ایسا کر سکتا ہے۔ہم تو آدمی کے مقام کے اوپر بھی نہیں پہنچے۔اور اسی لیے تو اس نے یہ کہا تھا دکھ بھری آواز میں اس قوم کو پکار کے کہ

بہ آدمِ نہ رسیدی خدا چہ مہ جوئی

''اوتوتے ہیچ بندے دا پتر نئیں بنڑیاں تے رب دا مقرب بنن دے تے دعوے کرن ڈیا ہیں توں''۔آدم کے مقام کے اوپر تو پہنچ اس کے بعد پھر بات کر خدا کی۔آدمی کے مقام پہ نہیں پہنچا خدا کی بات کیا کر رہا ہے تو۔کیا عجیب انداز تھا اس شخص کے کہنے کا۔بہ آدمِ نہ رسیدی خدا چہ مہ جوئی۔لیکن ہمیں تو یہ خدا کے پرستار جو ہیں آدم کے مقام پہ پہنچنے ہی نہیں دیتے۔جونہی یہ تباہیاں لائیں یہ فطرت کی قوتیں' ہماری نگاہوں کا رخ انہوں نے دوسری طرف موڑ دیا۔نہ ہمیں اپنی ذمہ داریاں یاد آنے دیں نہ ذمہ دار ارباب کی ذمہ داریاں ان کے سامنے لانے دیں۔بتایا ہی نہ گیا کہ یہ کن جرائم کی پاداش میں یہ ہو رہا ہے۔گناہوں کا چرچا ہونے لگ گیا' توبہ اور استغفار کے معنی مسجدوں میں بیٹھ کے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کے تسبیح پھیرنے کا نام ہو گیا تا کہ ادھر ان کی توجہ ہی نہ آئے۔نتیجہ یہ کہ ہر بار کا سیلاب پہلے سے زیادہ تباہیاں لانے والا بن گیا۔کیا ہی یہ تھا ابلیسی سازش نے جو اقبالؒ کہہ گیا ہے کہ راج اس کا' وہ کہتا تھا کہ میں اس امت کی بیداری سے ڈرتا ہوں ابلیس نے کہا تھا اپنے مشیروں سے کہ ابلیس کے نقطۂ نگاہ سے حقیقی فتنہ جو ہے وہ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے۔ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں۔تو انہوں نے یہ پوچھا تھا کہ پھر ہم کیا کریں کہ یہ امت بیدار نہ ہونے پائے مقامِ آدمیت پہ بھی نہ آنے پائے۔اس نے کہا تھا کہ پروگرام اس کے لیے یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

سیلاب آتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں تسبیحاں دیدو' انہیں یہ کہدو کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے آیا' جرائم کی طرف نگاہ نہ جانے دو۔اس طرف نظر نہ اٹھنے دو کہ کس نے اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ قوم تباہ ہو گئی۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ایک ایک مہرہ مات ہوتا چلا جا رہا ہے عزیزانِ من!۔مشرقی پاکستان کی بساط پہ ہمارے مہرے جس طرح سے مات ہوئے تھے' یہاں آنے کے

بعد جس طرح ایک ایک مہرہ مات ہو رہا ہے۔ عزیزانِ من! بھکاریوں کی قوم کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اس 1971ء کی جنگ کے بعد کے عواقب میں جو کچھ ہمارے ساتھ آج ہو رہا ہے' جس طرح سے وہاں وفد جا رہے ہیں ہمارے' جس طرح سے یہ مذاکرات' مذاکرات کیا ہو رہے ہیں جس طرح سے ہر بار ہم خود فریبی میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آج صبح کے اخبار میں یہ کچھ تھا جس سے تڑپ اٹھا تھا کہ اتنے لمبے چوڑے مذاکرات کے بعد بات پھر وہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ نہیں ہندو کی ذہنیت ہمیں کسی فیصلے کی طرف نہیں آنے دیتی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے عزیزانِ من! ہندو کی ذہنیت۔ ہندو نے تو پاکستان بننے کے بعد جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ ٹھیک ہے آج جناحؒ کو یہ کچھ کر لینے دیجیے' کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگے گا کہ اس کے بعد ہم پھر اکھنڈ بھارت بنا دیں گے۔ جن کے عزائم یہ ہوں ان سے ہم خیر کی توقع کر سکتے ہیں؟۔ عزیزانِ من! کسی سے بھی یہاں خیر کی توقع نہیں ہو سکتی اپنے ہی حسنِ عمل سے یہ چیز ہو سکتی ہے۔ اور پھر حسنِ عمل کے اندر فریب میں نہ آ جایئے۔ قرآن نے پہلی بات کہی تھی کہ اپنی سرحدوں کو اتنا مضبوط رکھیے کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور مخالفین کے دل وہاں کانپ رہے ہوں تمہاری وجہ سے۔ یہ کہا تھا اس نے۔ مومن کے متعلق یہ کہا تھا (**و یقتلون و یقتل**) مومن کی زندگی یہ ہے کہ اس حفاظت کے لیے وہ ہر وقت تیار ہوتا ہے میدانِ جنگ میں جانے کے لیے۔ وہاں دو ہی شکلیں قرآن نے بتائی ہیں تیسری شکل ہے ہی نہیں عزیزانِ من! یا وہاں وہ اپنی جان دیدیتا ہے یا غالب اور منصور واپس آتا ہے۔ اب بھی یہی چیز اس مسئلہ کو حل کر سکے گی عزیزانِ من! آج بھی یہی ایک حل ہے کوئی دوسرا حل اس کا نہیں ہے۔ (**و یقتلون و یقتل**) ۔لیکن اس کے لیے تو قرآن نے شرط لگائی تھی کہ اس کے لیے اس انداز میں میدانِ جنگ میں لڑنا ہوگا پوری قوم کو۔ وہاں تو سپاہی الگ ہوتا ہی نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے تو ہر مسلمان سپاہی ہوتا ہے۔ ان کے لیے کہا تھا (**؟؟ مرسوس**) قوم کو یوں ہونا چاہیے جیسے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ اینٹ کی بھی دیوار نہیں کہ دو دیواروں کے اندر تھوڑا سا یونہی رخنہ ہوتا ہے۔ جیسے سکہ ڈھال کے ایک دیوار بنائی ہوئی ہو عزیزانِ من! یہ مثال تھی قرآن میں۔ قوم کے اندر اس قسم کی باہمی (**الف بین قلوبکم**) دلوں کی دیواریں اس طرح سے ملی ہوئی ہوں پوری قوم کے اندر۔ اور پھر ایک ہی زندگی کا مقصد ہو یا وہاں سے غالب اور منصور لوٹنا ہے یا جان دیدینی ہے۔ عزیزانِ من! وہاں آپ ایک ہندو کہہ رہے ہیں۔ ایران اور روما جیسی طاقتیں مٹھی بھر عربوں کا ایک میدان میں مقابلہ نہ کر سکیں۔ لیکن یہ جو آفتیں آتی ہیں ان کا علاج عزیزانِ من! یہ علاج ہوگا کہ ہر وقت Vigilance رہے۔ کوئی اور نہیں مارتا عزیزانِ من! (**وما اعصابکم مصیبة الا بما کسبت ایدیھم**) قرآن کہتا ہے جو مصیبت تم پہ آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ مصیبت آئے تو ڈھونڈوں ان ہاتھوں کو جن کی وجہ سے وہ مصیبت آئی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! میرا آج کا پیغام۔ اور پھر دہرا دوں ہم جو بچ گئے ہیں ان مصیبتوں سے ان کے لیے جو ابھی سانس لے رہے ہیں ان آفتوں کے اندر۔ ان کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے ہم کریں اور اس انداز سے کریں کہ ان کو اس کا احساس نہ ہونے پائے کہ ہمیں خیرات دی جا رہی ہے۔ ان کی طبعی زندگی کو بچانے کے لیے ان کی انسانی زندگی کی موت

جو ہے اس کو نہ خریدنے دیجیے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ بات میں نے درس کی اس آیت سے شروع کرنی تھی لیکن آج اس موضوع سے زیادہ موزوں موضوع ہو نہیں سکتا۔ اور آج کیا ابھی تو پتہ نہیں ہمیں کب تک یہ چیزیں جو ہیں یہ دہرانی پڑیں گی۔ یا اللہ! ہمیں وہ نگاہ دیدے کہ ہم ایسے اوقات میں ان اسباب کو دوسروں کی طرف تلاش کرنے کی بجائے اپنے ہاں تلاش کیا کریں۔ دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے کے لیے ہم خود سوچا کریں کہ ہم کس قدر ذمہ دار ہیں۔ پھر توفیق دیدے کہ اس کے بعد ہم یہ چیز عزم کریں اس بات کا کہ اس دفعہ یہ ہو گیا ہے اس کے بعد ایسا نہیں ہو گا۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ چھٹا باب (آیات 24 تا 30)

عزیزانِ من!

آج ستمبر 1973ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 24 ویں آیت سے ہو رہا ہے۔

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ انسان کی کیفیت یہ ہے اور میں یہ عرض کر دوں کہ جہاں قرآن یہ کہتا ہے انسان کی یہ کیفیت ہے عام طور پہ وہ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جس میں اس کی خودغرضی' تنگ نگہی' جلد بازی' عیش پروری' ظلوماً جھولاً اس قسم کی چیزیں آتی ہیں۔اس نقطہ کا سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔عیسائیت نے یہ کہا تھا کہ ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے۔اس کے بعد اس چیز نے ایک فلسفہ کی حیثیت اختیار کر لی کہ Evil یا شر انسان کی فطرت کے اندر ہے۔گویا اس کی ابتداء ہوئی اس وقت جس پہ اسکا کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔نہ تو انسانی بچے کا یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ خود دنیا میں آتا ہے نہ ہی یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنے اندر اپنی مرضی کی چیزیں رکھ لے۔تو ابتداء ہی یہاں سے کی کہ جب یہ بالکل مجبور ہوتا ہے تو یہ شر کا پیکر ہوتا ہے Evil ہوتا ہے۔پہلا گناہ جسے کہتے ہیں عیسائیت والے' وہ اس کے اندر ہوتا ہے۔اب جو فطرت ہی گناہگار ٹھہری اس میں شر ٹھہرا تو فطرت تو وہ چیز ہے جو بدلی نہیں جا سکتی۔اور اولیں گناہ جو ہے اس کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی اعمال اس دھبے کو دھو نہیں سکتے۔تو ذرا ذہن میں رکھیے کہ تصور کیا ہوا انسان کا۔مجبور پیدا کیا گیا اور یہ شر کا پیکر ہوا' فطرت ہی گناہگار اور اس چیز کو مٹا سکتا نہیں اپنی سعی و عمل سے۔وہ خدا جو اس قسم کا پیدا کرے اور پھر اس کے بعد یہ کہ اسکے یہ گناہ اور شر جو ہے اس کی سزا بھی دے۔آپ ذہن میں رکھیے کہ یہ مذاہب اور ان کے اوپر مبنی یہ فلسفے کیا کہتے چلے آ رہے تھے۔اب ہمارے ہاں آگے بڑھیے۔انسان کے متعلق قرآن نے جہاں یہ کہا کہ خودغرض ہے تنگ نگاہ ہے جلد باز ہے ظالم ہے تو ہمارے ہاں والوں نے بھی یہ آیتیں پیش کرنی شروع کر دیں اس بات کی تائید میں کہ دیکھئے صاحب قرآن کہتا ہے انسان ہے ہی ایسا۔چلئے جی مل گئی تائید۔

بات یہ ہے کہ جسے آپ انسان کہتے ہیں یہ حیوان ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے بس ایک درجہ اوپر آیا ہوا ہے۔اور وہ تو انہیں ابھی Missing Link جو ہے نہیں مل رہا ورنہ یہ جو بن مانس ہیں ان کے متعلق یہ ہے کہ وہ قریباً اسی نوے فیصد تو وہ انسان سے ملتی جلتی ان کے اندر صلاحیتیں ہوتی ہیں۔اور وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک لنک اور اگر مل جائے تو یہ کڑی مسلسل ہو جائے گی حیوانات سے انسان تک پہنچنے کی۔وہ کڑی ملے یا نہ ملے یہ تو حقیقت ہے کہ جسے ہم انسان کہتے ہیں اس کی بنیادی ضرورتیں اگر آپ دیکھتے ہیں بنیادی تقاضے کہیے ان کو' بنیادی تقاضے اس کے وہی ہیں جو حیوانات کے ہوتے ہیں: کھانا پینا سونا افزائش نسل کرنا۔اور پھر وہ جو حیوانوں کے اندر Instincts ہیں جبلت جسے کہتے ہیں وہ اندر کی خصوصیات جنہیں کہتے ہیں وہ تو اس کے اندر بھی ہیں اسی طرح جیسے حیوانات کے اندر ہیں۔اور Basically عام طور پہ وہ ان

کے علماء جو ہیں حیاتیات کے تین بنیادی جبلتیں گناتے ہیں نا اس کے لیے: Self Preservation (تحفظِ خویش) اپنے آپ کو محفوظ رکھنا یہ بنیادی تقاضا ہے زندگی کا ۔ وہ زندگی خواہ چیونٹی میں ہو یا وہ زندگی انسان کے اندر ہو تحفظِ خویش زندگی کا تقاضا ہے ۔ Self Aggression (تغلبِ خویش) غالب رہنا دوسرے سے ۔ یہ اصل میں وہ جو پہلا جذبہ ہے نا تحفظِ خویش کا اسی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غالب رہے ۔ اور Preservation of Self تسلسل جو ہے اپنا حیات کا اپنی ذات کا نسل کی افزائش کے ذریعے سے اس کو قائم رکھنا ۔ یہ جسے Sex کا جذبہ کہا جاتا ہے یہ Basic جذبے ہیں ۔ آپ دیکھئے گا حیوانات میں بھی یہ ہیں انسانوں کے اندر بھی یہ ہیں ۔ اور اسی لیے کہا جاتا ہے 9/10 جو ہے انسان کا وہ حیوانی زندگی ہے اس کی ۔ 1/10 یا دسواں حصہ تو بہر حال یہ بھی مانتے ہیں ۔ اور فرق وہیں آ کے شروع ہوتا ہے جو وہ دسواں حصہ ہے ۔ قرآن یہ کہتا ہے یاد رکھئے جہاں اس نے خالی انسان کا ذکر کیا ہے وہ کہتا یہ ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے اس کی حیوانی سطح زندگی کے اوپر تو وہ یہ یہ کچھ کرتا ہے جو ہر حیوان کرتا ہے ۔ لیکن وہ جو 1/10 حصہ اس کے ساتھ وہ گناتے ہیں وہ اس کی انسانی زندگی کا ہے ۔ اور انسانی زندگی وہ ہے کہ جس میں Values آتی ہیں اقدار آتی ہیں جائز اور ناجائز کی تمیز آتی ہے غلط اور صحیح کا امتیاز آتا ہے شر اور خیر کا ایک فرق پیدا ہوتا ہے ۔ حیوانات میں یہ نہیں ہے وہ Value سے واقف نہیں ہوتے ۔ ایک بیل کے نزدیک پیٹ بھرنا بھوک کے تقاضے کا ختم کرنا یہ تقاضا ہے اس کی زندگی کا ۔ اسے باہر چھوڑ دیجیے ایک طرف اس کے مالک کا کھیت ہو ساتھ ہی کسی دوسرے کا کھیت ہو وہ جائے گا تو اس کو یہ نگاہ میں بات نہیں آئے گی کہ میں نے اپنے مالک کے کھیت سے کھانا ہے اِدھر سے نہیں کھانا کیونکہ یہ ناجائز ہے ۔ جائز اور ناجائز کا تصور نہیں ہوتا اس کے ہاں' وہ جو کھیت سامنے آ جائے گا اس میں منہ مار دے گا ۔ یہ چھوٹی سی مثال میں اسے Value کہتے ہیں ۔ یہ جو چیز ہے کہ نہیں اپنی چیز میرے لیے جائز ہے دوسرے کی ناجائز ہے یہ Value ہے ۔ حیوان میں یہ نہیں ۔ 9/10 جو کہا ہے انسان کا اس میں یہ نہیں ہے ۔ یہ جو 1/10 حصہ کہتے ہیں کہ اسمیں انسانیت کا ہے یہ ہے جہاں Values آتے ہیں ۔ تو یاد رکھیے جہاں جہاں قرآن نے یہ کہا ہے نا کہ انسان خود غرض بھی ہے Selfish ہے اپنا ہی آپ سنبھالتا ہے تنگ نظر بھی ہے دوسرے کے مفاد کو نہیں دیکھتا ۔ یہ سارا وہ حیوان ہے جو وہ 9/10 حصہ حیوانی زندگی کا اس میں ہے The animal in man ۔ اور اس کے بعد قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ جو 1/10 یہ کہتے ہیں وہ حصہ ایسا ہے کہ اگر اس کو یہ Develope کر لے اپنے اس حصے کو تو یہ اس کی حیوانی زندگی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہتے ہیں اور اس انسانی زندگی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہتے ہیں جسے Values کے تقاضے کہا گیا ہے ۔ پیٹ اس نے بھی بھرنا ہے اپنا' اس کے بغیر چارہ نہیں ہے ۔ ہر حیوان کی طرح ضرورت ہے Basic Necessities کی ہے' تقاضا ہے اس کی زندگی کے محفوظ رہنے کا کہ اپنا پیٹ بھرے ۔ لیکن انسان کی اپنی جو زندگی انسانیت کی اب میں اسے کہونگا حیوانی زندگی نہیں' اس کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے کھیت سے چرے غیر کی کھیتی پہ نگاہ نہ رکھے ۔ بس یہ فرق پیدا ہوا انسان ہو گیا ہمارے معنوں میں ۔ یہ فرق نہ پیدا کیا حیوان ہو گیا ۔ غالب نے اسے آدمی اور انسان کے الفاظ

سے امتیاز اس میں پیدا کیا تھا۔ جو اس نے کہا تھا کہ

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

آدمی سے مراد اس کی یہ حیوانی سطحِ زندگی تھی اس کی۔ Basically قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ تصور کہ انسان فطرت کے اعتبار سے پیدائش کے تخلیق کے اعتبار سے شر ہے' وہ کہتا ہے غلط ہے۔(**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**) بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہے جو اس کو ملتا ہے۔ یہ تو حسین ترین تقویم میں اس کو پیدا کیا ہے۔(**ثم رددنٰہ اسفل سافلین**) یہ کم بخت پھر اس کے بعد خود اپنے آپ کو حیوانی سطح کے اوپر لے آتا ہے۔ کون نہیں لاتا۔(**الا الذین اٰمنوا و عملوا الصٰلحٰت**) وہ جو اقدار کا تحفظ رکھتے ہیں اپنے ساتھ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس پست سطح پر نہیں گرتے۔ یہ تو پست سطح کی طرف آنا ہے۔ اور بلندیوں کی طرف جانے میں تو پوچھئے نہیں کہ اس کی کیفیت کیا ہے کہاں پہنچ سکتا ہے صاحب ۔ وہ کہ جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ کہ جسے **اختار السمٰوٰت و الارض** سے بھی قرآن کہتا ہے کہ آگے جا سکتا ہے یہ صاحب ۔ وہ کہ جسے حیوانی زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی حیاتِ جاوداں مل سکتی ہے' وہ جس کے سامنے ارتقائی منازل اتنی لامنتہا کھلی ہوئی ہیں کہ جن کی انتہا نہیں ہے۔ جنت بھی انتہا نہیں ہے اس کے ارتقائی سفر کی' وہاں بھی کہا ہے کہ ان کی پیشانیوں کا نور انہیں اور آگے کے راستے دکھائے گا۔ یہ ہے انسان۔ لیکن اگر یہ اپنے آپ کو حیوانی سطح پہ رکھتا ہے یعنی اقدار اور Values کا خیال نہیں رکھتا تو پھر وہ ساری چیزیں ہیں جنہیں قرآن نے کہا ہے کہ انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے اگر' وحی کی راہنمائی میں اپنے تقاضے پورے نہ کرے تو پھر یہ اس قسم کا ہوتا ہے۔ اس نقطہ کو سامنے رکھیے گا۔ یہ امتیاز آپ کو کہیں نہ دوسرے مذاہب میں ملے گا نہ فلسفہ میں ملے گا۔ وہ انسان کو حیوان ہی کی بڑھی ہوئی سطح قرار دیں گے۔ قرآن اس حصۂ زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا کہ جس میں اس کی طبعی زندگی کے تقاضوں کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ابھی ابھی میں عرض کرونگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ وہ جو ایک حصہ انسانیت کا جسے آپ کہہ لیجیے اس کو دیا گیا ہے وہ اقدار سے متعلق ہے Values سے متعلق ہے۔ وہاں اس کو وحی کی راہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے کہ Values انسان کی اپنی عقل اپنے اس کے تقاضے اپنی جبلت جسے آپ کہیں گے وہ Values کو پیدا نہیں کر سکتیں یہ اسے ملی ہیں وحی کے ذریعے سے۔ یہ ہے جہاں وہ انسان کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے گا۔ میں نے کہا ہے کہ غالب نے تو اس سطح زندگی کو جو حیوانی سطح ہے اسے آدمی کہا ہے اور اوپر کی زندگی کو انسان کہا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ قرآن نے بھی آدم کے سامنے فطرت کی قوتوں کو جھکایا ہے آدمی ہے وہ ابھی انسان کی سطح پہ نہیں ہے۔ لیکن قرآن نے اس سے اوپر کی سطح جو ہے اسے مومن کہہ کے تعبیر کیا ہے۔ اگر وہ وحی کی راہنمائی میں اپنے تقاضے پورے نہیں کرتا تو اسے صرف انسان کہا ہے۔ اور انسان کے متعلق کہا ہے کہ پھر وہ حیوانوں کی طرح اسے اپنی اپنی فکر ہوگی دوسرے کا خیال نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں وہ کہتا ہے کہ (**بل ھم اضل**) کہتا ہے یہ حیوانات

سے بھی پست سطح پہ آ جاتا ہے اگر اس کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے۔ وحی کے ساحلوں کے اندر اس پانی کو نہ رکھا جائے تو اس کے سیلاب کی حدود فراموشیوں کو پوچھتے کیا ہو حیوانات سے نیچے گر جاتا ہے۔ عجیب چیز قرآن نے کہی ہے۔ یہاں تک تو حیوان اور انسان کہ جو وحی کی راہنمائی میں زندگی نہیں بسر کرتا برابر ہیں کہ جب اسے بھوک لگتی ہے تو یہ تمیز نہیں کرتا اپنے میں اور غیر کے اندر جائز میں اور ناجائز میں۔ بیل بھی نہیں کرتا یہ بھی نہیں کرتا۔ یہ لوٹ اور کھسوٹ یہ سلب اور نہب یہ کیا چیز ہے؟ حیوانی سطحِ زندگی ہے جنگل کا Law ہے یہ انسان نہیں بستے حیوان بستے ہیں۔ یہاں تک تو قرآن نے کہا ہے (**اولئک کالانعام**) انسان اور حیوان ایک سطح پہ ہیں۔ اس نے کہا (**بل ھم اضل**) یہ اس سے بھی پست تریں سطح پہ آ جاتا ہے۔ بیل جب چارہ چر لیتا ہے خواہ وہ اپنے کھیت سے چرے یا غیر کے کھیت سے چرے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے وہ اطمینان سے ایک طرف بیٹھ جاتا ہے اور بڑے مزے سے پھر وہ جگالی کرتا رہتا ہے۔ اُسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ باقی چارہ جو ہے وہ اس کو کاٹ کے اور ذخیرہ کر لے یا کسی دوسرے کو اس میں چرنے نہ دے۔ اس کو اس سے غرض ہی نہیں ہوتی۔ میرا پیٹ بھر گیا اطمینان ہو گیا' اس کم بخت کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی اس بھوک کی انتہا ہی نہیں ہوتی۔ یہ بھرے ہوئے پیٹ والے جو ہیں بھوکے پیٹوں سے زیادہ بھوک والے ہوتے ہیں۔ بھوک تو مٹ جاتی ہے دو تین روٹیوں سے یہ جو ساری دنیا کی دولت سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی حیوان قرآن کہتا ہے کہ فالتو رزق کو اپنی پیٹھ پہ لاد کے گھر نہیں لے جاتا۔ یہ یہی حیوان ہے کم بخت (**بل ھم اضل**) ۔ کھاتا ہے سلب و نہب سے' بالعموم اپنے کھیت سے نہیں کھاتا دوسروں کے کھیت سے ہی چرتا ہے۔ چرتا بھی ہے اور پھر اس کے بعد اس کو جمع بھی کرتا ہے (**جمع مالًا و عددہ**) پھر ننانوے کے پھیر میں لگ جاتا ہے یہ۔ اور یہ وہ چیز ہے (**الھٰکم التکاثر**) کہتا ہے ضروریاتِ زندگی تو بڑی جلدی سے پوری ہو جاتی ہیں انسان کی ہر زندگی کی۔ یہ بڑے چھوٹے چھوٹے پیمانے ہیں۔ بڑے سے بڑا دولتمند بھی کتنی روٹیاں کھا لے گا۔ بلکہ وہ تو جتنی دولت بڑھتی چلی جاتی ہے کم بخت کی وہ روٹیوں والی سکت کم ہوتی چلی جاتی ہے اتنی پریشانیاں ہوتی ہیں کہ جو ایک مزدور کھا کے اپنے آپ میں سیر ہو جاتا ہے اُس کے نصیب میں وہ بھی نہیں ہوتا ۔لیکن بہر حال کتنی کھا لے گا۔ لیکن ایک جذبہ ہے اس کے اندر اُسے قرآن کہتا ہ تکاثر۔ عجیب الفاظ ہیں اور یہ زبان عجیب ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ٹھیک ہے زیادہ سے زیادہ سمیٹنا تکاثر کا لفظ ہے ضرورت کے لیے نہیں۔ دوسروں سے زیادہ بڑھ جانے کا جذبہ جو ہے اس کے اندر' اس کے پاس ایک مل ہے میرے پاس دو ہونی چاہئیں صاحب' وہ Millionare ہو گیا Multi-Millionare ہونا چاہیے صاحب۔ کہتا ہے یہ ضرورت کے لیے نہیں کرتا۔ اور کوئی حیوان یہ نہیں کرتا۔ چلا جاتا ہے پھر' ایک ریس شروع ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر اس کی۔ (**الھٰکم التکاثر**) اور پھر تکاثر جو ہے ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ' یہ پھر اس کو اس کی صحیح انسانی زندگی کے مقصد سے غافل کر دیتا ہے۔ اور کہا کہ اگر تقاضا صرف زندگی کا ہوتا وہ تو چھوٹا سا پیمانہ تھا بھر بھی جاتا۔ (**حتّٰی زرتم المقابر**) تکاثر ایسی چیز ہے دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ کہ قبر تک نہیں کم بخت پورا ہوتا۔ (**بل ھم اضل**) حیوانات سے بھی گیا گذرا۔ یہ جس معاشرے میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں عزیزانِ من! آپ جا رہے

ہوں آپ کے ساتھ ہی عام کتا بھی چلا جا رہا ہو تو ایک دفعہ آپ دیکھ لیں گے کاٹنے والا نہیں ہے اطمینان سے آپ چلتے جائیں گے۔لیکن عزیزانِ من! اگر آپ چل رہے ہوں تنہائی میں اور پیچھے پیچھے آپ کے انسان آ رہا ہو' بیل بھیڑ اور کتا نہیں' اور آپ دیکھیں کہ وہ پیچھا کر رہا ہے آپ سوچئے پھر کیا گذرتی ہے آپ پہ' بار بار دیکھتے ہیں کن اکھیوں سے آپ۔اور اگر اب وہ ساتھ آپ کے لگ گیا ہے آ کے تو پھر تو پوچھئے ہی نہیں کیا کیفیت ہوتی ہے۔اور اگر اس نے جاتے وقت ہاتھ ملا لیا ہے تو آپ کو انگلیاں گننی پڑتی ہیں کہ پانچ رہ گئی ہیں یا چار ہیں۔یہ معاشرہ کہ جس میں انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے اقدار کا اس کو تحفظ نہ رہے وہاں انسانوں کی اپنی زندگی کی یہ کیفیت ہوتی ہے جو حیوانوں کی کبھی یہ نہیں ہوتی۔میں عرض کر رہا تھا کہ جہاں انسان کے متعلق گفتگو آئے قرآن میں' یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جب وہ یہ باتیں کہتا ہے تو اس کی حیوانی زندگی کے متعلق وہ گفتگو کرتا ہے۔جہاں اس میں اقدار آتی ہیں جس کو وہ ایمان کہتا ہے پھر یہ مومن کی زندگی ہوتی ہے۔تو میں نے جیسا کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ مومن کا ہمارے ہاں تو ترجمہ اور معنی ہر جگہ یہی کیا جاتا ہے ایمان لانے والا۔مومن کے معنی ہیں دنیا کو امن بخشنے والا۔اس کا تو مادہ ہی امن ہے اس لفظ کا۔اقدار کے تحفظ سے یہ خود بھی امن میں ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں ساری دنیا بھی امن میں ہوتی ہے۔یہ مومن کا درجہ وہ کہتا ہے انسان سے اونچا۔

کہہ وہ یہ رہا تھا کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ ذرا سی اس کے اوپر مصیبت آتی ہے تو تنگ دلی کا یہ عالم کہ دہائی مچا دیتا ہے صاحب۔اور اس دہائی میں کہا کہ خدا بھی یاد آنے لگ جاتا ہے۔اور ذرا سی وہ مصیبت رفع ہوئی اور تھوڑی سی خوشحالی آئی تو کیفیت (**فلما انجٰھم اذاھم یبغون فی الارض بغیر الحق**) (10:23) وہ سرکشی ایسی برپا کرتا ہے دنیا میں' الحق کا خیال ہی کوئی نہیں ہے پھر' اقدار کا کوئی تصور ہی نہیں باقی رہتا ان کے سامنے۔سرکشی اختیار کرتا ہے' اوکاہے کے لیے یہ سرکشی اختیار کرتا ہے؟ (**یٰایھا الناس انما بغیکم علیٰ انفسکم متاع الحیٰوۃ الدنیا**) (10:23) کہا کاہے کے لیے یہ قانون فراموشیاں' حدود سے تجاوز' ہر قسم کا فساد کاہے کے لیے اختیار کرتے ہو۔ایک ہی لفظ ہے۔**متاع الحیٰوۃ الدنیا** ہے نا' دنیاوی زندگی کا یہ ساز و سامان ہے نا جس کے لیے یہ کرتے ہو۔یہاں سے ایک دوسری چیز شروع ہوتی ہے۔وہ اگلی مثال کے بعد میں اس کی تفصیل پیش کرونگا پہلے یہ آیات دو پیش کر دوں۔کہا کہ دنیاوی زندگی کے ساز و سامان کے لیے یہ کچھ کرتے ہو۔(**انما مثل الحیٰوۃ الدنیا کمآءٍ انزلنٰہ من المسآء فاختلط بہ نبات الارض مما یاکل الناس و الانعام حتیٰ اذا اخذت الارض زخرفھا وازینت و ظن اھلھا انھم قٰدرون علیھا اتٰھا امرنا لیلًا او نھارًا فجعلنٰھا حصیدًا کان لم تغن بالامس کذٰلک نفصل الاٰیٰت لقومٍ یتفکرون**) (10:24) آخری بات کو پہلے کہوں کہ یوں ہم بات کو واضح کر دیتے ہیں' کن کے لیے؟ ان لوگوں کے لیے جو ذرا غور و فکر سے کام لیں۔یاد رکھئے قرآنِ کریم جتنے اپنے حقائق اور قوانین اور اصول و اقدار بیان کرتا ہے آپ دیکھیں گے کہ ان آیات کے بعد ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے (**لقوم یعلمون ' لقوم یعقلون ' لقوم یتفکرون**) غور و فکر

کرنے والوں کے لیے' عقل وشعور سے کام لینے والوں کے لیے' تدبر کرنے والوں کے لیے۔ یہ لازمی شرط ہے اس کے لیے۔ وہ چیز کہ جو اب حرام قدار دیدی گئی ہے' شرع میں تو عقل کو کوئی دخل ہی نہیں ہوتا صاحب۔ غور وفکر اب اس میں نہیں ہوسکتا جو کچھ آپ سے پہلے مرنے والے کہہ گئے ہیں آپ کو آنکھیں بند کر کے مانتے چلے جانا چاہیے۔ یہ غور فکر یہ تدبر تعقل یہ جتنے حکم ہیں قرآن کے وہ یہ ان پہلوں کے لیے تھے ہمارے آپ کے لیے نہیں ہیں۔ بہرحال۔ مثال دی ہے (**مثل الحیوٰۃ الدنیا**) میں نے عرض کیا ہے کہ پہلے میں یہ آیت پیش کرتا ہوں پھر عرض کرونگا قرآن کہتا کیا ہے۔ کہتا ہے یہ سارا کچھ اس کے لیے ہے اور اس کی حیثیت یہ ہے مثال اس کی یوں سمجھئے کہ آسمان سے بارش برسی زمین میں صلاحیت تھی اگانے کی اس نے اپنے دبے ہوئے خزانوں کو اگلا کونپلیں پھوٹیں فصلیں اگیں۔ پھر اس میں سے حسین حسین گل بوٹے سامنے آئے زمین نے گہنے پہنے وہ سہاگن بن گئی۔ کیا الفاظ ہیں!! (**و زخرفھا وازینت**) یہ سارا کچھ کیا۔ زمین کا مالک بہت خوش ہوا کہ بس چند دنوں کی بات ہے ڈھیر لگ جائیں گے غلے کا' اتنا مال آئے گا اتنی دولت آئے گی کہ کسی کے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔ کہا کہ اس کے بعد یہی پانی جس نے یہ کیا تھا وہی پانی طوفان بن کر آ گیا اور یہ کھیت یوں ہوگئے گویا اس میں کبھی کوئی ایک کونپل بھی نہیں پھوٹی۔ کہا یہی ہے نا حیثیت ان چیزوں کی۔ وہی پانی ایک مقدار سے وہ آیا ہے تو اس نے یہ سارا کچھ پیدا کیا ہے' اسی کا سیلاب اس طرح سے بہا کے لے جاتا ہے جو جا کے دیکھو ان کھیتوں کے اوپر تو نظر آئے گا کہ کبھی کسی نے یہاں کچھ بویا ہی نہیں تھا۔ کہا: جس کی زندگی یہ کیفیت ہو جس شے کے اپنے قائم رہنے کی استعداد واستطاعت کی یہ کیفیت ہو اُسے زندگی کا مستقل سہارا سمجھ لینا اور اس کے خاطر پھر جائز اور ناجائز کی تمیز بھی اڑا دینا۔ (**لقوم یتفکرون**) کہا مجھ سے نہ پوچھو ذرا اپنی عقل سے ہی پوچھو تو سہی' اپنی فکر سے ہی پوچھو۔ یہ کیفیت ہے صاحب اس کی۔ آگے عرض کرونگا وہ کیا کہتا ہے۔ (**واللہ یدعوا الیٰ دار السلٰم**) (10:25) کہتا ہے بات اتنی ہی ہے کہ یہ جو کچھ تم اپنے قوانین اپنی اغراض کے ماتحت کرتے ہو وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم میں دنیاوی زندگی اور اس کی متاع اس کے ساز وسامان اس کی زیب وزینت کے متعلق کئی ایک دیگر مقامات میں بھی اسی قسم کی باتیں کہی ہیں کہ بڑی ناپائیدار سی چیزیں ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ ایک طرف تو ہمارے سامنے وہ آئی شے کہ جنہوں نے اسی دنیاوی زندگی کے ساز وسامان وبراق کو مقصود بالذات سمجھ لیا۔ جائز وناجائز کی تمیزیں بھی اٹھا دیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنا شروع کر دیا گویا مقصود ہی یہ قرار پا گیا۔ وہ اس طرف نکل گئے۔ اور وہاں سے جب روکا' آئی یہ مذہب کی دنیا۔ تو ادھر سے ہمارے ہاں یہ مذہب کی دنیا آئی اور مذہب سے بھی جب آگے ہم چلے تو وہ جسے دین کا مغز کہا جاتا ہے پھر تصوف کی دنیا آئی۔ اِنہوں نے یہ کیا کہا کہ صاحب یہ دنیا ایک لاش ہے اس کے چاہنے والے کتے ہیں' دنیا تو ایک قید خانہ ہے جس میں مومن پھنسا ہوا ہوتا ہے' انتہائی قابلِ نفرت ہیں یہ چیزیں' بڑی ناپائیدار شے ہے' ناپاک ہے یہ' اس کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ ایسا پروپیگنڈہ اس کے متعلق کیا آپ دیکھئے الفاظ کس طرح سے خاص معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ کسی کے متعلق کہیے کہ صاحب بڑا دنیادار ہے آپ دیکھتے ہیں نقشہ کیا ذہن میں آ جاتا ہے۔ تصور وہ بنیادی کہ دنیاوی زندگی اس کے

لذائذ اس کا سامان و یراق اس کی زیب و زینت کی چیزیں بہرحال جو کچھ بھی اس دنیا میں ہے قابلِ نفرت ہے چھوڑ دو ترک کر دو اس کو' اللہ والوں کے لیے یہ نہیں ہے۔ پھر وہ اللہ کے مقربین کے نقشے سامنے ہمارے کھینچے گئے صاحب۔ ایک گدڑی ہے اس میں سو سو پیوند لگے ہوئے ہیں ایک جھونپڑی ہے جھونپڑی سے بھی نیچے ایک چیز ہوتی ہے ''اوہنوں کُلی کیندے نیں''۔ پھر وہ یہاں سے بھی نکل جاتے ہیں جنگلوں میں غاروں میں ہی چلے جاتے ہیں پھر بتایا جاتا ہے کہ صاحب چالیس دن کے بعد ایک جو کھاتے تھے ایک گھونٹ پانی کا پیتے تھے۔ ساری عمر میں سوا تولہ انہوں نے اناج کھایا۔ گھر بار بال بچے یہ سب چیزوں کو تیاگ دو ترک کرتے چلے جاؤ۔ دوسری طرف یہ زندگی۔ آپ نے دیکھا کہ انسان کس طرح Extremes پہ جاتا ہے۔ ایک طرف وہ Materialistic Concept of Life وہ کیا ہے۔ مادی تصورِ حیات: حیوانات ارتقاء کرتے کرتے آگے بڑھے انسانوں کی شکل میں آ گئے بس ایک پیکر ذرا اس کا مختلف ہوا ہے دوسروں سے کہ انہیں چار پاؤں کے اوپر چلنا پڑتا ہے یہ دو پاؤں ہیں اور دو یہ اوپر کر لیتا ہے تو یہ ہاتھ اس کے ہو جاتے ہیں باقی سب کچھ یہ ویسے ہی جانور کا جانور ہے۔ مادی سطح زندگی: کھایا پیا جبلی تقاضے پورے کیے ایک Physical Laws کے تابع یہ زندگی چل رہی ہے اس قانون کے مطابق آگے چل کے یہ مشین ختم ہوئی فزیکل لائف ختم ہوئی انسان بھی ختم ہو گیا۔ بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے۔ خالص حیوانی سطحِ زندگی' کوئی اقدار نہیں کوئی Values نہیں کوئی تسلسلِ حیات نہیں' طبعی زندگی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ ہے جسے قرآن نے کہا ہے یہ Concept جو ہے نا اس کا نام ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ یہ دنیاوی زندگی جو ہے جو تم اسی کو منتہا اور محاصل سمجھ رہے ہو اس کی کیفیت یہ ہے۔ ناپائیداری یہاں ہے اس کی' تمہارے جسم کی ناپائیداری' کتنا زیادہ سے زیادہ جی لو گے۔ بڑی سے بڑی خبریں آتیں اخبارات میں صاحب کہ 117 برس تک۔ ٹھیک ہے۔ یہ جتنی چیزیں ہیں تمہاری اپنی یہ طبعی زندگی ختم ہوئی ان سب کی قیمت خود بخود ختم ہو گئی۔ وہ انسان نہیں وہ مرتا یہ سارے مر جاتے ہیں یہ جو کچھ اس نے اکٹھا کر رکھا ہوتا ہے' بال بچے اولاد وغیرہ یہ سب۔ یعنی اس کی طرف سے سارے مر گئے۔ ختم ہو جانے والی چیز۔ یعنی ایک طرف وہ تصورِ حیات کہ وہی جانور کا جانور ہے۔ وہاں سے ادھر آئے تو دوسرا تصورِ حیات کہاں سے یہ آیا؟ رہبانیت: عیسائیت کی پھیلائی ہوئی یہودیوں کی پھیلائی ہوئی مجوسیوں کی پھیلائی ہوئی ہندو جوگیوں سنیاسیوں کی پھیلا ہوئی' ترکِ دنیا۔ یعنی ترک کے اندر ہی ان کے ہاں محاصل ہوا۔ چھوڑ دو یہ سب کچھ۔ آپ ملا کے وعظ سے سنیے تو اس میں یہ دنیا نہایت قابلِ نفرت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وعظ کہنے کے بعد پھر وہ یہ کہے کہ بھئی دیکھو اس مسجد کی یہ ضرورت اُس کی یہ ضرورت امام کی یہ ضرورت یہاں یہ ساری دنیا کی ضرورتیں وہ گنا تا جائے گا دنیا قابلِ نفرت ہے۔ یعنی تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ قابلِ نفرت ہے اس کو چھوڑ دو مجھے دیدو لا کے۔ اور وہاں سے اگر آپ گئے ہیں کہ نہیں صاحب اس میں تو صاحب؟؟؟ ہے ذرا روحانیت کی طرف جائیے تو وہاں تو پوچھئے ہی نا پھر جو نقشہ میں نے عرض کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اپنے محل جو ہیں سونے کے کھڑے ہو جائیں۔ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ پہلا تصور جو تھا وہ خالصتاً مادہ پرستی کا دیا انہوں نے' حیوانی تصور۔ ادھر آئے تو خالصتاً

یہ رہبانیت کا تصوف کا تصور جو عیسائیت ہندومت جوگیوں سے اور مجوسیوں سے ان سے لیا ہوا تصور۔ وہ بھی اسلام یہ بھی اسلام۔ اب دو ہی طرح کا اسلام ملے گا یا تو وہ ہے کہ صاحب اس دنیا کے اندر جو کچھ جی چاہے کرتے چلے جاؤ کرتے چلے جاؤ۔ اگر ذرا سی خلش باقی رہ گئی ہے اندر تو اس کا پورا کرنا وہ ملا سمجھا دیتا ہے جس طرح جی چاہے اکٹھا کرو اڑھائی پرسنٹ دیدیا کرو باقی سب شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب ہے۔ چل بھئی ۔اور اگر اُدھر سے آپ نے کہا کہ نہیں صاحب آپ ساری عمر یہ کچھ کرتے رہے آخری عمر میں بالآخر انسان عاقبت کی سوچتا ہے نا کہ کچھ میاں اس دنیا کی بھی فکر کرو۔ تو پھر یہ کیا کہ یہ سب کچھ چھوڑتے چلے جاؤ' بھئی اب تو ہم یہی چیز ہے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے زندگی بڑی باعزت گذاری نوکری باعزت کی اور اب اس کے بعد لڑکیوں کو بیاہ دیا بیٹے اپنے اپنے کام پہ لگ گئے گھر رہنے کو ملتا ہے پنشن بھی مل جاتی ہے سب اطمینان ہے۔ اور اب کچھ اُدھر کی فکر کرنی چاہیے میاں نماز پڑھ آتا ہے تلاوت کرتا ہوں تسبیح پھیرتا ہوں اپنے گھر میں بیٹھا رہتا ہوں۔ چل بھئی اب یہ عاقبت شروع ہوگئی اس کی۔ مسلمان کی زندگی یہ ہے۔ میں نے عرض کیا تھا نا کہ اس کی تائید میں اس قسم کی آیتیں جو قرآن نے کہا ہے ۔صرف ہو ہی یہ رہا ہے قرآن میں سے ایک آیت کو اٹھاتے ہیں اس میں سے جو اپنے مطلب کی ہوتی ہے۔ اس نے یہ کہا تھا کہ (**افتؤمنون ببعض الکتٰب و تکفرون ببعض**) کیا کیفیت تمہاری یہ ہے کہ اس قرآن کے بعض حصے کو مانتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ (**فما جزآء من یفعل منکم ذٰلک الا خزی فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم القیٰمۃ اشدہ علیٰ اشد العذاب**) جو یہ طریقہ اختیار کرے گا کہ اپنے مطلب کی آیتیں نکال لیں باقی سے انکار کر دیا' یاد رکھیے اس دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوگا اور قیامت کے عذاب کا تو پوچھو نہیں کیا ہوگا۔ لیکن یہاں ہوتا یہ ہے کہ یا تو اس کو سرے سے اٹھا ہی پھینکا یا تو یہ تصور ہو گیا۔ اور اگر کہیں یہ بیچ میں آیا تو اس میں سے جو اپنے مطلب کی چیز ہوئی اس کو پیش کر دیا۔ یہ بھی نہیں کہ ایک آیت کو پیش کر دیا' آیت کے اتنے حصے کو پیش کر دیا ایک آیت کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ یہ کیفیت ہوگئی ہے ان کی کہ جو ابھی بہر حال اپنے آپ کو مذہب پرست کہتے ہیں۔ یہ آیتیں لی۔ دنیا کی ناپائیداری اس کو قابلِ نفرت تصور کرنا۔ عزیزانِ من! یہ اس قوم کا دین یا مذہب بن گیا جسے ایک بار نہیں قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں یہ کہا ہے ان کے (**و سخر لکم ما فی السمٰوٰت و الارض جمیعًا منھم**) اس ساری کائنات میں جو کچھ بھی ہے تمہارے لیے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ وہ ارض ہی نہیں کہہ رہا وہ سماوات بھی کہہ رہا ہے۔ **جمیعًا منھم** ارض وسماوات کے اندر جو کچھ اس کائنات کے اندر ہے وہ تمہارے تابع تسخیر کیا گیا ہے۔ اندازہ لگائیے وہ اس کا مقام یہ بتاتا تھا۔ اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی کی ضروریات بھی جو ہیں ان کو بھی یہ ناپاک قرار دیتے ہیں اور ان سے ترک اور ان سے دور بھاگنے کا نام ان کے ہاں خدا کا تقرب یا شریعت کا فیصلہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر وہ پہلا تصور جو تھا وہ انسان کے ذہن کے اندر سرسام پیدا کرتا تھا تو یہ دوسرا تصور فالج پیدا کرتا ہے۔ قوم مفلوج ہو کے رہ جاتی ہے بالکل۔ اللہ کہیں آپ کو فرصت دے تو اقبالؒ کی آخری کتاب ہے 'ارمغانِ حجاز' اس میں ایک نظم ہے اردو کی' باقی تو وہ فارسی میں ہے زیادہ' تھوڑا سا حصہ اردو کا بھی ہے۔ وہ اردو کی نظم ہے ابلیس کی

مجلسِ شوریٰ' اسے ذرا پڑھیے۔اور بڑے ہی عجیب حسین اور بلیغ انداز میں وہ بات کہہ گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؒ کی فکر کا اور قرآن کی جو رہنمائی ہے اس کا نچوڑ اس نظم کے اندر آپ کو ملے گا اور ڈرامائی انداز میں ملے گا۔ابلیس اپنی کیبنٹ کو لے کے بیٹھا ہوا ہے Preside کر رہا ہے اس کو' کابینہ کا اجلاس ہو رہا ہے وزراء بھی اس میں شامل ہیں۔وہ کہتا ہے رپورٹ پیش کرو اپنی اپنی کہاں کہاں کیا کیا تم نے دیکھا کیا کر آئے ہو۔اپنے اپنے محکمہ کا وزیر رپورٹ پیش کرتا ہے۔مغربی جمہوریت کا کیا انداز ہے اس نے کیا کیا' ہٹلر اور مسولینی کی ڈکٹیٹرشپ جو ہم نے ایجاد کی تھی اس کا نتیجہ کیا نکلا' روس کے اندر ہم نے ایک نظام دیا تھا اس کی رپورٹس آئی ہیں تازہ وہاں ہم نے انسانیت کے ساتھ کیا کیا کیسے اس کو ہم تباہ کر رہے ہیں۔یہ مختلف نظام مختلف نظریے وہ گنا تا چلا جاتا ہے۔اس کے لیے اس سے وہ کہتے ہیں کہ اس کا ہم یہ تدارک کر رہے ہیں اس کا یہ تدبر کر رہے ہیں۔آخر میں ان کے ہاں کا جو وہ ڈپٹی پریذیڈنٹ ہے اس کے ذمہ یہ اشتراکیت یا سوشلزم یا کمیونزم لگائی ہوئی تھی۔وہ کہتا ہے کہ یہ باقی جو کچھ کہتے ہیں یہ تو بڑی ہنگامی سی چیزیں ہیں چھوڑ دیجیے یہ قابلِ تفقہ نہیں ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد ابلیسیت جو ہے اس کا توڑ جو ہے مجھے ان میں نظر آتا ہے اگر یہ نظام دنیا میں چل گیا تو پھر ہمارا ابلیسی نظام ٹوٹ جائے گا۔وہ یہ چیز پیش کرتا ہے۔ابلیس اس سے کہتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو' تمہاری نگاہ دور تک نہیں گئی' میری نگاہ بہت دور تک جاتی ہے قیامت تک میری نظریں ہیں۔

مزدکیت فتنۂ نہیں اسلام ہے

ابلیسی نظام کے لیے فتنہ جو ہے وہ یہ سوشلزم اور کمیونزم بھی نہیں ہے۔وہ کہتا ہے تمہیں پتہ نہیں ہے یہ تو میرے ہی ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا ہے' میں بعض چیزیں تم سے بھی پوشیدہ رکھا کرتا ہوں۔

ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

کرنے کا کام یہ ہے سب کچھ چھوڑ دو اب' فکر اس کی کرو کہ یہ قوم کہیں بیدار نہ ہو جائے۔اور اس میں وہ کہتا ہے قوم کی بیداری سے مراد میں یہ ہے کہ کہیں قرآن کی شریعت ان کے سامنے پھر نہ آ جائے پھر ہمارا ٹھکانہ کہیں نہیں ہوگا۔بات سمجھ لی انہوں نے۔انہوں نے کہا کہ پھر کریں کیا اس کے لیے۔اور پھر وہ آخری بند ہے صاحب اس کا جس میں وہ یہ پروگرام دیتا ہے۔وہ کہتا ہے اس کے لیے بڑا آسان کام ہے۔قوم بڑی مذہب پرست اور روحانیت پرست واقع ہوئی ہے۔انہیں انہی چیزوں کے اندر الجھاؤ۔پہلے تو ان کے ہاں مذہبی مباحث یہ چھیڑ دو کہ آنے والوں سے مسیحِ ناصری مقصود ہے اور یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات ومنات۔یہ بحثیں جتنی بھی یہ مناظروں میں مباحثوں میں کرتے ہیں اور تیز کر دو ان کے اندر' الجھائے رکھو ان کو ان چیزوں کے اندر۔اور اس سے اور آگے بڑھو ان کے سامنے تصوف کا جو تصور ہے اور زیادہ شدت سے پیش کرو' ان میں عام یہ پروپیگنڈہ کرتے چلے جاؤ کہ یہ دنیا بڑی قابلِ نفرت ہے ناپاک ہے پلید ہے۔وہ انہیں کہتا ہے کہ

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام

چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

خیر اسی میں ہے ابلیسی نظام کی خیر اسی میں ہے کہ قیامت تک رہے مومن غلام۔ اور اس کے بعد پھر وہ بتاتا ہے کہ شاعری اس قسم کی ان کو دو موسیقی اس قسم کی دو تصوف اس قسم کا ان کو دو۔ یہ کرتے چلے جاؤ جس سے یہ دنیا سے نفرت کرتے چلے جائیں۔ اور یہ کچھ کرتے چلے جاؤ۔ اور آخری شعر ہے اس کا وہ جو میں اکثر پڑھا کرتا ہوں کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور پھر خیر ہی خیر ہے۔ کہا یہ ہے کام کرنے کا۔ اس کو مارنے کے لیے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لاتے جاؤ کبھی کبھی ان کے ہاں مامور من اللہ لے آئے کبھی کوئی مہدی لے آئے کبھی کوئی وکیلِ مسیح لے آئے۔ اور وہ یہ کرتے چلے جائیں کہ صاحب یہ سب دنیا ناپاک ہے یہ اوروں کی خاطر چھوڑ دیجیے صاحب۔ اور اس کے لیے یہ (**انما مثل الحیٰوۃ**) دیتے چلے جاؤ یہ آیتیں۔ یعنی جو آیتیں اس نے وہ جو سیکولر نظام تھا وہ خالص Materialistic Concept جو تھا جس میں زندگی خالص حیوانی زندگی ہی کو مقصود بالذات سمجھا ہوا تھا۔ جس میں اس کی حقیقت قرآنِ کریم نے بیان کی ہے اُسے وہ انسانی زندگی کا مقصود کر کے بیان کرتے ہیں۔ اور وہ جو آگے وہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں ہم بتائیں ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں۔ (**الیٰ دار السلٰم**) (10:25)

دیکھا آپ نے کیسے وہ خوف کو مٹاتا ہے امن کو لاتا ہے۔ امن ہی نہیں یہاں' سلام ہے یہاں۔ قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنا الگ الگ تو مختلف مقامات میں گنائی ہیں سورۃ حشر کے آخری رکوع میں وہ ایک ہی جگہ؟؟ نظر آتی ہے جس میں یہ صفات پروئی ہوئی ہیں ۔ وہاں یہ دو صفتیں ساتھ آتی ہیں۔ (**ھو اللہ الذی لا الا الہ الملک القدوس سلٰم المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر ھو اللہ الخٰلق الباری المصور لہ السمآء السحنٰی**) یہاں دو صفتیں آئیں ہیں خدا کی مومن اور سلام۔ مومن تو میں نے ابھی عرض کیا اور بات صاف ہوگئی یہاں۔ ترجمہ کیجیے اس کا ایمان لانے والا' اللہ کی صفت' اللہ کس چیز پہ ایمان لاتا۔ معنی واضح ہو جاتے ہیں مومن: نویدِ امن دینے والا' امن کا ذمہ دار۔ لیکن امن تو عزیزانِ من! صرف ایک Negative چیز ہے منفی قوت ہے۔ کسی خطرے سے آپ کو محفوظ کر دینا' بس' آپ کے اندر تو کوئی اور چیز پیدا نہیں ہوئی نا۔ آپ کی دولت اگر آپ کی الماری میں ہے اور اس کے متعلق ضمانت دی جائے کہ یہ محفوظ رہے گی تو وہ جتنی ہے ویسی کی ویسی اتنی رہے گی محفوظ صرف رہے گی نا آگے تو بڑھنے والی بات نہیں ہے۔ لیکن آگے بڑھنے کے لیے محفوظ رہنا تو نہایت ضروری ہے نا۔ آپ خود آگے اسی صورت میں بڑھ سکتے ہیں نا کہ آپ محفوظ بھی ہیں۔ اگر آپ محفوظ ہی نہ رہیں تو آگے کون بڑھے گا۔ حفاظت پہلا قدم ہے اس کے لیے لیکن مقصود بالذات تو نہیں ہے نا۔ مومن تو یہاں تک ہوا' امن دینے والا' خوف سے محفوظ رکھنے

والا ۔سلام کے معنی ہیں تکمیل تک پہنچانے والا ۔ یہاں ہمارے ہاں امن وسلامتی مرادف ہی الفاظ استعمال ہوجاتے ہیں ۔اور پھر سلامتی تو ہمارے ہاں جواردو میں آتی ہے وہ سلامتی کے معنی بھی زیادہ سے زیادہ وہ امن ہی ہوتا ہے تکمیل اور مکمل ہونا جو ہے یہ نہیں ہوتا۔اگر چہ ہمارے ہاں ایک مقام ایسا ہے جہاں ابھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ پتہ نہیں ہوتا ہے یا ہوتا تھا' ہمارے نزدیک تو ہوتا تھا۔یعنی اب جسے مرغِ مسلم کہتے ہیں ۔ ہمارے ہاں ہوتا تھا میں نے کہا ہے''ہن تے دال نئیں لبھدی'' ۔ ہے نا مرغِ مسلم کا لفظ آپ کے ہاں' وہ کیا ہوتا ہے؟ اس کی ایک ٹانگ اگر نہ ہوتو آپ اسے مسلم نہیں کہتے ہیں ۔وہ اسی سلامتی سے ہی تو ہے ۔تکمیل تک پہنچانے والا' مکمل کردینے والا۔عزیزانِ من! بار بار کہا کرتا ہوں پتہ نہیں زندگی کتنی ہے کہنے کے لیے ۔قرآن کے ان مفردات کے اوپر غور کیا کیجیے یوں نہ آگے بڑھ جایا کیجیے اور ترجموں پہ انحصار نہ کیا کیا کیجیے ۔میں پھر عرض کردوں کہ اگر اتنی خود محنت آپ نہیں کرسکتے کم ازکم میں نے ایک عمر محنت کی ہے ان مرادفات کے یہ قرآنی معانی جو ہیں میں نے اپنی لغات کے اندر رکھ دیے ہیں ۔اتنی محنت تو کرلیا کیجیے کہ اسے اٹھا لیجیے قرآن کے ہر لفظ کے معنی اس کے اندر قرآن سے متعین اس انداز میں ہیں ۔وہاں آپ دیکھیں گے کہ المؤمن کے یہ معنی ملیں گے' وہاں آپ دیکھیں گے کہ سلام کے یہ معنی ملیں گے ۔اوراسی سے تو اسلام ہے آپ کے ہاں' انسانیت کی تکمیل کرنے والا ۔ بہرحال دارالسلام کی طرف دعوت دیتا ہے ۔تو اب دارالسلام کیا ہوگا جی ؟ اگر صرف یہ طبعی زندگی کی ضروریات کو پورا کرے گا تو پھر بھی اس کی کم ازکم ان کے الفاظ میں 1/10 حصہ تو باقی رہ جائے گا۔تو تکمیل تو پھر بھی نہ ہوئی ۔اور اگر یہ روحانیت ہی کی طرف ان کے الفاظ میں چلا گیا تو یہ ساری دنیاوی زندگی اور اس کی زندگی کے یہ طبعی تقاضے رہ گئے سلام پھر بھی نہیں ہوا۔دیکھتے ہیں کہاں دارالسلام لا رہا ہے قرآن ۔کہا تکمیل نہیں ہوتی انسانیت کی' نہ تو خالصتاً اس کی طبعی زندگی کو مقصود بالذات سمجھ کے مادی تصورِ حیات یا سیکولر لائف اختیار کرلینا۔ایک حصے کی تسکین ہوجاتی ہے سلامتی نہیں ہوتی تکمیل نہیں ہوتی اس میں ۔اور جسے آپ یہ کہتے ہیں روحانیت یا مذہب وغیرہ بہرحال اس کو اگر آپ اقدار کی طرف بھی خالی لے آئیں تکمیل نہیں ہوتی ۔تکمیل تو دونوں کو اکٹھے کرنے سے ہوتی ہے ۔منزل تک پہنچنے کے لیے گھوڑے کا طاقتور اور توانا ہونا نہایت ضروری ہے ۔لیکن اگر گھوڑے کا طاقتور توانا رکھنا ہی مقصود بالذات سمجھ لیں نہایت عمدہ پرورش کریں اس کی' بہت اچھا ہو اور اصطبل میں باندھیں رکھیں ۔مقصود بالذات نہیں ہے ۔اور اگر گھوڑے کو ہی گولی ماردی جائے پھر بھی آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے ۔سلامتی اسی کے اندر ہے کہ اسے رکھا جائے طاقتور رکھا جائے لیکن اسے منزل تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جائے ۔

ایام کا مرقد نہیں راکب ہے قلندر

کیا عجیب باتیں کہہ جاتا ہے ۔اگر دنیاوی زندگی کے مفاد نے اسے گھوڑا بنا رکھا ہے تو یہ تانگے کا گھوڑا ہوگا جدھر یوں یوں کیا یہ ادھر چل پڑا۔سارا دن اس کے اشاروں پہ چلتا رہا شام کو اس کو دانہ پانی مل گیا۔راکب ۔اور اگر اس نے سواری ہی نہیں کی اس کے اوپر خود گھوڑے کے اوپر تو وہ

کوتل گھوڑا ہوگا اصطبل میں باندھے رکھنے کے لیے۔ راکب یہ ہوگا کہ اس کے اوپر سفر کرے۔ دارالسلام کی طرف بلاتا ہے۔ دولفظوں میں بات کہہ گیا ہے۔(**للذین احسنوا الحسنٰی**) (10:26) پہلی چیز یہ۔

قرآنِ کریم نے نیک عمل کے لیے حسنِ عمل کہا ہے نا' اعمالِ حسنہ اس کو کہتا ہے نا۔ یہ وہ اعمال ہوتے ہیں جس میں حسن ہوتا ہے۔ اور حسن کے تو معنی ہی توازن صحیح ہونا ہوتا ہے عزیزانِ من!۔ کسی حسین تریں چہرے کی آنکھ کی سیاہی انچ کا سواں حصہ اپنے مقام سے ذرا ادھر کر دیجیے آپ دیکھئے کہ سارا حسن کہاں چلا جائے گا۔ تھوڑا سا Proportion بگاڑ دیجیے کسی شے کا۔ قرآن نے تو اس ایک لفظ کے اندر بتایا ہے کہ بھائی نہ کسی کو چھوڑ دینا نہ کسی میں زیادہ طور کے اوپر الجھ جانا' توازن برقرار رکھو ان چیزوں کے اندر۔ جب یہ توازن برقرار رہے گا تو اسے اعمالِ حسنہ کہا جائے گا صاحب۔ اعمالِ حسنہ کرتے کیا ہیں؟ (**للذین احسنوا الحسنٰی**) (10:26) عزیزانِ من! پھر عرض کر رہا ہوں پتہ نہیں زندگی میں میسر ہو یا نہ۔ قرآن نصاب کی طرح پڑھانے کی چیز تھی ایک کلاس جو پانچ سات دس سال تک ساتھ رہے' نصاب کی طرح پڑھانے کی چیز ہے یہ۔(**للذین احسنوا السحنٰی**) (10:26) وہ جو لوگ احسن کام کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں دوسرے مقام پہ ہے نا عام طور پہ جسے ہمارے ہاں استعمال کیا جاتا ہے اس لفظ کو۔(**ھل جزآء الاحسان الا الاحسان**) احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔ اور پھر آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں پھر یہ کیسے استعمال ہوتا ہے۔ احسان کا بدلہ احسان: کسی کی مصیبت میں آپ اس کے کام آئے آپ نے اس پہ کیا احسان۔ اب وہ ساری عمر کے لیے آپ کا بے دام غلام بن کے رہ گیا۔ جونہی آپ کھڑے ہوئے کسی الیکشن میں اور اس نے یہ کہہ دیا کہ بھائی صاحب میں تو سمجھتا ہوں کہ دوسرا فلاں آدمی بہتر ہے اس کو ووٹ دونگا۔ گلی محلے میں کھڑے ہو کے چلانا شروع کر دیا احسان فراموش ہے' اندازہ لگائیے کل روتا ہوا آیا تھا میاں صاحب کی یہ صورت تھی گڑگڑا رہا تھا پاؤں پڑ رہا تھا۔ اس وقت ہم نے اس کی مدد کی' احسان فراموش طوطے چشم' آج کہتا ہے کہ نہیں صاحب ووٹ آپ کو نہیں دونگا۔ یعنی اب قیامت تک کے لیے احسان کا بدلہ آپ دیے چلے جائیں وہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ ختم تو اسی صورت میں ہوگا نا وہ پھر کہے گا کہ یا اللہ اس پہ بھی مصیبت پڑے یہ بھی روتا ہوا آئے یہ بھی ویسے پاؤں پڑے اس کی بھی میں مدد پڑوں پھر وہ احسان کا بدلہ چکاؤں۔ کیا معاشرہ ہے۔ بات ہی اور ہے جو کہہ جاتا ہے قرآن۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو توازن بدوش اعمال ہم نے کہے ہیں' کیا ہیں توازن بدوش اعمال؟ مسخر کرو اس ارض کو ہی نہیں ارض وسما کی ساری قوتوں کو مسخر کرو۔ قوت حاصل ہونے کے بعد سرکش اور بے باک نہ ہو جاؤ' اس پانی کو ساحلوں کے اندر رکھو' اس کا توازن نہ بگڑنے دو۔ مسخر کرو تو بڑی قوت حاصل ہو جائے گی۔ Permanent Values جو ہم نے تمہیں دی ہیں مستقل اقدار جو تمہیں دی ہیں ان قوتوں کو اس کے تابع رکھو ان میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ قوت کی بہتات سرکشی بھی نہیں پیدا کرنے دے گی قوت کی کمی ضعف نہیں پیدا کرنے دیگی کہ جس سے محتاج ہو جاؤ گے محکوم ہو جاؤ گے اس میں توازن جب تم پیدا کرو گے۔ وہ کہا دو باتیں ہیں(**احسنوا الحسنٰی**) (10:26) وہ جو ہے نا احسان کا بدلہ احسان۔ بدلہ نہیں

ہے' تم اگر کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو درست کرتے ہو تو پہلی چیز اس میں یہ ہوتی ہے کہ تمہاری اپنی ذات کا Balance ٹھیک ہو جاتا ہے تمہارا اپنا بگڑا ہوا توازن بھی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور توازن کا ٹھیک ہونا ہی تو ساری بات ہے عزیزانِ من!۔ جہاں ندامت ہوتی ہے آپ کو' کس وقت ہوتی ہے؟ کہ صاحب غصے میں آ کے میں وہ کچھ کہہ گیا جواب مجھے سمجھ میں بات آتی ہے کہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہ ہو گیا نا آپ کے ہاں کا کہ توازن نہیں رہا تھا اس وقت۔ توازن یہ ہے کہ Materialistic Concept of Life جو ہے مادی نظریۂ زندگی۔ پوری پوری توانائیوں سے مسخر کروان قوتوں کو' ہر فرشتہ ہر ملِک تمہارے سامنے سجدہ ریز ہو اور اس کے بعد انہیں سرف کرو خدا کی بتائی ہوئی Values کے مطابق۔ اور اس میں بنیادی Value یہ ہے کہ (**ینقس فی الارض ما ینفع الناس**) یاد رکھو بقاء اسی نظریہ اسی پروگرام اسی عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کو منفعت پہنچاتا ہو نفع پہنچاتا ہو۔ زیادہ سے زیادہ حاصل کرو زیادہ سے زیادہ انسانیت کی منفعت میں سرف کرو۔ کہتا ہے اس سے پہلی چیز تو یہ ہو گی کہ (**احسنوا الحسنٰی**) (10:26) اس کی اپنی ذات کے اندر ایک Balance پیدا ہو جائے گا۔ اور آپ کو یاد ہے کہ آج بھی آپ کے ہاں یہ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفرز اور سائیکولوجسٹ جب مثالی زندگی کسی کی پیش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ Balance Personality تھی اس کی' متوازن ذات تھی اس کی' توازن ذات میں پورا تھا۔ خالص مادی نظریۂ حیات مغرب کا وہ بھی توازن بگاڑ رہا ہے' یہ دوسری طرف جسے آپ مذہب یا روحانیت کی زندگی کہتے ہیں کہ یہ قابلِ نفرت یہ ہوا یہ بھی توازن بگڑ گیا۔ توازن یہ ہے کہ (**احسنوا**) سے کیا ہوتا ہے (**الحسنٰی**) انسان کی اپنی ذات میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ اب یہاں تک کی بات تو آ گئی کہ ہاں صاحب یہ سارے روحانیت والے یہی کہتے ہیں کہ باقی قصہ ختم ہے اندر کی روحانیت انسان کی ٹھیک ہو جانی چاہیے' تزکیۂ نفس جسے کہا جاتا ہے۔ اب میں کس کس لفظ کے معنی بتاتا رہوں کہ یہ بھی غلط وہ بھی غلط۔ چھوڑیے اس کو۔ ان کا منتہا یہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے اندر یہ سمجھتے ہیں کہ صاحب اندر انسان کے یہ تزکیہ ہوتا ہے توازن اس کا ہوتا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے **احسنوا الحسنٰی** کہہ دیا یہاں۔ عزیزانِ من! قرآن ہے ایک لفظ میں بات ساری کہہ گیا ہے۔ کہا اتنی بات نہیں ہے یاد رکھو (**احسنوا الحسنٰی و زیادۃ**) (10:26) اس سے زیادہ بھی۔ کیا بات ہے صاحب۔ یہ زیادہ کیا ہے؟ بس یہ چیز ہے عزیزانِ من! یہ بات سمجھ لی جائے قرآن سے' ساری بات آسان ہو جاتی ہے۔ (**فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا**) (2:200)

وہ لوگ ہیں کہ جن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی متاع ملتی چلی جائے ملتی چلی جائے۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ ان کا یہ کہنا ہوتا ہے بلکہ ان کا تصورِ حیات جو ہے وہ صرف Physical Life (طبعی زندگی) ہوتی ہے' ملتا چلا جائے ملتا چلا جائے۔ وہ کہا ٹھیک ہے طبعی زندگی' یہاں جو کچھ اکٹھا کرنا چاہو Physical Laws (طبعی قوانین) موجود ہیں ان کے مطابق یہ کچھ کرو ملتا چلا جائے گا۔ ملتا چلا جائے گا (**وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق**) (2:200) لیکن اس سے آگے جو تمہاری انسانی زندگی اونچی ہے جسے وہ آخرت سے تعبیر کرتا ہے اس Physical

Life سے آگے کی زندگی' خواہ وہ یہی ہو یا مرنے کے بعد آگے چلے۔ کہا اس میں پھر ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ غور کیا آپ نے یہ۔ یہ کچھ تو ہوجائے گا اس میں حصہ نہیں ہوگا۔ تو آگے پھر یہ ہونا چاہیے کہ ہم جو بتاتے ہیں تمہیں اس میں یہ ہوگا کہ یہ تو نہیں ملے گا وہ ملے گا تمہیں۔ آ گئی نا وہ مذہب اور تصوف کی بات کہ اس کو چھوڑ دے دوسروں کی خاطر۔ وہ کہتا ہے (**و منهم من يقول ربنا اٰتنا في الدنيا حسنة و في الاٰخرة حسنة**) (2:201) اور اس کے ماننے والے یہ ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا کے اندر بھی یہ تمام خوشحالیاں اور خوشگواریاں چاہتے ہیں اور اُس زندگی کو جو انسانیت کی 1/10 زندگی یہ کہتے ہیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں کے اندر ہمیں توازن ملنا چاہیے۔ کہا بس یہ ہے دین۔ (**في الدنيا حسنة و في الاٰخر حسنةً**) ۔ اگر **في الدنيا حسنة** کو نظر انداز کر کے آپ نے شریعت یا تصوف کو سمجھ لیا مقصود' یہ بھی قرآن کے خلاف۔ اور اگر آپ نے اسی کو مقصود سمجھ کے دنیاوی زندگی کو اپنے لیے ترک کرنے والی ناپاک کہہ یا تو پہلے حصے کے خلاف۔ یہ ہوگیا کہ یہ قرآن کے ایک حصہ پہ ایمان رکھتے ہیں دوسرے کو چھوڑتے ہیں' ذلت اور رسوائی۔ اور پھر اس میں تو جتنا زیادہ انسان مذہب کی طرف آتا جائے گا تصوف کی طرف آتا جائے گا۔ قرآن جو کہتا ہے ذلت اور رسوائی وہ اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی۔ 'چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات' اور جن کی خاطر آپ یہ جہانِ بے ثبات چھوڑیں گے پھر جو کچھ وہ آپ کے ساتھ کرتے ہیں وہ ہمیں پتہ ہے۔ آپ نے غور فرمایا کیا کہہ گیا یہ' یہ (**زيادة**) (10:26) جو قرآن نے کہا تھا۔ یہ اپنی ذات کے اندر کا توازن بھی (**و زيادة**) یہ دنیاوی متاعِ حیات بھی ساتھ۔ یاد رکھیے عزیزانِ من! وہ موضوع دوسرا ہو جائے گا ورنہ میں اس کے اندر اگر جاؤں تو وہ پورا ایک درس چاہیے جس میں قرآن نے اس دنیا کی متاع کو اس قابل قرار دیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کو حاصل کیا جائے۔ ترکِ دنیا اس کے نزدیک اسلام نہیں ہے وہ تو اس کے برعکس یہ کہتا ہے۔ (**و من اعرض عن ذكري فان له معيشة ضنكا**) جو ہمارے قوانین کو نظر انداز کرتا ہے اس دنیا میں اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اور جس کی یہاں روزی تنگ ہو جاتی ہے اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وہ کہتا یہ ہے کہ (**من كان في هٰذه اعمٰى فهو في الاٰخرة اعمٰى**) پھر جو یہاں کا اندھا ہوتا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہوتا ہے' جس کی اس دنیا میں زندگی گداگری محتاجی اور فقیری کی گذر رہی ہے عزیزانِ من! ذلت اور خواری کی گذر رہو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کے ہاں وہ مقرب اور مقبول بن جائے گا۔ اسی لیے اس نے خوف اور بھوک کو خدا کا عذاب گنایا ہے سورۃ النحل میں۔ (**و ضرب الله مثلًا قريةً كانت اٰمنةً مطمئنة ياتيها رزقها رغدًا من كل مكان**) (16:112)

کہا مثال کے طور پہ ذرا دیکھو قومیں تباہ کیسے ہوتے ہیں۔ قوم' اللہ کا دیا سب کچھ ہے رزق کی فراواں تھا سب کو کھانے کو ملتا تھا نہ مہنگائی کا یہ عالم تھا نہ قلت کی یہ کیفیت تھی کہ ہر ایک چیختا پھرتا ہے' جس کے پاس پیسہ نہیں ہے وہ مہنگائی کے زوروں مر رہا ہے جس کے پاس ہے وہ رو رہا ہے کہ ملتا نہیں ہے۔ یہ کیفیت نہیں تھی۔ رزق کھنچا چلا آ رہا تھا اس کی طرف (**رغدًا**) بافراط۔ (**من كل مكان**) (16:112) ہر

طرف کے لوگ زیادہ سے زیادہ اپنا مال اس ملک میں بھیجتے تھے کہ خوشحال ملک ہے یہاں بھیجو۔(**فکفرت بانعم اللہ**) (16:112) خدا کی ان انعامات اور بخشائشوں سے انہوں نے کفر برتا۔تفسیر چھوڑ دیجیے اس وقت کہ یہ کفر کیا ہوتا ہے۔تو نتیجہ کیا ہوا؟ (**فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف**) (16:112) ان کے اوپر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو گیا' ملک کے اندر بھوک۔ہر وقت ڈر کہ اس نے مار دیا اور وہ جھپٹ گیا وہ حملہ آور ہو جائے گا' ڈر رہے ہیں' بھوک سے مر رہے ہیں۔کہتا ہے خدا کا عذاب ان کے اوپر آ گیا۔خدا کا عذاب کہنے کے بعد یہ ہوا کہ ذہن ان کا فوراً یہ ادھر منتقل کر دیں گے کہ صاحب خدا کا عذاب ہے صبر شکر کر کے برداشت کرو اللہ سے لڑائی مول لینی ہے۔کہا(**بما کانوا یصنعون**) (16:112) اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے کرتوت جو تھے وہ سامنے آ گئے۔اور پھر صنع تو لفظ ہی عجیب ہے یہ مصنوعی کا لفظ نکلا ہے نا اسی سے۔بجائے اس کے کہ کوئی حقیقی طور کے اوپر کوئی نظام ایسا پائیدار ہوتا' مصنوعی اس قسم کے نظام بنائے کہ جن کی حقیقت ہی کچھ نہ نکلی۔نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ خوشحالیاں خوشگواریاں کہ رزقِ فراواں چلا آ رہا ہے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔اس کی ناسپاس گذاری کی' نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے اپنی اس قسم کی مصنوعی چیزوں کے ہاتھوں جو خود بنایا تھا اس کے ہاتھوں یہ کچھ کیفیت ہو گئی۔کہہ میں یہ رہا تھا کہ اس نے تو بھوک اور خوف کو عذاب گنایا ہے۔

(**احسنوا الحسنٰی و زیادۃ**) (10:26) اپنی اپنی ذات کے اندر تو یہ ہوا' اس سے بھی زیادہ۔سنیے عزیزانِ من! کیا کہہ گیا ہے۔وہ جو اس سے بھی زیادہ تھا کہا اس کی پہچان کیا ہے کیسے پتہ چلے کہ یہ کچھ مل گیا ہے۔کہا پہچان بڑی آسان سی ہے۔قیامت میں جا کے ہی تھوڑا پتہ چلے گا۔(**لا یرھق وجوھھم قتر و لا ذلۃ**) (10:26) وہ دنیا میں انکو کہیں روسیاہی اور ذلت نہیں نصیب ہو گی۔روسیاہی اور ذلت اس قوم کی نہیں ہو گی۔

(**اولئک اصحٰب الجنۃ ھم فیھا خٰلدون . و الذین کسبوا السیاٰت**) (10:27) اور جو اس کے خلاف کام کرے گا۔سیا کے معنی ہوتا ہے نا ہمواریاں پیدا کرنا۔اس قسم کا نظام کریں کہ (**جزآء سیئۃ بمثلھا**) (10:27) نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ اسی قسم کی ناہمواریاں آتی چلی جائیں گی ان کے ہاں۔نتیجہ ناہمواریوں کا عزیزانِ من! (**ترھقھم ذلۃ**) (10:27) ذلت اور روسیاہی جہاں جائیں گے ان کے پیچھے لگی ہوئی ہو گی۔روسیاہی' ذلت۔(**ما لھم من اللہ من عاصم**) (10:27) خدا کے قوانین سے سرکشی برتی تھی تو اس کی سرکشی برتنے والوں کو دنیا میں کوئی بھی اپنے ہاں حفاظت اور پناہ نہیں دیتا' کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔(**کانما اغشیت وجوھھم قطعًا من الیل مظلمًا**) (10:27) روسیاہی جیسی روسیاہی' اندھیری رات' کہتا ہے اندھیری بھی ایسی نہیں کہ جس میں چلو اور نہیں تو چاند نہیں تاروں ہی کی کچھ ملگجی سی روشنی کہیں آئے۔کہا یہ بھی نہیں۔ایسی اندھیری رات کہ سیاہ بادل جو چھا رہے ہوں' تاریکیاں اندھیریاں' اتنی سیاہیاں چہرے کے اوپر دھل ہی نہ سکیں۔یہ کیفیت ہو گی۔کہا تم پوچھا کرتے ہو کہ صاحب وہ دوزخیوں کی پہچان کیا ہو گی۔جنتیوں کی پہچان تو بتا دی نا

اپنی ذات کے اندر توازن اور زیادہ اس کے وہ کچھ جو ابھی نے بتایا(**فی الدنیا حسنة**) کہیں ذلت اور رسوائی نہیں ہر جگہ عزت اور غلبہ۔ کہا تھا نا یہ اصحابِ جنت کی نشانیاں ہیں۔ اور اس کے برعکس یہ کیفیت کہ ذلت اور روسیاہی کی مار ماری ہوئی۔ کہا(**اولئک اصحٰب النار هم فیها خٰلدون**) (10:27) انہیں دوزخی کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے اقبالؒ کہ وعظ سنتا رہا میں اور اندر ہی اندر ہنستا رہا میں۔ بڑے زور شور سے وعظ کر رہا تھا۔ کہنے لگا تمہیں پتہ ہے کیا کہہ رہا تھا میں کیوں ہنس رہا تھا۔ وہ کہہ رہا ہے سارے وعظ میں کیفیت اس کی یہ تھی کہ 'جہنم را مقامِ دیگراں گفت' وہ جہنم کے متعلق کہہ رہا تھا کہ اس میں کچھ اور لوگ ہونگے' اپنے متعلق نہیں کہہ رہا تھا دوسروں کا مقام بتا رہا تھا جہنم۔ جہاں بھی ہمارے ہاں جہنم کی بات آئے گی آپ دیکھیں گے کچھ ایسا نظر آئے گا کہ وہ کوئی اور ہیں جو وہاں جائیں گے ہم نہیں۔ کہیں گے کہ نہیں صاحب وہ تو ہمیں گناہگار فاسق فاجر یہ سب کچھ بھی گناتے ہیں ہم ایسے ہیں ایسے ہیں یہ سارا کچھ بھی ہے۔ ٹھیک ہے گناتے ہیں ان کی وجہ سے یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ہاں صاحب ان کی وجہ سے جہنم میں بھی جانا ہوگا۔ اور پھر مقطع کا بند آتا ہے کہ پھر نبی اکرم ﷺ سفارش کریں گے شفاعت کریں گے کہ کوئی مسلمان جہنم میں نہیں رہے گا آپ ﷺ جنت میں نہیں جائیں گے جب تک آخری مسلمان بھی جنت میں نہیں جائے گا۔(**اولئک اصحٰب النار هم فیها خٰلدون**) (10:27) ٹھیک ہے وہاں بھی جا کے جنت اور جہنم ملے گی اس کی علامتیں تو یہیں بتا دی ہیں قرآن نے' نشانیاں تو یہیں ظاہر ہو جاتی ہیں' کہتا ہے دنیاوی زندگی کے اندر۔ بار بار قرآن نے یہ کہا ہے(**خزی فی الحیٰوة الدنیا**) دنیاوی زندگی میں ذلت ان کے حصے میں آتی ہے یہ علامت ہے اس کی۔ لیکن جب آپ یہاں کی اس ذلت کو خدا کے قرب کی علامت سمجھ لیں۔ کہیں ہی یہ کہ جو یہاں زیادہ ذلیل ہوتا ہے وہاں زیادہ مقرب ہوتا ہے۔ تو پھر اس فریبِ نفس کا کیا علاج۔(**یخادعون الله و الذین معه و ما یخدعون الا بانفسهم**) دھوکہ دینا کہتے ہیں خدا کو مؤمنین کو' اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ تو یہ تو اپنے آپ کو عزیزانِ من! دھوکہ دینا ہے۔ وہ تو جہنم والوں کی علامتیں یہاں بتاتا ہے۔ ان علامات کو دیکھئے اور اس کے بعد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیجیے پھر دیکھ لیجیے علامتیں نظر آ جاتی ہیں آپ کو تو پھر دھوکے میں تو نہ رکھیے اپنے آپ کو۔(**و یوم نحشرهم جمیعًا ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم و شرکآؤکم فزیلنا بینهم و قال شرکآؤهم ما کنتم ایانا تعبدون**) (10:28) بات جب آئے گی تو میں عرض کرونگا جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ حشر کے میدان میں اکٹھا ہونا وہاں حساب کتاب ہونا وہ مقامات آئیں گے میں ان کی تفصیل بیان کرونگا۔ یہاں تو یہ بات وہ ذلت اور رسوائیوں کی بات کر رہا ہے صاحب۔ اکٹھا ہونے کے بعد صورت یہی ہوگی نا کہ کچھ ایسے لوگ ہونگے جن کی انہوں نے محکومی اختیار کی ہوئی تھی کچھ یہ ہونگے جو ان کے Followers تھے کچھ اوپر والے ہونگے لیڈرز قسم کے' کچھ Followers قسم کے لوگ۔ آپ کو یاد ہوگا کئی ایک درسوں میں میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم بڑے ہی بلیغ انداز میں مثالی طور پر بتاتا ہے جہنم میں لیڈرز اور ان کے Followers کے مکالمات۔ بڑے عجیب مکالمے ہیں۔ کہتا ہے جب یہ سب پھنستے ہیں تو پھر آپس میں کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں یہ ان کے پیچھے لگنے والے نعرہ مارنے والے اور یہ جو

آ گے چلا رہے تھے ان کو۔ اور کئی ایک مقامات میں کئی ایک آیات ہیں اور بڑی دلچسپ ہیں۔ بہرحال یہاں تو یہ چیز جو ہے کہ کہیں گے یہی کہ ہم ان کی محکومی اختیار کیے ہوئے تھے اس کی وجہ سے یہ کچھ ہو گیا۔ کہا کہ وہ فوراً مکر جائیں گے اس سے' بالکل غلط ہے' یہ اپنے مفاد کے لیے ہمارے ساتھ لگے ہوئے تھے اس لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ بالکل مکر جائیں گے۔ اور یہ چیز تو قرآن بار بار یہ کہتا ہے کہ یہ عذر تو قابلِ ؟؟ نہیں ہوگا کہ اگر یہ پورے کے پورے عوام اٹھ کے یہ ہم سے کہہ دیں کہ صاحب یہ ہم سے سب کچھ کراتے تھے ہم تو ذمہ دار نہیں ہیں۔ ایک فقرہ ہے۔ کہا کہ بتاؤ ہمیں کہ ان کے پاس وہ طاقت کونسی تھی جس کی بناء پر یہ تمہیں مجبور کر کے یہ کچھ کراتے تھے۔ جسے تم ان کی طاقت کہتے ہو وہ تمہاری دی ہوئی تو تھی' تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے ان کو یہ طاقت کیوں دی۔ اور ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے اس طاقت کو غلط استعمال کیوں کیا تھا۔ یہ کہیں گے کہ یا اللہ ان کو دوگنا عذاب دو۔ وہ کہتا ہے کہ دونوں کو دوگنا عذاب ملے گا۔ کبھی اتنا نہیں کھڑے ہو کے تم نے سوچا تھا کہ یہ طاقت غلط استعمال ہو رہی ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم ویسے تو وہ جہنم کہہ کے کہتا ہے کہ وہاں جانے کے بعد پھر ان میں اس قسم کے مکالمے ہونگے۔ بات یہی ہے کہ جب تک تو وہ بڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں عروج میں ہوتے ہیں اقتدار میں ہوتے ہیں قوت میں ہوتے ہیں پھر نہیں یہ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی۔ کہتا ہے جب افتاد پڑتی ہے نا تو اس کے بعد پھر آپس میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ سارے اکٹھے جہنم کے اندر ہوتے ہیں تو اس میں یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلی چیز اس میں یہ ہوتی ہے کہ فوراً یہ مکر جاتے ہیں کہ نہیں صاحب ہم نے ان سے یہ کچھ نہیں کرایا یہ خود ہی یہ کچھ کرتے تھے۔ (**فکفٰی باللہ شھیدًا بیننا و بینکم ان کنا عن عبادتکم لغٰفلین**) (10:29) اس وقت یہ بات کہیں گے کہ ہاں صاحب خدا سے پوچھ لو تو یہ شہادت دے گا ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا کہ ہم نے مجبور کر کے تمہیں اس راستے پر چلایا تھا یا تم نے ہی ہمیں وہ قوت دی تھی جس سے کہ ہم یہ کچھ کر رہے تھے۔ ذرا خدا سے پوچھ لو کہ خدا اس کا کیا فیصلہ دیتا ہے۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ (**ھنالک تبلوا کل نفسٍ ما اسلفت و ردوا الی اللہ مولٰھم الحق و ضل عنھم ما کانوا یفترون**) (10:30) یہ ہوں یا وہ ہوں جو کچھ بھی انہوں نے مداریوں کی طرح کچھ بنایا ہوا تھا ''اَک دے بوٹے نوں امب لا کے وکھائے ہوئے سن ایناں نے جیہڑے''۔ افترا کے یہ معنی ہوتے ہیں عزیزانِ من!۔ وہ نکھر کر سامنے آ جائے گا ہر ایک کے سامنے آ جائے گا۔ جو کچھ کسی نے کیا ہوا ہوگا کہا یا در کھیے جو کچھ کرتا ہے انسان وہ تو آ گے چلا جاتا ہے اس کے نتیجے اس کے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ عمل کے سرزد ہونے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے پہلے نہیں نکلتا۔ اسی کو وہ آخرت کہتا ہے۔ کہتا ہے یہ سارے نتائج ان چیزوں کے کہ جو پہلے انہوں نے کیے ہوئے تھے اس وقت پھر Accumilative Effect جسے آپ کہتے ہیں وہ محسوس شکل میں ابھر کر سامنے پھر آتا ہے۔ (**کل نفس**) ایک ایک فرد کے متعلق وہاں پھر ہوگا کہ اس کا کتنا حصہ ہے اس کے اندر اور اس کا کتنا حصہ ہے۔ وہاں وہ جو اس کا حقیقی آقا الحق ہے اس کے سامنے یہ ہوگا' قانونِ مکافاتِ عمل کے میزان گڑے جائیں گے' نتائج کے محسوس شکل میں سامنے آنے کا وقت آ جائے گا۔ یہ حشر ہے اس دنیا کے اندر' آخرت کا حشر اور ہے۔ یہاں تلیں گے اعمال' نظام کے

اندر، جتنا جتنا کسی کا حصہ ہوگا اس کے مطابق یہ تباہیاں سامنے آئیں گی۔(**و ضل عنهم ما كانوا يفترون**) (10:30) کیا لفظ ہے صاحب!! وہ جو اس طرح سے جھوٹ موٹ کا بنا کے دکھایا کرتے تھے اس کا پردہ چاک ہوجائے گا پھر وہ ''آم آم اور اک دیاں کنیاں کنیاں بن کے سامنے آ جان گیاں''۔ کہنے لگا کہ انجام یہ ہوتا ہے پھر جہنم کی زندگی کا۔ عزیزانِ من! سورۃ یونس کی 30 ویں آیت تک ہم آ گئے 31 ویں آیت ہم آئندہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ساتواں باب(آیات 31 تا 37)

عزیزانِ من!

آج ستمبر 1973ء کی 16 تاریخ ہےاور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 31ویں آیت سے ہورہا ہے۔ (10:31)

قرآنِ کریم کی تعلیم کواس کے نصب العین کواس کے منتہا کوایک فقرہ میں ادا کرنا چاہیں تو یوں کہا جائے گا کہ وہ کہتا یہ ہے کہ زندگی قاعدے اور قانون کے مطابق بسر کرنی چاہیے۔اگرلا قانونیت آجاتی ہے زندگی میں تو اس سے؟؟ پیدا ہوجاتا ہے اسی کو عربی زبان میں فساد کہتے ہیں۔اور قانون کے تابع اگر زندگی رہے تو پھر فساد پیدا نہیں ہوتا۔ پہلا بنیادی نقطہ یہ ہے۔ یہ جسے تقویٰ کہتے ہیں آپ اس کے معنی یہ ہیں قوانین کی نگہداشت کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا۔ سارا قرآنِ کریم اسی ایک نقطے کی تفسیر ہے کہ زندگی قاعدے اور قانون کے تابع بسر کرنی چاہیے۔اب آپ دیکھئے کہ قرآن نازل ہورہا ہے آج سے چودہ سوسال پہلے کہ جس زمانے میں ابھی قانون کا تصور ہی نہیں پیدا ہوا تھا اگر ہوا تھا تو بڑا دھندلا سا تصور تھا۔خارجی کائنات میں وہ لوگ دیکھتے تو تھے کہ سورج ایک وقت پہ طلوع ہوتا ہے چانداس طرح سے منازل طے کرتا ہے ہوائیں اس طرح سے اپنا رخ متعین کرتی ہیں۔لیکن ہنوز یہ جسے آپ Physical Science کہتے ہیں طبعی سائنس کہتے ہیں طبعی قوانین کہتے ہیں یہ کچھ ایسے اجلے اور نکھرے انداز میں دنیا کے سامنے نہیں آئے تھے۔اور پھراس زمانے کی دنیا میں بھی عرب تو بڑا ہی اس اعتبار سے تاریک تریں ملک تھا۔ یہاں کے کیپٹل سٹی میں زیادہ سے زیادہ کوئی سترہ لوگ تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔تو وہاں یہ سائنٹفک علوم کا دخل کیا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ یہ اس زمانے میں اپنے اس بنیادی نقطہ کے مطابق دلائل کیا پیش کرتا ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ تم یہ اپنے گردوپیش فطرت کے مظاہر جو ہیں ان پہ غور کرو تمہیں نظر آئے گا کہ وہ ایک لگے بندھے قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں۔انہیں یہی کہا جاسکتا تھا۔قرآن میں آپ جو دیکھتے ہیں نا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ چاند کو دیکھو اس کی منازل' شمس کو دیکھو صبح کیسے طلوع ہوتی ہے شام کیسے ہوتی ہے' ہوائیں کیسے چلتی ہیں' کشتیاں سمندروں میں کس طرح سے تیرتی ہیں' دریا کی روانیاں کیا ہوتی ہیں' موسموں کے تغیرات کیا ہیں' فصلیں جو ہیں کس طرح سے ان کی نمود ہوتی ہے نمو ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں وہ یہ بتانے کے لیے بیان کررہا تھا کہ تم دیکھتے ہو کہ یہاں کائنات میں ایک قاعدہ اور قانون کارفرما ہے یہ اس کے مطابق ہوتا ہے جو کچھ ہے۔اور جہاں کوئی کائناتی قوت قانون کی حدبندیوں کو توڑتی ہے تو آج کل کی ہماری مروجہ اصطلاح میں وہ پانی سیلاب بن جاتا ہے۔ وہی شے جو ممدِ حیات ہے وہ لاکھوں کروڑوں زندگیوں کو تلف کرنے کا موجب پیدا ہوجاتی ہے۔کیا ہوا تھا یہ؟ فساد تھا نا یہ۔ یہ اس زمانے میں وہ بات کرتا ہے۔اگلی چیز وہ یہ سمجھاتا ہے کہ یہ جو تم باہر کائنات میں قانون دیکھ رہے ہو۔اور قبل اس کے کہ میں فقرہ مکمل کروں میں کہونگا کہ ہم اب چودہ سوسال آگے آج کی دنیا میں آجاتے ہیں۔آج کی دنیا میں یہ ساری طبعی سائنس قوانین ہی کی

Discovery کا نام ہے نا۔ وہ پہلی چیز یہ کہتا ہے اور پھر میں دہرادوں کہ ہمارے ذہن میں یوں آ رہا ہے کہ جسے اب مغرب کی دہریت کہا جاتا ہے کہا یہ جاتا ہے نا کہ وہاں وہ لوگ سائنس کے علوم میں اتنے آگے چلے گئے ہیں بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ زندگی اپنی جسے Materialistic Concept کہتے ہیں مادی زندگی Physical Laws انہی کے تابع وہ زندگی سمجھ رہے ہیں۔ اس سے آگے وہ بھی ہیں جو خدا کو بھی نہیں مانتے' بیشتر پھر وہ ہیں کہ جو وحی کو نہیں مانتے۔ تو سائنس کے علوم یا Physical Laws میں وہ اتنی ترقی کر کے یعنی انہوں نے اتنے انکشافات اس کے کیے ہیں لیکن اس کا دوسرا حصہ جو ہے اس حصے میں وہ قوانین کو اس طرح سے نہیں مانتے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن کی جتنی بھی Discussion قرآن میں آتی ہے وہ اسی مسئلے پہ آتی ہے۔ وہ مخاطب ہی کرتا ہے ان لوگوں کو کہ جو علومِ سائنس سے بہرہ ہوتے ہیں اور اس کے بعد وہ جانتے ہیں کہ کائنات کا سلسلہ قانون کی رو سے چل رہا ہے۔ پہلی چیز تو وہ یہ کہتا ہے کہ قانون ہوتا کیا ہے۔ مذہب کے اندر صرف احکام کا تصور ہوتا ہے خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے۔ لیکن کوئی ایک حکم جب وہ غیر متبدل ہو جائے اس میں تبدیلی واقع نہ ہو اور کیفیت اس کی ہو یہ کہ جو بتایا گیا ہے کہ اگر یہ حکم مانو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس میں تبدیلی جب وہ واقع نہ ہو تو وہ کہتا ہے اسی کو قانون کہتے ہیں۔ حکم یہ دیا ہم نے بچے کو کہ بیٹا آگ میں انگلی نہ ڈالنا۔ اگر اس کی وجہ نہ بتائی جائے تو یہ ڈکٹیٹر شپ ہوگی' بغیر وجہ بتائے ہوئے حکم کو منوانا ہوگا۔ اس کی وجہ ہم بتائیں گے تو وہ یہ کہ انگلی اگر آگ میں ڈالو گے انگلی جل جائے گی درد ہوگا تکلیف ہوگی۔ وہ جو تین لفظوں میں قانون کی Definition بڑی جامع دی گئی ہے وہ یہی ہے نا کہ If Then Always اگر ایسا کرو گے تو یہ ایسا ہوگا اس کا نتیجہ اور ہمیشہ ہوگا۔ یہ ساری Physical World کی جتنی بھی یہ آپ کے ہاں کائنات کی سرگرمیاں ہیں اس دنیا میں جسے سائنس کی دنیا ہم کہتے ہیں وہ ان تین لفظوں پہ چلتی ہے۔ If & Then جو ہے اس کو کہتے ہیں Law of Cause & Effect اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اس Cause کا Effect یہ ہوگا۔ اب یہ چیز مسلمات میں سے ہے کہ یہ مستقل چیز ہے غیر متبدل چیز ہے۔ یہ جو Physical Laws ہیں ان میں تبدیلی کبھی نہیں آتی۔ (**لا تبديل لكلمت الله**) قرآن کہتا ہے۔ یہ Cause & Effect کا قانون وہی If , Then۔ اور اگلی چیز ہے Law of Uniformity of Nature اس کائنات میں جہاں کہیں بھی ایسا کرو گے وہاں یہ ہوگا۔ دونوں چیزیں ہو گئیں اس میں۔ جب بھی ایسا کرو گے تو یہ ہوگا اور جہاں بھی ایسا کرو گے تو یہ ہوگا۔ یہ ان قوانین کی عالمگیریت ہوگئی Unversilaty ان کی ہوگئی کہ ساری کائنات میں یہی قوانین چل رہے ہیں۔ جب بھی ایسا ہوگا اس کا نتیجہ ہوگا جہاں بھی ایسا ہوگا اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ (**ولن تجد لسنة الله تبديلا**) ۔ اسے تم سنت اللہ کہہ دو خدا کی روش کہہ دو اسے امر اللہ کہہ دو۔ لیکن اس نے اس زمانے میں عجیب چیز کہی۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ حکم یہ ہنگامی چیز ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بچے کو ہم حکم دیں کہ اندر سے پانی لاؤ۔ ابھی یہ کہا ہے دوسرے وقت میں کہیں کہ نہیں نہیں پانی لے جاؤ یہ نہیں چاہیے کھانا لے آؤ۔ صبح سے شام تک ہم اپنے ہاں کے بچوں

کوملازمین کو یہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔لیکن اگر ایسی بات ایک ہی دفعہ کہدی جائے کہ جواٹل ہوجائے قرآن کہتا ہے اسے پھر قانون کہتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے امر ہے ہمارا لیکن (**کان امر اللہ قدرًا مقدورًا**) ہمارے احکام نے Measures یا پیمانوں کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔یہ پیمانہ یا Measure ہے نا جواٹل ہوتا ہے جس کے زور پہ سارا یہ آپ کی کائنات اور علومِ سائنس چلتے ہیں۔یہ Measure ہے اتنا یہ ہوگا اور اتنا یہ ہوگا تو یہ نتیجہ ہوگا۔اتنا یونٹ آکسیجن کا اتنا یونٹ ہائیڈروجن کا اس کا نتیجہ پانی کا قطرہ۔اس پیمانے میں ذرا سا فرق آجائے وہ نتیجہ نہیں پیدا ہوتا۔غور کیجیے عزیزانِ من! کب یہ باتیں کر رہا ہے قرآن' کونسی قوم ہے اولیں مخاطب اس کی۔چودہ سو سال پہلے یہ کہنا کہ یہ ٹھیک ہے امر ہیں یہ لیکن (**کان امر اللہ قدرًا مقدورًا**) ہمارا امر پیمانہ بن چکا ہے۔یہ پیمانہ کہ صاحب ایک فٹ اتنا ہوتا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ Measure کا سارا آپ کا جتنا بھی قانون ہے میں مثال کے طور پہ کہہ رہا ہوں وہ اس پہ چلتا ہے کہ جہاں بھی آپ کہیں گے کہ صاحب چار فٹ لکڑی لائیے وہ ہر جگہ وہی فٹ ہوگا وہی اس کا پیمانہ ہوگا وہی اس کی پیمائش ہوگی۔سائنس کے علوم کے اندر جتنی لیبارٹریز اور آج تو میں کہونگا یہ چاند تک پہنچنا صرف اس چیز کے اوپر ہے کہ ہر شے کا پیمانہ وہاں مقرر ہے۔(**کان امر اللہ قدرًا مقدورًا**) ۔اسی کو وہ قانون کہتا ہے۔سارے قرآن میں وہ مخاطب کرتا ہے ان قانون دانوں سے۔وہ کہتا ہے کہ بتاؤ تو سہی اس کائنات میں تم نگاہ دوڑا کے دیکھو تو سہی' جہاں جی چاہے تم نگاہ کو پھیلاتے چلے جاؤ اور اسے کہو کہ جاؤ کہیں سے تلاش کر کے لاؤ کہ کہیں لاقانونیت ہے۔(**ما ؟؟ فی خلق رحمٰن من ؟؟ ثم ارجل ؟؟ قرتین ینقلب علیک البصر و کان حصیر**) بار بار آپ طائرِ نگاہ کو اذن بال کشائی دیجیے اور کہیے کہ جاؤ کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ کہیں آپ کو لاقانونیت نظر آتی ہے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ طائرِ نگاہ تھکا ماندہ واپس آجائے گا کاشانۂ چشم میں اور اسے کہیں لاقانونیت دکھائی نہیں دے گی۔آپ دیکھ رہے ہیں یہ آج کی دنیا میں بھی تو یہی دلیل آپ دیں گے' یورپ کے بڑے سے بڑے سائنٹسٹ کو یہی بات کہیں گے آپ۔یہاں سے وہ اگلی بات چلاتا ہے۔

وہ کہتا یہ ہے کہ یہ بتاؤ کہ یہ قوانین تمہارے بڑے سے بڑا سائنٹسٹ جو ہے یا تمہاری سائنٹسٹ کی اکٹھی کانفرنس کوئی ہو کوئی Association ہو یہ قوانین ان کے بنائے ہوئے ہیں؟ ان میں سے کوئی قانون کسی انسان کا بنایا ہوا ہے۔وہ کہتا ہے مجھے اس سے غرض نہیں میں بحث میں نہیں الجھتا کہ تم کیا نام رکھتے ہو اس کا جس نے یہ قوانین بنائے ہیں۔میں پوچھتا یہ ہوں کہ کیا انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں یہ؟ اگلی چیز میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا انسان ان میں تبدیلی کر سکتا ہے؟۔یہ بڑا بنیادی نقطہ ہے اس کا۔یہ وہ دلیل پیش کرتا ہے اور یہاں سے آگے بات چلاتا ہے اور میں بتاؤنگا آگے کیا بات چلاتا ہے وہ۔وہ کہتا ہے کہ کیا صورت یہی ہے آپ کی کہ اس وقت تو یہ چیز آپ نے دیکھی کہ مثلاً سنکھیا کھانے سے موت واقع ہوجاتی ہے۔اور آپ نے پارلیمنٹ کا ایک سیشن بلا لیا اور اس میں یہ بل پیش کر دیا کہ نہیں صاحب کل سے سنکھیا مہلک نہیں ہوگا ممدِ حیات ہوگا۔اور آپ نے کثرت رائے سے ہی نہیں بلکہ اتفاقِ رائے سے یہ وہاں بل کو Law بنا دیا ایکٹ بنا دیا

سینٹ میں بھی منظور کر دیا آپ کے جتنے مراحل ہیں Constitutional اس نے طے کر دیا' صدر نے توثیق کر دی ملک میں Introduce بھی ہو گیا۔تو پھر دوسرے دن یہ سنکھیا ممدِ حیات ہو جائے گا؟ یا کیا یہ قوانین ان چیزوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں؟ وہ تو ان کے تابع چل رہی ہیں۔آپ غور کرتے ہیں کہ یہ Proceed کس طرح سے کرتا ہے قرآن' مخاطب کس چیز کو کرتا ہے' علم کو مخاطب کرتا ہے فکر کو مخاطب کرتا ہے علومِ سائنس کو مخاطب کرتا ہے دلائل یہ دیتا ہے وہ۔وہ کہتا ہے اس بحث میں مت پڑیے۔ٹھیک ہے یہ آگے چل کے بات آئے گی کہ اس کے متعلق ہم ایک تمہیں تصور یا ایک نام دیتے ہیں لیکن تم اتنی بات پہ تو متفق ہونا کہ بہرحال یہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں انسانوں کے Discover کیے ہوئے ہیں۔بڑا حسین فقرہ ہے آئن سٹائن کا کہ ہم کتابِ فطرت لکھتے نہیں ہیں کتابِ فطرت پڑھتے ہیں صرف۔یہ انکی تصنیف کردہ نہیں ہوتی تصنیف شدہ ہے یہ۔اور عجیب بات ہے کہ قرآن نے خود اس کو فطرت کو بھی تو کتاب کہا ہے۔بات یہاں سے چلتی ہے سورۃ یونس کی آیت 31 سے۔

(**قل من یرزقکم من السمآء و الارض**) (10:31) کہا یہ بتاؤ کہ یہ جو انسانوں کو اور سارے ذی حیات کو پیدا کیا اور جن چیزوں پہ ان کی زندگی کا دارومدار ہے وہ ان کی پیدائش سے پہلے یہاں کائنات میں موجود ہیں۔سانس لینے پہ مدار ہوتا ہے زندگی کا اور یہ فضا خالی ہوتی ہوا سے' کوئی ہوا پیدا کر کے دیدیتا؟ وہ کہتا ہے پہلا سانس ہی بچہ نہ لے سکتا یہاں' یہاں کوئی انسان ہی نہ ہوتا' یہاں کوئی ذی حیات نہ ہوتا۔زندگی کا مدار ہے پانی پر' تو اگر اس کائنات کے اندر یا صفحۂ ارض کو ہی اگر لے لیجیے آپ' یہ پانی نہ ہوتا رطوبت نہ ہوتی زندگی نہیں ہو سکتی تھی۔وہ کہتا ہے کہ یہ زندہ چیزوں نے مل کے یہ طے کیا تھا کہ اس قسم کی ایک چیز بھی یہاں بنا دینی چاہیے جسے پانی کہا جاتا ہے؟ ایسا نہیں ہوا۔یہ سب کچھ بنا بنایا ہوا مل رہا ہے Discover کرنے کی بات ہے۔جس قانون کو تم ابھی Discover نہیں کرتے ہو اس سے تم اس کی نعمت سے محروم رہ رہے ہو جب Discover کر لیتے ہو وہ تمہارے سجدہ ریز ہوتا ہے۔یہی تو وہ ملائک ہیں جو آدم کے حضور جھکتے ہیں۔

(**قل من یرزقکم من السمآء و الارض**) (10:31) یہ جو سامانِ زیست کا سلسلہ بہم پہنچایا ہے زمین میں یہ صلاحیت بادلوں میں یہ چیز کہ وہاں سے اس طرح سے پانی برستا ہے ہوائیں اس طرح سے چلتی ہیں حرارت اس طرح سے وہاں سے آ رہی ہے اتنا بڑا سرچشمۂ حرارت۔ کہا بتاؤ یہ جو ہے نا(**امـــن**) (10:31) والی بات جو ہے کون کرتا ہے۔مقصد یہ ہے کہ کیا تم کرتے ہو ایسا؟ انسانوں میں یہ چیز ہے؟ اتنے بڑے اختیارات کے مالک ہونے کے باوجود۔(**امن یملک السمع و الابصار**) (10:31) یہ جو ذی حیات بنائے یا انسان کو بنایا یہ جو اس کے اندر صلاحیتیں ہیں دیکھنے والے سننے والے ان حواس کو لیے ہوئے پیدا ہونے والے۔کہا کہ کیا یہ سارا ایک ڈھانچہ اس قسم کا ایک پہلے سے نمونہ یہ انسانوں نے بنایا تھا ایک مشینری طے کی تھی کہ ہاں اس طرح سے یہ آنکھ کام کرے گی اس طرح سے یہ کان کام کرے گا؟ یہ رحمِ مادر کے اندر تین تین تاریکیوں کے اندر ایک جنین کا دل دھڑکتا ہے وہاں بھی' اس میں کہیں سے کوئی خلا نہیں ہوتا کہ کسی جگہ سے باہر کی کوئی چیز جا

سکے' زندہ ہوتا ہے بچہ۔ وہ تو حرکت کر رہا ہوتا ہے اس کی نشو ونما ہو رہی ہوتی ہے ساری صلاحیتیں وہاں اندر Develope ہو رہی ہوتی ہیں یا کم از کم Potential Form کے اندر اس کے اندر آتی ہیں۔ اور دیکھنے سننے کی صلاحیت تو Develope شکل میں ہوتی ہے جب بچہ اس دنیا میں آتا ہے تو۔ کہا کہ اس مقام کے اوپر کوئی ذرائع تمہارے تھے کہ جس میں سے یہ چیزیں وہاں سب پیدا ہو جاتیں یا خود وہ بچہ اس قابل تھا کہ اپنے لیے یہ کچھ کرتا یا ساری دنیا کے انسان مل کے یہ صورت تھی کہ وہ ایک پیدا ہونے والی شے کے اندر یہ ساری صلاحیتیں امکانات جو ہیں پوری Potentialities وہ وہاں سے رکھ دی جاتیں۔ تمہاری تو نہیں پیدا کردہ۔ انکشاف تو تم کر لیتے ہو ان چیزوں کا' انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں ہیں۔ اور آگے تو وہ بات کہتا ہے کہ یہ اس زمانے میں بہرحال ایک عمومی سطح پہ تو سمجھ میں آ سکتی تھی Scientific Level کے اوپر تو سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی تھی۔ (**و من یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی**) (10:31)

سوچو تو سہی کون ہے وہ کہ زندہ چیزوں میں سے مردہ چیزیں نکلتی چلی جاتی ہیں اور مردہ چیزوں میں سے زندگی کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے۔ بہت بڑا قانون ہے۔ اس سے پہلے تو یہ یونہی سمجھ میں بات آتی تھی کہ بھئی یہ دیکھئے یہ دانہ ہے اس میں زندگی نہیں ہوتی اس میں سے پودا اگتا ہے۔ اس قسم کی ہی مثالیں دی جا سکتی تھیں۔ آج سائنس کی دنیا کے اندر تو یہ بات یہ جو اتنی بڑی چیز قرآن چودہ سو سال پہلے کہہ گیا ہے پوچھئے علمائے حیاتیات سے یہ بائیالوجی والوں سے وہ آپ کو بتائیں گے کہ یہ سارا سلسلہ زندگی کا لائف کا کسی ایک پیکر میں بھی ہو وہ چل رہا ہوتا ہے۔ وہ دو ان کے ہاں کے قانون جو ہیں Anabolism اور Catabolism اور اسی کے ماتحت ہے Motabolism۔ یعنی Anabolism کہ ہر وقت کوئی چیزیں جو ہیں Construct ہوتی رہتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی Catabolism ہے کہ وہ کچھ چیزیں تلف ہوتی رہتی ہیں۔ انسانی جسم کے اندر وہ بتاتے ہیں کہ یہ جو Cells ہیں یہ انہی کے مجموعے کا نام جسم ہے۔ اور Cells کی اندر کیفیت یہ ہے کہ ایک ثانیہ میں کروڑوں کی تعداد کے اندر وہ تلف ہوتے رہتے ہیں اور کروڑوں ہی کی تعداد کے اندر زندہ سیلز بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کن چیزوں سے بنتے ہیں؟ زندہ چیزیں تو آپ کھاتے نہیں ہیں۔ جس شکل میں بھی آپ کھاتے ہیں کھانے کے بعد وہ Assimilate ہوتی ہیں آپ کے پیمانے کے مطابق تو ان میں زندگی رہتی نہیں ہے۔ اور پھر ان میں تو بیشتر چیزیں جو بنتی ہیں جنہیں آپ Salts کہتے ہیں منرلز کہتے ہیں ان میں تو لائف اس شکل میں ہوتی نہیں ہے۔ اس شکل میں تو آپ ساری چیزیں اندر دیتے ہیں جسم کو اور ان تمام میں سے وہ زندہ سیلز ہر ثانیہ میں کروڑوں کی تعداد میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور زندہ سیلز اپنا کام کرنے کے بعد کروڑوں کی تعداد میں تلف ہوتے چلے جاتے ہیں کیونکہ تازہ سیلز چاہئیں زندگی کو اپنی نمود کے لیے۔ حیرت ہوتی ہے عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے کہ بتاؤ تو سہی یہ تم میں سے کسی نے ایسا قانون بنایا ہوا ہے کہ اس قسم کی اشیاء کہ جن میں زندگی نہیں ہے وہ Convert ہو جاتی ہیں ان چیزوں میں جو زندہ ہوتی ہیں۔ اور وہ زندہ چیزیں جو ہیں ہر آن Convert ہوتی رہتی ہیں ان میں جو مردہ ہوتی ہیں۔ اور اس سے اس پیکر کی زندگی جو ہے وہ برقرار

رہتی ہے۔کہا فرمایئے تو سہی کونسی آپ کی پارلیمنٹ تھی جس میں آپ نے یہ بل Introduce فرمایا تھا' کونسا Constitution تھا جس کی رو سے آپ نے یہ طے کیا تھا کہ ایسا ہونا چاہیے یا اس کے بعد پھر کہدیں کہ نہیں صاحب اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔اور پھر ایک لفظ میں کہ (و من یدبر الامر) (10:31) یہ کہتا ہے کہ یہ پورے عظیم کارگہ کائنات کے اندر جو کچھ بھی ہو رہا ہے کہیے کہ اس میں یہ جسے تدبیرِ امور کہتے ہیں۔یہ عجیب لفظ ہے قرآن کا۔ایک تو ایک چیز ہے کہ امر ہے جسے وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے پیمانوں میں ہم نے ڈھال دیا قانون بنا دیا۔لیکن وہ کہتا ہے کہ قانون کا پیچھا کرنے والا بھی کوئی ہونا چاہیے یہ دیکھے کہ قانون کا رفرما بھی ہو رہا ہے کام بھی کر رہا ہے۔الفاظ قرآن کے عزیزانِ من! کہاں کیا لاتا ہے۔سینکڑوں لفظ عربی زبان میں مل سکتے تھے بیسیوں تو کم از کم یونہی عام لغت میں چل جاتے ہیں جسے آپ تدبیر کہتے ہیں کسی چیز کی تنظیم کہتے ہیں Administer کرنا کہتے ہیں۔(یدبر الامر) (10:31) دبر کے معنی ہی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔کہتا ہے ایک تو بنا دیا ہے نا قانون۔اب یہ کہ وہ ڈنڈا لے کے اس کے پیچھے پیچھے کوئی چل رہا ہے ہانکنے والا کہ وہ کام کرتا چلا جائے اسی طرح سے۔یہ کائنات کا سلسلہ جس طرح سے چل رہا ہے بتاؤ تو سہی وہ کونسی ایک تم نے کمیٹی مقرر کی ہوئی ہے کہ جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتی رہے کہ یہ سائنس کے قوانین یہ کارگہ کائنات میں جتنے قوانین کارفرما ہیں وہ ٹھیک ٹھکانے سے اپنا اپنا کام اسی طرح سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔بہرحال وہ کہتا ہے کہ آج بھی' اس زمانے کے مخاطبوں سے بھی کہو۔وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ بھی جتنی بھی ان کی سطح ہے بہرحال وہ اس کا اقرار کریں گے۔ (فسیقولون اللہ) (10:31) اتنا تو اقرار یہ بھی وہ کریں گے کہ ہمارا تمہارا انسانوں کا یہ کیا ہوا نہیں ہے۔بہرحال وہ کہیں گے کہ ہاں صاحب نام کچھ رکھ لیں گے کوئی ایشور کہے گا کوئی God کہے گا کوئی پرماتما کہہ دے گا کوئی خدا کہہ دے گا۔یہ تو یہ اقرار کریں گے کہ یہ انسانوں کا نہیں ہے ہمارا قائم کردہ یہ نظام نہیں ہے ہمارے بنائے ہوئے قوانین نہیں ہیں۔عزیزانِ من! آپ دیکھئے کہ اگر آج بھی آپ نے اس موضوع پر کسی بڑے سے بڑے سائنٹسٹ سے گفتگو کرنی ہو اسی لائن پہ آپ چلیں گے نا۔اب یہاں سے وہ آگے ایک لفظ یہ کہتا ہے جہاں اب وہ اس کا نقطۂ امتیاز یہاں سے آتا ہے۔جس بات پہ لانا ہے اس نے وہ بات اب آتی ہے آگے۔وہ کوئی سائنس کی کتاب نہیں تھی کہ اس نے یہ سائنٹفک گفتگو اس لیے کرنی تھی کہ ان کو فزکس کے کوئی Lesson دیدیے جائیں۔وہ تو یہاں لانا چاہتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اب یہ بتاؤ کہ یہ جو انسانوں کی ایک مخلوق ہے یہ بھی اسی کائنات کا حصہ ہے نا۔ٹھیک ہے۔خود انسانی زندگی جو ہے اس میں تم دیکھتے ہو نا کہ وہی قوانینِ فطرت یا Physical Laws جنہیں آپ کہتے ہو وہ اس پہ بھی کارفرما ہیں۔باقی جانداروں کی طرح سانس لینے سے زندگی ملتی ہے کھانے سے زندگی قائم رہتی ہے اسی طرح سے خون کی گردش ہوتی ہے Law of Preservation of Life (تحفظِ خویش) کا قانون کارفرما ہے۔بلکہ زندگی کا تقاضا ان کا ہے جسے Instinct کہتے ہیں وہ بھی اسی طرح سے ہے سونا ہے جاگنا ہے افزائشِ نسل ہے۔اور انہی قوانین کے مطابق مشینری فرسودہ ہو جاتی ہے چلنا چھوڑ دیتی ہے بند ہو جاتی ہے تو موت کہتے ہو۔کہا کہ انسان بھی اس کائنات کا حصہ ہیں انسان کی ایک

زندگی انہی قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ وہ قوانین کہ جو نہ اس انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہوتے ہیں نہ اس تمام مخلوق کے اکٹھے ہو کے بنائے ہوتے ہیں جنہیں آپ انسان کہتے ہیں۔ چلتے ہیں نا ایک بنے بنائے قانون کے تابع یہ سارا قصہ۔ اور اس میں ذرا سی بھی سرکشی برتئے ان قوانین میں تو نتیجہ فساد ہوتا ہے نا۔ ہوا موجود ہو تم سانس لینا بند کرو اسے کہتے ہیں نا خلاف ورزی قانون کی۔ پھر دیکھتے ہو ہوتا کیا ہے۔ اب یہاں سے آگے چلتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اگر تو تمہاری زندگی بھی یہی جنگل کے درختوں کی ان پانیوں کی اسی قسم کی ایسی مخلوق کی جو اپنی اپنی جگہ زندہ رہتے ہیں مر جاتے ہیں۔ یہ ہوتا تو ٹھیک ہے Physical Laws اور ان کے اندر جو ہم نے ودیعت کی Instinct کافی تھی۔ انسانوں کے معاملے میں معاملہ کچھ اور آگے بڑھ گیا ہے اور وہ معاملہ یہ بڑھ گیا ہے کہ انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔ ان کی زندگی تمدنی زندگی ہے' اس میں سے ایک شخص کے فیصلے کا اثر بیسیوں انسانوں پہ پڑتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار بنا دیا گیا ہے مجبور نہیں ہے۔ اب اگر صورت یہاں یہ ہو کہ ان کی اس زندگی کو Governe کرنے کے لیے کوئی اسی قسم کے قوانین نہ ہوں جیسے کہ فطرت کی زندگی میں باہر فطرت کی کائنات میں چل رہے ہیں تو ان کی اس زندگی کے اندر فساد ہو جائے گا۔ اختیار ان کو دیا جائے کہ جس قسم کے جی چاہے قوانین بنا لیجیے اور پھر ہر فرد کو اختیار دیا گیا ہو کہ جی چاہے قانون مانئے جی چاہے نہ قانون مانئے۔ کہتا ہے پہلی تو یہی چیز کہ جس گروپ اور جس گروہ کو بھی آپ کہیں گے کہ جس قسم کے بھی جی چاہے قوانین بنا لیجیے تو آپ دیکھئے گا کہ جب بھی انسان کوئی قانون بنائے گا اس میں اس کے رجحاناتِ قلب کی رنگینی کی آمیزش کہیں نہ کہیں ضرور آ جائے گی۔ کوئی گروپ کیوں نہ ہو کوئی ادارہ کیوں نہ ہو کہتا ہے جہاں بھی قوانین بنائے جائیں گے انسانوں سے متعلق ان کی تمدنی زندگی سے متعلق۔ تو پہلی چیز تو اس کے اندر یہ آ جائے گی۔ پھر وہ قوانین جو ہیں آئے دن جب جی چاہے تمہارا بدلتے چلے جاؤ گے۔ پھر ان قوانین میں افراد کی کیفیت یہ ہو گی کہ جس کا جی چاہے گا مانے گا جس کا جی چاہے گا اس کو Aviod کرے گا۔ ادھر سے قانون ابھی آئین کی ?? Annual کے اوپر رکھا ہوتا ہے ابھی اس کی شکل بھی نہیں بنی ہوتی قانون توڑنے والے دماغوں میں اس کے توڑنے کی راہیں پہلے سے تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ Announce بعد میں ہوتا ہے اور یہ راستے ان کے ہاں پہلے طے ہو گئے ہوتے ہیں کہ اس میں سے نکلنا کیسے ہے۔ جبھی تو آپ نے دیکھا نہیں کہ قانون بننے کے بعد ابھی وہ چھپ کے بھی نہیں آتا کتاب میں اور Ammendmends شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ Ammendmends کیا ہوتی ہیں؟ وہ چور دروازے جن میں سے وہ نکلنے کی راہیں اپنے لیے تلاشتے ہیں پھر اس پہ لیپا پوتی ہوتی ہے۔ اور وہ جب دروازے بہت زیادہ بن جاتے ہیں تو پھر ایک دن وہ سارا قانون آئین دھڑم سے گر جاتا ہے یا کوئی آتا ہے ایک لات مارتا ہے اس کو الگ کر دیتا ہے۔ کہتا ہے یہ دو دنیائیں جو تمہاری ہیں یہ تمہاری Physical Life کی دنیا اور یہ تمہاری تمدنی دنیا ۔تم دیکھتے ہو کہ ان دونوں میں کتنا فرق آ جاتا ہے۔ اور ہم تو صرف اتنی سی بات تمہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ بھائی جس طرح سے اٹل قوانین کے تابع

یہ باہر کا سلسلۂ کائنات چل رہا ہے اسی قسم کے اٹل عالمگیر قوانین کے تابع تمہاری یہ تمدنی زندگی بھی اسی طرح چلنی چاہیے تاکہ اس میں فساد نہ ہو۔ یہ ہے عزیزانِ من! ملخص سارا اس کی تعلیم کا۔ غور کیجیے میں نے کہا کہ ایک لفظ آ گیا یہاں۔ چلا آ رہا ہے (**قل من یرزقکم من السمآء و الارض امن یملک السمع و الابصار و من یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی و من یدبر الامر**) (10:31) سارا کائنات کا سلسلہ گنانے کے بعد۔ پوچھو ان سے کہ یہ کون کرتا ہے تو بہرحال یہ بتائیں گے کہ صاحب ہمارا تو یہ بنایا ہوا نہیں ہے نام کچھ لے لیں گے تم کہہ دو کہ یہ اللہ کا ہے۔ کہتا ہے (**فقل افلا تتقون**) (10:31)

اب آیا وہ لفظ تقویٰ جو میں نے کہا تھا شروع میں۔ کہا کہ اب بتاؤ یہ کہ اپنی زندگی بھی چاہتے ہو یا نہیں کہ اسی قسم کی ہو۔ دیکھتے ہو کیسے سکون سے امن سے کتنے حسین انداز سے یہ سلسلہ چل رہا ہے کائنات کا۔ تو پھر ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اسی طرح سے تمہارا سلسلہ چلنا چاہیے۔ یہاں آ کے تمہیں کیوں موت پڑ جاتی ہے۔ اوا تنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ (**افلا تتقون**) (10:31) کیا بات کہہ گیا ہے!! کہ پھر تم اپنی زندگی بھی اسی نہج سے کیوں گذارنا نہیں چاہتے۔ کہا جسے اللہ کہا جاتا ہے وہ یہی ہے تصور کہ وہ تمہاری جس طرح سے کائنات کے نظم و نسق اور کارگہ کے لیے قوانین مرتب کرنے والا جو ہے اس کا اللہ کہہ کے پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح تمہاری تمدنی زندگی کے متعلق بھی اسی قسم کے قوانین دینے والا جو ہے اسے تم خدا کہہ دو۔ مقصد تو قوانین سے ہے کہ ایسے قوانین ملنے چاہئیں۔ کہا یہ کہ جو دونوں دنیاؤں کے لیے تمہیں قوانین اس قسم کے دیتا ہے (**فذٰلکم اللہ**) (10:32) یہ ہے جسے اللہ کہتے ہیں۔ (**ربکم الحق**) (10:32) ایک ہی لفظ لے آیا 'رب' اس میں۔ رب کے معنی ہوتے ہیں کسی شے کو نقطۂ آغاز سے ابتداء سے بتدریج نشوونما دیتا ہوا اس کی تکمیل تک پہنچانے والا۔ وہ کہتا ہے آ جاؤ پھر پہلی دنیا کی طرف جو ہم کہہ رہے تھے باہر کی کائنات۔ وہاں کوئی شے بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ Accomplished Form میں بنی بنائی مکمل شکل کے اندر پہلے دن نمود میں آ جاتی ہو۔ وہاں بھی ایک بیج کے ذرے کو ایک درخت بننے کے لیے اتنی لمبی منازل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک ذرے سے جسے آپ بنیاد کہتے ہیں زندگی کی یا بچے کی یا افزائشِ نسل کی اُسے ایک جیتا جاگتا بچہ بننے تک ان منازل میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہ ساری منازل جن میں سے یہ اس طرح سے نشوونما پاتی ہوئی ہر شے چلی جاتی ہے اسے ربوبیت کہتے ہیں ایسا کرنے والا جو ہے رب کہلاتا ہے۔ (**فذٰلکم اللہ ربکم الحق**) (10:32) یہ الحق یہاں کہا ہے۔ حق کے معنی ہوتا ہے وہ شے کہ جو محض ذہنی اور نظری نہ ہو فارمولے کے اندر ہی نہ ہو وہ ایک محسوس حقیقت بن کے سامنے آ جانے والی ہو۔ حق کہتے ہی اس کو ہیں عربی زبان میں عزیزانِ من!۔ اس میں دو چیزوں کو ہی بنیاد رکھتے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ وہ جتنے تقاضے ہوں اس میں وہ فٹ ان کرنے والی چیز ہو۔ ہر شے کے تقاضے کے مطابق وہ اس کو سامانِ ربوبیت دے کہ جو اس کی Potentialities ہیں امکانات ہیں وہ Actualities بن کے محسوس شکل میں سامنے آئیں اسے ربوبیت کہتے ہیں۔ اور الحق کہتے ہیں کہ ہر منزل میں یہ تقاضا پورا کرتا چلا جائے وہ۔ (**کل یومًا ھو فی شان**) جس شے کا جو تقاضا ہے وہ اس تقاضے کو پورا کرنے

کے لیے سامان وقانون دینے والا ہے وہ۔اسی طرح سے تمہاری تمدنی زندگی بھی غاروں سے تم نے شروع کی چاند تک پہنچ رہے ہو۔آپ دیکھتے ہو کہ کتنی منازل ہیں جو اس میں طے کی ہیں۔اور پھر اس قدر مسلسل خطرات میں سے یہ زندگی گذرتی ہوئی اس کے ارتقاء کا کارواں چلا آ رہا ہے

۔

دام ہر موج میں حلقۂ صد کامِ نہنگ

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یہ قطرے کا گہر ہونا جو ہے اسے ربوبیت کہتے ہیں۔(**ذٰلکم اللہ ربکم الحق**) (10:32) ربوبیت اور محض نظری اور شاعری نہیں الحق ہے ایک اپنے دعوے اور نظریے اور قانون کو محسوس پیکروں میں سامنے لے آنے والا۔کہا کہ (**فماذا بعد الحق الا الضلٰل**) (10:32) اب سوچو کہ اگر حق کی طرف نہ آیا جائے تو حق چھوڑ دینے کے بعد سوائے اس کے کہ ہر شے ناکام رہ جائے گی اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔یعنی یہ بنیادیں عربی زبان کے الفاظ کی' میں نے کہا نا الحق کہتے ہی اس کو ہیں۔یہ خود جسے آپ Reality کہتے ہیں انگریزی زبان کے اندر' Realise کہتے ہیں وہ یہی ہے نا کہ Real بنا دینا کسی چیز کو۔وہ کہتا ہے کہ اگر یہ نظریات ہی رہیں محض Abstract Laws ہی رہیں قوانین ایسے ہی خلا کے اندر رہیں اور وہ الحق نہ بنتے ہوں تو اس قسم کی کوششوں کا نتیجہ سوائے **ضلٰل** کے اور کچھ نہیں۔**ضلٰل** کے معنی گمراہی نہیں ہوتا بلکہ سعی لا حاصل جسے آپ کہتے ہیں رائیگاں جانا کسی چیز کا جو کہتے ہیں اُسے ضلالت کہتے ہیں۔(**اولئک حبطت اعمالھم**) ساری کوششیں بے نتیجہ رہ جاتی ہیں اگر الحق نہیں وہ بنتیں۔عزیزانِ من! کونسی مملکت کونسی قوم ہے جس میں اچھے سے اچھے قانون اور آئین موجود نہیں ہیں۔پھر یہ جو زندگی ساری جہنموں میں گذرتی ہے انسانوں کی' کیا وجہ ہے؟ وہ قانون نظری حیثیت تو وہ رکھتے ہیں الحق نہیں بنتے۔(**فماذا بعد الحق الا الضلٰل**) (10:32) کہتا ہے اس قسم کے قانون پھر ان قوانین کو الحق بنا دینے والا۔ابھی ابھی آگے چل کے آتا ہے کہ جس طرح باہر کی زندگی میں یہ الحق بنتے ہیں تمہاری زندگی میں کس طرح سے الحق بن سکتے ہیں یہ قوانین جو تمہاری زندگی سے متعلق ہم نے دیے ہیں۔(**فماذا بعد الحق الا الضلٰل**) (10:32) آگے پھر بڑا دلچسپ لکھا ہے۔(**فانی تصرفون**) (10:32) کہا یہ بتاؤ کہ اتنا کچھ جو ہم نے کہا ہے دلیل و برہان پہ مبنی ہے نا' علم و بصیرت پہ مبنی ہے نا' تمہارے مشاہدے مطالعہ تجربے پہ مبنی ہے نا۔تو جو چیزیں ان پہ مبنی ہوں اس کے بعد پھر رخ موڑ کے دوسری طرف جانے کے معنی کیا ہیں۔تم نے اپنے تجربے سے دیکھ لیا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے پھر پیاس لگنے کے وقت پانی کی طرف سے رخ موڑ کے خشکی کی طرف چلے جانا معنی کیا ہیں اس کے۔ہم سے کیوں پوچھتے ہو تم ہی بتاؤ۔کہا جس طرح سے ہم نے یہ دلائل دیے اور تم نے دیکھا ہے کہ یہ ہر دعویٰ ہر نظریہ ہر فارمولا ہر تھیوری ہر Law ایک محسوس شکل اختیار کر کے سامنے آتا ہے۔(**کذٰلک حقت کلمت ربک**) (10:33) کیا بات ہے!!! میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا قرآنِ کریم میں قوانینِ خداوندی کے لیے دو لفظ آتے ہیں: ایک لفظ ہے سنت اللہ'

خدا کی روش۔ایک لفظ ہے کلمت اللہ۔کلمہ کا لفظ وہاں استعمال اس نے کیا ہے جہاں Law جو ہے وہ نظری حیثیت میں دیا ہوا ہے صرف' قانون ایک فارمولے کی حیثیت میں دیا ہوا ہے۔اور جب وہ Law وہ فارمولا ان پریکٹس آتا ہے اُسے سنت اللہ کہا گیا ہے کہ دیکھو یہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کس طرح سے عملی دنیا میں نتائج پیدا کرتے ہیں۔یہ سنت اللہ ہے۔تو اس نے کہا ہے کہ نہ تو کلمت اللہ بدل سکتے ہیں(**لا تبدیل لکلمت الله**) وہ قوانین بھی اٹل ہیں۔اور جب وہ عملی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کے نتائج بھی اٹل نکلتے ہیں(**ولن تجد لسنت الله تبدیلًا**) ۔(**کذٰلک حقت کلمت ربک**) (10:33)اس طرح سے خدا اپنے ان نظری قوانین کو حقت (یہاں دیکھئے وہ لفظ آ گیا)ایک عملی شکل میں نمودار کر کے دکھا دیتا ہے۔(**علی الذین فسقوا انهم لا یومنون**) (10:33)اس کا نتیجہ دیکھنا ہو ان قوموں کی زندگی میں دیکھو کہ جو یہ پیٹرن چھوڑ کر۔آپ کو معلوم میں نے بتایا تھا فسق' ہم تو فاسق وفاجر کہہ دیتے ہیں اور پھر وہ تو آپ کو معلوم ہے ذہن میں کیا آتا ہے جب ملا فاسق وفاجر کہتا ہے' ہم آپ سارے وہ نہیں۔فسق: آپ کو پھر دہرا دوں بار بار لفظ آئیں گے بار بار دہرانا پڑے گا۔ہر پھر اپنے باہر کا خول یا پیٹرن جو ہوتا ہے اس کے اندر وہ تکمیل تک پہنچتا ہے اس کے اندر پختگی تک پہنچتا ہے۔یہ جو کسی ایک پیٹرن کے اندر رہتے ہوئے تکمیل تک پہنچنا ہے یہ وہ چیز ہے کہ جسے وہ تقویٰ کہتا ہے۔اور اگر کوئی پھل آپ نے دیکھا ہوگا یہ آم کے پیڑ پہ نہایت عمدہ قسم کے آم اتنے اتنے بڑے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اوپر ہی پکنے سے پہلے پھٹ جاتے ہیں۔وہ اپنا باہر کا جو پیٹرن ہوتا ہے وہ اسے توڑ دیتے ہیں اور جو اسے توڑ دیتے ہیں تو پھر وہ پختگی تک نہیں پہنچتے ''سڑ جانداائے''۔یہ جو باہر کے پیٹرن کو توڑنا ہوتا ہے اسے فسق کہتے تھے عربی زبان میں۔وہ کہتا ہے کہ یہ قومیں جو ہمارے ان قوانین کی ان حقانیت کے اوپر یقین نہیں رکھتی وہ خود پہلے تو اپنے لیے پیٹرن تلاش کرتی ہیں وہ پیٹرن تکمیل تک پہنچاتا نہیں ہے وہ پھٹ جاتا ہے۔اور جب بھی کوئی پیٹرن پھٹتا ہے تو پھر تکمیل تک پھل نہیں پہنچ سکتا۔وہ کہتا ہے کہ ہم جو تمہیں اقوامِ عالم کی سرگذشتیں بیان کرتے ہیں تو وہ یہی سمجھاتے ہیں کہ تم دیکھو ان کے تار تار شدہ پیراہنوں کو دیکھو ان پیٹرنز کو دیکھو یہاں وہاں ان کی دھجیاں بکھری ہوئی تمہیں ملیں گی ان بستیوں کے کھنڈرات کی شکل میں جس سے یہ نظر آئے گا کہ وہ قطرہ گہر نہ ہو سکا۔(**کذٰلک حقت کلمت ربک علی الذین فسقوا انهم لا یؤمنون**) (10:33)اس لیے کہ ان کو یقین کامل حاصل نہیں تھا اس بات کا کہ زندگی تکمیل تک صرف اس پیٹرن یا ان قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے پہنچ سکتی ہے۔زندگی تو کسی منزل میں بھی ان قوانین سے سرکشی برتے وہیں اس کا ارتقاء ختم ہو جاتا ہے وہ تکمیل تک پہنچ نہیں سکتی۔اب آگے آیا۔کہا پہلی چیز تو ہم نے یہ کہی کہ بتاؤ یہ تم کرتے ہو؟ اگلی چیز اس نے یہ کہی ہے کہ یاد رکھو یہ بھی کوئی بہت سے Members اکٹھے ہوئے ہوئے نہیں ہیں وہاں کہ جو یہ کچھ کرتے ہیں۔(**قل هل من شرکآئکم من یبدؤا الخلق ثم یعیده**) (10:34)

کہا یہاں تک تو قوانین کا ذکر ہو رہا تھا جو اس بنی بنائی ہوئی یا وجود میں آئی ہوئی کائنات میں کارفرما ہیں۔کہا ان سے کہو ذرا ذہنوں

میں زور دے کے بتائیں کہ ابتدائے کائنات جو ہے اس کے متعلق کوئی ذہن میں تصور بھی آتا ہے؟۔ یہ وہ نقطہ ہے عزیزانِ من! جہاں سائنس اپنے ہتھیار رکھ دیتی ہے۔ ابتداء کہاں سے ہوئی؟ اور آخرالامر انہوں نے اس معاملے پہ سوچنا چھوڑ دیا' سوچنا چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے ہاں کا پھر قانون یہ ہے کہ جو Finite ہے وہ Infinite کا تصور نہیں کرسکتا' محدود ذہن جو ہے وہ لامحدود کا تصور نہیں کرسکتا۔ ابتداء لا محدود ہے ابتداء کا تصور ہی ذہن میں نہیں آسکتا۔ ابتداء کا تصور یہ کہ کوئی شے موجود نہ ہو موجود ہو جائے۔ یہ چیز سائنس کے احاطے سے باہر ہے' Cause & Effect کا قانون یہاں بالکل ختم ہو جاتا ہے عاجز آجاتا ہے۔ سائنس اس کا احاطہ نہیں کرسکتی لاموجود موجود ہو جائے Nothingness میں سے کچھ پیدا ہو جائے' سائنس کا احاطہ ختم ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے یہاں بتائے پھر۔ ہم تو قوانین کی بات کر رہے تھے یہاں ذہن نہیں پہنچ سکتا تمہارا۔ کون ہے کہ جو اس طرح سے جس نے ابتداء کی' کی بھی نہیں **یبدؤا** ہے یہاں تو' کرتا ہے اس لیے کہ اس نے کہا ہوا ہے (**واللہ یزید فی الخلق ما یشآء**) ۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دفعہ ہم نے اس طرح سے یہ پیدا کر دی بس یہ ہو گیا اس کے بعد اب ہم یہودیوں کے تصور کے مطابق ساتویں دن خدا تھک گیا کائنات بن کے تو پھر وہ آرام کر رہا ہے۔ یا وہ ہندو دھرم کے مطابق کہ خدا تو اس کے بعد سو رہا ہے یہ سارا وہ خواب ہے جو دیکھ رہا ہے۔ کہتا ہے یہ بات نہیں ہے۔ (**یزید فی الخلق**) ایک تو (**یدبر الامر**) قانون بنانے کے بعد یہ نہیں ہے کہ گھڑی کو چابی دیدی ہے اس نے کہ اب چوبیس گھنٹے یہ خود چلتی رہے گی۔ وہ تو ایک ڈنڈا لے کے ہانکنے والے کی طرح اس قانون کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔ (**یبدؤا الخلق ثم یعیدہ**) (10:34) عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے کے الفاظ ہیں۔ کہتا ہے کہ ابتداء کرتا ہے تو ابتداء یہ نہیں ہے کہ Accomplished Form کے اندر تکمیل شدہ فارم کے اندر وہ شے وجود میں آجاتی ہے۔ وہ جس شکل میں وجود میں آتی ہے پھر اس کے بعد گردشیں دیتا ہے اس کو' گردشیں دیتا ہوا اس کو تکمیل کی منازل طے کراتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا کا پھر یہ تصور کہ وہ ایک دفعہ ایسا اس نے کر دیا ہے اور اس کے بعد پھر وہ سو گیا ہے یا اس کی ضرورت نہیں رہی' یہ بھی غلط ہے تصور۔ وہ خدائے زندہ ہونا چاہیے۔ تو جس نے اتنے بڑے عظیم کارگۂ کائنات کو اس طرح سے تدبیر کرنی ہے ہانکنا ہے اضافے کرنے ہیں **یعیدہ** گردشیں دینی ہیں' خدا وہ سو جائے گا؟ سو جانا!! وہ کہتا ہے (**لا تاخذہ سینۃ ولا نوم**) سونا تو ایک طرف اسے تو اونگھ بھی نہیں آسکتی۔ عزیزانِ من! اگر کسی وقت (معاذ اللہ) خدا کو تھوڑے وقت کے لیے اونگھ آجائے پوچھو نہیں کیا ہو جائے یہاں۔ اونگھ آجائے کیا معنی ہیں؟ یہ سارے قوانین کا سلسلہ تھوڑے سے وقت کے لیے معطل نہ سہی سست ہی ہو جائے اپنی رفتار میں۔ میں کہتا ہوں یہ جو اجرامِ فلکی ہیں اور کچھ نہیں اس کی رفتار اور تناسب جو اس کے اندر ہے اس میں اگر کسی ذرہ کے کروڑویں حصے کا بھی فرق آجائے کسی کی اونگھ آنے سے۔ یہ آپس میں اس طرح ٹکرا کے پاش پاش ہو جائیں کہ پوچھئے نہیں کیا ہو۔ بڑا الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس نے ڈر کے چیخ کے کہا تھا کہ خداوندہ خدائی دردِسر ہے میرے اللہ توبہ میری' نہ بابا۔ خدائی دردِسر ہے۔ لیکن یہ تو اقبالؒ تھا۔ دردِسر۔ اور مگر یہ بندگی۔ غلامی کسی کی دردِجگر ہے۔ بات اور جگہ چلی گئی۔

(**من یبدؤا الخلق ثم یعیدہ**) (10:34) کون ہے ابتداء کرتا ہے اس کی' گردشیں دیتا ہے۔تمہارے علوم سارے اکٹھے ہو کے بھی یہ نہیں بتا سکے کہ ابتداء کیسے ہوئی ہے۔ کہنے لگے یہاں پہنچنے کے بعد تم کچھ بھی کہو یہ کہو گے نا کہ یہ ہمارا نہیں تمہارا نہیں کسی اور کا نہیں ذہن میں نہیں آ سکتا کس کا ہے۔کہا ٹھیک ہے ہم یہ کہتے ہیں۔(**قل اللہ یبدؤا الخلق ثم یعیدہ**) (10:34) ایک قوت ہے کہ جو پیچھے ہے یہ سارا کچھ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔پھر وہی بات آ گئی۔ کہنے لگے جب یہاں یہ کیفیت ہے کہ ان قوانین کے متعلق تم یہ بات کہتے ہو کہ ہم نہیں کہہ سکتے کب شروع ہوئے کیسے کائنات وجود میں آ گئی یہاں پہنچنے کے بعد ہمارا ذہن بالکل عاجز آ جاتا ہے۔(**فانّٰی تؤفکون**) (10:34) تو اس کے بعد کہو کہ جب انسانی زندگی کی طرف آتے ہو تو یہاں کیوں الٹے پاؤں پھر جاتے ہو یہاں کیوں یہ طے کر لیتے ہو کہ ہم ہی ابتداء کریں گے ہم ہی انتہا کریں گے ہم ہی قوانین بنائیں گے ہم ہی سنواریں گے ہم زندگی کو تکمیل تک پہنچائیں گے۔بھئی یہاں تک سیدھے چلے آ رہے ہو نا۔ یہاں آنے کے بعد جب کہا کہ تمہارا اپنی زندگی: الٹے پھر گئے کہ جی یہ تو سب کچھ ہم خود کریں گے۔اچھا!!۔(**قل ھل من شرکآئکم من یدی الی الحق قل اللہ یھدی للحق افمن یھدی الی الحق احق ان یبتع امن لا یھدی الا ان یھدٰی**) (10:35) کہا یہ بتائیے یہ قوانین جو ہیں یہ تم میں سے یہ بڑے بڑے سائنٹسٹ یا تم میں سے بڑے بڑے تمہارے یہ معبودانِ باطل بڑے بڑے صاحبِ اقتدار جن کو تم مانتے ہو۔ان قوانین کی Directions ان کی ہدایت ان کے راستے یہ مقرر کرتے ہیں تم مقرر کرتے ہو؟ ان کی رہنمائیاں تم کرتے ہو یا یہ تمہاری رہنمائی کرتے ہیں؟ یہ تم نے قطب تارے سے کہہ رکھا ہوا ہے کہ اس مقام کے اوپر ہمیشہ کھڑے رہنا یاد رکھنا ہلنا نہیں یہاں سے؟ یا اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب تاریک رات میں صحرا میں کھڑے ہوئے کہیں راستہ نہ نظر آئے تو اس وقت تمہارے ہاں یہ چیز ہے کہ اگر اس قطب تارے کی طرف کندھا ہمارا سیدھا کر لیں تو جدھر ہمارا رخ ہو جائے گا وہ West ہو جائے گی۔کہا یہ تمہارا رہنمائی کرتا ہے یا تم نے اس کی رہنمائی کی تھی کہ میاں یہاں کھڑے ہونا ہم آئیں گے اور پوچھیں گے ذرا؟۔یعنی کس طرح سمجھا رہا ہے۔چودہ سو سال پہلے کے عرب کے تاریکستان میں عرب جیسی قوم میں صحراء نشین بدو' ان کے ذہن پہ بھی گفتگو کر رہا ہے آج آئن سٹائن کو بھی یہ سمجھا رہا ہے۔کہ میاں صاحب یہ ذرا بتاتے جائیے کہ یہ جو قوانین جس ڈائریکشن میں چلے جا رہے ہیں یہ Directions تمہاری مقرر کی ہوئی ہیں؟ تم نے سجھائے ہیں ان کو یہ راستے؟ یہ تمہارا طے کیا ہوا ہے قانون اور تم نے پانی کو کہا ہے کہ نشیب کی طرف بہنا؟ تم نے اس سے کہا تھا کہ جب ایک سو فارن ہیٹ پہ پہنچ جاؤ تو تم نے بھاپ بن جانا ہے چار ڈگری پہ پہنچو تو برف بن جانا؟ یہ راستے تمہارے ان کے لیے طے کیے ہوئے ہیں؟ یا یہ بات ہے کہ پانی نے یہ راستے تمہیں بتائے ہیں کہ دیکھ لو اتنے درجے کے اوپر میں یہ ہو جاتا ہوں اتنے پہ یہ ہو جاتا ہوں نشیب کی طرف بہتا ہوں دونوں چیزیں مجھ میں ایسی ہیں جو ایک تو خود جلنے والی ہے دوسری جلانے والی ہے آکسیجن اور ہائیڈروجن اور اس کی امتزاج سے جو میں بنتا ہوں آگ کو بجھاتا ہوں؟ کہا یہ چیزیں پانی نے تمہیں بتائی ہیں یا تم نے پانی کو یہ ہدایت دی تھی کہ ایسا بن جانا۔سوچئے کہ کیا

دلائل دے رہا ہے۔انہیں یہ کہہ رہا ہے کہ یادرکھو جن چیزوں سے تم راہنمائی لیتے ہوخواہ وہ آسمان کے ستارے کیوں نہ ہوں ہواؤں کے رخ کیوں نہ ہوں۔تم نے انکی راہنمائی کی ہوئی ہے کہ تم نے یوں چلنا؟ تاکہ ہم کہدیں کہ اب پچھّم اور پروا چل پڑا ہے۔وہ بچپن میں یہ چیزیں ہوتی تھیں اب تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم الٹے ہیں تو ہمارے پچھے اور پروے بھی سارے الٹے ہیں۔خیر۔یہ اس لیے ہے عزیزانِ من! یہ نہیں ہے کہ وہاں فساد ہوگیا ہے' اس لیے کہ ہم نے اپنے علم کو اس کے مطابق نہیں رکھا ہوا۔بات دوسری طرف چلی گئی۔وہ کہتا یہ ہے۔بڑی عظیم آیت ہے۔(**افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع**) (10:35) کیا وہ کہ جو ان تمام چیزوں کی راہنمائی کرتا ہے اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی رہنمائی کا اتباع کیا جائے یا وہ کہ جو اپنی راہنمائی میں بھی وہ محکوم محتاج ہیں کسی دوسرے کے۔تم تمہارے یہ معبود یا جن کو تم بڑا سمجھ رہے ہو اپنی زندگی میں جن کا اتباع کرنا چاہتے ہو کہو کہ ان کو زندہ رہنے کے متعلق یہ جو ہدایات ہیں یہ جو قوانین ہیں ان کے دیے ہوئے ہیں یا وہ قوانین ان کی ہدایت کر رہے ہیں کہ نہ بابا ایسے چلنا تم نے۔کہا کس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے۔کہا بات سمجھ میں آئی؟ ہے کوئی علمی دلیل تمہارے پاس جو اس کے خلاف دے سکو جو ہم نے دعویٰ کیا ہے اس کو توڑ سکو۔اور جب نہیں ہے اور ہے ہی نہیں عزیزانِ من! نہ اس زمانے میں کوئی اس کو توڑ سکتا تھا ان دلائل کو نہ کوئی آج توڑ سکتا ہے۔کہا(**فمالکم**) (10:35) او پھر تمہیں کیا ہو جاتا ہے یہاں آ کے۔(**کیف تحکمون**) (10:35) اپنی زندگی کے متعلق اپنی دنیا کے متعلق پھر تم کس قسم کے فیصلے کرنے بیٹھ جاتے ہو۔(**ما یتبع اکثرھم الا ظنًا**) (10:36)

خود کچھ کرنے بیٹھ جاؤ گے تو بہر حال ظن اور قیاس کے پیچھے چلتے جاؤ گے۔کچھ یوں کر لیا جائے' نہیں ٹھیک نہیں رہا' یوں کر لیا جائے ۔یہ سارا راستہ عزیزانِ من! جو انسان نے خود اپنے طور پہ طے کیا ہے وہ اس کی علم اور علمی عقل اور علمی استعداد کے Trial & Error کا راستہ ہے۔یوں سوچا کہ یوں کر لیا جائے تو ٹھیک رہے گا اور تھوڑا سا عرصہ چلے تو نتائج نے بتایا کہ نہیں بات غلط ہوگئی ایسے نہیں ایسے کر لینا چاہیے ۔اور یہ جو Trial & Error کا درمیانی عرصہ ہے اس میں کتنی ہڈیاں ٹوٹیں اور کتنے یہ خون کے دریا بہے۔قطب تارے کی طرف کندھا کرنے والا تو کبھی ظن میں نہیں راستہ متعین اپنا کرتا عزیزانِ من! اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والا کرتا ہے نا۔پھر ٹکراتا ہے کبھی دروازے سے ٹکراتا ہے کبھی کرسی سے ٹکراتا ہے۔ٹکراتا ہے تو پھر دوسری طرف یوں ہوتا ہے نا اسے کہتے ہیں ظن۔کہتا ہے اس کو چھوڑ دو گے کہ جو ہم بتا رہے ہیں تو پھر ظن وتخمین کے پیچھے چلو گے نا۔(**ان الظن لا یغنی من الحق شیئًا**) (10:36) کہا یہ کوئی الگ بات ہے کہ حق ہو ہی نہ کسی کے سامنے' صحیح راستہ ہو ہی نہ' یہ قطب تارا ہو ہی نہ سامنے تو پھر تو مجبوری اور معذوری ہے۔لیکن اگر یہ سب چیزیں موجود ہوں اور اس کے باوجود تم ظن اور قیاس ہی کے پیچھے چلو تو حق کی موجودگی میں تو ظن اور قیاس کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔(**ان اللہ علیم بما یفعلون**) (10:36) تمہیں اندھیرے میں نہیں پتہ ہوتا کیا کر رہے ہو۔ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں یہ جو ٹکریں مار رہے ہو تم' کیا کر رہے ہو تم۔عزیزانِ

من! یہاں تک وہ ان دلائل سے آیا۔ بات اس نے یہ کہی کہ تمہارے علم کی انتہا یہ ہے اور یہ ٹھیک ہے ہم مانتے ہیں یہ بڑی چیز ہے کیونکہ علم بڑی چیز ہے۔ لیکن اس کی انتہا یہ ہے کہ تم اس خارجی کائنات کے اندر تو ایک قوت کو مانتے ہو کہ جس نے تخلیق کی ابتداء بھی کی گردشیں بھی دے رہی ہے قوانین بھی اس قسم کے بنا دیے ہیں اٹل ہیں غیر متبدل ہیں راہنمائی تمہاری کر رہے ہیں ربوبیتِ عالمینی جاری ہے اس کے بعد۔ یہ سارا کچھ تم مان رہے ہو۔ کہتا ہے یہ خارجی کائنات میں الٰہ کو مانتے ہو لیکن اپنی ارضی زندگی کے اندر الٰہ کو تم نہیں مانتے ہو یہ ہے تمہاری بھول۔ اور یہ جو کہا ہے (**ذٰلکم اللہ**) (10:32) یہ **ذٰلکم اللہ** کے متعلق کیا کہا عزیزانِ من! سنیے اور وجد میں آ جایئے۔ کہا (**و ھو الذی فی السمآء الٰہ و فی الارض الٰہ**) اووہ جو قوت اتنی عظیم باہر کی کائنات کے اندر ہے وہی عظیم قوت تمہاری اپنی زندگی کے اندر بھی ہے۔ عزیزانِ من! خدا کو الٰہ السمآء اور الٰہ الارض کہنا۔ اللہ اکبر۔ (**و ھو الذی**) وہی ایک (**فی السمآء الٰہ و فی الارض الٰہ**) اب آپ کو سمجھ میں بات آئی کہ یہ دو باتیں کیا کہہ گیا ہے قرآن' سمآء کا الٰہ وہی ارض کا الٰہ۔ انسان کی تاریخ کی ساری بھول ہی یہ ہے سمآء کے الٰہ سے کبھی بھی اس نے انکار نہیں کیا نام الگ رکھ لیے ہوں یہ کہہ دیا ہو کہ صاحب ہم کچھ کہہ نہیں سکتے اس کے متعلق کہ وہ کیا ہے۔ لیکن اس سے کبھی انکار کسی نے نہیں کیا بڑے سے بڑا Ethiest بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خارج کی کائنات میں کچھ اٹل قوانین ہیں اور وہ قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اسی کو تو الٰہ کہتے ہیں۔ نہ نام رکھو۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن آگے جو انکار ہے وہ یہ کہ جو ارض ہے تمہاری اپنی زمینی زندگی اس میں الٰہ نہیں کوئی اور مانتے۔ اس میں یا تو اپنے آپ کو ہی الٰہ مان لیتے ہو ''جو میرا جی چاہے کراں گا'' خود الٰہ ہے نا۔ قرآن نے یہ کہا ہے (**افرءیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ**) کہا اس کو بھی تم نے دیکھا کہ جو اپنی خواہشوں کو اپنی آرزوؤں اپنے خیالات اپنے فیصلوں کو ہی اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ کہیں تو یہ خود ہی بن جاتا ہے نا کہیں پھر وہ یہ باہر کے الٰہ تجویز کرتا ہے۔ پھر ان میں سے جو قوت حاصل کر لیتا ہے وہ کہتا ہے (**انا ربکم الاعلٰی**)۔ کہیں یہ ان سے پھر یہ یہی اس کی Trial & Error کی عقل یہ کہتی ہے کہ یہ تو غلط ہے ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے اس کو یہ کیا حق حاصل پہنچتا ہے کہ یہ الٰہ الارض بن جائے' یہ غلط ہے۔ Trial & Erro کے ذریعے سے میں نے عرض کیا ہے نا کہ چلی آ رہی ہے کہ کیا کیا جائے۔ کرتی رہی کرتی رہی اب آخری دور میں اس نے کہا کہ نہیں صاحب یہ جمہوریت Democracy یہ ہے طریقہ۔ کیا اس میں جی دور کی کوڑی یہ لائے؟ کیا کیا اس نے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ صاحب ایک فرعون جو ہے وہ غلط ہے اور اگر یہ سو اکٹھے ہو جائیں تو ٹھیک ہے۔ او فٹے منہ تیرا۔ ''اواک دا عذاب نئیں سی سانبھیا جاندا''۔ یہ ہے جہاں یہ پہنچی ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں۔ اب ساری دنیا جشن منا رہی ہے کہ ہاں صاحب وہ پالیا نظام دنیا نے۔ دیکھنا کس طرح سے اس نے چھٹکارا کیا ہے وہ شخصی حکومتوں کا۔ شخصی حکومتوں کا چھٹکارا؟ ارے وہ ایک تھا ایک جگہ تم نے تو پورا بت کدہ جو ہے اس کو شخصی حکومتوں کا ادارہ بنا دیا۔ او ایک ہی مان نہیں تھا ایک بت او سو اکٹھا کر کے ایک جگہ حریمِ کعبہ میں رکھ دیا۔ کہا کہ ہم نے چھٹکارا پا لیا ہے۔ چھٹکارا پا لیا ہے؟ یہ نکالا ہے کعبے سے اس ایک بت کو یا اس کی جگہ تین سو ساٹھ اکٹھے کر دیے ہیں۔ یہاں تک پہنچی ہے۔ قصہ وہی ہے۔

(الٰہ السمآء) : تو جوں جوں ان کی علم وعقل بڑھتا ہے الٰہ السمآ کا ایک ہونا جو ہے یہ اور زیادہ تقویت حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ اس کی عہدِ جاہلیت کا زمانہ تھا جب یہ کہا تھا اُنہوں نے کہ صاحب بتیس کروڑ دیوتا ہیں بارش کا خدا اور ہے بادلوں کا اور ہے گرج کا اور ہے چمک کا اور ہے زمین میں دانہ ڈالنے والا اور ہے اگانے والا اور ہے دریاؤں کا اور ہے آگ کی دیویاں شروع ہوئیں وہ اور ہیں۔ یہ جو تھا نا اس کے متعلق یہ بڑی جہالت کا زمانہ تھا۔ خود انسان کی عقل تجربہ علم سمٹا کے اس کو توحید یا وحدتِ الٰہ کے اوپر لا رہا ہے لیکن صرف خارجی کائنات کے اندر۔ اب کوئی نہیں مان رہا ان میں سے کہ خارجی کائنات کے اندر ایک سے زیادہ قوتیں کارفرما ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بات قرآنِ کریم نے بہت پہلے کہی تھی۔ اور یہ جو چیز ہے کہ ہاں ایک ہی قوت ساری کائنات کے اندر کارفرما ہے۔ کیا انداز ہے کہا کہ یہ لوگ سما میں ایک الٰہ ماننے والے (ام اتخذوا الٰھة من الارض ھم ینشرون) تو کیا یہ ان کی کیفیت ہے کہ وہاں تو ایک الٰہ یہ مانتے ہیں کہ جو انسان کوئی نہیں نہ انسانوں کی جماعت ہے نہ ڈیموکریسی ہے۔ تو کیا ارض کے اندر پھر یہ کوئی اور الٰہ مان رہے ہیں ایک یا ایک سے زیادہ۔ دیکھا ایک یا ایک سے زیادہ' شخصی حکومت یا جمہوری حکومت۔ (ھم ینشرون) جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی کو آگے پھیلانا جو ہے یہ ان کا کام ہے جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ارض میں یہ اور مان رہے ہیں۔ کہا ان سے پوچھو ایک ماننے والوں کو کہ (لو کان فیھما الٰھةً الا اللہ) ان سے پوچھو کہ اگر ایک سے زیادہ قوتیں کارفرما ہو جائیں تو پھر جانتے ہو کیا ہو؟ میں نے عرض کیا ہے نا ایک ہی لفظ ہے (لفسدت) فساد ہو جائے۔ تو تمہارا کیا خیال ہے کہ جو چیز ایک دائرہ کائنات کے اندر اس طرح سے فساد Create کرے گی کائنات کا دوسرا دائرہ جو ہے جس کو آپ انسانی دنیا یا ارض کی زندگی اپنی کہتے ہو اس میں یہی نتیجہ پیدا نہیں ہوگا؟۔ ان دلائل کے بعد عزیزانِ من! وہ یہ کہتا ہے کہ بھائی ایک ہی الٰہ' قانون دینے والا ایک ہی۔ فرق یہ ہے کہ وہاں یہ قوانین از خود کارفرما ہیں کسی شے کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ قانون بنا لے یہ تو ہے ہی نہیں' قانون سے سرکشی برتے یہ بھی وہ نہیں کر سکتی تو مجبور واقع ہوئی ہے۔ انسانی دنیا میں انسان کو صاحبِ اختیار بنایا گیا اس لیے ان میں سے ہر ایک کے اندر وہ قوانین نہیں رکھ دیے گئے۔ اندر رکھ دیے جاتے تو باہر کی چیزوں کی طرح یہ بھی مجبور ہو جاتا۔ تو پھر یہ انسان کی تخلیق میں اور یہ کائنات کی چیزوں میں کچھ فرق نہ رہتا۔ کہتا ہے یہ بات نہیں' بڑا فرق ہے۔ اس کے صاحبِ اختیار ہونے کا یہ تقاضا تھا کہ قانون دینے والا جو طریقہ ہمارا تھا اس میں ہم فرق کر دیتے۔ فرق اب یہ کیا ہے کہ قانون ہم نے بنا بنایا اسی طرح جیسا کائنات کے اندر وہاں ہر شے کے اندر دیدیا جسے Instinct کہتے ہیں یہاں ہم نے خارج میں اس قانون کو ایک کتاب کی شکل میں انسانوں کی طرف بھیج دیا۔ تو علم وعقل سے کام لو اس قانون کے ضابطے کو تم دیکھ لو۔ یہ آگے بات اس قانون کے ضابطے کی آتی ہے عزیزانِ من!۔ دھاندلی سے تو وہ کوئی بات منواتا ہی نہیں وہ اسے ایمان ہی نہیں کہتا۔ دھاندلی نہیں جو انسان خود اپنا فکری طور پہ نہیں مانتا وہ اسے بھی ایمان نہیں کہتا۔ منواتا چلا آ رہا ہے فکری طور پہ۔

یہاں کہا یہ ہے کہ یہاں ایک فرق ہو گیا ہے اُن قوانین میں اور اِن قوانین میں ۔ یہ قوانین ہماری طرف سے دیے گئے

Objectively دیے گئے یہ ایک ضابطہ ہے اسے القرآن کہتے ہیں۔(و ما کان ھٰذا القراٰن ان یفترٰی من دون اللہ) (10:37)

آپ دیکھتے ہیں انہی آیات کے تسلسل میں کس طرح سے یہاں قرآن آیا ہے کتنا ربط ہے اس کے اندر۔ ملا کے نزدیک تو بڑی بے ربط کتاب ہے یہ' مجمل بھی ہے' مہمل بھی ہے۔(معاذ اللہ)۔ان دلائل کے بعد وہ کہتا ہے کہ بتاؤ تو سہی۔ کہنے لگا یہ بتاؤ کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہاری ارضی زندگی کے متعلق بھی اٹل غیر متبدل قوانین ہیں اور یہ وہ قوانین کا ضابطہ ہے۔ہمیں یہ بتاؤ کہ اگر یہ ہم کہیں کہ یہ ضابطۂ قوانین خدا کی طرف سے ہے یا اٹل قوانین ہیں تو یہاں کے متعلق تم کہو گے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں انسان بنا سکتا ہے۔ وہاں اٹل قوانین انسان کوئی نہیں بنا سکتا اس کو تو تم مانتے ہو۔اٹل قوانین دو چیزیں آگے کہی ہیں ان قوانین کی تفصیل میں' ابھی دیکھئے گا۔غیر متبدل قوانین۔(ما کان ھٰذا القراٰن ان یفترٰی من دون اللہ) (10:37) کوئی انسان نہیں بنا سکتا اس قسم کے قوانین۔کیا ہیں؟ (ولٰکن تصدیق الذی بین یدیہ) (10:37) کیا کرے گا یہ قانون؟ آج تک جو دعاوی ہوتے چلے آئے ہیں انسانی زندگی کے متعلق' کہا تمہاری ساری کوششیں یہ ہیں نا کہ اس قسم کا نظم ونسق کوئی ایسا قانون کوئی ایسا آئین بنالیں کہ زندگی انسانوں کی ٹکراؤ اس میں نہ ہو تزاحم نہ ہو خوں ریزیاں نہ ہوں فساد نہ ہو خوشگوار ہو کامیابیاں ہو کامرانیاں ہوں خوف نہ ہو حزن نہ ہو۔یہی چاہتے ہو نا۔(تصدیق الذی بین یدیہ) (10:37) جو چیزیں چاہتے ہو اور کہتے ہو کہ ایسا کچھ ہونا چاہیے۔عزیزانِ من! تصدیق کے معنی ہمارے ہاں جو کہتے ہیں کہ تصدیق کرتا ہے' ترجمہ ہمارے ہاں یہ کیا جاتا ہے کہ جو کتابیں تمہارے پاس پہلے سے موجود ہیں قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے۔قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ تحریف ہوئی ہوئی ہے ان کتابوں میں' وہ ہے ہی نہیں اصلی شکل میں۔ایک طرف وہ کہتا ہے تحریف کرتا ہے تم کہتے ہو یہ ان کی تصدیق کرتا ہے۔لفظ کے ذرا سے ترجمے نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ یہ تصدیق صدق جو ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی نظری دعوے کو سچ کر کے دکھانے والا۔کہتا ہے پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ باتیں نظری طور پہ تو تم پہ چلی آتی ہیں کہ زندگی ایسی ہونی چاہیے جس میں باہمی ٹکراؤ نہ ہو انسانوں کے اندر۔کہتے چلے آرہے ہو نا۔کہتا ہے اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمہاری ان چیزوں کو عملاً کر کے دکھادے گا۔(و تفصیل الکتٰب) (10:37) قانون وہ دیا ہے کہ جو بالکل الگ الگ اور ربطِ باہمی بھی اس کے اندر ہے۔اس ساری کائنات کے اندر جو باہمی ربط ہے وہ بہرحال اب سائنٹسٹ آپ کو بتا رہے ہیں ۔امریکہ کے ایک کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے چاند پر جو وہ سونے والا تھا ایک تو اسکے متعلق وہاں یہ کہہ رہے تھے کہ وہ فلاں سو گیا ہوا ہے۔وہ جو کام کر رہا تھا انجن پہ' اس نے وہاں سے یہ بات کہی کہ میں ذرا تھک گیا ہوں اسے جگادوں۔انہوں نے یہاں سے کہا کہ تم نے مڑ کے نہ جگانا اتنے میں پتہ نہیں یہاں فرق آجائے تمہارے اس انجن چلانے کے اوپر' ہم جگائے دیتے ہیں۔''آ ساڈے کولوں کا کا سویرے نئیں اٹھدا منجی توں' پیو جگا کے جاندا اے تے' بانگ اوندی اے تے فیر ستا ہوندا اے' اٹھ کے تریا جانڈیا ہوندا اے ستا ہوندا اے''۔وہ کہنے لگے ہم جگاتے ہیں۔آپ دیکھ رہے ہیں ربطِ باہمی' یہ ہے ربطِ باہمی۔ہماری سمجھ میں تو خیر آتا ہی نہیں یہ۔کہنے لگا کہ تمہیں یہ پہلے پتہ کیسے چلا کہ وہ سویا ہوا ہے

۔کہنے لگا اس میں کونسی بات ہے' جاگنے والے اور سونے والے کی دل کی دھڑکن جو ہے نا اس کی رفتار میں فرق ہو جاتا ہے۔ہمارے ہاں آلہ رکھا ہوا ہے جو اس کی دل کی دھڑکن ریکارڈ کرتا چلا جاتا ہے ہمیں پتہ چل جاتا ہے سو گیا ہے جاگ رہا ہے۔یا اللہ۔''آ ساری عمر اسی اوہنوں لئی پھرنے ہیگے آں'' کبھی نہیں ذہن میں آتا کہ یہ سوتے اور جاگتے میں اتنا فرق پڑتا ہے۔''ایہدا پتہ اوس دن لگدا اے جس دن فیل ہو جاندا اے'' یعنی اس سے پہلے تو ہمیں اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔میں کہہ یہ رہا ہوں کہ ربطِ باہمی کی کیفیت یہ ہے وہ جو کہہ گیا ہے اقبالؒ کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اور اس کے باوجود یوں دیکھئے تو قانون اپنے اپنے دائرے کے الگ۔وہ فزکس والا کیمسٹری والے کو کہتا ہے اپنی لیبارٹری الگ بناؤ صاحب۔ بائیالوجی کا ڈیپارٹمنٹ الگ بن رہا ہے۔ذوآلوجی کا الگ بنتا چلا جا رہا ہے۔فزکس کے اندر پھر Sub Divisions ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ (تفصیل الکتٰب) (10:37) نکھار کے الگ الگ قوانین کی کیفیت اور پھر ربطِ باہمی اس کے اندر یہ پیدا کیا۔(لا ریب فیہ) (10:37) قانون وہ کہ جس میں کوئی چیز Doubtful نہیں رہنے دی۔قانون کار فرما رہ ہی نہیں ہو سکتا اگر اس میں ذرا سا بھی کوئی شک کا ذرہ آ جائے صاحب۔اور بڑی چیز جو ہے وہ آگے۔کہتا ہے یہ جو انسانی زندگی میں قوانین تم بناتے ہو ان میں ٹکراؤ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ٹکراؤ اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ قانون بنانے والے گروپ جماعتیں افراد جو ہیں کہتا ہے کچھ بھی کر لو اپنی پارٹی کا اپنی قوم کا اپنے ملک کا مفاد جو ہے وہ ضرور زائد ہو جائے گا۔اور جونہی آپ ایک گروپ کے مفاد کا تحفظ کریں گے کسی دوسرے گروپ کے اوپر اثر پیدا ہو جائے گا۔ٹکراؤ یوں پیدا ہوتا ہے۔لہٰذا قانون کس کی طرف سے ہونا چاہیے۔(لا ریب فیہ من رب العٰلمین) (10:37) اس کی طرف سے یہ بننا چاہیے کہ جو ساری کائنات کا رب ہے تمام اقوامِ عالم کو ربوبیت دینے کا ذمہ دار ہے۔صرف وہ ایسے قوانین بنا سکتا ہے کہ جس میں پوری مخلوق کے مفاد کی رعایت رکھ دی گئی ہو کسی کا مفاد دوسرے سے ٹکرائے نہیں۔یہ قانون کوئی فرد کوئی جماعت کوئی گروہ بنا نہیں سکتا۔(من رب العٰلمین) (10:37) کہتا ہے یہ ہے یہ ضابطۂ قوانین۔میں نے کہا تھا نا یوں نہیں منوا تا عقل وفکر کی بنیادوں پہ منواتا ہے۔جیسے خارجی کائنات کے دلائل دیتا چلا آ رہا ہے وہ یہ جو چیز ہے جو بطور وحی کی رو سے جو پیش کر رہا ہے اس کے بھی اسی قسم کے دلائل دے رہا ہے آیتیں آگے جو آ رہی ہیں۔اسی قسم کے دلائل عزیزانِ من! جیسے سائنٹفک دلائل ہوتے ہیں۔پہلے تو یہ بتایا کہ خصوصیت اس ضابطۂ قانون کی یہ ہے کہ جو چیزیں آرزو بن کے تمہارے دل میں مچلتی رہتی ہیں اور حقیقتِ ثابتہ نہیں بنتی ہیں' تصدیق ان کو سچ کر دکھائے گا۔یہی تڑپ ہے نا انسان کے دل کی کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

ہے ہی یہی ساری۔وہ اس کا فردوسِ گم گشتہ اس کو دوبارہ پا لینے کی ساری تلاش ہے انسانیت کی تاریخ' ٹکریں مارتا پھرتا ہے۔(تصدیق الذی بین یدیہ) (10:37) جو حسین خواب دیکھتے چلے آ رہے ہو جو آرزوئیں تمہارے سینے میں مچل رہی ہیں جو کہتے ہو کہ ایسا کچھ کرنے کے لیے

ہم یہ کرتے ہیں' یہ ویسا کچھ کر کے دکھادے گی۔(**تفصیل الکتٰب**) (10:37) نکھرے ہوئے الگ الگ ڈیپارٹمنٹس کے قوانین اور ربطِ باہمی رکھے ہوئے ہے۔(**لا ریب فیہ**) (10:37) کسی میں ذرا بھر Doubt کی گنجائش نہیں ہے۔(**من رب العٰلمین**) (10:37) پوری کائنات اور تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا دینے والا۔اس کی طرف سے ہے۔(**ام یقولون افترٰہ**) (10:38) کہتے ہو کہ پھر یہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہے افترا کیا ہوا ہے۔اعتراض اس کے اوپر پڑا۔اور عزیزانِ من! اگلی آیات کے اندر علم و برہان و دلیل و بصیرت کی بناء پہ اسی قسم کے دلائل کہ یہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہوسکتا۔وقت ہوگیا اس حصے کو ہم آگے لیں گے۔سورۃ یونس کی آیت 37 تک ہم پہنچ گئے۔38 ویں آیت کا پہلا لفظ میں نے کہا ہے(**ام یقولون افترٰہ**) (10:38) کیا اس کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کا یہ ضابطۂ قوانین انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔اچھا! یہ کہتے ہو' آؤ۔اور دیکھیں گے آگے کیا کہتا ہے قرآن۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔آٹھواں باب(آیات 38 تا45)

عزیزانِ من!

آج ستمبر 1973ء کی 23 تاریخ ہےاوردرسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 38ویں آیت سے ہورہا ہے۔ (10:38)

آپ کو یاد ہوگا پچھلی ملحقہ آیات میں کہا یہ گیا تھا کہ تم دیکھو کہ یہ خارجی کائنات کا سلسلہ کس نظم وضبط کے ساتھ ٹھیکم ٹھیک جارہا ہے۔ اوراسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں قانون کی کارفرمائی ہے ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے تابع زندگی بسر کررہی ہے۔اوراس قانون کے متعلق یہ کہا تھا کہ یہ ان چیزوں کا اپنا بنایا ہوانہیں ہے اپنے لیے یہ قوانین بنا ہی نہیں سکتی تھیں۔جس خالق نے ان اشیاء اور کائنات کی تخلیق کی اسی نے ان کے لیے یہ قوانین بھی تجویز کیے۔اور یہ وجہ ہے یہ سلسلہ اس حسن وخوبی کے ساتھ چلا جارہا ہے۔اور دوسری چیز یہ کہی تھی کہ وہ ایک ہی ہونا چاہیے خالق اور قوانین کا وضع کرنے والا اور ایک ہی ہے جس کی وجہ سے یہاں فساد برپا نہیں ہوتا۔ ورنہ ایک سے زیادہ اتھارٹیز وہ اپنے قوانین ہی کیوں نہ نافذ کریں ان میں ٹکراؤ ہوجاتا ہے تزاحم ہوجاتا ہے اوراس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ بہرحال زوراس چیز پہ دیا گیا تھا کہ یہ قوانین ان چیزوں کے خود وضع کردہ نہیں ہیں۔اوراس پورے پسِ منظر کے بعد یہ کہا گیا تھا کہ تمہاری انسانوں کی زندگی بھی تو اسی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ اس حصہ میں یہ Exception اوراستثنا کیوں کہ ان کی زندگی کسی قانون کے تابع ہی نہ چلے۔اوراگر قوانین کے تابع چلنی ہو تو وہ قوانین خود ان انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے ہوں۔کہا اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔تو جس خالقِ کائنات نے باقی اشیائے کائنات کے لیے قوانین تجویز اور وضع فرمائے تھے انسانوں کے اسی خالق کے ذمہ تھا کہ ان کی زندگی کے لیے بھی وہ قوانین تجویز اور تعین کرے۔چنانچہ وہ قوانین اس نے دیے ہیں اور وہ اب اس قرآن کے اندر محفوظ کردیے گئے ہیں۔تو قرآن ان قوانین کا مجموعہ ہے جنہیں خالقِ کائنات نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے وضع کیے تجویز کیے اور قرآن کے اندر دیدیے۔تواب وہ دلیل سامنے لائیے کہ یہ قوانین ان چیزوں کے بنائے ہوئے نہیں تھے ۔اسی بناء پہ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ قوانین بھی انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔اوراس کے بعد یہ چیز ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ نہیں یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں تو یہاں وہ قرآن کا چیلنج آتا ہے جو متعدد مقامات پر وہ دہراتا ہے۔پھر سوچ لیجیے کہ اس چیلنج کا پسِ منظر یہی ہے کہ کوئی شے کوئی چیز اپنے لیے قوانین وضع نہیں کرسکتی قوانین اس سے بالاتر ہستی کے وضع کردہ ہونے چاہئیں۔اور یہ قوانین خدا کے وضع کردہ ہیں انسانوں کے نہیں ہیں۔اوراس میں وہ چیلنج آتا ہے کہ (ام یقولون افترٰہ) (10:38)

اے رسول یہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ تیرے اپنے وضع کردہ ہیں اور تو نے یونہی ایک افتراء کیا ہے(معاذ اللہ) جھوٹ بولا ہے کہ انہیں خدا کی طرف منسوب کردیا ہے کہ یہ میرے بنائے ہوئے نہیں ہیں خدا کے عطا کیے ہوئے ہیں۔ یہ یہ بات کہتے ہیں تو گویا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک

انسان کے بنائے ہوئے ہیں انسانی فکران قوانین کی تخلیق کرسکتی ہے یہ ہے ان کا دعویٰ ہے۔ان سے کہو کہ اگر یہ دعویٰ ہے تو اس کا ثبوت تو بڑا آسانی سے بہم پہنچ سکتا ہے۔(**قل فاتوا بسورةٍ مثلهٖ وادعوا من استطعتم من دون الله ان كنتم صٰدقين**) (10:38)اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ قوانین انسانی فکر کی تخلیق ہیں انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں تو بات بڑی صاف سی ہے۔ پورا ضابطۂ قوانین تو ایک طرف رہا اس کا کوئی ایک باب اس کی مثل تم بنا کے دکھاؤ۔اور یہ چیلنج صرف تمہیں ہی نہیں ہے کہ جو اس وقت بات سن رہے ہو یا مخاطب ہو۔ جنہیں جی چاہتا ہے اپنے ساتھ ملالو جتنے انسان جی چاہتا ہے مل بیٹھو۔ایک انسان کی فکر اگر یہ نہیں کرسکتی تو جتنے انسان جی چاہے اکٹھے کرلو اور کہو کہ اتنے انسانوں کی فکر مل کر بنادے پورے قوانین نہیں بلکہ ان کا کوئی ایک باب ایک چیپٹر ایک شق۔سیدھی سی بات ہے(**ان كنتم صٰدقين**) اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو بڑا آسان ہے طریقہ اس کے ثابت کرنے کا۔ یہ چیز قرآن کے مختلف مقامات میں آتی ہے اور یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے قرآن نے بار بار یہ کہا ہے کہ عربی مبین کے اندر ہے اور ان لوگوں سے کہا ہے کہ تمہاری ہی زبان کے اندر ہے یہ تو قرآن۔تو اب یہ جو کہا ہے نا کہ اس کی مثل بنا کے بتاؤ قوانین' تو یہ بحث ایک بڑی پرانی چلی آرہی ہے کہ یہ جو قرآن کا دعویٰ ہے کہ نہیں تم بنا سکتے تو کیا یہ جو اسلوبِ بیان ہے اس کا' جس انداز میں یہ بیان کیا گیا ہے کیا یہ بیان ایسا ہے کہ اس کی مثال انسان دوسرا بنا نہیں سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک قرآن کے اندازِ بیان کا تعلق ہے وہ بھی ایسا ہے کہ بہت بلند ہے لیکن سوال اسلوبِ بیان کا نہیں ہے۔ میں پھر عرض کردوں کہ جہاں تک اسلوبِ بیان کا تعلق ہے عربوں کے سامنے یہ چیلنج پیش کیا گیا تھا اور عربوں کی خصوصیتِ کبریٰ ان کی زبان تھی ان کو بڑا ہی دعویٰ تھا اپنی زبان پر۔ وہ باقی ساری دنیا کو عجم یعنی گونگے کہتے تھے۔اور عرب کے معنی ہی فصیح البیان کے ہیں۔اپنا نام ہی عرب انہوں نے رکھا ہوا تھا کہ دنیا میں فصاحت تو ہمارے پاس ہے باقی ساری دنیا گونگی پھر رہی ہے۔تو گویا خود انہیں اپنی اس زبان پہ اتنا ناز تھا۔اور پھر اس زبان دانی کے ان کے ہاں معرکے ہوا کرتے تھے۔حج کی تقریب میں خصوصیت سے اس قسم کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں ان کے ہاں کے شعرا اور شعر میں ہی اپنی زبان کا مظاہرہ کرتے تھے۔نثر ان کے ہاں کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔آپ حیران ہونگے کہ قرآنِ کریم پہلی نثر کی کتاب ہے عربی زبان میں۔شعر میں ہی وہ بات کیا کرتے تھے اور اس کے مقابلے ہوا کرتے تھے اور پھر ان میں سے جو اس قابل ہوا کرتا تھا اسے ایوارڈ مل جائے انہیں کعبہ کی دیواروں پہ چسپاں کردیا جاتا تھا کہ وہ ایک سال بھر کے لیے ممتاز ترین کلام سمجھا جاتا تھا۔تو گویا اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی وہ قوم بہت اونچی تھی' اپنے آپ کو دنیا کی ممتاز ترین قوموں میں سمجھتی تھی بلکہ سرِ فہرست اپنا نام رکھتی تھی۔ جہاں تک صرف اندازِ بیان کا تعلق ہے یہ واقعہ ہے جو تاریخ بیان کرتی ہے کہ ان لوگوں نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ اس کا انداز بھی اپنا خاص نرالا ہے۔اور وہ اس چودہ سو سال میں عرب ہی نہیں غیرِ عرب بھی عربی زبان کے بڑے بڑے فاضل ہو گذرے ہیں اور یورپ میں تو بہت ہی بڑے بڑے فاضل ہوئے ہیں عربی زبان کے۔ان سب کا یہ اعتراف ہے کہ اس کا انداز بھی بہت مختلف ہے یہ نہ تو نظم ہے شعر ہے نہ یہ عام نثر ہے کچھ اور ہے۔اور یہ کچھ اور ہے

والی بات مجھے یاد آ گیا نیٹشے مشہور جرمن فلاسفر تھا۔ جس زمانے میں وہ اپنی آخری کتاب لکھ رہا تھا اس پہ عجیب وجدانی کہتی تھی اسے مجذوب فرنگی کہا ہے اقبالؒ نے وہ مجذوب قسم کا تھا وہ فلاسفر اور بہت بڑا فلاسفر تھا۔ تو اس نے یہ چیز کہی تھی کہ مجھ پہ ایسے اوقات آ جاتے ہیں اور خاص طور پر اس کتاب کے لکھتے وقت تو وجدانی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جسے میں الہامی کیفیت کہہ سکتا ہوں اور اس وقت یہ زبان حامل نہیں ہو سکتی میرے خیالات کے' اس کے لیے کوئی الگ زبان ہونی چاہیے۔ اور اس نے یہ کہا ہے اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں نے زرا تشرا جو لکھی ہے الہامی زبان میں لکھی ہے اور اس لیے آپ دیکھو گے اس کا اسلوب بھی تمہاری زبان سے مختلف ہے۔ وہ ہے ہی بڑے پایے کی کتاب۔ یعنی میں نے کہا ہے جہاں تک اسلوبِ بیان کا تعلق ہے یہ بھی عربوں کے ہاں مانا ہوا تھا کہ قرآن کا اپنا انداز ہے۔ لیکن یہ جو چیلنج ہے قرآنِ کریم کا' چیلنج تو ان قوانین کے متعلق ہے کہ انسانی فکر ان قوانین کو وضع نہیں کر سکتی خدا کی طرف سے دیے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح تیرہ سو سال میں آپ سوچئے تو سہی پہلے تو ان عربوں کو دیکھئے کہ سات سال تک مسلسل لڑائیاں لڑتے رہے مسلمانوں کے ساتھ۔ ہر ممکن کوشش کر دیکھی رسول اللہ ﷺ کی تکذیب میں آپ ﷺ کو جھوٹا ثابت کرنے میں۔ اگر یہ ممکن ہوتا کسی طرح تو کتنا آسان تھا خوامخواہ میدانِ جنگ میں جانے اور مشکلات کا سامنا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ عربوں کی زبان تھی اتنے اتنے بڑے فاضل شاعران کے ہاں موجود تھے ان کے لیے مشکل کیا تھا وہ تو ایک سورۃ کہہ رہا ہے دس آیتیں کہتا ہے دوسرے مقام پر' کم از کم اس زبان میں یہ چیز بیان کر دینا مشکل کیا تھا۔ لیکن نظر آتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ باقی انہوں نے مخالفت میں کیا لیکن یہ چیلنج جو تھا اسے قبول نہیں کیا۔ تو ایک تو وہی قومِ مخاطب آپ دیکھ لیجیے کہ اس نے ہی سپر ڈال دی کہ یہ چیلنج قبول نہیں کیا۔ اور اس کے بعد اس چودہ سو سال میں آپ سوچئے تو سہی دنیا کی بڑی بڑی قومیں ان کے ہاں صورت یہ تھی غیرِ عرب کو بھی آپ دیکھ لیجیے خود عربوں میں بھی غیر مسلم عرب جو تھے انہیں دیکھ لیجیے۔ بڑے بڑے فاضل گذرے ہیں غیر مسلم یہ عرب' عربی لغت کی کتابیں ان کے ہاں کی ہیں' عربی دائرۃ المعارف غیر مسلم عربوں کا لکھا ہوا ہے۔ اور جرمنی میں یہ تو یہ لوگ بڑے ہی فاضل تھے۔ اس چودہ سو سال میں ان کی کیفیت یہ کہ دو دو تین تین سو سال تک Cursade کی جنگیں تو یہ لڑتے رہے مسلمانوں کے ساتھ' ہر قسم کے حربے استعمال کیے اسلام کے خلاف۔ اگر یہ بات ایسی ہی آسان ہوتی تو یہ تو یونہی ایک گھنٹے آدھے گھنٹے کے اندر شکست دے سکتے تھے۔ تو یہ بات یونہی کوئی معمولی سی نہیں ہے کہ شاعری کی گئی ہے صاحب۔ ساری دنیا کے سامنے یہ چیلنج تھا آج بھی یہ چیلنج ہے دنیا کے سامنے۔ آج بھی ایک دنیا اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ اسلام کو کسی طرح سے شکست دی جائے۔ وہ مسلمانوں کو تو شکست دیتے چلے جاتے ہیں۔ اسلام کو شکست دینے کے اتنا ہی چیلنج کافی تھا ان کے لیے' ایک سورۃ دس آیتیں۔ یہ بات عزیزانِ من! یونہی سن کر گذر جانے کی نہیں ہے بڑی اہم چیز ہے۔ کتنی کوششیں انہوں نے نہیں کی ہونگی لیکن کوئی ایک کوشش بھی یہ سامنے نہیں لائے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے یہ غیر مسلم بڑے بڑے فاضل گذرے ہیں بڑا ہی عبور ان کو حاصل تھا۔ لیکن اس پورے چودہ سو سال کے اندر ان میں سے کسی ایک نے یا کسی سوسائٹی نے یا کسی گروپ نے یہ جرآت نہیں کی

ہے کہ قرآن کے مقابل میں وہ دس آیتیں کہتا ہے کہ یہ لے آئے کہ یہ دیکھئے صاحب۔ ہے نا کچھ بات۔ بات جو وہ یہ کہہ رہا ہے قرآن وہ یہ ہے کہ یہ ہے قوانین انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہیں انسانی فکر اس قسم کا ضابطۂ قوانین مرتب کر نہیں سکتی۔ کیونکہ اوپر اس نے کہا تھا (لا ریب فیہ من رب العٰلمین) (10:37) پہلی صفت اس کے اندر اس قسم کا ضابطۂ قوانین دینے والے کی یہ ہے کہ وہ ربوبیتِ عالمینی کا ذمہ دار ہونا چاہیے پوری نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار۔ قانون وہ ہونا چاہیے کہ ساری نوعِ انسانی کی ربوبیت اس کے اندر آ جائے۔ ایسی نشوونما کہ اس کی طبعی زندگی کے لیے بھی تمام سامان فراہم ہوں اور انسانی صلاحیتیں اور اس کی ذات کی نشوونما کے لیے بھی اس کے اندر یہ قوانین موجود ہوں۔ یہ ضابطۂ قوانین تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے اور اس میں اور خارجی قوانین کے اندر ایک ربط بھی موجود ہو۔ اس نے کہا کہ یہ قوانین انسانی فکر نہیں بنا سکتی۔ اور یہ چیلنج جیسا میں نے کہا ہے یہ اس زمانے کی قومِ مخاطب کے لیے بھی تھا اور قیامت تک کے انسانوں کے لیے یہ چیلنج ہے نا۔ آج تک کسی میں جرآت اس کی نہیں ہوئی ہے کہ اس کو قبول کر لیں۔ یہ جتنے بڑے بڑے کم از کم یورپین مستشرق عربی دان' ان کی اچھی اچھی؟؟ کی کتابیں میں نے دیکھی ہیں کہ کہیں کسی جگہ بھی اس کے متعلق انہوں نے یہ کہا ہو۔ اتنا ہی کہا ہو کہ ہم اس اسلوب کے مطابق ہی کچھ پیش کرتے ہیں کہ یہ دیکھئے یہ انداز کیا ہے۔ یہ بھی نہیں کسی نے کیا۔ اس کے مطابق پیش کرنا تو ایک طرف رہا یہ Gibb تو یہ لکھتا ہے۔ کراچی میں ملا مجھ سے آ کے وہ شخص' واقعی عربی زبان کا بڑا فاضل ہے' اسلام پہ اس نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب Mohammadanism میں یہ لکھا ہے' اس نے کہا ہے یہ یورپ کے جو اس کے ہاں Translate کرنے والے ہیں قرآن کے ؟؟ وغیرہ وہ بھی بڑے بڑے فاضل عربی دان ہیں۔ وہ ترجمہ کرنے والوں سے یہ کہتا ہے وہ کہتا ہے انہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے اس کتاب کا ترجمہ کر سکتے ہو؟ اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہے یہ تو معلوم نہیں کہ کیا چیز ہے۔ تمہارے ہاں کا بڑے سے بڑا ترجمہ جو ہے اس کی مثالیں اس نے دیں اور اس کے بعد قرآنِ کریم کی مثال میں ایک آیت وہ پیش کرتا ہے پانچ لفظ ہیں اس کے اندر۔ وہ کہتا ہے آؤ تم ؟؟ کا ترجمہ اور ان کا یہ ترجمہ دیا ہوا' کہنے لگا جان نکال کے رکھ دی تم نے اس پھول کی پتیوں کی' مسل کے رکھ دیا انہیں۔ یا تو تمہیں عربی آتی نہیں سمجھتے ہی نہیں ہو کہ یہ الفاظ کیا ہیں۔ اگر یہ ایسا ہے تو دھوکہ دیتے ہو اپنے آپ کو۔ یہ ترجمہ ہے تمہارا؟۔ انہیں چیلنج کر رہا ہے۔ اور اس کے بعد وہ کہہ رہا ہے کہ سارا قرآن ایک طرف رہا یہ اتنی سی آیت جس میں پانچ لفظ ہیں سارے وہ کہتا ہے آؤ دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے بتاؤ۔ اور پوچھونگا میں ان سے کہ جو عربی اتنی جانتے ہوں جنہیں پتہ ہو کہ یہ الفاظ کیا ہیں۔ اور وہ الفاظ وہ ہیں قرآنِ کریم اتنی سہل آسان عربی زبان میں ہے کہ ابتدائی گریمر کی کتاب پڑھانے کے بعد آپ براہِ راست اسے شروع کرا سکتے ہیں۔ عجیب چیز ہے۔ اما تو چیزے دیگری۔ میں نے جہاں کوشش کی' ابتدائی گریمر کی کتاب پڑھانے کے بعد اس کتاب کو وہاں سے شروع کر دیجیے۔ الفاظ کی تو یہ صورت ہے کہ لغت سے اس کا مفہوم آپ کو دیکھنا پڑے گا۔ جہاں تک اس قرآن کی Construction کا تعلق ہے زبان کا تعلق ہے اتنی آسان کتاب

ہے یہ۔صاحب آپ میں سے جو عربی جاننے والے ہیں آپ کو معلوم ہوگا عربی زبان کی مشکل کتابیں کیا ہوتی ہیں کم بخت ۔ یہ مقاماتِ حریری کبھی دیکھے ہوں تو اس کے دو فقرے کبھی دیکھئے کہ ہوتا کیا ہے وہ ۔ بلائیں ہیں وہ کم بخت' ہمالیہ پہاڑ جتنے مشکل ۔عربی زبان: جس کے مرادفات کی کیفیت یہ ہے کہ ایک اونٹ کے لیے ہزار لفظ' ایک تلوار کے لیے آٹھ سو لفظ' شراب کے لیے چھ سو لفظ۔اندازہ لگائیے تو اس زبان کا۔شاید آپ کو یاد ہو پھر دہراؤں زبان کی بات آ گئی تو واصل بن عطا کی صورت ۔ وہ معتزلہ کا امام' عربوں کے ساتھ تو مقابلہ ہی زبان کا ہوتا تھا ۔ایک ایک خطیب اٹھتا تھا گھنٹوں تقریریں کرتا تھا۔اور اس کے ساتھ تو پھر ان تمام عشریوں نے اتنے مناظرے کیے اتنے مناظرے کیے اور عرب ہوتے تھے سامعین بھی' زبان کے اعتبار سے ۔معاف رکھئے گا کوٹیشن میں کہونگا لکھنویت سے بھی زیادہ ناز انداز ان کا تھا وہ زبان کے اعتبار سے ۔ذرا سا سقم زبان کے اندر ہوا اٹھ کے چلے جاتے تھے ۔تو اس کے مباحثے اس کے مناظروں کے اندر تو یہ بڑی بڑی دنیا ایک آتی تھی معرکے کی کیفیت تھی ۔اس کی زبان میں ذرا سی لکنت تھی اور لکنت وہ تھی کہ وہ ' ر' کا حرف جو تھا صاف ادا نہیں کیا کرتا تھا۔تو میں بتایا کرتا ہوں جیسے ہمارے ہاں کے لاہوری بھائی لاہور کو لاہوڑ ہی کہیں گے اور چڑیا کو چریا ہی کہیں گے یعنی ر اور ڑ دونوں ہیں موجود لیکن معلوم نہیں کیوں ۔ ایک بات ہوتی ہے بعض اوقات لیکن اس میں تو لکنت تھی اس کی زبان میں' ر کا لفظ ذرا سا وہ اٹک کے کہتا تھا۔ان کے ہاں جہاں روانیاں سیلاب کی سی ہوں زبان کے اندر' ایک خطیب کے لیے یہ کیفیت کہ ایک حرف کے اوپر آ کے ذرا سا بھی اس میں رک جانا''تھوڑی جئی کرک آ جانا نال جنوں کیندے ہیگے نیں'' اُسے معلوم تھا کہ اس کا اثر کیا ہوگا۔ساری عمر وہ اس خطابت میں مباحثے کرتا رہا گھنٹوں اٹھ کے کھڑا ہو کے وہ تقریری کرتا رہا ساری عمر کسی تقریر میں اس نے وہ لفظ نہیں آنے دیا جس میں رآتا ہو۔میرے اللہ۔آپ جانتے ہیں کہ یہ زبان کیا ہے۔ یہ تو بلا ہے میں سمجھتا ہوں ۔حضرتِ ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کے حصے میں حضرتِ اسحٰقؑ کی اولاد کے حصے میں اگر وہ مملکتِ عظیم آئی وہ سب کچھ آئی ۔تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ حضرتِ اسماعیلؑ کو جو یہاں بسایا اس تمام صدیوں کے اندر یہ قوم صرف زبان کو مانجھتی رہی کیونکہ اس زبان نے قرآن جیسی کتاب کا حامل بننا تھا۔ یہ ہے یہ زبان ۔ یہ تھے اس زبان کے یہ جاننے والے ۔یعنی ابوالاعلیٰ محری جو ہے رسالۃ غفران اس میں یہ لکھا وہ اندھا شاعر عربوں کے ہاں کا اتنا بڑا ادیب۔اس کے متعلق دوسرا اندھا ہمارے ہاں کا طٰہٰ حسین عجیب شخص تھے صاحب یہ لوگ تو عرب تو' طٰہٰ بھی اندھا' بہت بڑا ادیب بہت بڑا فاضل ۔اس نے یہ کہا ہے کہ اگر یہ قرآن کا انداز اپنا نہ ہوتا تو عربی کا جہاں تک تعلق ہے میں محری کے رسالۃ غفران کو بہت اونچا لے جاتا اس سے ۔لیکن وہ کہا کہ یہ اس کا انداز اپنا ہے کوئی ۔ورنہ عربی زبان میں اس نے کہا ہے کہ وہ مثل ہے رسالۃ غفران ۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس اس قسم کے بھی فاضل ادیب زبان کے ہمارے ہاں گذرے ہیں اور غیر مسلموں نے تو میں نے عرض کیا ہے آپ کے ہاں عربی زبان کے لغت ان کے لکھے ہوئے ہیں ۔پطرس؟؟ کا دارالُلغت محیط المحیط دائرۃ المعارف باپ بیٹے نے ان کے مل کے لکھا ہے' بیوت کے عیسائی ہیں ۔؟؟ کی لکھی ہوئی کتابیں آپ دیکھئے عیسائی ہے ۔ یہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جو آپ کے ہاں کا ہے یہ سارا ان کا

عیسائیوں کا مرتب کیا ہوا ہے' کوئی کوئی آرٹیکل کسی مسلمان کا لیا ہے اس نے۔ آج کی بات ہے یہ۔ میں نے کہا یہ کہ یہ نہیں کہ یہ زبان ایسی تھی کوئی African Language کہ کسی نے سیکھی نہیں کسی کو Desifer نہیں کرنی آئی۔ اتنے اتنے بڑے ادیب اتنے اتنے بڑی فاضل ان کے ہاں عربی زبان کے موجود ہیں۔ قرآن کا یہ چیلنج کوئی نہیں قبول کیا آج تک کسی نے نہ کر سکا ہے نہ کر رہا ہے کہ اس اسلوب کی دس آیتیں لے آئے۔ ہماری آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ مجھے یاد ہے کہ ان چیزوں کے اوپر اعتراض کیا تھا ہمارے ہاں مسلمان نوجوانوں نے ہی کیا۔ اور کیا ہی انہوں نے جب میں نے ان سے پوچھا کہ کیوں بھئی وہ زیادہ بڑی عربی منتہا تو چھوڑ دیجیے کچھ عربی شد بد بھی ہے۔ عربی کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے اور کہہ یہ رہے تھے کہ صاحب یہ کونسی بات ہے ایسا کہہ دینا کہ اس کے مقابل ایک سورۃ یا دس آیتیں نہیں بنا سکتے' بنا کیوں نہیں سکتے۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ نے کہدیا۔ یہ تو کہتے ہیں ہمارے ہاں والے لیکن وہ جو عربی زبان کے اتنے بڑے بڑے فاضل گذرے ہیں ان میں سے نہ کسی نے کہا ہے آج تک نہ Attempt کی ہے نہ جرآت کی ہے نہ آج کوئی کہتا ہے۔ تین سو سال تک Cursade کی لڑائیاں تو لڑتا رہا سارا یورپ اور سارے فاضل عربی زبان کے موجود تھے کسی نے یہ نہیں کیا کہ صاحب جنگ لڑنے کی ضرورت کیا ہے دس آیتیں بنا کے ان کے سامنے لے آؤ خود بخود قرآن کا دعویٰ باطل ثابت ہو جائے گا مسلمان کو شکست ہو جائے گی۔ کسی نے نہیں کیا۔ سارا یورپ تین سو سال تک لڑائیاں لڑتا رہا۔ میں قرآن کے اس دعوے کا کہہ رہا ہوں۔ آگے چل کے ذرا دو ہی آیتوں کے بعد وہ بتا رہا ہے کہ تمہاری کیا حالت ہے۔ (**وادعوا من استطعتم من دون الله**) (10:38) بس صرف خدا کو درمیان سے چھوڑ دو باقی جن کو جی چاہے بلا لو انسانی فکر یہ نہیں دے سکتی۔ رسول کے متعلق جب کہدیا کہ (**ما ینطق عن الھویٰ**) اس میں اس کی اپنی فکر کا ذرا دخل نہیں ہے۔ جب اس کی فکر کا بھی ذرا دخل نہیں ہے کہ جسے مہبت بنایا گیا جس کے سینے کو اس قرآن کا' جس نے ہمیں قرآن دیا۔ ہم نے الفاظِ رسول اللہ ﷺ میں ہی سنا۔ الفاظ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ﷺ کے تھے۔ یعنی خدا کا کلام بزبانِ محمد ﷺ ہم تک پہنچا ہے نا۔ اس کے متعلق یہ چیز ہے کہ اس کی اپنی فکر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے تو اور کسی کا کیا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس دور کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق عرب خود افصح العرب والعجم خود حضور ﷺ سے کہا کرتے تھے: عرب و عجم میں فصیح تریں انسان۔ یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ کہا کہ اس قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ دیکھئے ربط آیات کے اندر کیا ہے۔ اس قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ کہا اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا کتاب ہے!! تکذیب کرنے کے بعد یہ نہیں (معاذ اللہ) ان کو ایک گالی دی اور آگے بڑھ گئے۔ کہا اس کی وجہ یہ ہے۔ اور عزیزانِ من! یہ سوچ لیجیے یہ جو بتایا گیا ہے نا یہاں' قرآنِ کریم کے سمجھنے کے یہ تین طریقے ہیں جو یہاں بتائے ہیں قرآن نے۔ انہی سے قرآن سمجھ میں آ سکتا ہے اس نے خود بتایا ہے کہ جو یہ طریقے نہیں برتتا وہ اس کی تکذیب کرے گا۔ تو اب ظاہر ہے کہ اس کی تصدیق وہ کرے گا جو ان طریقوں کو برت کے قرآن کو سمجھے گا۔ ٹھیک ہوئی نا بات یہ۔ وہ بتایا گیا ہے کہ تکذیب یہ کون کرتے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ (**بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہٖ**) (10:39)

قرآن کے سمجھنے کا پہلا طریق یہ ہے پہلی شرط یہ ہے کہ انسانی علم جس سطح پہ پہنچ گیا ہے جس زمانے میں قرآن سمجھنے والا ہے۔ انسانی علم تو بہرحال بلند سے بلند ہوتا چلا جاتا ہے وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ تو ایک دور کا انسان اپنے دور کے انسانی علم کی سطح جو ہے وہیں تک پہنچ سکتا ہے نا۔ کہتا ہے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اتنا علم آنا چاہیے پہلی بات تو یہ ہے۔ کہتا ہے تکذیب یہ کر رہے ہیں کہ ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر رہا۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ جہاں تک انسانی علم کسی زمانے میں پہنچا ہے وہ انسانی علم اس کے سامنے ہونا چاہیے جو قرآن کی طرف آئے گا۔ یہ یاد رکھئے قرآن کے اندر ایک تو ہے ہدایت یعنی عام رہنمائی زندگی بسر کرنے کی' وہ بڑی آسان ہے وہ آسانی سے سمجھ میں بھی آ سکتی ہے آسانی سے لی بھی جا سکتی ہے۔ اور دوسری چیز ہے قرآن کے اندر حقائق۔ یہ حقائق جو قرآن نے بیان کیے ہیں اصل میں اس کا مقصود تو ہدایت ہی ہے انسانی راہنمائی کرنا ہی مقصود ہے اس کا۔ لیکن جو کچھ اس نے ہدایت کے لیے دیا ہے اس کے لیے وہ دلائل دیتا ہے ثبوت پیش کرتا ہے شہادات پیش کرتا ہے۔ یہ جو چیزیں ہیں انہیں حقائق کہا جاتا ہے۔ یہ جو حقائق ہیں یہ اسی طریق سے سمجھ میں آتے ہیں کہ علمِ انسانی جتنا بلند ہوتا چلا جائے گا ان حقائق کے اوپر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے اور یہ حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر دور میں انسانی سطح اونچی جتنی ہوئی ہے جس نے بھی قرآنِ کریم پر اس انداز سے غور کیا ہے اپنے زمانے کی علمی سطح تک پہنچ کے قرآن کے حقائق پر' اس نے دیکھا ہے کہ جتنا بھی علم بڑھتا چلا جاتا ہے اس پہ پڑے ہوئے پردے اور اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چیز خود قرآن نے بتائی تھی کہ یہ قرآن حقیقتِ ثابتہ کس طرح سے بن کے تمہارے سامنے آئے گا۔ کہا کہ (**سنریھم اٰیٰتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انه الحق**) (41:53) کہا یہ عالم انفس و آفاق یہ باہر کی خارجی دنیا انسان کی اپنی داخلی دنیا یہ Objective اور Subjective کائناتیں ان میں ہم اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ جوں جوں ان کے اندر چھپی ہوئی نشانیاں انسانوں کے سامنے آتی چلی جائیں گی اسی انداز سے قرآن کی حقیقت سمجھ میں آتی چلی جائے گی۔ اور جب کوئی Truth بالکل بے نقاب ہو کے سامنے آئے گا تو وہ دیکھے گا کہ وہ وہی تھا جو قرآن نے کہا تھا۔ (**حتیٰ یتبین لھم انه الحق**) (41:53) یہ پردے اٹھتے چلے جائیں انفس اور آفاق کی دنیا کے حقائق کے اوپر پڑے ہوئے پردے یہ اٹھتے چلے جائیں گے۔ اٹھتے چلے جائیں گے تآنکہ یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جائے کہ واقعی قرآن الحق ہے The Truth۔ حق اضافی اور Relative نہیں' Absulute Truth الحق۔ طریقہ یہ ہے۔ انفس اور آفاق کے اندر یہ جتنے بھی حقائق چھپے ہوئے ہیں ان پہ پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں۔ یہ پردے کیسے اٹھتے چلے جائیں گے؟ انسانی علم کے ذریعے سے' انکشافات کے ذریعے سے' اقتشافات کے ذریعے سے' ایجادات کے ذریعے سے' فکر کے ذریعے سے۔ جوں جوں یہ چیز ہوتی چلی جائے گی' جب بھی کوئی شے کائنات کی ایک Truth بن کے سامنے آئے گی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ کبھی قرآن کے خلاف نہیں ہوگی۔ اور اس چودہ سو سال میں یہ ایسا کبھی نہیں ہوا عزیزانِ من!۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ پھر میں عرض کر دوں کہ جہاں تک اس سے Guidance یا ہدایت لینے کا تعلق ہے اس کے لیے کسی Plato کے دماغ کی

ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو (لقد یسرنا القراٰن للذکر) ہے وہ بالکل آسان اس نے کہا ہے' ہدایت لینے کے لیے بڑا آسان واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر آپ اس ہدایت کی کنہ اور حقیقت کی طرف جانا چاہیں علمی دلائل اور بصائر کی رو سے سمجھنا چاہیں یہ دیکھیں کہ وہ کونسی حقیقتیں ہیں جو اس کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں۔ کہا اس کے لیے تو پھر تمہیں اپنی علمی سطح کو بلند کرنا ہوگا۔ اور پھر ہر دور میں انسان کی علمی سطح تو وہاں تک ہی جا سکتی ہے جس سطح تک انسانی علم پہنچا ہوا ہے۔ اور انسانی علم کی تو کیفیت یہ ہے کہ یہاں ہر دور میں ایک رداس کے اوپر رکھا جاتا ہے پہلے سے یہ دیوار بلند ہوتی چلی جاتی ہے انسانی علم کی۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ انسانی علم اپنے دور کا جو ہے اس کی روشنی میں قرآن کے حقائق سمجھ میں آتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری ہے اس کے سمجھنے کے لیے۔ دو باتیں اس سے ثابت ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کسی ایک دور کی بات نہیں ہے کہ اس میں قرآن کے سارے حقائق بے نقاب ہو جائیں۔ وہ تو علمِ انسانی جوں جوں بڑھتا چلا جائے گا آگے بڑھتے چلے جائیں گے ہم۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ غلط ہو گیا کہ صاحب یہ جو جتنا سمجھا جانا تھا قرآن وہ تو سمجھا گیا نا۔ ہمارے اسلاف نے اسکو سمجھ لیا انہوں نے جو کچھ کہہ دیا حرفِ آخر ہے۔ خود قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔ حرفِ آخر ہو نہیں سکتا کسی دور کے اندر۔ علمِ انسانی نے تو آگے بڑھنا ہے۔ یہ آگے آنے والے انسان یہ جو پیچھے رہ جانے والے انسان ہیں علم کے اعتبار سے ان سے کہیں آگے جاتے ہیں۔ صاحب دور تو ایک طرف رہا ایک Age (زمانہ) تو ایک طرف رہا اب تو یہ علمی انکشافات اتنی برق رفتاری سے ہو رہے ہیں کہ ایک ہی Age کے اندر باپ اور بیٹے میں فرق ہوتا ہے' ہمارے بچے ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ جو کچھ یہ تیسری چوتھی جماعت میں پڑھ کے آجاتے ہیں ہمارے زمانے میں کہیں میٹرک تک بھی نہیں ذہن میں آتا تھا وہ۔ اور چلتے پھرتے جو کچھ یہ معلومات ان کو آجاتی ہیں' ذرائع معلومات بڑھ گئے ہیں' مواصلات کے طریقے تیز رفتار ہو گئے ہیں' انکشافات کی رفتار بڑی تیز ہو گئی ہیں۔ تو علمِ انسانی تو بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے نہیں کہ کوئی ایسا دور تھا کہ جس میں علمِ انسانی اپنی انتہا تک پہنچ گیا تھا اس لیے اس دور میں جو کچھ قرآنی حقائق کے متعلق کہا گیا وہ حرفِ آخر ہو گیا۔ وہ اپنے دور کی Attempt تھی ان کی' انہوں نے بہر حال اپنے ہی دور کی علمی سطح کے مطابق کوشش کی۔ ہمارے ہاں کی بڑی سے بڑی تفسیر کو اٹھا کے دیکھ لیجیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آسمان ہے کیا۔ اس میں ہر ایک نے لکھا ہوا ہے کہ یہ ایک شیشے کا ڈلا ہے بہت بڑا موٹا اور اس کے اندر یہ جڑے ہوئے ہیں یہ جو دیے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ یہی کہہ سکتے تھے۔ کل تک ابھی اس زمین کو ساکن مانا جاتا تھا۔ ہم تو ایک طرف رہے یورپ کے سائنٹسٹ بھی یہی مانتے تھے زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ علمی سطح کی تو یہ کیفیت تھی۔ تو یہ سمجھنا کہ کسی اس دور کے اندر جو کچھ سمجھ گئے ہیں وہ اس سے آگے نہیں سمجھا جا سکتا غلط ہے حقائق کے خلاف ہے قرآن کے دعوے کے خلاف ہے۔ اس نے تو کہا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں انفس اور آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ اس کا ہر دعویٰ حقیقتِ ثابتہ بن کے سامنے آجائے۔ ہر دعویٰ حقیقتِ ثابتہ بن کے ان کے سامنے نہیں آسکتا تھا۔ ان کے سامنے جب یہ بات آئی کہ (کان عرشه علی الماء) خدا کا عرش پانیوں کے اوپر ہے۔ اس دور میں وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ بات کیا ہو گئی۔ آپ کو معلوم ہے

کہ وہ سمجھے تو کیا سمجھے کہ یہ سات آسمان ہیں ہر آسمان اس طرح سے ایک شیشے کا ڈلا ہے۔ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے۔ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے' پانی پہ جو عرش رکھنا تھا۔وہ جو پانی ہے اس کے اندر سات پہاڑی بکرے کھڑے ہیں (مسکرائیے گا نہیں میں بتاؤنگا کیوں نہیں؟ کلیجے پہ چھری چل جاتی ہے وہ بتاتے وقت) سات پہاڑی بکرے کھڑے ہیں وہ پانی سمندر اتنا گہرا ہے کہ وہ بھی پانچ سو میل کی مسافت ہے۔اور وہ بکرے اتنے بڑے ہیں کہ یہ سمندر جو ہے وہ ان کے گھٹنے تک آتا ہے۔ان بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے۔کہا یہ کیسے تھا؟ کہا قرآن نے کہا ہے (**کان عرشہ علی المآء**) پانیوں کے اوپر ہے۔تو یہ زمین کے جو پانی ہیں یہاں تو ہے نہیں آسمان پہ ہی کہیں ہوگا نا جی۔میں نے کہا تھا نا کہ یہ مسکرائیے گا نہیں۔یہاں تک بھی ٹھیک تھا۔ٹھیک ہے اس دور کا کوئی شخص اس کا ذہن یہیں تک گیا تھا' ہم ہوتے تو ہم بھی ایسا ہی کچھ کہتے۔ہماری کونسی بڑی کاریگری ہے یہی ہے نا کہ ہم اس دور میں پیدا ہوگئے جب علمِ انسانی آگے ہے۔لیکن یہاں جو چیز ایسی ہے جو قابلِ اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات کہی کسی نے اور کہا یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ایسا۔لیجیے صاحب یہاں فرق ہوگیا۔اپنی بات کہتا تو ہمیں حق تھا کہتے ٹھیک ہے غلط ہوگئی' بعد کے آنے والے انکشافات نے اس کی تردید کردی۔اس کو کیا کہیں گے ہم' یوں ہم مرے پڑے ہیں۔مانئے اگر کہ حضور ﷺ نے فرمایا اور اس کے بعد میں دل گذرے کچھ خیال شبہ شک گمان ظن' کافر ہوگئے' فرمانِ رسالت مآب ﷺ کے خلاف مسلمان کے دل میں شبہ اور شک گذرے۔کہیے کہ نہیں ہے یہ ان کا تو منکرِ حدیث ہوگئے' کفر کا فتویٰ لگ گیا۔مسلمان پہ تو لگا دیا کفر کا فتویٰ اور جی ٹھنڈا ہوگیا۔کافر جب یہ بات کہیں گے تو اس کے اوپر کیا فتویٰ لگاؤ گے جی ''اوتے پہلاں ای کافر ہیگا''۔جواب نہیں ان کا بن پڑتا جب وہ ان چیزوں پہ اعتراض کرتے ہیں عزیزانِ من!۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ چیزیں اپنے اپنے دور کے اندر ان لوگوں نے کوشش کی سمجھنے کی۔جہاں تک انسانی عقل جاسکتی تھی وہیں تک یہ جاسکتے تھے۔بنیادی غلطی اس میں یہ ہے کہ ہم کسی ایک دور کے سمجھے ہوئے قرآن کو حرفِ آخر سمجھ لیتے ہیں۔اور حرفِ آخر قرار دینے کے لیے انہوں نے تکنیک یہ برتی کہ باتیں کہیں اپنی' منسوب کیا ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی طرف۔زبان نہیں کھل سکتی اب اس کے بعد مسلمان کی۔نتیجہ اس کا یہ کہ اس چودہ سو سال کے اندر

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی اُدھر ہے
وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

جو پہلی تفسیر لکھی گئی آخری تفسیر بھی وہی لکھی جارہی ہے۔کیونکہ اس پہلی تفسیر والے نے کہدیا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔کس کا دل گردہ ہے اسکے بعد یہ کہے کہ صاحب میں اس سے بہتر کہہ سکتا ہوں۔اور جیسا میں نے عرض کیا ہے دوسرا راستہ یہی تھا کہ اس قسم کی باتیں جو علم اور عقل اور تجربے اور مشاہدے اور مطالعے کے خلاف جائیں گی حضور ﷺ کبھی ایسی بات نہیں فرما سکتے تھے یہ آپ ﷺ کی نہیں ہوسکتیں۔یہ کہیے تو انکارِ

حدیث' انکارِحدیث کفر۔ یہ فتویٰ ہے ان کے ہاں کا متفق علیہ کہ صحیحین کی احادیث میں سے کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ جو ابھی ابھی میں نے ترمذی کی حدیث آپ کے سامنے پیش کی ہے اس کا انکار کیجیے تو کفر' دائرہ اسلام سے خارج۔ زبان سے اقرار کیجیے ان کی خاطر تو منافقت' دل میں شبہ گذرے تو ذاتِ رسالت مآب ﷺ پہ جو ایمان ہے ہمارا وہ ختم۔ حضور ﷺ پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ صادق القول تھے۔ اسی سے ہم قرآن کو قرآن مان رہے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا خدا کا کلام ہے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ اتنی سی بات جو تھی قرآنی حقائق کو محصور کر دینا کسی ایک دور میں اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ کسی دور میں یہ محصور نہیں ہوسکتا' یہ علم کی دنیا میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ دعویٰ اس کا یہ ہے اور بڑی Boldness ہے اس دعوے کے اندر۔ دنیا کے سارے مذاہب جی چراتے پھرتے ہیں علمی انکشافات سے' ہر علمی انکشافات ان کے کسی نہ کسی دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ وہ اتنے تنگ آئے اس دور میں آ کے جب علمی انکشافات اتنی تیزی سے آئے کہ ''اوہناں نے اوہدے بعد کہیا سیاپا ای مکاؤ جناب'' وہ لبادہ ہی اتار کے الگ ہوگئے۔ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ یعنی جب ان کے ہاں بائبل میں سال تک ڈیٹ تک دی ہوئی ہو قیامت آ جانے کی کہ دنیا نے ختم ہو جانا ہے۔ تو جس زمانے میں وہ تاریخ قریب آ رہی تھی نا بڑے بڑے مجمعے لگتے تھے اس کے بعد۔ وہ پادری حساب کر کے بتا دیتے تھے اٹھارہ سو کتنے میں وہ یہ پڑتا تھا۔ قریب آتے تھے وہ شہر خالی ہو جاتے تھے لوگوں کے' گاؤں خالی ہو جاتے تھے جیسے قیامت شہروں میں آنی ہے وہاں نہیں آنی۔ یہ ہو جاتا تھا۔ وہ تاریخ گذر جاتی تھی تو پھر یہ بیٹھ جاتے تھے کہ ''نہیں نہیں حساب اچ غلطی لگ گئی کتھے''۔ پھر آگے چلتے تھے۔ یہ تماشہ جو تھا یہ کوئی پچاس سال تک ان کے ہاں ہوتا رہا' ان کی ہسٹری میں یہ چیز ہے۔ تو پچاس ایک سال تک یہ کچھ ہوتا رہا اس کے بعد انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب یہ بائبل میں کسی دوسرے شخص نے خوامخوہ داخل کر دیا ہے یہ بات ہے نہیں۔ یعنی اب کریں کیا۔ دنیا کا ہر مذہب جی چرا رہا ہے علم سے۔ یہ قرآن ہے جو علم کی بارگاہ میں چھاتی لگا کے کہہ رہا ہے کہ لاؤ تم بلند ترین حقیقتیں لاؤ سامنے' جو بھی تمہارے ہاں کا ظن اور قیاس حقیقتِ ثابتہ بنے گا وہ قرآن کی تصدیق کرے گا کبھی اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔ لیکن اس دعوے کا اثبات تو وہی کر سکتا ہے کہ جو علمی طور پر احاطہ کرے۔ کہتا ہے (**بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه**) (10:39) اس کی تکذیب وہ کرے گا جو علم سے جی چرائے گا۔ علم کی رو سے احاطہ کروا سکے حقائق کے اوپر۔ کہا پہلی چیز تو یہ ہے قرآن کے سمجھنے کی۔ اگلی بات اور۔ اس میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہاں صاحب اتنا علم حاصل کیا جائے پھر وہ بھی کسی ایک زمانے کے اندر حرفِ آخر نہ ہو تو بڑی لمبی بات ہوگئی۔ اُس نے کہا نہیں اور دوسرا طریقہ ہے۔ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہا کہ میں محض کوئی نظری باتیں نہیں بیان کرتا محض کوئی چند Theories نہیں ہیں وہ خالی الفاظ نہیں ہیں دعاوی نہیں ہیں۔ میں ایک نظام دیتا ہوں ایک پروگرام دیتا ہوں معاشرے کے لیے ایک ضابطہ دیتا ہوں۔ اور دعویٰ یہ کرتا ہوں کہ اگر اس پہ عمل کیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکل کے رہے گا۔ کہا کہ اس کے لیے تو کچھ زیادہ مشکل بات نہیں ہے نا۔ تم انہیں جو کچھ میں کہتا ہوں کہ اس طرح سے معاشرہ متشکل کر لو علمی اعتبار سے علمی سطح کے اوپر نہ بھی سمجھوا گر نہیں سمجھ سکتے تو' عملاً تو اسکو اختیار

کر سکتے ہونا۔تمہیں نہ بھی معلوم ہو کہ یہ جو فارمولے کے Consequence ہیں یہ ان کی حقیقت کیا ہے' اگر یہ چیز بتا دی جائے کہ دیکھو بھئی اتنے ماشے یہ ڈالو اتنے تولے یہ ڈالو اور اتنا یہ ڈالو اس میں اور اس طرح سے رگڑو اس طرح سے پیسو اس طرح سے لگاؤ یہ نتیجہ نکل آئے گا۔ کہا کہ یہ تو کچھ مشکل نہیں ہے نا۔کہا کہ دوسرا طریقہ یہ ہے Pragmatic Test جسے آج کہتے ہیں کہ اس پروگرام کو عمل میں لاؤ نتائج تمہیں خود بتا دیں گے کہ جو میں کہتا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط۔کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ چیز بھی عمل میں نہیں لاتے اور اس کے انجام تک کا انتظار نہیں کر رہے ہیں۔ان سے کہا گیا کہ تم خود عمل میں نہیں لاتے تو نہ لاؤ ہم اس نسخہ پہ عمل کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں مکہ کی زندگی میں۔ ہمیں اتنی مہلت دیدو کہ ہم اس کے اوپر عمل کریں' ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے۔(**قل یقوم اعملوا علیٰ مکانتم انی اعمل**) ان سے کہدو کہ تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو جو کہتے ہو کہ صاحب اس کا نتیجہ بہت خوشگواریاں سرفرازیاں ہونگی۔میں کہتا ہوں اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' یہ جو میں پروگرام دے رہا ہوں اس کا نتیجہ یہ خوشگواریاں ہونگی۔پہلی چیز تو یہ تھی کہ علمی سطح کے اوپر آؤ تو میں گفتگو کرنے کو تیار ہوں علمی سطح پہ بھی تمہیں سمجھا سکوں گا میں۔نہیں چاہتے تو بہر حال اس کو عمل میں لاؤ خود نہیں عمل میں لانا چاہتے تو مجھے اتنی فرصت اور مہلت دیدو کہ میں عمل میں لالوں اس کو۔اور اس کے بعد اس کا انجام دیکھو۔آپ دیکھ رہے ہیں دعوے کی صداقت کے لیے شہادت کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا جا رہا ہے۔کہا کیفیت یہ ہے کہ یہ یہ بھی نہیں کرتے(**ولم یاتھم تاویلہ**) (10:39)اب ہمارے ہاں تاویل کے معنی ہی کچھ اور کر لیے۔کیا کیا جائے۔مآل کا لفظ تو ہمارے ہاں اپنے ٹھیک معنوں میں استعمال یہ ہوتا ہے۔انجام اور مآل اردو میں بھی لکھتے ہیں ہم۔وہی مآل ہے کہ جب اس کو اس باب میں تاویل میں وہی ہے عربی زبان کے دوسرا باب یا وزن آ جاتا ہے۔اس میں یہ دیکھا جائے تو پھر تاویل کے معنی کچھ اور آ جاتے ہیں صاحب۔ تاویل کے معنی ہی ہیں کہ وہ اصل بات نہ ہو کچھ کا کچھ ہی اس کے بعد کیا جائے۔کہا یہ کہ دوسری بات یہ ہے کہ یہ اتنا صبر بھی نہیں کر سکتے انتظار بھی نہیں اتنا کرتے کہ جو پروگرام میں عمل میں لا رہا ہوں وہ اتنا وقت تو اسکو دیں کہ یہ برومند ہو جائے۔میں نے بیج بویا ہے میں کہہ رہا ہوں چھ مہینے کے بعد دیکھ لینا کہ اس میں کیا پھل آتا ہے کونسی فصل اس میں بوئی جاتی ہے۔کہتے ہیں نہیں صاحب تم جھوٹ کہتے ہو۔اوبابا ٹھہر تو جاؤ چھ مہینے کا انتظار تو کر لو۔کہتے ہیں کہ نہیں تم جھوٹ کہتے ہو۔تاویل۔یہ سورۃ اعراف (7:53) میں بھی یہ چیز آئی ہے۔میں لفظ تاویل کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔میں نے کہا ہے نا کہ قرآن سے معانی یا مفہوم متعین کرنے کا طریقہ تصریفِ آیات ہے ایک جگہ دیکھئے پھر دوسرے مقامات میں دیکھئے کہ وہ کیسے استعمال کرتا ہے۔ہر آیت ہر لفظ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں عزیزانِ من!۔کہتا ہے(**ھل ینظرون الا تاویلہ**) (7:53) یہ جو اس طرح سے تکذیب کر رہے ہیں مخالفت کر رہے ہیں۔اور اس وقت تو تم کہہ رہے ہو کہ غلط روش پہ جا رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا نہیں مان رہے تمہاری بات۔کہہ رہے ہیں کیا کہہ رہے ہو ہم بڑے مزے میں ہیں Overnight Millionare ہو جاتے ہیں صاحب' تم کیا کہہ رہے ہو تباہی ہے اس کا نتیجہ ہے۔کہتا ہے سوائے اس کے کہ اب یہ انتظار کر رہے ہیں **تاویلہ** کہ اس پروگرام کا انجام ان کے سامنے آ جائے اور

کوئی بات نہیں ہے۔(**ھل ینظرون الا تاویله**) (7:53)انتظار کر رہے ہیں۔(**یوم یاتی تاویله یقول الذین نسوہ من قبل قد جآء ت رسل ربنا بالحق**) (7:53)جب اس کی تاویل سامنے آ گئی ان کے(معنی تاویل کے واضح ہو گئے صاحب) کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ اس روش کا انجام ان کے سامنے آ گیا اس وقت یہ کہیں گے کہ ہاں صاحب ایک کہنے والے نے کہا تو تھا پہلے یہ کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہا تو پھر اس وقت تو اس کا فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ کہنے والے نے کہا تو تھا سیلاب آئے گا۔تم نے نہ کشتی بنائی نہ وہاں سے Remove ہو کے دوسری جگہ پہنچے' نہ کوئی بند ہی بنائے' بنائے تو وہاں سیمنٹ کی جگہ ریت ہی بھر دی۔ اب جو آ گیا ہے سیلاب اس کا تو اس کے بعد یہ کہنا کہ ہاں صاحب کہا تو تھا کسی نے' فائدہ کیا دیتا۔ میں تاویل کے لفظ کے معنی بیان کر رہا تھا۔قرآن نے خود بتایا ہے کسی پروگرام کا انجام۔ دوسری چیز یہ ہے عزیزانِ من! قرآن ایک پریکٹکل پروگرام دیتا ہے آپ کو۔اور یہ فرق ہے مذہب اور دین میں' مذہب کوئی پروگرام نہیں دیتا۔ مذہب کے پاس کوئی عملی پروگرام نہیں ہوتا وہ انفرادی تسکین یا فریب ہوتا ہے Subjective ہوتا ہے سارا' اپنے گیان دھیان میں بیٹھے ہوئے عقیدے کی رو سے کچھ کر لو کوئی تھوڑی سی پرستش کر لی کوئی ہاتھ جوڑ لیے گھنٹی بجالی کچھ کر لیا' اپنے دل کا اطمینان لے کے اٹھ آئے۔ برہمن مندر سے اٹھ آیا بت کے سامنے سے' پادری گرجے سے اٹھ آیا' مسلمان مسجد سے نکل آیا تینوں کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر ان تینوں کے پاس کوئی پروگرام عملی دیا ہوا ہوتا اور ان سے کہا جاتا کہ دیکھو بھئی اس پہ عمل کرو یہ نتیجہ نکلے گا۔تو ان کو پتہ چل جاتا نا ان تینوں کو کہ کس نے عمل کیا کس نے نہیں کیا' کس کو سچا پروگرام دیا گیا کس کو جھوٹا دیا گیا۔ جب یہ صورت نہ ہو سوال دل کے اطمینان کا ہو تو ساری عمر آدمی فریب کھائے جاتا ہے' عمر نہیں صدیوں تک کھائے جاتا ہے۔ ہر مذہب والا دوسرے مذہب کے طور طریقوں پہ ہنستا ہے اور دیکھتا یہ ہے کہ وہ بھی ہزاروں سال سے اسی طرح سے چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ ایسی ہی ہنسی کی بات ہوتی تو بہر حال دو ایک صدیوں تک کچھ عمل کر کے وہ چھوڑ دیتے' وہ کیوں لگے رہتے ہیں۔ وہ تمہاری باتوں پہ ہنس رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ Objectively خارج میں تو کوئی ثبوت نہ ان کے جھوٹے ہونے کا ہوتا ہے نہ تمہارے سچے ہونے کا ہوتا ہے۔ اپنا اپنا اطمینان ہوتا ہے وہ اپنے طریق پہ کر لیتے ہیں تم اپنے طریق پہ کر لیتے ہو۔ دین ایک عملی پروگرام دیتا ہے لو یہ بیج ہے بوؤ جا کے۔ دعویٰ میرا یہ ہے کہ ایک گیہوں بوؤ گے تو ایک ایکڑ سے سو من نکلے گا۔ سیدھی سی بات ہے چھ مہینے کا انتظار کرنا ہوگا۔ کہتا ہے یہ ابھی سے کہنے لگ گئے جھوٹ بولتا ہے جھوٹ بولتا ہے نہ بونا۔(**لما یاتھم تاویله**) (10:39) یہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نتیجہ جو تھا اس کا انتظار نہیں کر رہے۔ اور اگر عزیزانِ من! دین مذہب میں تبدیل ہو جائے جیسا ہمارے ہاں ہوا ہے پھر تو آپ کا انتظار قیامت کے قریب امام مہدی کا انتظار ہو گا نا۔ اپنے کسی پروگرام کے عملی نتیجے کا انتظار تو نہیں ہو سکتا' وہ تو نکلنا ہی نہیں مذہب میں تو نتیجہ نکلا ہی نہیں کرتا۔ پھر اس انتظار کی یہ شکل ہو جاتی ہے''اوتریخاں ای ہائی کورٹ والیاں پین لگ پیندی نیں او''۔ مجدد سو سال کے بعد مسیح اور مہدی قیامت کے قریب۔ قیامت کے قریب جب یہ دنیا ہی ختم ہو جانی ہے تو اس وقت آیا بھی تو کیا ہے ہمیں''اوہدے بعد تے کِکھ نئیں رہنا''۔

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم

جان لبوں پہ آئی ہے اب بھی مسیحا آ جا میں زندہ ہوں۔

؟؟ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد

''او میں مر گیا او ہدے بعد تو ہزار مسیحا او ندار ہو''۔

(**ولما یاتھم تاویلہ**) (10:39) جھٹلائے جا رہے ہیں۔کہا کہ یہ بھی نہیں انتظار کر سکتے تم تو آؤ تیسرا طریقہ تمہیں بتائیں۔ قرآن ہے عزیزانِ من! قرآن ہے۔کہتا ہے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بہرحال(**کذٰلک کذب الذین من قبلھم فانظر کیف کان عاقبۃ الظٰلمین**) (10:39) تم سے پہلے بھی تو یہ قومیں گذری ہیں جن کے کھنڈرات سے دن رات تم گذرتے رہتے ہو ان کی کہانیاں بھی روز اب بیان کرتے رہتے ہو۔ان قوموں کی تاریخ کو ہی پڑھ کے دیکھ لو کہ جس قوم نے یہ روش اختیار کی جو تم اختیار کیے ہوئے ہو اس کا انجام کیا ہوا۔روز تم دیکھتے ہو جس نے اس کے خلاف روش اختیار کی' جو میں کہہ رہا ہوں اس کا مآل کیا ہوا۔خود پروگرام پہ عمل نہیں کرنا چاہتے تو تاریخ کی شہادتوں سے ہی پوچھ لو۔(**فانظر**) یہاں **فانظر** ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات پہ ان کی داستانیں لکھی ہوئی تمہیں ملیں گی۔کیا ہوا؟ قرآنِ کریم تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے وہ تو یہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ حقائق نازل کیے اور اس کے ساتھ نازل کی ہم نے تاریخی سرگذشتیں۔اتنی اہمیت ہے۔اور ہے ہی بڑی اہمیت تاریخ کو حاصل۔اگر تاریخ کو بطور ایک سائنس یا فلسفہ کے پڑھا جائے محض Informatory نہ اسے رکھا جائے کہ اکبر فلاں سال میں تخت پہ بیٹھا فلاں سال میں بہرم اس کو لے گیا فلاں سال میں لڑائی لڑی اور اس کے بعد فلاں سال میں مر گیا۔یہ تاریخ نہیں ہے۔تاریخ یہ ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا۔قرآن کہتا ہے یہ بھی کرو۔(**فانظر کیف کان عاقبۃ الظٰلمین**) (10:39) اس سے دیکھ لو کہ ظلم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے تاریخ بتا دے گی۔تین طریقے عزیزانِ من! قرآن نے بتائے ہیں۔اس کے حقائق کو نظری طور پہ سمجھنا چاہتے ہو تو تمہارے دور میں انسانی علم جس سطح پہ جا پہنچی ہے کم از کم اس سطحِ علم کے مقابلے میں ان حقائق کو ہی لا کے دیکھو ان کی تصدیق ہوتی جائے گی۔اور یہ حقائق اتنے مختلف ہیں اس کے اندر دیے گئے کہ یہ جتنی سائنسز آپ لیے پھر رہے ہیں آج کم و بیش تمام سائنسز اس کے ساتھ Cover ہو جاتی ہیں۔ایک طریقہ تو یہ تھا ان علوم کے جو آئمہ ہیں وہ بیٹھتے وہ قرآن کے حقائق کو سمجھتے۔لیکن جہاں علم کی کیفیت یہ ہو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں جغرافیہ جو پڑھایا جاتا ہے جس کے بعد یہ فضیلت کے عمامے باندھتے ہیں۔جس زمانے میں وہ بنا تھا اس زمانے میں تین ہی برِاعظم تھے وہ یہ دو برِاعظم آسٹریلیا اور امریکہ ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔اس جغرافیہ میں تین ہی برِاعظم ہوتے ہیں۔کبھی اس نصاب پہ کسی وقت خدا توفیق دے تو کسی وقت نظر ڈالنا سات سات سال جس کے اندر یہ سرف کرتے ہیں۔اس کے بعد ذرا ان سے پوچھنا جو فارغ التحصیل ہوتا ہے کہ سوئی کیسے بنتی ہے'' کہندا اے ساہنوں تے ایناں ای

پتہ ہیگا کہ ساڈا منڈا ہے او گھروں لیا دیندا ہیگا سوئی دھاگہ اللہ اللہ خیر سلا''۔کوئی علم نہیں۔اسے تو چھوڑ دیجیے' جسے اپنا علم یہ کہتے ہیں نا وہ علم اتنا ہی ہوتا ہے ان سے کسی مسئلہ کے متعلق جا کے پوچھئے ان کا علم یہ ہوتا ہے کہ فلاں امام نے یہ کہا فلاں تفسیر میں یہ آیا ہے فلاں محدث نے یہ لکھا ہے فلاں فتویٰ یہ ہے۔اور بڑا جرآت کرے گا تو نیچے یہ ہوگا کہ فقیر کی بھی یہی رائے ہے۔یعنی علم صرف اتنا ہے کہ حوالے یاد ہیں۔جتنے زیادہ حوالے یاد ہوں اتنا بڑا جید عالم ہے کہ اس کے متعلق اسے معلوم نہیں ہے کہ صاحب کس کتاب میں ہے چلیے فلاں شیخ الحدیث ہیں ان سے پوچھئے وہ بتا دیتے ہیں کہ یہ بخاری میں ہے ترمذی میں ہے وہ سب سے بڑا عالم ہے۔ Catalogers ' یہ ہے علم کا منتہا۔کیا لکھ جاتا ہے یہ شخص

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب

مکتب اور ملا اور وہاں اس کتاب کے حقائق' کیا کہہ رہے ہو۔وہ کہتا ہے کہ

کور و مادر زاد و نورِ آفتاب

پیدائشی اندھا سورج کی روشنی کو کیا جانے۔

یہ ہوتا ہے ہمارے ہاں کا مبلغِ علم۔قرآن کہتا ہے اس کی تکذیب اس لیے کرتے ہیں۔اور اس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ یہاں جو شخص قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے یہ اس کی مخالفت اتنی کیوں کرتے ہیں۔یہ ان کے نصاب میں نہیں ہوتا اور نصاب میں ہی نہیں ہوتا یہ ان کی ذہنی سطح ہی اتنی نہیں ہے کہ قرآن کے حقائق تک آ سکیں۔یہ تو علم چاہتا ہے اپنے زمانے کا۔دوسری چیز یہ تھی کہ اس پہ عمل کیا جاتا اس کے نتائج بتا دیتے۔پاکستان اس کے لیے مانگا گیا تھا۔اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔وہاں سے بیج ہم نے لیے اور باہر کے ملکوں کو دیدیے کہ ''تسی بیجنا کرواسی منگ کے تہاڈے گھروں دانے لے جایا کراں گے جی''۔(**ولا یاتھم تاویلہ کذٰلک کذب الذین من قبلھم فانظر کیف کان عاقبۃ الظٰلمین**) (10:39) ہمیں تو عزیزانِ من! دور کی تاریخوں کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے چھبیس سال کا آئینہ ہمارا ہمارے سامنے ہے۔(**کیف کان عاقبۃ الظٰلمین**) (10:39) دیکھو استبداد اور ظلم کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔یہ ہے قرآن نے عزیزانِ من! جو طریقہ بتایا اپنے سمجھنے کا۔وہ کہتا ہے کہ (**ومنھم من یؤمن بہ و منھم لا یؤمن بہ و ربک اعلم بالمفسدین**) (10:40) ٹھیک ہے اس طریقے کے مطابق ایمان لانے والی بات ہے۔جو لانا چاہتا ہے ایمان اس طرح سے لائے نہیں لانا چاہتا نہ ایمان لائے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ فساد کا نتیجہ کیا کیا ہوتا ہے۔اور باقی رہا رسول(**و ان کذبوک فقل لی عملی ولکم عملکم انتم بریؤن مما اعمل و انا بریٓ مما تعملون**) (10:41) اس کے باوجود اگر تمہاری تکذیب کیے چلے جاتے ہیں یہ جھٹلائے چلے جاتے ہیں تو ان سے کہو کہ میرا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔میں جس پروگرام پہ عمل کر رہا ہوں اس کے نتیجے جو ہیں وہ میرے لیے ہونگے' تم جس پروگرام پہ عمل کر رہے ہو اس کے نتائج تمہارے لیے ہونگے میں بری الذمہ ہوں اس سے۔(**فانتظروا انی معکم**

انتظـرین) تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔کہا ہم نے تو یہ طریقہ بتایا تھا قرآن کے سمجھنے کا۔ان کی کیفیت کیا ہے؟ غور سے سنیے گا عزیزانِ من! اس لیے کہ ارے دل یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔اب ہماری اپنی بات آ رہی ہے اور عجیب اتفاق ہے سامنے آ رہی ہے عین اس وقت جب رمضان المبارک ہمارے سامنے آ رہا ہے۔کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ تمہاری مجلسوں میں آتے ہیں قرآن وہاں پیش کیا جا رہا ہوتا ہے' قرآن پیش کیا جا رہا ہے پیش کرنے والا صاحبِ قرآن ﷺ۔اندازہ لگایے عزیزانِ من اس سے زیادہ سمجھنے سمجھانے کی بات کیا ہوتی ہے۔کہا لیکن ان کی کیفیت یہ ہے۔سنیے غور سے عزیزانِ من! اپنی بات آ رہی ہے۔

(و منهم من یستمعون الیک) (10:42) **یستمعون** : عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے اس 'ت' میں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ بیٹھے ہوئے یوں نظر آ رہے ہیں جیسے کہ بڑے غور سے سن رہا ہے لیکن دھیان کہیں اور ہونا سن نہ رہا ہونا۔آتے ہیں مجلسوں میں تمہاری' تم قرآن بھی پیش کرتے ہو۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ اتنا ہی نہیں کہ ذرا دل سے غور سے اس کو سن تو لیں کہ یہ کہہ کیا رہا ہے۔ کہتا ہے کیفیت یہ ہے آتے ہیں قرآن پیش کیا جا رہا ہے بظاہر نظر آ رہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے اس کو سن رہے ہیں **(یستمعون)** کان تو لگائے ہوئے ہوتے ہیں سن نہیں رہے ہوتے۔**(افانت تسمع الصم)** (10:42) کہا کیا تو بہروں کو سنائے گا۔یہ بہرے تو نہیں ہیں' سیدھی سی بات ہے یہ تو سن سکتے ہیں Physically تو بہرے کیسے ہیں؟ کہنے لگا اس لیے کہ **(و لو کانوا لا یعقلون)** (10:42) سننے کے معنی یہ ہیں کہ عقل وفکر سے کام لیا جائے۔اور اگر ایک شخص سن رہا ہے اور سمجھ نہیں رہا اسے' اس میں اور اُس میں کہ جو سن ہی نہیں رہا دونوں میں فرق کیا ہے عزیزانِ من!۔ایک بہرہ ہے جو بات تمہاری سن ہی نہیں رہا' ایک شخص ہے جو بات تو سن رہا ہے اس کو سمجھ نہیں رہا۔عزیزانِ من! اب اگلی بات آتی ہے۔بڑی معذرت کے ساتھ عرض کرونگا۔یہ ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جن کی زبان عربی تھی قرآن بھی عربی زبان میں ان کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا **(لا یعقلون)** کی صورت یہ تھی کہ اس پہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے تھے سمجھتے نہیں تھے۔عقل وفکر سے کام نہیں لیتے تھے' الفاظ عربی زبان کے تو پھر بھی ان کی اپنی زبان کے الفاظ تھے' الفاظ بھی سن رہے تھے لیکن چونکہ ان الفاظ پہ غور وفکر نہیں کر رہے تھے **(لا یعقلون)** عقل وفکر سے کام نہیں لے رہے تھے۔قرآن نے کہا کہ ان میں اور بہروں میں فرق کیا ہے کہ زبان بھی جانتے ہیں جاننے کے باوجود اگر عقل و فکر سے یہ کام نہ لیں تو وہ بہرہ ہے۔اور قرآن کہہ رہا ہے کہ بہروں کو تو تُو سنا نہیں سکتا۔اور عزیزانِ من! اس کے بعد آگے آ جایئے کہ قرآن کی زبان بھی ہم نہ جانیں اور کھڑے ہوئے قرآن کو روز ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ پارہ سنتے چلے آئیں۔فرق آپ نے دیکھ لیا۔وہ زبان جانتے تھے عربی لیکن چونکہ وہ غور وفکر نہیں کرتے تھے انہیں بھی بہرہ کہا اور کہا کہ انہیں نہیں ہدایت مل سکتی بہرے ہیں۔اور اگر صورت یہ ہو (پھر دہرا دوں ہماری) عربی زبان بھی نہیں جانتے زور دیا جاتا ہے ناظرہ قرآنِ کریم پڑھانے پہ۔عزیزانِ من! جس زبان کو نہیں جانتے اس میں **لا یعقلون** تو پہلی بات آ گئی۔اس میں سمجھنے سوچنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' زبان ہی نہیں جانتے سمجھنا سوچنا تو آگے ہے۔سوچئے تو سہی صدیوں سے

ہمیں اطمینان دلایا چلا جا رہا ہے بڑا ثواب ہوتا ہے اس سے صاحب ناظرہ قرآن پڑھ لینے سے۔ پڑھنا نہ جانتا ہو تو صبح اٹھ کے اس پہ انگلیاں ہی پھیر لے۔ میں کہتا ہوں ان کو چھوڑ دیجیے یہ جو پڑھنا ہے جسے ہم کہتے ہیں ناظرہ' زبان نہیں جانتا۔(**لا یعقلون**) قرآن کہتا ہے' زبان جاننے کے باوجود اگر سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لیتے تو اسے قرآن بہرہ کہہ رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ یہ نہیں ہدایت پہ آ سکتے۔ جہاں زبان ہی نہ جانیں اور سنتے رہیں قرآن کو وہ ہمارا سننا **یستمعون** میں نہیں آئے گا؟ کہ سنتے رہے ہیں۔ ایک سننا وہ ہے کہ لفظ سنا اور اس پہ غور کیا اور سمجھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ دوسرا سننا یہ ہے ان عربوں کا کہ زبان تو جانتے تھے لیکن سمجھ سے کام نہیں لیتے تھے انہیں بہرہ کہتا ہے۔ تیسرا سننا یہ ہے کہ زبان ہی نہیں آپ جانتے اور الفاظ اس کے سن رہے ہیں۔ لیکن کوئی یہ کہہ کے دیکھے ساری دنیا پیچھے پڑ جائے اس کے' قرآن کی برکتوں سے انکار کر رہا ہے۔ چل بھئی ایک Term آ گئی۔ اس کے ثواب سے انکار کر رہا ہے' چل بھئی آ گئی بات۔ اوبابا وہ کہتا ہے **لا یعقلون** والی بات۔ وہ کہتا ہے کہ عقل و فکر سے اگر کام نہیں لیا جاتا تو وہ یہ ہدایت نہیں دے سکتی بہرے ہیں یہ۔ سوچئے عزیزانِ من! میں نے یہ اس لیے کہا کہ رمضان المبارک سر پہ آ رہا ہے۔ ویسے تو سال بھر ہی ہم لوگ ناظرہ قرآنِ کریم جو ہے پڑھتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اگلے دور میں بچے جو ہیں وہ اس پہ نہیں آ رہے کہ وہ پہلا ہی تقاضا ان کا یہ ہوتا ہے کہ ''ابا جی ساہنوں سمجھاؤ تے سہی'' ان کا تقاضا یہ ہو رہا ہے۔ اور اسی سے مجھے اب یہ امید بندھ رہی ہے کہ ان بچوں کے اس انکار کے بعد جس سے ہم اس قدر تنگ آئے ہوئے ہیں یہ زمین آگے صاف ہو جائے گی۔ تو جب وہ تقاضا کریں گے کہ صاحب ہمیں سمجھاؤ تو سہی تو پھر ہم کہیں گے کہ ہاں بیٹا آؤ سمجھو۔ بات سمجھنے سے شروع ہوئی' قرآن کی بات سمجھنے سے شروع ہوئی ''تے ایہنے کنڈی لائی فیر نئیں اگاں جاندا کتے ہوآدمی''۔ دور آ رہا ہے۔ لیکن جب تک دور یہ ہو کہ اس کے ناظرہ بلا سمجھے ہوئے پڑھنے سے بھی ثواب ملتا ہے آپ آ ہی نہیں سکتے قرآن کی طرف۔ ثواب مذہب کی اصطلاح میں آپ کو مل جاتا ہے' وہی اپنا اطمینان۔ نتائج کے تو اعتبار سے تو وہی ملے گا جس میں آپ سمجھ سوچ کے کام لیں گے۔(**لا یعقلون**)۔ ہمارے ہاں بھی بہر حال جتنا کوئی کر رہا ہے قرآن کے متعلق' کہنا ہی پڑتا ہے کہ اس کی خدمت ہے۔ اپنی اسلامی خدمت بھی ہوئی ''تیلی وی کتاتے رکھاوی کھادا''۔ بیس پچیس سال کے اندر بڑی ہی ٹل ماری کسی نے تو صاحب (معاف رکھیے گا درمیان میں مسی روٹی والا حساب آ جاتا ہے میرا' اردو میں یہ پنجابی' لیکن ہوتا ہے یہ بیسنی ذرا چٹخارہ ہوتا ہے اس میں) تو وہ کیا کیا ہم نے اس میں؟ قرآن شریف پڑھایا جائے گا صاحب' مدرسوں میں قرآن شریف پڑھایا جائے گا۔ اور وہ ناظرہ قرآنِ کریم ہوتا ہے چھ سات سال تک اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں نے زندگی میں تجربے کیے یہ بچے اردو جاننے والا ہی بچہ صرف ہو بیسیوں بچے ہیں میرے ہاں کے' اب تو خیر وہ بڑے ہو گئے ہیں بچوں کے بھی باپ بنے ہوئے ہیں۔ اب بھی میری کیفیت یہ ہے۔ ایک قاعدہ دو ہفتے میں پڑھا دیا جائے تین ہفتے میں پڑھا دیا جائے اور اس کے بعد شروع کرنے کے بعد تیس دن میں دو مہینے میں قرآن شریف ناظرہ ختم۔ سات سال تک تو یہ پھیلاتے ہیں اس کو۔ ناظرہ قرآنِ کریم پڑھاتے ہوئے بہت بڑی خدمت ہو رہی ہے۔ بچہ یونہی بھاگ جاتا

ہے کیونکہ بچہ تو اب کہتا ہے کہ ہمیں سمجھایئے ۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی اور یوں آپ پڑھاتے ہیں ثواب والی بات تو اس کے دل سے نکل گئی ہوئی ہے سمجھتا وہ ہے نہیں بور نہیں ہو جاتا ہے انسان ۔لیکن اس کو پڑھانا پڑتا ہے ۔ وہاں انہوں نے ایک جن رکھا ہوا ہوتا ہے ۔آپ کو معلوم ہے آپ کے بچے انگلش سکول میں بھی پڑھنے والے کانپتے ہوئے آتے ہیں' کیا ہوا؟ جاتے کیوں نہیں''او جی مولوی صاحب دا پیریڈ آندا جی اوتھے اوہناں دے کول تے ڈنڈا ہوندا ہیگا جناب'' کانپ رہا ہوتا ہے بچہ ۔ وہ سمجھتا نہیں ہے وہ مولوی کہ یہ بچہ باقی پیریڈ تو یوں Attend کرتا ہے جیسا پلے گراؤنڈ میں جا رہا ہے یہاں آتے ہوئے کیا ہوتا ہے ۔ وہ یہ کہہ کے خوش ہو جاتا ہے کہ جی گھر میں ماں باپ نے چونکہ مذہب کو تیاگ دیا ہے بچے پیدائشی مادہ پرست ہو رہے ہیں' بات نہیں سمجھتا کہ یہ بچہ تقاضا کرتا ہے مجھے سمجھایئے ۔اور جو بات سمجھ میں نہیں آتی اس سے بڑی جلدی بور ہو جاتا ہے انسان ۔ سات سال تک ۔ تقاضا کیا گیا کہ صاحب اس کے ساتھ ترجمہ تو پڑھایئے ۔ آپ کو معلوم ہے اس کا Official Explaination آیا تھا نہ نہ نہ ترجمہ نہ پڑھایئے گا' کیا ہوگا؟ فرقہ وارانہ تعصب ابھر آئیں گے صاحب ۔ترجمہ کس کا پڑھایا جائے شیعوں کا پڑھایا جائے سنیوں کا پڑھایا جائے سنیوں میں اہل حدیث کا پڑھایا جائے یا اہلِ فقہ کا پڑھایا جائے اہلِ فقہ میں سے دیو بندیوں کا پڑھایا جائے یا بریلیوں کا پڑھایا جائے ۔ترجمہ نہ پڑھاؤ اس قرآن کا ۔ یا میرے اللہ ۔خدمتِ قرآنِ کریم ہے ۔ٹھیک ہے وہ بڑی بات ہے کہ قرآنِ کریم کم از کم چھپنا چاہیے صحیح' بڑی اچھی بات ہے وہ' ضرور ہونا چاہیے ۔اگلی بات بھی جو تھی پتہ نہیں غالباً پچھلے ہی طلوعِ اسلام میں ایک مراسلہ تھا ۔شیخ صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے صاحب قرآن کے صفحہ کے اوپر غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں کہ اس میں زیر سے لکھا اُس میں زبر سے لکھا ہو ۔لیکن اگر صورت یہ ہو کہ جو ترجمہ اٹھائیں اس لفظ کا ترجمہ ایک کے ہاں کچھ اور ہو دوسروں کے ہاں کچھ اور ہو تیسرے کے ہاں کچھ اور ہو ۔تو وہ جتنا نقصان آپ کے ہاں طباعت کی غلطی اور تضاد سے تھا اس سے کہیں زیادہ نقصان تو یہ ترجموں سے ہو رہا ہوگا آپ کے ہاں' آپ نے اس کا انتظام کیا کہ ترجموں کے اندر یہ تضاد نہ ہو ۔ وہ اسی لیے آتے ہی نہیں ترجموں کے اوپر ۔لیکن عزیزانِ من! یہ سب کچھ کر لیجیے گا ٹھیک ہے اپنے ذہن میں آپ سمجھ لیجیے گا ان چیزوں سے ثواب ہوتا ہے نتائج تو کوئی برآمد نہیں ہو سکتے ۔(**اولئک حبطت اعمالھم**) یہ وہ لوگ ہیں جو بڑا کام کرتے ہیں سارا رائیگاں جاتا ہے ۔(**یحسبون انھم یحسنون صنعا**) اپنے ذہن میں سمجھتے یہ ہیں کہ بہت اچھے نیک کام ہم کر رہے ہیں ۔(**اولئک حبطت اعمالھم**) ۔ایک تو وہ ہیں نا کہ کچھ کرتے ہی نہیں ہیں ۔ یہ سعی لا حاصل عزیزانِ من! (**حبطت اعمالھم**) کہا ہے نا قرآن نے' کتنی حرماں نصیبی ہے اس قوم کی عزیزانِ من! کہ کام کرتی چلی جائے نتیجہ برآمد نہ ہو ۔ میں کہتا ہوں مذہب کے نام کے اوپر اس گئے گذرے دور میں بھی جتنا کام یہ قوم کر رہی ہے اتنی مشقتیں اٹھاتی ہے اتنی صعوبتیں برداشت کرتی ہے اتنا روپیہ صرف کرتی ہے اتنا وقت دیتی ہے اس کے اوپر ۔(**اولئک حبطت اعمالھم**) ۔قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے سنتے ہیں لیکن جس سننے میں عقل و فکر کو دخل نہ ہو اس میں اور بہرے میں فرق نہیں ہوتا ۔(**ومنھم من ینظر الیک**) (10:43) پہلے بھی یہ آیت آ چکی ہوئی ہے سورۃ اعراف میں'

وہاں بھی میں نے عرض کیا تھا کہ اب یہاں تو وہ جو ہمارے ہاں کی زبان ہے اپنی ''اوہدا گھوڑا مک جاندا اے''۔(**ومنهم من ينظر اليک**) (10:43) یہ آتے ہیں مجلس میں بیٹھتے ہیں تیری طرف دیکھ بھی رہے ہوتے ہیں(**افانت تهدی العمی**) (10:43) کیا ان اندھوں کو تو کچھ دکھا سکے گا۔ کہہ تو رہے ہیں کہ بیٹھے ہیں مجلس میں(**و ینظر الیک**) دیکھ رہے ہیں تیری طرف' اس کے بعد کہہ رہا ہے اندھے۔ کیا بات ہے عربی زبان کی!! (**ولو کانوا لا یبصرون**) (10:43) ینظرون اور یبصرون جو ہے اس کا میں کیا ترجمہ کر کے آپ کو بتاؤں' ہیں نہیں لفظ۔ دیکھ رہے ہیں تمہیں نظر ہے بصر نہیں ہے۔ یعنی ہم بصارت کو بھی اپنے ہاں بینائی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں وہ تو نظر اور بصر میں بھی فرق کرتا ہے۔ الگ بات ہے کہ وہ بصارت اور بصیرت میں بھی فرق کرتے ہیں لیکن یہاں تو نظر اور بصر میں فرق کر رہا ہے۔ دیکھ رہے ہیں تیری طرف۔ تو اب میں یہی مفہوم بیان کرونگا نا کہ جس دیکھنے میں بھی کیفیت یہ ہو کہ نگاہیں Physically تو دیکھ رہی ہوں دماغ کہیں اور ہوا سے وہ کہتا ہے کہ (**لو کانوا لا یبصرون**) (10:43) دیکھ رہے ہیں لیکن دیکھ نہیں رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے نا ہے نہیں لفظ اس کے لیے کہ کیا کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ شکایت جو تھی غالب کو اس میں اختصار تھا اصل میں' نظر اور بصر میں فرق نہیں تھا۔

بہت دنوں کے تغافل نے تیرے کی پیدا
وہ اک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

وہ نگاہ سے کم ہی ہو نگاہ لیکن بہر حال اس کے اندر نگاہ تو تھی نا۔ یہاں یہ نظر اور بصر کی بات جو ہے اس کو کون بتا سکے گا۔ لیکن یہ دیکھنا تو آپ جانتے ہیں نا کہ اس قسم کا بھی دیکھنا ہوتا ہے جیسا وہ سننا جیسا یہ دیکھنا۔(**ان اللہ لا یظلم الناس شیئًا ولٰکن الناس انفسهم یظلمون**) (10:44) کہا سمجھ لیا تم نے جو کہتے ہو کہ صاحب یہ قرآن پڑھنے والے محفلوں میں بیٹھنے والے درس سننے والے اتنا وقت دینے والے یہ ذکر کرنے والے اتنی محنت و مشقت کرنے والے اس کے باوجود حالت یہ کہ دن بدن اپنی نگاہوں میں ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! غیر تو ایک طرف رہا ہم اپنی نظروں میں ذلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب یہاں پہنچتے ہیں تو چونکہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اس کے اسباب نہیں ڈھونڈتے' بات آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ اللہ کا عذاب تم پہ آ گیا صاحب۔ آخری فقرہ یہی ہمارے ہاں ہوتا ہے نا' خدا کی مرضی یہی تھی صاحب' منظور ہی یہی ہے صاحب' جسے چاہتا ہے وہ ذلت دیتا ہے جسے چاہتا ہے وہ عزت دیدیتا ہے'۔ یہ فقرے جو ہیں یہ ساری اپنی ذلتیں یہ عذاب یہ سزائیں یہ صعوبات جو ہمیں مل رہی ہیں ان کے متعلق یہ کہہ کے اپنے آپ کو فریب دے لیا جاتا ہے نا کہ خدا کی طرف سے یہ آیا ہے ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ وہ کہتا ہے(**ان اللہ لا یظلم الناس شیئًا**) (10:44) اوان سے کہدو یوں قرآن کو سننے والوں سے کہ ہم کسی پہ بالکل ظلم نہیں کرتے۔ یہ جو اس کے بعد تباہیاں ان پہ آتی ہیں اور اس کے بعد پھر یہ ایک فریب اس کے اوپر اور فریب ایک جھوٹ کو سچا کرنے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں نا۔ اس کے بعد یہ انتہائی فریب کہ جی ہاں یہ اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے۔ کہتا ہے ہم تو ذرا

بھی کسی کے اوپر ظلم نہیں کرتے۔(**ولٰکن الناس انفسھم یظلمون**) (10:44) یہ اپنے آپ پہ خود ظلم کرتے ہیں۔ پہلے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ یہ سارے پروگرام یہ سارے قوانین یہ سارے ضابطے ہدایتیں یوں دے رکھی ہیں ان کے سامنے۔ اور اس کی طرف یہ آتے بھی ہیں یہ قوم' ابھی تک مذہب پرست ہے انکار نہیں کیا اس ستر کروڑ میں سے کسی ایک نے بھی اس قرآن سے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہے کہ دن بدن حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کے بھی وہی کیفیت ہے ان کی کہ پھر نہیں کھڑے ہو کے سوچتے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ یہ سارا کچھ ہماری طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کہا ان سے کہدو(**ان اللہ لا یظلم الناس شیئًا ولکن الناس انفسھم یظلمون**) (10:44)۔

(**و یوم یحشرھم کان لم یلبثوا الا ساعۃً من النھار یتعارفون بینھم قد خسر الذین کذبوا بلقآء اللہ و ما کانوا مھتدین**) (10:45) بات تو اگر میں اس کو لے جاؤں حشر کی طرف قیامت کی طرف تو لمبی بات ہو جائے گی۔ میں اُس وہاں بتاؤنگا۔ یہاں لفظ تو آیا ہے حشر کا' قرآنِ کریم میں قیامت کے دن کا جو جمع ہونا ہے اس کو بھی کہتے ہیں۔ حشر کے معنی ہوتا ہے کہیں اکٹھا کر دینا۔ اور عربی زبان میں بھی اور قرآن میں بھی یہاں بھی میدانِ جنگ میں جو آمنے سامنے ہوتا ہے اس کو بھی قرآن نے حشر کہا ہے۔ یہ جو اجتماع اس قسم کے ہوتے ہیں۔ میں تفصیل میں نہیں جاتا۔ وہ کہتا ہے یہ جو اس طرح سے کہنے والے ہیں کہ خدا نے ظلم کر دیا حالانکہ یہ ان کے اپنے ہاں کا ہوتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ جہنم میں پھر آپس میں ان کے مکالمے ہونگے لیڈرز کے اور Followers کے۔ وہ اس پہ الزام دیں گے وہ ان کو الزام دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ جیسا دودھ ہے ویسی بالائی نکل آئی اس میں سے' دودھ ہی گندا تھا بالائی کیسے اچھی ہوتی۔ یہ کہتے کہ تم ہی سب کچھ تھے جو ہمیں اس طرف لے گئے تم تو ہماری امامت کر رہے تھے قیادت کر رہے تھے تم صحیح راستے پہ ہوتے تو ہم غلط پہ کیوں جاتے۔ قرآن یہ کچھ کہتا ہے کہ جھگڑ رہے ہونگے۔ کہتا ہے کہ جب یہ آمنے سامنے اکٹھے ہونگے۔ یاد رکھئے قیامت کے متعلق بھی یہ یاد رکھئے قرآنِ کریم نے بالتصریح وہاں یہ کہا ہے (**یتعارفون**) (10:45) وہاں اکٹھے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونگے اور پہچان رہے ہونگے ایک دوسرے کو۔ اور میں نے کہا تھا عزیزانِ من! کہ کم از کم میں جب اس کا احساس کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں اس سے بڑا اور عذاب کیا ہو سکے گا کہ وہ لوگ کہ جن کے اندر میں ساری عمر اتنا معتبر بنا رہا قرآن کا درس دینے والے مفسرِ قرآن اتنی کتابیں لکھیں بڑے مزکی پرہیزگار ساری عمریوں گذاری فریب دیتے ہوئے جھوٹ دیتے ہو اس انداز کا کامیاب فریب کہ کسی کو پتہ نہ لگنے پائے کہ میرے دل میں کیا ہے اور میں یہ کیا کہہ رہا ہوں' دوستوں سے فریب عمر بھر منافقت کے اندر اس کے ساتھ رہے ریاکاریاں برتتے رہے اور مر گئے اور ذہن میں رکھا کہ بڑا کامیاب رہے صاحب کسی کو پتہ نہیں لگنے دیا۔ اور اس کے بعد عزیزانِ من! جو قرآن یہ کہتا ہے کہ تم نے آنکھ بند کی وہاں پہنچے یہ سارے تمہارے سامنے ہونگے اور یہ سینہ کہ جس کے اندر تم نے اس منافقت کو چھپا رکھا ہوگا کھل کے سامنے آیا ہوا ہوگا۔ کہا سوچو تو سہی ان کے سامنے تمہاری وہاں کیا قیامت کی حشر ہوگی۔ اوہو ہو ہو۔

عزیزانِ من! کسی ایک دوسے کہ جس کو آپ نے اتنے فریب دیے ہوں آپ کی کوئی ایک بات اس کے سامنے کھل کے آ جائے آپ عمر بھر اس کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوتے کہ اسے پتہ چل گیا کہ میں جھوٹا ہوں۔ اور اگر یہ صورت ہو کہ ساری عمر جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا وہ سامنے ہوں اور سارے جھوٹ جو بولے تھے منافقت جو برتی تھی ریاکاریاں جو کی تھیں وہ ساری کی ساری کھل کے سامنے آ جائیں۔ اور کہا یہ کہ کیفیت یہ ہو کہ

جو چپ رہے گی خزانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

تمہاری زبان اگر نہیں گواہی دے گی ہاتھ پاؤں گواہیاں دیں گے کہ اس کم بخت نے کیا تھا تمہارے خلاف۔ دوست سامنے کھڑا ہو یوں عمر کے جھوٹ فریب اور منافقتیں کھل کے سامنے آ جائیں میں کہونگا اس کے بعد تو کسی اور جہنم میں لے کے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ **(یتعارفون بینھم)** (10:45) ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ **(قد خسر الذین کذبوا بلقآء اللہ وما کانوا مھتدین)** (10:45) کہا سوچو تو سہی کہ جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی تکذیب کرتے چلے جاتے تھے کہ جھوٹ ہے' سوچو تو سہی کہ وہاں کتنا بڑا نقصان وہاں ہوگا۔ اور پھر اس کے بعد تو سوال یہ بھی نہیں ہوگا کہ صاحب ہمیں واپس بھیج دیجیے دوبارہ میری توبہ کہ میں یہ کچھ کروں۔ کہنے لگے یہاں دوبارہ کا سوال ہی نہیں ہوتا یہاں کا ہر Subject, Compulsory Subject ہے کہ جس میں فیل ہوا گیا اور دوسرا چانس ہی پھر نہیں ہے' نامہ ہی کٹ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! ایک ہی چانس ہے اس میں زندگی کی یہ کیفیت اور اس طرح سے اگر گذاری ہوئی ہے۔ یہ ہے تکذیب' مکافاتِ عمل سے عزیزانِ من!۔ آج وقت ہو گیا ہم سورۃ یونس کی آیت 45 تک آ گئے۔ 46 میں آگے آئے گی بات وہ جو کہا تھا کہ یہ انجام کا انتظار نہیں کر رہے فصل بوئی ہوئی ہے پکنے تک کا انتظار تو کر لیں۔ اگلی آیتوں میں اس کی تفصیل سامنے آئے گی اور پوری تاریخ سامنے ہمارے آ جائے گی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔نواں باب (آیات 46 تا 56)

عزیزانِ من!

آج ستمبر 1973ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی آیت 46 سے ہو رہا ہے۔ (10:46)

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں اور اس سے بھی پیوستہ میں بات یہ چلی آ رہی تھی کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریقہ کیا ہے۔قرآن کے الفاظ میں یہ بات تھی کہ یہ لوگ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں جلدی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے۔تو اس کے لیے بتایا تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ یہ اس کے حقائق اور معارف علمی سطح پر سمجھنے کی چیز ہے۔تو یہ انہیں علم و بصیرت کی رو سے نہیں سمجھتے یونہی دھاندلی سے نہ کرتے چلے جاتے ہیں یا اپنے سابقہ متواتر عقائد اور نظریات جو چلے آتے ہیں جن کی بنیاد علم و بصیرت نہیں ہے۔چونکہ یہ ان کے خلاف ہیں اس واسطے ان سے انکار کرتے ہیں۔بہرحال یہ چیزیں تفصیل سے ہو گئی تھیں۔ایک بات ان میں یہ تھی کہ دوسرا طریقہ یہ ہے ان سے کہو کہ میں جو نظریات پیش کر رہا ہوں ان کو عمل میں لانے کے لیے میرے پاس عملی پروگرام ہے میں اس پہ عمل پیرا ہو رہا ہوں۔تم مجھے اس کی اجازت دو کہ میں اپنے طور پر اس پر عمل کروں تم اپنے طور پر اپنے نظریات پر عمل کرو نتائج خود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ صحیح ہے کون غلط کہتا ہے۔ یہ جسے Pragmatic Test کہتے ہیں کہ نتائج کے ذریعے سے کسی پروگرام کے عملی ثمرات کے ذریعے سے اس نتیجے پہ پہنچنا کہ وہ ٹھیک ہے یا غلط ہے۔اس پہ بڑی اہمیت دی گئی تھی۔(**قل یقوم اعملوا علٰی مکانتکم انی اعمل**) کہ تم اپنے طور پر کام کیے جاؤ مجھے اپنے طور پر کام کرنے دو نتائج خود بتا دیں گے کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا ہے۔بڑا ہی مؤثر اور اہم اور مبنی علی الحقیقت ایک دعویٰ ہے۔لیکن اس میں بھی ایک چیز تھی وہ بھی اس کے لیے تیار نہیں تھے اور یہ بھی اس لیے سامنے جلدی سے نہیں لا سکتے تھے کہ وہ جو فطرت کا طریقہ ہے کہ بیج بونے میں اور فصل پکنے میں ایک درمیانی عرصہ ہوتا ہے ایک وقفہ ہوتا ہے۔یہ لوگ جو جھٹلاتے تھے وہ یہ کہتے تھے کہ تم یہ جو روز دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔قرآن نے جو کہا ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی تم یہ کہہ رہے ہو تو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں کہ اس کے الٹ ہو رہا ہے ظالم تو پنپتا چلا جاتا ہے۔وہ یہ کہتے تھے آ کر۔ادھر سے جسے کہا جاتا تھا اس کی بھی صورت یہ نہیں تھی کہ وہ آ کر کہیں اور یہ کچھ اسی طرح سے نظر بٹو کو پھیرے اور اس کے بعد نتیجہ سامنے لے آئے۔یہ نہیں کر سکتا تھا۔اسے بھی انتظار کرنا ہوتا تھا اس وقت تک کا۔اور یہ واقعی یہ چیز جو ہے آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی کبھی کچھ دھاندلیاں زیادہ ہوتی ہیں یہ اعتراض بھی بہت ابھر کر سامنے آ جاتا ہے کہ صاحب قرآن یہ کہتا ہے کہ ان کو کامیابی نہیں ہو سکتی یہ تباہ ہو جاتی ہیں برباد ہو جاتی ہیں۔قومیں جب اس قسم کے احوال و کیفیات میں سے گذرتی ہیں تو اس کے بعد اس نے سابقہ قوموں کی مثالیں دی ہیں کہ اس طرح تباہی آئی اس طرح سے یہ ہوا۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب یہاں تو کسی کا کچھ بگڑتا ہی نہیں ہے بلکہ روز بروز یہ

لوگ اور زیادہ مرفع الحال ہوتے جاتے ہیں یہ غریب بے کس بے بس اور پستے چلے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات ابھر کے آجاتے ہیں سامنے۔ اُدھر سے بھی آتے ہیں اِدھر سے بھی بہرحال جو شخص ایک پروگرام کو لے کر نکلا ہے اسے عمل میں لانے کے لیے اس قدر مشکلات اس قدر دشوار گذار راستوں سے اسے گذرنا پڑتا ہے اور اس پہ ایک لمبا عرصہ لگ جاتا ہے۔ فطری طور پر دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا اللہ مجھے ایمان تو ہے یقین تو ہے اس پہ کہ یہ کھیتی پکے گی نتائج برآمد ہونگے۔ تو کیا میری ساری عمر انہی مشکلات میں گذر جائے گی یا یہ میرے سامنے نتیجہ سامنے آجائے گا۔ سامنے نتیجہ دیکھنے کی آرزو بڑی فطری ہوتی ہے' جی چاہتا ہے کہ یہ ایسا ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اس دعوے سے پہلے کی چالیس سالہ زندگی اندازہ لگایے اس زمانے میں دولت معیارِ تکریم یا عزت نہیں ہوتا تھا کریکٹر ہوتا تھا۔ کریکٹر کے اعتبار سے زندگی کی یہ کیفیت کہ سارا معاشرہ آپ کو امین کہتا تھا' اپنے معاملات میں آپ کو ثالث مقرر کیا کرتا تھا۔ قبائل کے بڑے بوڑھے بھی آتے تھے جس معاملے میں تنازع ہوتا تھا اختلاف ہوتا تھا ان سے اس کا حل چاہتے تھے۔ تو گویا معاشرے میں ایک بڑی معزز حیثیت تھی۔ کوئی تکلیف نہیں تھی کوئی دکھ نہیں تھا گھر میں آسائش تھی آرام تھا جنتی زندگی تھی۔ یہ دعوت شروع کی چاروں طرف سے مخالفتیں ہجوم کر کے آگئیں۔ وہی معاشرہ کہ جو چالیس سال تک اتنی عزت کرتا چلا آرہا تھا انہوں نے وہاں جینا دوبھر کر دیا۔ پتھر پڑ رہے ہیں گالیاں دی جارہی ہیں الزامات تراشے چلے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ وطن چھوڑ دینا پڑا' گھر بار چھوڑ دینا پڑا' عزیز رشتہ داروں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آپ سوچئے ناکس قدر صبر آزما یہ مراحل ہوتے ہیں۔ اور اگلی بات یہ کہ وہ جس پروگرام کو لے کر نکلے ہیں اس کے بھی نتائج محسوس شکل میں ابھی سامنے نہیں آرہے۔ بڑا ہمت طلب تھا مرحلہ یہ۔ تو اس معصوم سی آرزو کا دل میں مچل جانا کہ یا اللہ میری ساری عمر اسی طرح سے یہ مار کھاتے ہوئے گذر جائے گی یا وہ میری آنکھوں کے سامنے بھی سامنے آئے گا۔ یعنی یہ نہیں کہ اس میں یقین نہیں رہا کہ آئے کہ نہ آئے' آئے گا تو ضرور۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ میرے سامنے یہ ہو جائے گا یا نہیں ہو جائے گا۔ تو یہ چیز وہ جو پہلی آیتیں گذری ہیں آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں فطری ربط ہے اس آرزو کا۔ تو قرآن کا تو انداز یہ ہے کہ وہ چیزیں مسلسل بیان نہیں کرتا Gaps درمیان میں چھوڑتا ہے کہ تم اپنی بصیرت سے ربط قائم کرتے ہوئے Gap کو Fill in کرو۔ یہ الفاظ تو حضور ﷺ کے یہ آرزو اس کا تو اظہار نہیں الفاظ میں آیا جواب آیا ہے اس کا کہ اچھا یہ بات تمہارے دل میں بیدار ہوئی ٹھیک ہے ہونی چاہیے۔ لیکن ہم تو کسان کی ہزار آرزوؤں کے باوجود یہ کبھی نہیں کرتے کہ جس فصل کے پکنے میں چھ مہینے لگنے ہیں وہ پانچ مہینے میں پک کے سامنے آجائے۔ کسان روز دعائیں مانگتا ہے' یہی نہیں' کسان کے بچے بھوک سے مر رہے ہیں ان کی خاطر ہی یہ کر دیا جائے کہ صاحب وہ چار مہینے میں پک کے گھر آجائے۔ ہم تو یہ نہیں کیا کرتے۔ یہاں تو ہر چیز قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے اور کسی کی آرزو وہ کتنی ہی معصوم اور مقدم کیوں نہ ہو اس کی خاطر بھی ہم اس میں تبدیلی نہیں کیا کرتے۔ (**و اما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک**) (10:46) تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے کہ یہ نتائج تمہاری زندگی میں سامنے آتے ہیں یا تمہارے مرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ یہاں تو آگے

یہ کہا کہ (**فالینا مرجعھم ثم اللہ شھید علٰی ما یفعلون**) (10:46) یہ بات کہ خدا جیسا ایک قادرِ مطلق دیکھ رہا ہے کہ یہ کیا کر رہے ہیں تمہارے لیے یہ کافی ہونا چاہیے۔ یہ تمام جو کچھ یہ کر رہے ہیں ان کے تمام پروگرام نے ان کی تمام حرکات وسکنات نے پلٹ کر آنا ہے اسی ہمارے قانونِ مکافات کے نقطے پر اور اسکے مطابق اس کا نتیجہ مرتب ہونا ہے۔ اس لیے تمہیں اس میں گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ باقی رہا یہ کہ صاحب تمہاری زندگی میں ہو جائے یا وہ تمہارے بعد ہوگا۔ عزیزانِ من! حضورﷺ تو ایک طرف آج ہمارا بھی یہ جی چاہتا ہے کہ اتنی لمبی مصیبتیں مشقتیں گذارنے والے مزدور کو اتنا تو کہہ دیا جاتا کہ خیر کوئی بات نہیں تمہارے سامنے یہ سامنے آ جائے گا۔ لیکن میں نے کہا ہے نا کہ خدا بننا تو جچتا ہی اسے ہے کہ جو جذبات میں نہ آ جائے۔ میں نے کہا ہے کہ موقعہ ہی ایسا ہے کہ آج ہمارے ذہن میں یہ بات اٹھتی ہے کہ اتنی سی بات تو ہونی چاہیے نا۔ جواب اس کا ہے' یہی الفاظ ہیں سورۃ الرعد کی آیت 40 ویں۔ غور کیجیے جواب کیا ملتا ہے۔ (**و ان ما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک**) (13:40) وہی الفاظ ہیں۔ تمہاری زندگی میں یہ نتائج سامنے آ جائیں یا تمہاری وفات کے بعد سامنے آئیں تمہیں اس سے غرض نہیں ہے۔ سنیے کہا کیا ہے۔ (**فانما علیک البلٰغ و علینا الحساب**) (13:40) تیرا کام یہ ہے کہ تو اس آواز کو پہنچائے چلا جا پہنچائے چلا جا یہ کہ یہ نتائج کب برآمد کرے گی اس کا حساب کرنا ہمارے ذمہ ہے تمہارے ذمہ نہیں ہے۔ غور فرمایا آپ نے۔ اپنے فریضے کو ادا کرتے چلے جاؤ۔ یقین تو ہے نا تمہیں کہ یہ نتائج مرتب ہونگے۔ بات تو اتنی ہی کہتے ہو نا تم کہ کب سامنے آئیں گے۔ (**علینا الحساب**) (13:40) اس کے لیے قانون ہے ہمارے ہاں' اس قانون کی رو سے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہم حساب کر رہے ہیں کتنے دن ابھی باقی ہیں فصل کے پکنے میں۔ اسے ہم پہ چھوڑو۔ (**علیک البلٰغ**) (13:40) تمہارے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے یا تم نے اپنے ذمہ جو فریضہ لیا ہے تم اسے ادا کرتے چلے جاؤ اس یقین کے ساتھ کہ اس کا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ یہ کہ وہ کب نکلے گا نتیجہ یہ ہمارے حساب کے مطابق ہوگا ۔ یہ جواب ملتا ہے عزیزانِ من! ۔ نظر بظاہر خاصا ہمت شکن ہے یہ کہ مجھے کیا ملے گا۔ لیکن جب یقیں محکم ہو تو پھر ہمت نہیں ٹوٹتی۔

اب یہ بات کہ میری زندگی میں نہیں ہوگا اس کے متعلق قرآن نے ایک ایسی نفسیاتی چیز کہی ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ یہ جو اتنی بڑی ہوس ہے کہ میری زندگی میں سامنے آئے یہ تو وہی کہے گا کہ جو سمجھے کہ موت کے ساتھ میرا خاتمہ ہو جانا ہے۔ اور جب ایمان یہ ہے کہ زندگی جو ہے مسلسل چلنی ہے موت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی میں نے تو اس کے بعد بھی زندہ رہنا ہے۔ تو جب کیفیت پھر یہ ہے کہ تو نے مرنا ہی نہیں ہے تو پھر یہ تمہارے دل میں کیوں خیال پیدا ہو رہا ہے۔ ہمارے متعلق جو تم کہتے ہو کہ بڑے بڑے لمبے دن خدا کے ہوتے ہیں جلدی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے نا کہ ہم نے مرنا نہیں ہے۔ کرنے کو تو ہم ایک دن میں یہ کر سکتے ہیں۔ مشکل کیا ہے؟ جس نے ایک کن کہنے سے اتنی بڑی کائنات وجود میں لے آیا' کیا مشکل ہے کہ ادھر ڈالے گیہوں کا دوسرے دن فصل پک کے سامنے آ جائے۔ ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم دیکھتے ہو کہ ہم یہ اس طرح نہیں کرتے۔ مقرر کیا ہوا قاعدہ ہے اس کے مطابق وہ چیز اگتی ہے پھلتی ہے پھولتی ہے اتنا وقت لیتی ہے۔

تو یہ جو ہمارے ذہن میں اضطراب نہیں پیدا ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مرنا نہیں ہے۔ تو جب تمہیں بھی یقین یہ آ جائے کہ تم نے مرنا نہیں ہے تو پھر تم اس سے مایوس نہیں ہوگے کہ یہ میری زندگی میں سامنے آتا ہے یا نہیں۔ زندگی کا پیمانہ بدل دو یہ اضطراب ختم ہو جائے گا۔ کیا بات ہے صاحب!!!۔ قرآن تو عزیزانِ من! انسان کو چھوٹے پیمانے میں خدا بنا دیتا ہے اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ مقام کیا دیا ہے۔ واقعی کام کرنے والا تھک کے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ وہ بے تابی ہے

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

یہ جو اضطراب ہے نا کہ

دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

یہ اسی کے لیے ہوتا ہے کہ جسے یہ معلوم ہو کہ اس کے بعد میں نہیں رہونگا۔ اس کے بعد 'پس ازاں کہ من نہ مانم ہیچ چہ کار خواہی آمد' میں ہی نہیں رہونگا تو پھر آ ؤ گے تو کیا ہوگا۔ وہ کہتا ہے تمہارے دل میں یہ خیال ہی نہیں پیدا ہو سکتا کہ میں نہ رہونگا' تم نے مرنا ہے کہیں؟ تم نے تو زندہ رہنا ہے۔ اس واسطے یہ جو پیمانہ ہے یہاں سامنے آئے گا یا نہیں آئے گا اس کے لیے تمہیں مضطرب و بیقرار نہیں ہونا چاہیے۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من ! کہ یہ جو قرآن کو ماننے والا مردِ مومن ہے اس کی زندگی کے یہ تصورات کیسے بدل دیتا ہے۔ اتنی سی بات کہ صاحب میری زندگی میں سامنے نہ آیا میں مر گیا مشقتیں کرتا کرتا مجھے کیا ملا۔ یہ تصور ہی ذہن سے اٹھ جاتا ہے اس کے۔ یقین یہ ہونا چاہیے کہ جس پروگرام کو لے کے میں اٹھا ہوں یہ صداقت پر مبنی ہے نتائج مرتب ہونگے۔ میری زندگی میں ہو جائیں تو کیا بعد میں ہو جائیں تو کیا۔ حالانکہ بڑے بڑے اربابِ عزم جو ہیں وہ بھی اس مقام پہ کئی دفعہ ہمتیں ہار دیتے ہیں کہ نہیں صاحب نہیں ہوتا۔ آخری وقت میں پھر وہ آ جاتے ہیں کہ چلو اللہ اللہ ہی کریں۔ مایوسی کا نام رہتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس کی بناء پہ قرآن کہتا ہے کہ (**لا تقنطوا من رحمة الله**) یہ جو ہے رحمت اللہ سے قنوط' یہ کسے ہوتا ہے؟ وہ یہی چیز چاہتا ہے نا کہ میری زندگی میں یہ سامنے آ جائے۔ پروگرام ایسا ہو کہ جس کی صداقت پہ یقین ہو کہ نتائج نکل کے رہیں گے اور اس کے بعد یہ چیز کہ میں نے تو مرنا ہی نہیں ہے' مایوسی آ ہی نہیں سکتی عزیزانِ من!۔ بڑی عظیم چیز ہے جو قرآن اس میں کہہ گیا ہے۔ وہ جب ایسی ذاتِ اقدس و اعظم کو جو خدا سے قریب تریں محبوب تریں جسے ہم کہتے ہیں اسے یہ جواب مل رہا ہے تو دوسرے جو ہیں ''ایہہ کیہڑے بنے دے سادھو؟؟ ہوندے ہیگے'' کہ ان کے لیے خدا اپنا قانون بدل دے گا' حساب بدل دے گا کہ ہاں صاحب ہم نے تو مر جانا ہے جلدی جلدی ہمیں کچھ کر کے دکھا دیجیے۔ یہ جو نشاطِ کار ہے یہ ان چیزوں کے اندر خوشی کہ نتیجہ میرے ہی سامنے آ جائے یہ تو اسی کے لیے ہے کہ جس نے موت کے متعلق سمجھنا ہو کہ اس سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ مرنے والا جو ہے اس کو کبھی یہ اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ کہا قاعدہ ہے قانون ہے۔ سنو کیا قانون ہے؟ چلا آ گے یہ سلسلہ۔

پہلی بات یہ کہ (و لکل امۃٍ رسول فاذا جآء رسولھم قضی بینھم بالقسط و ھم لا یظلمون) (10:47) پہلی چیز تو یہ ہے کہ غلط چلنے والوں کے سامنے ان کو وارننگ دینے والا آنا چاہیے وارننگ ملنی چاہیے ان کو تنبیہ ہونی چاہیے کہ یہ غلط راستہ ہے جس پہ تم چلے جا رہے ہو۔ قرآن نے متعدد مقامات پہ کہا ہے کہ ہم یونہی کسی امت کو تباہ کر دیا کرتے تاوقتیکہ انہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ ہم جس راستے پہ جا رہے ہیں غلط ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ جب تک نبوت کا اجراء تھا اس زمانے تک رسول آتا تھا' ختمِ نبوت ﷺ کے بعد رسالت باقی ہے حضور ﷺ کی' قرآن باقی ہے قیامت تک۔ اس کے معنی یہ ہیں' یہی ہے رسالت پیغام' یہ باقی ہے۔ غلط چلنے والی قومیں جو ہیں آج یہ نہیں کہہ سکتیں کہ ہمیں اس کا علم نہیں تھا۔ تو کہا یہ کہ ایک تو یہ ہے کہ ان کو یہ علم ہو جانا چاہیے۔ جب یہ علم ہو جاتا ہے وارننگ مل جاتی ہے اس کے باوجود وہ قوم صحیح راستے پہ نہیں چلتی۔ اب دیکھئے جسے عام الفاظ میں تو اتمامِ حجت اسے کہتے ہیں۔ اتمامِ حجت نہیں ہے بلکہ یہ بڑا ہی انصاف کے مطابق ہے یہ کہ غلط چلنے والے کو یہ تو بتا دیا جائے کہ راستہ غلط ہے۔ یہیں سے قانونی ایک چیز سامنے آتی ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ جب تک ایک بتانے والا نہ آئے ہم قوم کو ہلاک نہیں کرتے۔ قانونی نقطہ یہ ہے کہ قانون ملک کا جو ہے اس کی اس طرح سے تشہیر ہونی چاہیے کہ ہر فرد کو معلوم ہے کہ قانون کیا کہتا ہے۔ غلط معاشرے کے اندر پہلی چیز یہ ہے کہ وہ قانون اس کا پتہ ہی نہیں چلتا کسی کو۔ وہ کیا ہے کب بن گیا پھر اس کے بعد جو Ammendments ہوتی ہیں ان کے متعلق پتہ نہیں۔ اچھے اچھے Lawers جو ہیں ان کو معلوم نہیں ہوتا عوام کو تو ایک طرف رہا۔ کوئی مشینری ایسی نہیں ہوتی کہ جس کے ذریعے سے ہر فرد تک یہ بات پہنچ جائے کہ قانون کیا کہتا ہے۔ یہ ہوتی نہیں اور قانون یہ کہتا ہے کہ Ignorance of Law is no execuse یہ کہ صاحب اس قانون کا ہمیں پتہ نہیں تھا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا جو عدل کا بنیادی تصور ہے اس میں یہ بات ہے کہ یہ بات پہلے پہنچائی جانی چاہیے کہ غلط کیا ہے صحیح کیا ہے۔ پھر اس کے بعد آگے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ (قضی بینھم بالقسط) (10:47) عجیب چیز ہے یہاں۔ میں نے کہا تھا نا کہ قانونی نقطہ۔ وہ کہتا ہے انصاف کے مطابق پھر فیصلہ ہوتا ہے اور انصاف کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ قانون کیا ہے' میں اس کی خلاف ورزی کر رہا ہوں یا اس کے مطابق چل رہا ہوں۔ (قضی بینھم بالقسط) (10:47) قانون کا تقاضا پورا نہیں ہوتا اگر اس طرح سے قانون کی تشہیر نہ کی جائے کہ ہر فرد کو معلوم ہو کہ قانون کیا کہتا ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں دورِ اول تو ایک طرف رہا وہاں تو یہ ایسا انتظام تھا اس کے بعد کا زمانہ بھی جو ہمارا تھا جب پچھلے نقوش ابھی چلے آ رہے تھے۔ مملکت کی طرف سے جسے اب مفتی کہتے ہیں نا ''ایہ مفت دیاں کھان والائیں سی ہوندا'' یہ گورنمنٹ کی طرف سے حکومت کی طرف سے Institute ہوتی تھی یہ کہ ہر فرد معلوم کرنا چاہے کہ فلاں معاملے میں قانون کیا کہتا ہے تو وہ وہاں جا کے ان سے معلوم کر سکتا تھا بغیر معاوضے کے۔ قانون کا تو اس زمانے میں معاوضہ ہوتا ہی نہیں تھا دینا ہی نہیں پڑتا تھا۔ یعنی یہ گورنمنٹ کی طرف سے حکومت کی طرف سے یہ مقرر ہوتے تھے کہ وہاں جا کے وہ یہ پوچھ لے کہ جی فلاں معاملے میں قانون کیا کہتا ہے۔ قاضی نہیں وہ ہوتے تھے وہ اس کے

Particular Case میں فیصلے نہیں دیتا تھا وہ شخص۔ وہ صرف یہ بتاتا تھا کہ ایسے معاملے میں قانون کیا ہے۔ وہ اس کے لیے تھا کہ قرآن نے یہ شرط عائد کر رکھی ہے (**قضی بینھم بالقسط**) **قسط** کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے رسول آئے۔ اب دیکھا کس کس انداز سے قرآن بات کر جاتا ہے۔ (**و ھم لا یظلمون**) (10:47) یوں کیا جائے گا تو اسے آپ ظلم نہیں کہہ سکتے کہ جی پتہ ہی نہیں کوئی بتایا ہی نہیں کوئی انتظام ہی نہیں مجھے معلوم ہی نہیں تھا اور یونہی میرا ٹینٹوا دبائے جا رہے ہیں۔ **بالقسط** اس وقت ہوتا جب پہلے رسول آئے گا۔ (**وھم لا یظلمون**) یوں ہوگا وہ۔ (**و یقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صٰدقین**) (10:48) کہا یہ ٹھیک ہے تمہارے جی میں بھی یہ آرزو مچلی۔ لیکن یہ تو اعتراض کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ کہیے جو تم کہتے ہو تباہی آئے گی تخریب ہوگی گرفت ہوگی' کب ہوگی یہ؟ **متٰی** کا وقت آ گیا۔ پوچھا جاتا ہے رسول سے جو روزان سے کہتا ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ٹھیک ہے۔ کسی نیت سے بھی پوچھتے ہوں بہرحال وہ یہ پوچھتے ہیں کب ایسا ہوگا۔ کہا مجھ سے پوچھ رہے ہو نا۔ عجیب چیز ہے آگے جو کہی گئی ہے۔ کہا میں تمہیں بتاؤں میری حیثیت کیا ہے اس معاملے سارے کے اندر' میری حیثیت یہ ہے کہ (**لا املک لنفسی ضرًا و لا نفعًا**) (10:49) تم تو ایک طرف رہے میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع اور نقصان کا کوئی اقتدار اور اختیار نہیں رکھتا چہ جائیکہ تمہارا متعلق میں فیصلہ دیدوں کہ ہاں صاحب پرسوں مارے جاؤ گے تم۔ اور دوسری چیز اس میں دوسرے مقامات پہ قرآن نے یہ کہا ہے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے تمہیں غیب کا علم نہیں کل کیا ہونے والا ہے مجھے بھی نہیں علم۔ نفع اور نقصان سے وہ بچتا ہے نفع وہ زیادہ کماتا ہے جسے ذرا پہلے پتہ لگ جائے۔ آپ کو معلوم ہے ذرا پہلے پتہ لگنے سے کیا کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ یہ بجٹ اناؤنس کرنے سے پہلے پہلے کتنے یہ گِدھوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں ان ایوانوں کے کہ کہیں سے بھنک کان میں پڑ جائے کہ کس چیز کے اوپر ٹیکس نیا لگنے والا ہے۔ اتنی سی انفرمیشن جو ہے وہ سیل ہوتی ہے جب لاکھوں میں بکتی ہے۔ ذرا سا پہلے پتہ چل جائے۔ یہ ساری کرامات یہ ساری مزاریں یہ سارے ننگ دھڑنگ کھاتے اسی چیز کا ہیں کہ ذرا مجھے پہلے پتہ لگ جائے یہی پوچھتے ہیں نا جا کے۔ تو یہ مقربین کہلاتے ہیں جو پہلے کچھ بتاتے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا مقرب جو ہے کائنات کے اندر سب سے بڑا مقرب انسان ﷺ وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اپنے متعلق بھی پتہ نہیں کہ کل میرے ساتھ کیا گذرنے والی ہے۔ کیا بات ہے عزیزانِ من!!۔ (**الا ما شآء اللہ**) (10:49) جو کچھ بھی خدا کے قانون کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ یہ میں ضمناً عرض کر دوں یہ جو Construction ہے الا ماشآء اللہ کی۔ پہلے تو اسے سمجھ لیجیے کہ یہ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس زبان میں جو محاورے جو انداز جو تراکیب جو الفاظ تھے قرآن سمجھنے کے لیے پہلے ان کا سمجھنا ضروری ہے۔ یہ جو Construction ہے الا ماشآء اللہ' عربوں کے ہاں موجود تھی اور یہ اس وقت کہتے تھے جب اس میں انہوں نے کہنا ہو کہ حتمی طور پر یہ بات ہے یقیناً ایسا ہے۔ یہ Construction تھی۔ یہ جو ترجمہ ہے نظر بجز اس کے کہ جو اللہ چاہے یہ ہمارا آپ کا ترجمہ ہے۔ عرب یہ ترجمہ نہیں کرتے تھے اس کا' وہ کہتے یہ تھے کہ حتمی طور پر ایسا ہی ہوگا۔ قرآن نے آگے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ اس لیے ہوگا کہ ہر چیز قانون کے مطابق ہوتی

ہے اور قانون کو ہم بدلتے نہیں ہیں۔اس لیے الا ماشآ ءاللہ کے معنی یہ متعین ہو گئے اب 'خدا کے قانون کے مطابق جو بدلتا نہیں ہے'۔تو بات وہی ہوگئی کہ یہ حتمی طور پہ ہوگا ایسا۔ضمناً بات تھی۔کہا پھر یہ چیز کہ صاحب یہ ظلم کرنے والے جو ہیں تباہ فوراً کیوں نہیں ہوتے۔کہا اس لیے کہ وہ جو مشیت ہے خدا کا قانون ہے۔پھر سمجھ لیجیے مشیت کے بھی وہ معنی نہیں جو ہمارے ہاں ذہنوں میں ہیں۔ہمارے ہاں ذہن میں تو مشیت کے معنی ہیں نا جہاں قاعدہ قانون کچھ نہیں جسے ہم کہتے ہیں مرضی اللہ کی 'خدا کی مرضی ایسی تھی'۔مشیت کے بھی یہ معنی نہیں ہیں مشیت کے معنی ہیں خدا کا وہ قانون جو وہاں بنا تھا جہاں ہماری رسائی نہیں ہے۔قانون' قانونِ مشیت جب وہ اس کائنات میں آ جاتے ہیں تو وہ کہیں قانونِ فطرت کہلاتے ہیں کہیں وہ قوانینِ تمدنی زندگی کہلاتے ہیں جو قرآن کے اندر ہیں۔اور وہاں جب تک خدا کے ہاں ہوتے ہیں انہیں قوانینِ مشیت کہا جاتا ہے۔ بہرحال۔کہا اب تمہیں بتاؤں یہ کہ یہ بھی جلدی مچا رہے ہیں تمہارے دل میں بھی یہ آرزو ابھر رہی ہے کہ جلدی سے آئے۔(لکل امةٍ اجل) (10:49) وہ اجل تو ہمارے ہاں تو موت ہی کے لیے ہوتا ہے یہ لفظ۔اجل کے معنی اصل میں ایک معیاد ہوتی ہے ایک وقفہ ہوتا ہے جو بیج بونے میں اور پھل کے پکنے کے درمیان ہوتا ہے۔یہ اجل معیاد کو کہتے ہیں اور اس معیاد کا جو آخری لمحہ ہوتا ہے جہاں اس نے ختم ہو جانا ہوتا ہے اسے بھی اس کی اجل کہی جاتی ہے۔وقفے کا ہر لمحہ اجل ہوتا ہے آخری لمحہ بھی اجل ہوتا ہے۔کہا(لکل امةٍ اجل) (10:49) آ گئی پھر وہی تقدیر کا مسئلہ ہمارے ہاں مجوسیوں کا کہ صاحب قرآن کہتا ہے ہر قوم کی ایک اجل ہوتی ہے مقرر ہوتی ہے۔تو یہ تو مقرر شدہ ہے بات کہ اس قوم نے اتنا عرصہ زندہ رہنا ہے اُس نے اتنا عرصہ زندہ رہنا ہے۔اجل کا یہ ترجمہ پہلے۔اتنی سی چیز لی(لکل امةٍ اجل) اور دوسری جگہ یہ نہ دیکھا عزیزانِ من! وہی تصریفِ آیات۔لیجیے (13:38) ملائیے دونوں آیتوں کو۔(لکل امةٍ اجل . لکل اجل کتاب) ہر قوم کے لیے ایک معیاد ہوتی ہے اس کی موت اور زندگی کی اور ہر معیاد کے لیے ایک قانون مقرر ہے۔بات صاف ہوگئی۔وہ ایک قانون مقرر ہے۔اس قسم کے کام کرنے والی قوم یہ ہوگی۔اس مرنے والے کے لیے بھی تو یہ صورت ہے بعض امراض ایسے ہوتے ہیں دس دس سال تک مرض چلتا چلا جاتا ہے ہر قدم اس کا اٹھ رہا ہوتا ہے موت کی طرف۔لیکن موت آتی ہے پر نہیں آتی' وہ بھی اجل ہوتی ہے۔ایک وہ بھی اجل ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب رات اچھا بھلا سویا صبح اٹھا تو مرا پڑا تھا۔رات تو ایک طرف رہا وہ کہتے ہیں چلتے ہوئے یونہی گر پڑا مر گیا۔اس کے لیے بھی قانون ہوتا ہے۔تو جب کہا کہ قوموں کے لیے قانون ہے تو وہ دیکھنا یہ ہے کہ پھر وہ قومیں کس کس قسم کا کام کرتی ہیں۔(لکل امة اجل و لکل اجل کتاب) ۔ضمناً بات یاد آ گئی ہمارے ہاں یہ جو نبی آتے ہیں عجیب قسم کے جاہلِ مطلق ہوتے ہیں' یہ بہائیوں کے ہاں بھی دعویٰ کیا باب نے اور اس کے بعد بہاءاللہ نے۔وہ کہا یہ کہ صاحب جو کتاب آتی ہے خدا کی طرف سے اس کے لیے ایک پیریڈ ہوتا ہے صرف' ایک زمانہ ہوتا ہے اس زمانے تک کے لیے وہ کتاب زندہ رہتی ہے اس کے بعد پھر اس کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔جیسے کلینڈر ہوتا ہے 31 دسمبر کو ختم' ریلوے کے ٹائم ٹیبل ہر چھ مہینے کے بعد وہ بدلتا ہے۔تو انہوں نے کہا کہ وہ ہر کتاب کے لیے ایک وقفہ ہوتا ہے اس کے بعد وہ اس کا پیریڈ ختم ہو جاتا ہے پھر ایک

نئی کتاب آنی چاہیے۔ یہ ہے ان کے ہاں کا مؤقف۔ وہ اپنے ہر دعوے کو قرآن سے پیش کرتے ہیں۔ یعنی ایک طرف یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ کلینڈر ختم ہو گیا تھا 31 دسمبر تک ''ویاہ دیاں تاریخاں او سے کلینڈر نال متھ دے ہیگے'' دلیلیں اسی قرآن سے لاتے ہیں۔ دلیل یہ لائی گئی (**ولکل کتاب اجل**) ہر کتاب کے لیے ایک پیریڈ ہوتا ہے۔ اور قرآن میں ہے (**لکل اجل کتاب**) ہر معیاد کے لیے ایک قانون ہوتا ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا (**ولکل کتاب اجل**) یا یہ کہ قرآن کے متعلق کہیں یہ آیا ہو کہ اس کی بھی ایک معیاد ہے ایک زمانہ ہے ایک پیریڈ ہے جس میں یہ رہے گا۔ وہ تو قیامت تک کے لیے دیا گیا ہے۔ بہرحال۔

ہر قوم کے لیے اس کے پروگرام اور اعمال کے مطابق۔ یہ کیا ہے جو اجل ہے۔ یہ وہ کشمکش کا زمانہ ہے جو زندگی اور موت کے درمیان مریض کے اندر جاری ہوتا ہے۔ ہلاک کرنے والے عناصر Attack کرتے ہیں مدافعت کرنے والے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کشمکش ہوتی چلی جاتی ہے۔ مقابلہ کرنے والوں میں جب تک قوتِ مدافعت رہتی ہے زندہ رہتے ہیں جس دن قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے شکست کھا جاتے ہیں۔ اُسے موت کہا جاتا ہے۔ جو کچھ آپ کے ہاں علاج یا طِب یا ڈاکٹر کرتا ہے وہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جو مدافعت کرنے والی اندر قوت ہے اس قوت کو اور مزید تقویت دیتا ہے وہ۔ یہ جو عرصہ درمیان میں رکھا گیا ہے عین عدل کے مطابق ہے کہ ان کو وارننگ دیے جاؤ یہ بتائے جاؤ مرض یہ ہے تمہارا۔ ہلاکت آفریں عناصر اس طرح سے تم پر مؤثر ہو رہے ہیں اس کی مدافعت کا یہ طریقہ ہے ان کو طاقت بہم پہنچانے کا یہ مداوا ہے کرتے چلے جاؤ۔ اس کے باوجود وہ اگر نہیں کرتا تو پھر ایک دن مدافعت کی قوتیں جواب دے جاتی ہیں اور یہ اس قوم کی پھر ہلاکت ہوتی ہے۔ کہا اس کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اس دوران میں تو ابھی اس کا چانس ہوتا ہے مہلت ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنی روش کو بدل لے تو پھر اس کا پلڑا مدافعت کا بھاری ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں آخری فیصلے کے لیے جو کہتے ہیں میزان کھڑی ہوگی قیامت میں' اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ایک ایک ذرہ غلط اور صحیح کا تولا جائے گا۔ وہاں بھی جو معیار مقرر کیا ہے قرآن نے (**ثقلت موازینہ و خفت موازینہ**) کہا ہے کہ پلڑا بھاری کونسا ہے۔ یہ جو ہلاکت آفریں کشمکش ہوتی ہے ہمارے اندر' کوئی بھی سانس لینے والا ایسا نہیں ہے جس میں یہ ہلاکت آفریں چیزیں اندر نہیں جاتیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ مدافعت کرنے والا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ جس کا یہ پلڑا بھاری ہوتا ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ انسان معصوم نہیں پیدا کیا گیا' اس سے لغزشیں ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا تخریبی کاموں کا پلڑا بھاری ہو گیا ہے یا تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری ہے۔ قوموں کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ تخریب میں وہ اترتی ہیں اگر تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری رہتا ہے تو ان کو زندگی ملتی جاتی ہے۔ ابھی مہلت ہوتی ہے۔ جب یہ کیفیت ہو جائے کہ تخریبی پلڑا بھاری ہو جائے اور اس کے بعد پھر ان کی اجل آتی ہے۔ جب یہ وقت آ جاتا ہے تو کہا کہ (**و اذا جآء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃً ولا یستقدمون**) (10:49) پھر اس میں ایک لمحہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس وقت پھر طبیب مریض کی بالی سے مایوس اٹھ جاتا ہے' No Hope ' وہ کس وقت کہتا ہے No Hope؟ ابھی سانس تو آ رہا ہوتا ہے'

جب وہ دیکھتا ہے کہ مدافعت کا پلڑا بہت اونچا چلا گیا ہے۔ یہ ہے جو قرآن نے اصول بتایا ہے اس کے مطابق کہا کہ تم بھی نہیں جلدی کر سکتے ہو نہ تمہاری آرزوؤں کی خاطر ہم جلدی سے ان کا پلڑا جھکا دیں گے' انصاف کے خلاف ہوگا۔ نہ ان کا یہ تقاضا کہ صاحب بتاؤ جلدی سے کر کے تب ایمان لائیں گے۔ کہا سوال ہی نہیں ہے۔ ہم نے ان کے ایمان سے کونسا ووٹ حاصل کرنا ہے کہ بل پاس نہیں ہوگا ہمارا۔ وہ تو ان کی اپنی زندگی اور موت کا سوال ہے' ہم تو صرف قانون دینے والے ہیں۔ اس لیے نہ ان کے لیے نہ تمہارے لیے۔ (**لیس بایمانکم و لا بامانه اهل الکتٰب**) وہاں کہا ہے کہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق نہ تمہارے مخالفین کی آرزوؤں کے مطابق۔ نہ بھائی یہاں تو فیصلے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے کہا کہ (**قل ارء یتم ان اتٰکم عذابه بیاتًا او نهارًا ماذا یستعجل منه المجرمون**) (10:50) کہا دوسری بات ان سے یہ پوچھو کہ اگر تو کوئی مریض یہ پوچھے طبیب سے روز کہ ڈاکٹر صاحب میں کب اچھا ہو جاؤنگا۔ تو اس کا یہ پوچھنا قابلِ التفات ہوتا ہے ہمدردی چاہتا ہے۔ اور اگر وہ روز یہ پوچھے کہ ڈاکٹر صاحب میں کب مرونگا مرتا کیوں نہیں ہوں۔ اب سوچو تو سہی اس کو کیا جواب دیں۔ آگے بات یہ کہہ رہے ہیں۔ کہا تم ان سے یہ کہہ رہے ہو کہ تمہاری روش ایسی ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ان سے پوچھو کہ کبھی کوئی مریض یہ پوچھا کرتا ہے اور یہ دن رات تم سے یہ پوچھتے ہیں کب تباہ ہونگے۔ ارے کم بختو کونسا وہ عید کا چاند ہے جو تم یہ کہتے ہو کہ صاحب نکلتا ہے انتیس کو یا نہیں نکلتا۔ او موت کا پیغام ہے اس کے جلدی مچا رہے ہو۔ (**ماذا یستعجل منه المجرمون**) (10:50) مجرم جس چیز کے لیے جلدی کر رہا ہے وہ کونسی چیز اس کے لیے ایسی باعثِ مسرت یا نشیدِ انبساط ہے جس کے لیے یہ روز کہتا ہے کہ بتاؤ صاحب کب آئے گا۔ (**ثم اذا ما وقع اٰمنتم به**) (10:51) کہا کہ یہ ہے بات کہ روز پوچھتے ہو کہ صاحب اس وقت تو ہم تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے' جب موت آ جائے گی تو اس وقت ہم مان لیں گے کہ ہاں تم نے سچ کہا تھا۔ تو کہا کہ (**آلـٰٔن**) (10:51) اس وقت تمہیں یہ ماننا فائدہ کیا دے گا۔ پھر یہ سوال غلط ہے۔ جب اس کے بعد یہ مہلت کا وقفہ ہی نہیں رہے گا کتنی قوتِ مدافعت ڈاکٹر کیوں نہ بڑھا دے وہ مقابلہ ہی نہیں کر سکیں گے تخریبی Elements کا تو فائدہ کیا ہوگا اس وقت تمہارے ایمان لانے کا ڈاکٹر سے کہنے کا کہ ہاں صاحب ہم مانتے ہیں بہت اچھے طبیب ہو تم۔ اس وقت کچھ فائدہ ہی نہیں ہے۔ (**و قد کنتم به تستعجلون**) (10:51) پہلے اتنی جلدی مچاتے تھے اور جب ہلاکت سر پہ آ جائے گی تو اس وقت پھر تم کہو گے کہ ہاں ہاں صاحب ہم ایمان لاتے ہیں تو فائدہ کیا ہے اس وقت۔ اس وقت سوچو سمجھو ابھی اس کے لیے مہلت ہے۔ دیکھتے ہیں عزیزانِ من! قومیں سمجھتی نہیں ہیں' عجیب بات ہے پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے قوموں کو۔ ذرا باہر کھڑا ہوا آدمی دیکھ رہا ہوتا ہے کہ تباہی کی طرف چلے جا رہے ہیں لیکن یہ جو جا رہے ہوتے ہیں انہیں دکھائی نہیں دیتا کہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ (**ثم قیل للذین ظلموا ذوقوا عذاب الخلد**) (10:52) اس وقت تو پھر سوائے اس کے کہ یہ ان سے کہا جائے کہ نہیں بھئی یہ جواب تباہی آ گئی ہے یہ تو اب ہمیشہ رہنے والی ہے۔ یعنی یہ تو اس وقت ٹل نہیں سکتی موت آ گئی اس کا وقت آ گیا۔ اور وہاں بھی یاد رکھئے یہ بات نہیں ہے کہ ہم نے کچھ فیصلہ کر دیا تھا اور

ہماری مرضی کے مطابق یہ ہوگا اور اب نہیں تم بچ سکتے۔ کہتا ہے نہیں۔(**ھل تجزون الا بما کنتم تکسبون**) (10:52) یہ تو تمہارے اپنے ہی کیے کا نتیجہ ہے جو تمہارے سامنے آیا ہے ہم نے تو صرف قانون مقرر کیا تھا۔ آگے کہہ رہا ہے (**و یستنبؤنک احق ھو**) (10:53) اور جب یہ ان کے کہنے کے مطابق روز جو یہ کہتے ہیں تو تباہی اسی وقت نہیں آتی۔ تو تم سے پوچھتے ہیں کہ سچ مچ بتاؤ ایمانداری سے یونہی مذاق کرتے ہو یا واقعی ٹھیک کہتے ہو تم۔ کہتا ہے یہ پوچھتے ہیں۔ وہ جو تمہیں اس سے پیشتر ہر معاملے میں صادق اور امین کہا کرتے تھے تم سے فیصلے کرانے آتے تھے تم جب ان کی تباہی کے متعلق یہ بات کہتے ہو کہ اس روش سے تباہ ہو جاؤ گے۔ تو کیفیت یہ ہے کہ یہی نہیں کہ خود غور و فکر سے اس پر توجہ نہیں دیتے سوچتے نہیں، بلکہ تم سے آ کے پوچھتے ہیں کہ بھئی "سچو سچ دس" کیا ٹھیک ہے جو کچھ تم کہتے ہو۔(**ای و ربی انہ لحق**) (10:53) ہاں اور میرا پروردگار شاہد ہے اس چیز کے اوپر کہ (**انہ لحق**) (10:53) دیکھئے عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں۔ (**ای و ربی انح لحق**) (10:53) بالکل حقیقت ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اور میرا خدا اس پہ شاہد ہے میں اپنی طرف سے تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ اور ربی یہاں کہا ہے کہ جو کسی شے کو نقطۂ آغاز سے آخر تک بتدریج پہنچاتا ہے۔ تو یہ چیز تدریجاً ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا جو پروگرام ہے تدریجاً لے جانا والا وہ اس پہ شاہد ہے کہ یہ ہو کر رہے گا۔(**وما انتم بمعجزین**) (10:53) یاد رکھو تم اس کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے۔ اس پہ بھی اپنی طرف سے یہ نہیں کہا ہے کہ تم یہ بار بار کہتے ہو چڑاتے ہو مجھ کو یہ پوچھتے ہو "دیکھو ہُن میں کی کرنا ہیگا"۔ میں کیا کرتا ہوں تو بات ہی یہاں نہیں آتی، ایک قانون ہے جس کے مطابق یہ ہوگا اور تم اسے شکست نہیں دے سکتے۔(**ولو ان لکل نفس ظلمت ما فی الارض لافتدت بہ**) (10:54) اور پھر یاد رکھو کہ جب وہ فیصلہ کن گھڑی آ جاتی ہے تو پھر تم اگر ساری دنیا کے خزانے دے کر بھی چاہو کہ اس کے کفارے میں یہ دیدوں اور اس ہلاکت سے بچ جاؤں یہ نہیں ہو سکتا۔ تباہ ہونے والی قوموں کے خزانے بالکلیہ خالی تو نہیں ہوتے جس دن وہ تباہ ہوتے ہیں۔ جس دن ایران کی تباہی آئی تھی مدائن میں اس جماعت کے ہاتھوں میں، تو وہاں ایک مدائن کیپٹل سٹی کے اندر سے جو کچھ انہیں ملا تھا یہ عرب جیسی قوم بیچاری انہوں نے تو کہانیاں سنی ہوئی تھیں۔ یہ اپنی آنکھوں کے اوپر یقین نہیں کرتے تھے کہ دنیا میں اتنی دولت بھی کہیں ہوتی ہے۔ اور ایک ہی جگہ ابھی تو وہ تھی، مملکت پوری بھری پڑی تھی۔ شکست کھائی فوجوں نے، مملکت گئی فوجیں ختم ہوئیں اور سربراہِ مملکت کسریٰ کہ جس کا نام، تاریخ میں آج تک جس کی دھوم پڑی ہوئی ہے جان بچاتا ہوا مارا مارا پھرتا رہا عزیزانِ من! کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی اس کو، مختلف سلطنتوں میں گیا مختلف مملکتوں میں گیا پناہ لینے کے لیے، کہیں پناہ نہیں ملی۔ ایک پن چکی کے اندر مرا ہوا پایا گیا تھا۔(**وما انتم بمعجزین**) (10:53) تم اسے شکست نہیں دے سکتے۔ اس وقت اگر ساری دنیا کی دولت دے کر بھی چاہو کہ چھوٹ جائیں کفارے سے، اس سے وقت نہیں چھوٹ سکتے، تباہی مقدر ہوگی۔(**و اسروا الندامۃ لما راوا العذاب**) (10:54) کفارہ ہی نہیں اس وقت کا Regret کیا ہوا ہے مجھے افسوس ہے میں نے کیا یہ بھی کام نہیں دے سکتا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب آپ ہزار کہتے تھے کہ نہیں بھئی یہ چھوڑ دو اس چیز

کواس سے موت آ جائے گی۔ میں نے یہ نہ چھوڑا' یہ کہنا بھی اس وقت کچھ کام نہیں دے گا۔ ندامت وہ ہے نا کہ جس کے بعد انسان پلٹ آئے صحیح راستے کے طرف۔ پلٹ آنے کے لیے چلنے کی قوت چاہیئے' پھر اس موڑ پر آ کر پھر ٹھیک راستے پہ چلنے کے لیے وقت چاہیے۔ اور اگر یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں تو وہاں یہ احساس ہونا کہ غلط تھا یہ جو کچھ کیا' پھر تو کچھ کام نہیں دے سکتا۔ اسی لیے اس وقت جب تباہی آ جاتی ہے تو یہ ندامت اور یہ Regret بھی کسی کام نہیں آتا نہ کفارہ کسی کام آتا ہے نہ اس وقت یہ ندامت کسی کام آتی ہے۔ (**و قضی بینھم**) (10:54) اس لیے کہ قانون نے فیصلہ دیدیا ہوتا ہے ان کے ہاں۔ (**بالقسط**) (10:54) پھر یہاں وہی آیا کہ فیصلہ قانون نے دیدیا ان کے ہاں۔ (**و ھم لا یظلمون**) (10:54) کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے ان کے خلاف۔ وہ جو خلافِ قانون ہوتا ہے وہ تو یہ ہے یہ جو آجکل اغوا کرتے پھر رہے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اردن والوں سے کہیے کہ ہمارا وہ قیدی چھوڑ دیں۔ سعودی عریبیہ والے جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں جن کا ان پہ ہاتھ ہی نہیں ان کے آدمی ہیں ان کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ تو وہ ان سے کہیں کہ ان کو چھوڑ دیں ورنہ ہم ان کو مار دیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اس عمل کے اندر کوئی ربط نہیں قانون کا۔ (**ھم لا یظلمون**) (10:54) دھاندلی نہیں وہاں۔ یہ کہ تم اسے شکست نہیں دے سکتے دلیل ہے (**الا ان للہ ما فی السمٰوٰت و الارض**) (10:55) اس قوت کے زور کے اوپر تم اسے شکست دو گے' کائنات کی ساری قوتیں اس کے پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے روبہ عمل ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ بر پارم

قرآن نے بھی دوسری جگہ کہا ہے یہ سارا سلسلۂ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہیں کہ کسی کا کوئی کام بلا نتیجہ یہاں نہ رہ جائے۔ یہ مکافاتِ عمل کا قانون یہ بنیادی قانون ہے یہ سارے باقی قوانین اس کے خدمت گذار ہیں اس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ (**الا ان وعدہ اللہ حق**) (10:55) آگاہ کردو ان کو اس بات سے کہ خدا کا ہر وعدہ حق ہوتا ہے۔ جسے وعدہ خدا کا کہا جا رہا ہے اُسے ہی ہم اپنی زبان میں قانون کہتے ہیں۔ قانون کا لفظ قرآن میں نہیں آیا عرب اسے ان الفاظ میں استعمال ہی نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ بھی عجیب قوم تھی ان کے ہاں بھی اس کے لیے وعدے کا لفظ ہوتا تھا کہ اس نے وعدہ کرلیا ہے اٹل ہے ایسا ہو کے رہے گا۔ بڑی عجیب چیز ہے عزیزانِ من! ۔ قوموں کے اندر جب یہ چیز پیدا ہو جائے بڑی خود اعتمادی ہوتی ہے کہ وعدہ قانون کی حیثیت لے لے۔ اور قومیں جب بگڑتی ہیں تو وہاں قانون جوتی کی حیثیت نہیں رکھتا وعدہ تو ایک طرف رہا قانون کی حیثیت لے لے۔ قرآن نے اسی لیے خدا کے متعلق جہاں کہا ہے وعدے کے متعلق کہا ہے۔ (**لا یخلف المیعاد**) وہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ کتنی بڑی پابندی ہے جو خدا اپنے اوپر عائد کرتا ہے عزیزانِ من! ہم جو وعدہ کرتے ہیں ہم بھی اس کے خلاف نہیں کرتے۔ اب آپ سوچئے کہ لمبی چوڑی باتیں چھوڑ دیجیے عزیزانِ من! اور پروگرام تو' ایک اتنا سا پروگرام وعدے کا۔ قوم میں اتنی سی بات اگر پیدا ہو جائے وعدہ کرنے والا جو ہے اس کے اوپر اعتماد آپ کو یہ ہو کہ یہ وعدہ شکنی نہیں ہوگی قوم کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اتنے سے۔

یہاں Actually اتنے دھوکے نہیں ملتے جتنے کہ In-Security کی جو Sence ہے نا ہمارے ہاں' عدمِ اطمینان اور عدمِ اعتماد کا جو احساس پیدا ہو گیا اس کا نام ہے حزن اس کا نام ہے یہ پریشانیاں۔تو کہا ہے تو اس نے بڑے یقین دلائے ہیں اس نے کہا ہے' او پھر تم کیوں مارے مارے؟ ''کچھ پتہ نئیں ہیگا اوہدا''۔یہ ہے نا حزن' یہ ہے وہ چیز۔ان کے عہدِ جاہلیت میں یہ چیز تھی کہ جب وہ کسی سے کہتے تھے کہ ہاں آ جاؤ میرے ہاں' میں پناہ دونگا۔اس پناہ دہی کے بعد یعنی کیفیت یہ تھی اس سردار کی' پناہ دی دینے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص تو میرے بیٹے کا قاتل تھا۔اُسے کہا کہ اطمینان رکھو اس علم کے باوجود کہ تم میرے بیٹے کے قاتل تھے میرا وعدہ جو ہے وہ اسی طرح سے Stand کر رہا ہے۔ وہ باہر سے وہ جو دشمن تھے انہوں نے محاصرہ کیا ہوا تھا اس کے قلعہ کا' اس کا دوسرا بیٹا کہیں باہر سے آ گیا دشمن نے پکڑ لیا کہا کہ اسے ہمارے حوالے کرو ورنہ اس کو مار دیں گے۔کہا اسے میں وعدہ دے چکا ہوں۔جس نے ایک بیٹا مار دیا ہوا تھا اس کا قاتل ہے اپنے ہاتھ میں کہ اسے میں پناہ دے چکا ہوا ہوں' خود اس کے خلاف کچھ نہیں۔دوسرا بیٹا ان کے ہاتھ میں ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں اسے پناہ دے چکا ہوں میں وعدہ خلافی نہیں کرتا۔سامنے بیٹا مروا دیا اس کی وعدہ خلافی نہیں کی۔اور اس کے بعد اسے کہا کہ میں اپنی حدود سے اپنی حفاظت میں تمہیں باہر پہنچاتا ہوں۔ کہا کہ باہر پہنچنے کے بعد احتیاط برتنا اپنی حفاظت کر لینا میں انتقام لے کے چھوڑونگا تم سے۔عزیزانِ من! جس قوم کی جاہلیت کے زمانے میں یہ کیفیت تھی وہ قوم تھی کہ جب وہ خدا پہ ایمان لائی اس نے کہا کہ ٹھیک ہے ہمارا خدا کہتا ہے کہ ہم وعدہ خلافی نہیں کرتے' ہم اس کے نام کے اوپر اٹھنے والے کبھی وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔اور پہلی چیز قوم کے اندر باہمی اعتماد تھا جس نے سکون پیدا کر دیا تھا ہر ایک کے دل میں' دشمن کے متعلق بھی پتہ تھا کہ دشمن ہے۔یعنی یہ چیز کہ اپنی حد سے تو تمہیں اپنی حفاظت سے باہر پہنچا دونگا۔اور وہیں وارننگ دے رہا ہے کہ اس کے بعد محتاط رہنا۔اس بیٹے کا نہیں وہ جو دشمن مار دیا ہے' وہ جو تم نے مار دیا تھا اس کا انتقام تم سے لے کے رہونگا اپنی حد سے باہر جا کر۔یوں لوگ کہتے ہیں صاحب یہ چند سالوں میں اس قوم نے کر کیا دیا تھا۔یہ ہوتی ہیں قوموں کی خصوصیات۔ہر ایک کو یقین ہو کہ یہ ہے ان کے ہاں کا قانون۔ اور خدا نے جو کہا ہے (**لا مبدل لکلمت الله**) یہ ہے اعتماد کی بات کہ خدا بھی اپنی بات کے خلاف نہیں کرے گا خدا کے یہ بندے کیوں کریں گے میرے خلاف یہ بات۔آج انفرادی سطح پہ تو یہ کیفیت ہے اجتماعی سطح کے اوپر قوموں کو باہمی معاہدے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا کہ کر تو آئے ہیں پتہ نہیں اب وہ کیا کریں صاحب۔چاٹتے رہیے معاہدے۔روز معاہدوں کی جو مٹی پلید ہوتی ہے ہمارے سامنے ہے۔پہلے تو ایک Language نئی ایجاد ہوئی ہے ابلیسی سیاست میں "Diplomatic Language"۔بڑے بڑے ماہرِ فن ان کو بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں' کس کام کے لیے؟ ایسے الفاظ رکھے جائیں کہ اس وقت دستخط کرنے والا تو ان کے فریب میں آئے اور کل جو معنی ہم چاہیں وہ پہنا دیے جائیں۔یہ جو ہوتا ہے نا کہ فیصلہ ہو گیا Drafting کر رہے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے ''انگریزی نئیں اوندی ایناں نوں؟ او ہندی اچ لکھ دیو''۔وہ ڈرافٹنگ یہ ہو رہا ہوتا ہے وہ جو لکھ لکھ کے کاٹے جاتے ہیں نا وہ یہ ہوتے ہیں کہ نہ اس کے تو یہ معنی یہی بنیں گے جب بھی

لیے جائیں گے۔ جو بھی وہاں الفاظ میں پٹ گیا بس پٹ گیا۔ وعدہ خلافی ہوتی نہیں ہے اور نظر آ جاتا ہے کہ صاحب کیا ہوگا۔ پہلی چیز تو یہ ہوتی ہے۔ بہرحال۔

تو کہا کہ یاد رکھو یہ ہمارا وعدہ ہے کہ ان قانون کے مطابق (**هو يحي و يميت و اليه ترجعون**) (10:56) موت اور حیات کے فیصلے ہمارے اس قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ قانون کو واضح ہونا چاہیے قانون کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہر ایک تک وہ پہنچ جائے۔ کہا اس کے لیے۔ اور عزیزانِ من! یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ آج رمضان کا پہلا درس آ رہا ہے اور وہ آیت ہمارے سامنے آ رہی ہے جو ٹھیک اس تقریب کے عین مطابق تھی۔ یہ رمضان المبارک کیا ہے؟ یہ اس کے بعد آخری دن یہ ایک جشن آتا ہے یہ جشن کیا ہے؟ اب تو ہمیں اتنا ہی پتہ ہے نا کہ اردو میں اسے میٹھی عید کہتے ہیں ''اسی وی سیویاں دی عید کہہ دینے آں'' یا بہرحال چھوٹی عید۔ بس۔ پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے وہ کہتے ہیں عید ہے۔ ویسے عید کے تو معنی ہوتے ہیں ہر سال آنے والی چیز۔ یہ الگ بات ہے کہ عید جو آپ کے ہاں کی ہے وہ سال کے بعد آتی ہے ''ایہہ روزے یار ہیں مہینے ای آ جاندے ہیگے''۔ ایک مہینہ پورا اس کے جشن کی تیاری کا عزیزانِ من! کتنا عجیب وہ تقریب عظیم ہوگی جس کی تیاری اس طرح سے ہو رہی ہے۔ کیا ہے وہ تقریب؟ کیوں اس کی ایسی شاندار تیاری ہو رہی ہے؟۔ یہی چیز ہے جو میں نے یہ کہا۔ کہا کہ واضح کر دیا ہم نے کہ یہ قوموں کی موت اور حیات کے فیصلے قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ قانون یقیناً ایسا ہونا چاہیے کہ جو واضح طور پہ ہو اور قوموں کے سامنے آ جائے۔ (**يا يها الناس**) (10:57) پوری نوعِ انسانی سے کہا گیا ہے عزیزانِ من!۔ اس دور میں بھی عالمگیر' قیامت تک الناس آئیں گے ان سب کے لیے یہ اعلان۔ اس لیے قرآن کے لیے کوئی پیریڈ یا وقفہ مقرر نہیں ہے کہ یہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو جائے گا کلینڈر نہیں ہے کہ جو بدل جائے گا۔ قیامت تک کے لیے نبوتِ محمد ﷺ جاری ہے۔ (**يايها الناس قد جآء تكم موعظة من ربكم**) (10:57) تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ ہدایت آیا۔ (**موعظة**) وعظ کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جو ہلاکتوں سے روکنے والی شے ہو۔ وہ یہ نہیں ہے کہ ''ساڈے ہر وعظ دے بعد اتھے سر پھٹول ہوندی رہندی ہیگی اے'' فساد ہو جاتا ہے۔ روکتی ہے تخریبی چیزوں کو۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ (**و شفآء لما فى الصدور**) (10:57) اس ٹکڑے کے اوپر آؤں تو عزیزانِ من! کتنے درس چاہئیں مجھے۔ شفا ہے دل کی بیماریوں کی۔ قرآن کی عظمت ہے۔ بمشکل بات سمجھ میں آتی تھی اس سے پیشتر۔ قرآن نے کہا تھا نا کہ جوں جوں علم ترقی کرتا چلا جائے گا اس کے حقائق سامنے آتے چلے جائیں گے۔ ہمارے اس دور میں عزیزانِ من! اگرچہ علم النفس کی اصطلاح ہمارے ہاں تھی پہلے بھی' اس پہ کوئی تحقیق ابھی نہیں ہوئی تھی۔ سائیکولوجی ایک سائنس کی حیثیت ہمارے دور میں آ کے بن رہی ہے۔ اس سے پیشتر جتنی تحقیقات تھیں قوموں کی زندگی اور موت کے متعلق' وہ خارجی عناصر جو تھے ان کے متعلق ہوتی تھی: معاشی پہلو اس کا کیا ہے؟ سیاسی پالیسی کس قسم کی ہے؟ Geographical Conditions کیا ہیں؟ آب وہوا اس ملک کی کس قسم کی ہے؟۔ ان چیزوں کے متعلق فیصلے کیا کرتے تھے۔ زیادہ

سے زیادہ یہ کہ سیاسی پالیسیاں کیا ہیں۔اس دور میں آ کے اس نئی سائنس نے جس کو سائیکولوجی کہتے ہیں اس نے آ کے کہا ہے کہ یہ جتنی چیزیں تم گنا رہے ہو یہ تو محض خارجی چیزیں ہیں ذرائع ہیں اصل چیز کچھ اور ہے۔اصل شے جو ہے جس کے اوپر فرد یا قوم کی زندگی اور موت کا دارومدار ہے وہ اس کا Psyche ہے اس کا نفس ہے اس کا وہ قلب کہہ لیجیے۔اس کے اندر ایک چیز ہے اس کی تبدیلی سے ہر تبدیلی باہر کی رونما ہوتی ہے ۔اسے روگ لگ جاتا ہے تو قوموں میں زوال آنا شروع ہو جاتا ہے' وہ مر جاتا ہے تو قوم تباہ ہو جاتی ہے۔اسے تقویت رہتی ہے تقویت کے لیے توازن کا لفظ انہوں نے کہا' Balance جسے آپ کہتے ہیں۔قرآن کا لفظ ہے یہ' اسی لیے اس نے میزان کہا ہے عزیزانِ من! توازن برقرار رکھنے والی شے۔انہوں نے کہا ہے کہ توازن اس کا برقرار رہتا ہے فرد کی بھی زندگی قائم رہتی ہے سکون اور خوشگواریوں کی ہوتی ہے۔ قوموں کی زندگی بھی متوازن جب ہوتی ہے تو سکون وخوشگواریاں اور سرفرازیوں کی زندگی ہوتی ہے۔فرد کا اگر توازن کھو جاتا ہے اعصابی بیماریوں کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے۔قوم جب ان چیزوں کے اندر آ جاتی ہے تو اس کے اندر ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے افراد کے اندر یا مختلف گروہوں اور پارٹیوں کے اندر۔یہ کشمکش نشانی ہوتی ہے اس چیز کی کہ Psyche جو ہے قوم کا اس کا Balance بگڑ گیا ہے۔جب بھی چلتے ہوئے انسان کا ذرا سا توازن بگڑتا ہے تو لڑکھڑا جاتا ہے نا وہ۔یہ جو قوموں کے اندر فساد برپا ہوتے ہیں معاشروں کے اندر وہ کہتے ہیں قوم کا Psychological Balance بگڑا ہوا ہوتا ہے۔اس سے پیشتر تو انفرادی چیز تھی صرف' فرد کی سائیکولوجی ہوتی تھی۔اب ان کے ہاں قوموں کو سائیکولوجی بھی ہے اس کے اوپر وہ چل رہے ہیں۔اور یہ باقی جتنے بھی علوم اور سائنسز تھیں جنہوں نے اتنی اہمیت حاصل کی تھی۔حتیٰ کہ اکنامکس کہ جسے ہمارے دور کے اندر اسے کہا ہی Age of Economics کہا جاتا ہے دورِ معاشیات۔اتنی بڑی سائنس اتنی بڑی سیاست کھڑی ہو گئی اکنامکس کی بنیادوں کے اوپر' مارکس ازم کی بنیاد پہ۔وہ کہا کہ قوموں کی موت وحیات کا معیار ہی اس کے اوپر ہے۔انہوں نے سب کے پرخچے اڑا دیے کہنے لگے سب غلط ہے۔یہ تو اندر ایک چیز ہے

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر ایک چیز کا بدلا

قرآن چودہ سو سال پہلے کہہ گیا ہے(**ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیر ما بانسھم**) کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی تاوقتیکہ اس کی Psyche کے اندر تبدیلی واقع نہ ہو۔چودہ سو سال پیشتر عزیزانِ من! اعلان کر گیا ہے قرآن۔کہا Psyche کا علاج ان چیزوں سے نہیں ہو گا بگڑا ہوا بیلنس اس طرح سے استوار نہیں ہو گا۔وہ ان ہدایت کی رو سے ہو گا اس لیے اس کو کہا(**شفآء لما فی الصدور**) (10:57) تمہاری نفسیاتی کشمکش جو ہے یہ اس کو دور کرنے والی چیز ہے۔یہ ہے قرآن عزیزانِ من! چودہ سال پیشتر۔میں نے عرض کیا ہے ابھی پچاس سال پہلے بھی یہ چیز؟؟نہیں دیجاتی تھی۔(**ھو یحی و یمیت**) (10:56) سے بات شروع کر رہا ہے۔قوموں کی موت وحیات

کا ذکر چلا آ رہا ہے۔قوموں کی موت وحیات کے فیصلے کس چیز سے ہوتے ہیں؟ یہ سینے کے امراض سے ہوتے ہیں۔لفظ تو یہی ہے نا جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' Psyche بگڑتا ہے توازن بگڑتا ہے۔اس کا علاج کرتا ہے۔فرد کا بھی وہ کرتا ہے جماعت کا بھی کرتا ہے قوم کا کرتا ہے عالمگیر انسانیت کا کرتا ہے اسی لیے (**یا یھا الناس**) کہا ہے صاحب۔ابھی تک سائیکولوجی قوموں تک انہوں نے پہنچائی ہے' وہ پوری نوعِ انسانی کی سائیکولوجی کے لیے کہتا ہے (**شفآء لما فی الصدور**) (10:57) انسانیت کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار رکھنے والا۔ (**ھدًی و رحمة للمؤمنین**) (10:57) کہا اس کے اندر یہ سب کچھ ہے۔لیکن اس شفا کی طرف لے جانے والا راستہ اس کی راہنمائی' پھر وہ سامان۔اور سامان بھی یہاں عزیزانِ من! طبعی زندگی کے لیے جس سامان کی ضرورت ہے رزق نہیں یہاں کہا رحمت کہا ہے۔رحمت اس لطافت والے سامان کو کہتے ہیں جو لطیف چیزوں کی نشوونما کرتا ہے۔ Psyche جیسی لطیف چیز جو ہے اس کے علاج کے لیے جو سامان دیتا ہے اسے رحمت کہہ کے پکارتا ہے۔(**ھد و رحمة**) (**یایھا الناس**) سے خطاب ہے لیکن کہا کہ بہرحال اس سے فائدہ تو وہی اٹھا سکیں گے نا جو اس کی صداقت پہ یقین رکھیں گے۔پہلی چیز تو Psyche کی تبدیلی میں یہ ضروری ہوتی ہے۔اس کی صداقت پر یقین بھی وہ اندھی عقیدت کی رو سے نہیں منواتا کہ پہلے یہ چیز کر کے آؤ عقیدت کی بناء پہ پھر اس کی طرف آؤ۔کہتا ہے بالکل نہیں۔عقل وبصیرت کی رو سے علم وتدبر کی رو سے اسے چھان پھٹک لو۔تم جب اس یقین پہ پہنچ جاؤ کہ واقعی اس کے اندر میرے لیے شفاء ہے پھر آؤ اور اس کے بعد دیکھو یہ کیسے شفاء دیتا ہے۔ عزیزانِ من! علاج کی کامیابی کے لیے اولیں شرط یہ ہے کہ آپ کو ڈاکٹر یا طبیب کے اوپر اعتماد ہو۔اور سائیکولوجی میں تو بات ہی اور ہے۔ Psycho Analysis جو ہوتا ہے تجزیۂ نفس جو یہ کرتے ہیں۔اب تو سائیکوتھراپی آ گئی ہے وہ علاج کرتے ہیں ان امراض کا۔لیکن Psyco Analysis والا ہو یا اس کی یہ شکل جس کو ہپناٹزم کی آپ کہتے ہیں یہ سائیکولوجی کی ایک قسم ہے۔یہ صرف ان کا ہوسکتا ہے جو صرف اس عقیدت کے ساتھ آئیں اس شخص کے پاس کہ ہمیں یقین ہے تمہارے اوپر۔جو شخص بھی اس یقین کو ساتھ لے کے نہ آئے آپ حیران ہونگے Psycho Analysis تو بڑی تھوڑی سی چیز ہے ہپناٹزم میں بڑی قوت ہوتی ہے۔یہ اس شخص کے اوپر ہپناٹزم قطعاً اثر نہیں کرتی جو یہ یقین لے کے آئے پتہ نہیں یہ ٹھیک کرے نہ کرے' مجھے عقیدت نہیں ہے اس کے اوپر' چلو میں دیکھ لیتا ہوں۔بالکل کچھ نہیں ہوتا۔ بنیادی چیز یہ ہے (**شفآء لما فی الصدور**) کے لیے کہ اس کی صداقت پہ ایمان ہونا چاہیے۔اندھا ایمان نہیں۔پہلی چیز یہ ہے۔یہ جتنی آپ کے ہاں کی درگاہوں کی اور جتنی بھی یہ بڑی بڑی بارگاہیں ہیں ان کے ہاں سے جو اس قسم کے کچھ آپ اولادیں لے کے چلے آتے ہیں اور مرادیں لے کے چلے آتے ہیں۔وہاں کچھ نہیں ہوتا عزیزانِ من! یہ آپ کی اپنی عقیدت ہے جو وہاں لے کے جاتی ہے۔اور پھر آپ کو یاد ہے جو میں دہرایا کرتا ہوں اور جسے کہا کرتا ہوں پلے باندھ لو وہ پنجابی کا ''تت کڈیا ہویا جیہڑا'' یہ ہے ساری چیز جو اس نے چار لفظوں میں اس پنجابی محاورے نے ''تت کڈ دتا' پیر مندیاں نوں کھاندا اے''۔پیر کو ماننا چھوڑ دیجیے ''پیرای نئیں رہندا بندے دا پتر بن جاندا اے فیر''۔''پیر مندیاں

نوں کھاندا اے‘‘۔ بڑی عجیب چیز تھی جو کہہ گیا ہے۔ بات یہی ہے جو اس نے کہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہیں جو پیر کی عقیدت کے اوپر ایمان لانے کے لیے کہا جاتا ہے تو اہم پرستی کی بناء پہ کہا جاتا ہے یہ کر دیتے ہیں وہ کر دیتے ہیں۔ تمہاری فکری قوتوں کے سوئچ کو آف کیا جاتا ہے عقیدت پیدا کی جاتی ہے۔ بڑی سطحی عقیدت یہ ہوتی ہے عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ میں ایسا پودا جس کی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہی ہوں۔ یہ جو یقین ہوتا ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں قرآن کہتا ہے یہ وہ یقین ہے جو علم و بصیرت کی بنیاد کے اوپر یقین آپ کو آتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی قوت اس میں کسی قسم کی بھی لغزش نہیں پیدا کر سکتی۔ تو اہم پرستی کی عقیدت کی عمر کیا ہوتی ہے عزیزانِ من! آپ کی ایک مراد پوری نہ ہوگا لیاں دینے لگ جاتے ہیں۔ (و ھدًی رحمة للمؤمنین) (10:57) کہا اے نوعِ انسانی! سوچو تو سہی کہ اس قسم کا اگر نسخہ کسی کو مل جائے اور کیفیت پھر یہ ہو اس نسخے کی کہ ساری دنیا کے سیانے سمجھدار فکر والے جمع ہو جائیں۔ پہلے تھا نا چیلنج کہ اس کی مثل ایک سورۃ دس آیتیں بھی تم بنا نہیں سکتے کہ فکرِ انسانی کبھی اس قسم کا ضابطہ نہ دے سکے۔ ملے پھر کس طرح سے کہ انسان تو دے نہیں سکتا؟ (قل بفضل اللہ و برحمته) (10:58) یہ صرف اس کے فضل اور رحمت سے ہے یہ کہ اتنی بڑی گراں بہا چیز تمہیں مل رہی ہے۔ کہا تم محسوس نہیں کر رہے کہ یہ کتنی بڑی قیمتی شے ہے اتنی بڑی (ھو خیر مما یجمعون) ساری دنیا کی دولت بھی اکٹھی کر لو اس سے بھی زیادہ قیمتی اور بہتر شے ہے۔ ملی اور ملی یوں مفت (بفضل اللہ و برحمته) ۔ کہا سوچو تو سہی کہ اس قسم کی وہ چیز ہو (شفآء لما فی الصدور) موت اور حیات کا دارومدار جس کے اوپر ہو ایک پیسہ خرچ نہ کرو تم اس کو حاصل کرنے کے لیے۔ ایک صدری نسخہ حاصل کرنے کے لیے عزیزانِ من! کسی طبیبوں کے خاندان کا پوچھو نہیں کتنا کچھ دینے کے لیے انسان تیار ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے پوری کی پوری؟؟ تمہیں مل رہی ہے یہاں۔ ایک پیسہ خرچ نہیں کیا الناس! تم نے۔ کہیں سے مل نہیں سکتی تھی فکرِ انسانی عاجز تھا۔ (بفضل اللہ و برحمته) کہا بتاؤ بیمار کو اگر اس قسم کا نسخہ مل جائے اور مل جائے مفت‘ کیا یہ تقریب ایسی نہیں ہے کہ اس کے اوپر وہ جشنِ مسرت منائے۔ (فلیفرحوا) (10:57) او جشنِ مسرت مناؤ اس کے ملنے کے اوپر۔ یہ ہے عید عزیزانِ من!۔ کسی اور تقریب کے متعلق قرآن نے یہ نہیں کہا۔ یہ رمضان ہے کیا؟ (شھر رمضان الذی انزل فیه القراٰن) ایک ہی خصوصیت ہے اس رمضان کی جو بتائی۔ او بابا رمضان پوچھتو ہو کہ یہ کیا ہے رمضان؟ او بھئی اس میں قرآن نازل ہوا۔ آہاہاہا۔ دو لفظوں میں بات کہہ گیا‘ او اس میں قرآن نازل ہوا‘۔ بھئی قرآن نازل ہوا وہ کیا ہے؟ کہا قرآن: (شفآء لما فی الصدور . موعظة من ربکم . ھدًی و رحمة . ھو خیر مما یجمعون) او یہ قرآن (شھر رمضان الذی انزل فیه القراٰن) ۔ یہ ہے رمضان جس میں قرآن نازل ہوا اس میں یہ پروگرام دیا۔ پروگرام کی بات تو پھر اور کرونگا۔ کہا کہو ہے اس قابل کہ نہیں کہ اس کا جشن منایا جائے۔ (فلیفرحوا) (10:58) دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے عزیزانِ من! تہوار منانے کے ان کے ہاں دیکھئے تقاریب کیا ہوتی ہیں۔ آرین قوم ہمارے ہاں زراعت پیشہ قوم تھی موسموں کی تبدیلی کے اوپر ان کے ہاں تہوار آتے تھے ہولی آتی تھی اور لوری آتی تھی اور بسنت آتی تھی اور یہ

آتے تھے۔کسی بڑے انسان کی موت یا اس کی پیدائش کے تہوار کہیں آتے تھے' کوئی بڑا واقعہ کہیں کوئی لڑائی فتح ہوئی تھی اس کی تقریب میں کوئی تہوار آتا تھا۔بڑی وقتی اور ہنگامی چیزیں تھیں۔یہ قوم جب آئی ہے دنیا میں جسے ہم جماعتِ مؤمنین کہتے ہیں ان کے ذمہ تو کائنات کے گیسوؤں کو سنوارنے کا اتنا عظیم فریضہ دیا گیا تھا انہیں فرصت کہاں تھی کہ یہ تہوار مناتے۔اتنا بڑا پروگرام ان کے لیے تھا لیکن اس کے باوجود تہوار جشن و تقریب کی ضرورت تو ہوتی ہے انسان کے لطیف جذبات کی تسکین بھی بڑی ضروری ہے۔اس کی زندگی کی گاڑی خالی پٹرول سے نہیں چلتی موبل آئل اس میں ہونا چاہیے۔لیکن قرآن نے اگر کوئی ایک تقریب کے لیے کہا ہے تو وہ یہ نہیں' نہ موسموں کی تبدیلی نہ مشاہیر میں کسی کا جنم یا موت کا دن نہ کوئی بڑی لڑائی کا فتح کرنے کی یادگار' کچھ نہیں۔ایک ایسا نسخہ ملنے کی تقریب کہ جو(**شفآء لما فی الصدور**) (10:57) زندگی بخشنے والا جو ہے۔اومرنے والے تیری زندگی کے سامان لے کے میں آ گیا۔کہو کہ یہ مرنے والا جس کو زندگی مل جائے گی باقی عمر میں اس دن منائے گا یا نہیں یہ تقریب؟ (**فلیفرحوا**) (10:58) جشنِ مسرت مناؤ اس کے اوپر۔یہ ایک ہی حکم ہے جشن منانے کا۔یہ ہے عزیزانِ من! جسے عید کہا جاتا ہے اور یہ ہے جو اس کی تیاریوں کا مہینہ ہے۔اتنا بڑا جشن اس کی تیاریوں کے لیے خاصا وقت چاہیے تھا۔لیکن جیسا جشن عام دنیا کے جشنوں سے نرالا یعنی اس کی تقریب' اسی طرح سے اس کے منانے کی تیاریوں کا پروگرام بھی دنیا سے انوکھا۔کامل تطہیرِ فکر و نظر' قوم میں صحیح Discipline پیدا کرنے کا پروگرام' جذبۂ جہاد کے لیے ایک Refresher Course۔وہ Reservest سال کے بعد ایک مہینے میں جاتے ہیں ٹریننگ کی مشق کرنے کے لیے۔یہ بھوک اور پیاس کیا ہے؟ جنگ میں جانے والے سپاہی کے لیے ایک خوگر بنانے کی بات ہے نا۔پوری قوم کو اس کے لیے مجاہد تیار کرنا تھا۔تیاریاں اس انداز سے ہو رہی ہیں۔پھر یہ جو چیز ہے پتہ نہیں بعد میں کب یہ آئی ہے یہ جو سارے کا سارا قرآن دہرانا ہے۔اب تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ قرآن بھی یہ ثواب کے لیے روزہ بھی ثواب کے لیے وہ رات کی تراویحاں بھی ثواب کے لیے اس کے اندر قرآن کا دہرانا بھی ثواب کے لیے۔ایک موہوم عقیدت۔ورنہ یہ بھی میں کہہ رہا ہوں کہ جنہوں نے بھی یہ چیز ایجاد کی ہے مجھے اس سے غرض نہیں کہ کب یہ شروع ہوئی ہے نبی اکرم ﷺ نے شروع کیا یا صحابہ کرامؓ کے زمانے میں ہوئی۔بات تو یہ تھی کہ یہ پورا قرآن جو تھا وہ سارے کا سارا سامنے لایا جاتا۔یوں تو سارا سال ان کے سامنے یہ ہوتا تھا۔ابھی کل کی بات عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ ہمارا تو بچپن ابھی اس ماحول میں گذرا ہے جب بھی جاگ کھلی گھر کے اندر سے وہ جیسے حضرتِ عمرؓ نے کہا تھا کہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھنانے کی طرح قرآن کی آوازیں۔جب بھی گھر میں آنکھ کھلی قرآن کے گنگنانے کی آوازیں کان میں پڑتی تھیں۔لیکن وہ قرآن تو جو انہوں نے گنگنایا تھا اس میں تو ایک تو زبان ان کی تھی پھر وہ تو اس کو سمجھتے تھے سال بھر اس کی تلاوت ہوتی تھی ہر ایک کے ہاتھ میں یہ ہوتا تھا ہر جگہ اپنے ہاتھ میں ہوتا تھا۔آج ہم عش عش کرتے ہیں کہ صاحب وہ لال کتاب جو ہے ماؤزے تنگ کی دیکھئے ہر چینی کی بغل میں ہوتی ہے۔جب کوئی مسئلہ آتا ہے پرابلم آتی ہے یہ ہے وہ چیز۔وہ قوم زندہ رہے گی جب تک اگر اس قانون کے اندر ان میں ہے جان ایسی کہ جب کوئی

پرابلم آتی ہے وہ بیٹھ جاتے ہیں اس پہ۔ یہ اس لیے ہر ایک کے پاس ہر جگہ ہوتا تھا کہ جب کوئی پرابلم آئے اس کو کھول کو دیکھے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ (ھـــدًی) زندگی کے ہر دوراہے کے اوپر بتائے گا کدھر جانا چاہیے تمہیں سال بھر یہ۔ایک مہینہ تیاری کا اس میں یہ سارے کا سارا پورے کا پورا کورس سامنے دہرا دیا گیا صاحب یہ۔فکر ونظر کی تطہیر' جسم وجان کے اندر وہ توانائیاں جو مجاہد کو ایک سپاہی کو چاہئیں' مہینہ بھر کے لیے یہ کورس Revise کر دیا گیا۔اور اس طرح سے نئے سرے سے اس قوم کو تیار کر کے اور وہاں بٹھا دیا گیا' کاہے کے لیے؟ ٹھیک ہے اس کے ملنے کے اوپر سجدۂ شکر بھی بجالاؤ اور پھر باہمی مشاورت سے نمائندے تیار کرو اس عظیم اجتماع کے لیے جو ڈھائی ماہ کے بعد وہاں مکہ میں ہونے والا ہے تمہارا' اس مرکز میں بھیجنے کے لیے انتخاب کرو۔ یہ انتخاب تھا عزیزانِ من! جو اس پروگرام کے بعد ہوتا تھا۔اس طرح سے تطہیرِ فکر ونظر لیے ہوئے قوم کا انتخاب جو ہوتا تھا آپ سوچ سکتے ہیں کیا انتخاب وہ نہیں ہوگا۔وہ اجتماع جو تھا یہ تھا عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جو اقبالؒ کہہ گیا ہے کہ

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں

دو لفظ یہ کہہ جاتا ہے صاحب کیا بات ہے!!! عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں۔ ہر عید کے بعد ان کی مملکت میں ان کے دین کے نظام میں تازہ شکوہ پیدا ہوتا تھا۔

عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنین

یہاں مؤمنین کا لفظ بھی عجیب لایا ہے یہ شخص' ہجومِ مومن۔اب تو وہ ہجوم بھی نہیں رہتا ہے۔اس بچپن کے ہجوم میں بھی ایک طبعی خوشی تو ہوتی تھی۔ ہم بچوں کو نئے کپڑے ملتے تھے نیا جوتا ملتا تھا۔اس دن اتنے پیسے ملتے تھے کہ شام کو جن کا حساب نہیں دینا پڑتا تھا کہ کہاں خرچ کیے۔ورنہ روز کے پیسے کا تو بتانا پڑتا تھا'' کی لیا سی پیسے دا''۔بغیرِ حساب رزق ملتا تھا اس دن عزیزانِ من! عیدگاہ میں جاتے تھے تو کم از کم ایک دن تو دیکھتے تھے کہ قوم میں ہر ایک کو نئے کپڑے پہنے ہوئے دیکھتے تھے کوئی پھٹے کپڑے والا نہیں ہوتا تھا کوئی پرانے کپڑے والا وہاں نہیں ہوتا تھا۔اتنی خوشی ہوتی تھی' ہر گھر میں سویاں پکتی تھیں' ہر گھر سے خوشی کی آواز آتی تھی گئے گذرے دور میں بھی عزیزانِ من!۔ اب اس ہجومِ مؤمنین کو عید کے دن جا کے دیکھ لیجیے گا اسی نوے فیصد تو وہ ہوتا ہے جن کو نیا کپڑا ابھی اس دن نصیب نہیں ہوتا۔اور اب تو شاید پرانے بھی باقی نہ رہے ہوں۔ہجومِ مؤمنین میں بھی ہم یہاں آ گئے۔اور عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں۔عزیزانِ من! یہ تھا یہ تیاری کا مہینہ رمضان کا۔میں نے کہا تھا کہ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ یہ پہلے ہی درس میں یہ آیت سامنے آ گئی اور یہ ہے جس کو آپ عید کہتے ہیں۔سورۃ یونس کی آیت 58 تک ہم آ گئے 59 سے ہم آئندہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔دسواں باب (آیات 59 تا 63)

عزیزانِ من!

آج اکتوبر 1973ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی آیت 59 سے ہو رہا ہے۔ (10:59)

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس اس آیت پہ ختم ہوا تھا کہ قرآنِ کریم (**قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذٰلک فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون**) (10:58) تو یہ خدا کے فضل اور رحمت کا ایسا ضابطۂ ہدایت تمہیں مل گیا اور یہ ایسی متاعِ گراں بہا ہی نہیں بے بہا ہے (**خیر مما یجمعون**) جو کچھ بھی تم اکٹھا کر لو یہ اس سے بھی کہیں بہتر ہے۔لہٰذا اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جسے ہم عید کہتے ہیں یہ جشنِ مسرت ہے نزولِ قرآن کا۔اور اس جشن کے منانے کے لیے اس تقریب کی تیاریوں کے لیے یہ پورا مہینہ ہے رمضان کا۔ اس لیے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ قرآن سے مَس وہی کر سکتا ہے جو فکر و نظر کی تطہیر کر لے اس کے بغیر اسے چھوا بھی نہیں جا سکتا اس کے پاس تک پھٹکا نہیں جا سکتا۔یہ کبھی ہدایت نہیں دے سکتا جب تک کعبے سے بتوں کو نہ نکالا جائے اس میں خدا قدم نہیں رکھتا۔اس کے لیے یہ ایک مہینے بھر کی تیاری تھی وہ میں نے پچھلے درس میں یہ کچھ عرض کیا تھا۔اب اس قرآن کی اتنی اہمیت بتانے کے بعد اگلی آیت ہمارے سامنے یہ آتی ہے۔

(**قل ارء یتم ما انزل اللہ لکم من رزقٍ فجعلتم منہ حرامًا و حلٰلًا**) (10:59) کہا کہ تم نے اس پر بھی غور کیا کہ خدا نے تو یہ قرآن اتارا اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم خود ہی حرام اور حلال کی فہرستیں تیار کرنے لگ گئے۔نظر بظاہر یہ چیز آئے گی کہ وہ پیچھے قرآنِ کریم کے نزول پہ جشنِ مسرت منانے کا ذکر' اتنی عظیم کتاب۔اس کے بعد جو اگلی آیت آ گئی ہے وہ حرام حلال کا مسئلہ۔ہمارے ہاں تو حرام حلال کا مسئلہ یونہی ایک جذباتی سی بات ہے نا اس کی اہمیت بس اتنی ہے نا کہ صاحب یہ ٹھیک ہے مرغی حلال ہے کوا حرام ہے۔اتنا سا ہے۔یعنی اس کو اتنی بڑی اہمیت کہ نزولِ قرآن کے بعد جو پہلی بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ ہم نے قرآن نازل کیا اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم خود یہ فہرستیں تیار کرنے لگ گئے۔تو گویا قرآن کی اور اتنی بنیادی تعلیم جسے کہا جاتا ہے کہ وہ توحید ہے اور رسالت ہے اور آخرت ہے اور یہ مقامات اوامر ہیں نواہی ہیں۔وہ سارا قصہ چھوڑ کے یہ حرام اور حلال کی بات۔یہ کیا اتنی اہم چیز ہے جیسے کہیں گے کہ قرآن کی Introduction کے بعد پہلی بات جو کہی گئی وہ یہ کہی گئی۔یہ ہے کیا بات۔اور ہے ہی اتنی۔قرآن ملا ہی اس لیے تھا۔یہ یوں نہیں کہ آپ کا فقہ کا جو مسئلہ ہے کوا حرام اور مرغی حلال' بات اور ہے یہ۔اور وہ سمجھ لی جائے تو یہ بھی بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ وحی کا بنیادی مقصد کیا ہے قرآن کرنے کے لیے کیا آیا تھا اس کا ہماری زندگی سے تعلق کیا ہے اتنی اہمیت اسے کیوں دی گئی ہے۔آپ حیران ہونگے کہ میں بھی کیا کہہ رہا ہوں' بات کر رہا ہوں حرام اور حلال کی اور بتا رہا ہوں کہ اتنی بنیادی اہمیت جو ہے انسان کی انسانی زندگی کی دین کی وہ اسی پہ ہے۔تخلیقِ کائنات کے بعد یہ جتنی بھی اشیائے کائنات ہیں

ان کے متعلق آپ دیکھ رہے ہیں قرآن بھی کہہ رہا ہے کہ ان میں سے کسی کو اختیار وارادہ نہیں دیا گیا۔ان میں سے ہر ایک خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے پہ مجبور ہیں' علمائے بائیالوجی یہ کہتے ہیں کہ فطرت نے ان کے اوپر ایک کنٹرول خود رکھا ہوا ہے۔کچھ ہی کہہ لیجیے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ وحی ان کے اندر ہم نے داخل کی ہوئی ہے۔آپ کہہ لیجیے فطرت نے کنٹرول رکھا ہوا ہے۔بات وہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک' ایک قاعدے ضابطے قانون کے تابع زندگی بسر کرتا ہے۔اور جو بھی ہے اس کے لیے وہ مجبور ہے اس پر زندگی بسر کرنے کے لیے' اسے اختیار نہیں ہے۔پانی نشیب کی طرف بہنے کے لیے مجبور ہے' آگ حرارت دینے کے لیے مجبور ہے۔یہاں تک تو آپ کہیں گے کہ ذی حیات کی بات نہیں ہو رہی۔اور ذی حیات کی طرف آ جایئے۔شیر اتنی بے پناہ مہیب قوتوں کا مالک ہے جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔وہ ایسے مقام پہ ہو کہ جہاں پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہیں نہایت خوشنما لہلہاتی ہوئی گھاس ہے۔بیمار ہو گیا ہے یا شکار کی کمی ہو گئی ہے اس پاکستان میں پھلوں کے لدے ہوئے باغ میں لہلہاتی ہوئی گھاس کے اندر بھوک سے تڑپ کر مر جائے گا انگور کا ایک دانہ منہ میں نہیں ڈالے گا' گھاس کی پتی کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھے گا۔یہ اتنی بڑی قوتوں کا مالک مر رہا ہے' اتنا کچھ موجود ہے' سارے ہرن چر رہے ہیں بکریاں کھا رہی ہیں ان چیزوں کو۔تمام اپنا اپنا پیٹ بھرتی ہیں وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی قوت تو نہیں رکھتیں۔اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ ساری قوتوں کا مالک جنگل کا بادشاہ مر رہا ہے بھوک سے یہ سامان اتنا پڑا ہوا ہے آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔یہ کیا ہے؟ اس لیے کہ فطرت نے اس پر اسے حرام قرار دیدیا ہوا ہے۔کنٹرول اس کے اوپر یہ رکھا ہوا ہے اس کے اختیار وارادے پہ۔سوچیے تو سہی کہ اگر شیر کو یہ کنٹرول نہ رکھا جاتا کوئی چرند اس جنگل میں اس دنیا میں باقی بھی بچتا۔یہ نہیں کہ وہ ساری گھاس کھا جاتا' شیر کی ایک دھاڑ بیچاری بکریاں ہرن وہاں رہ کیسے سکتے تھے۔بلی اگر اڑنا جانتی کوئی پرندہ محفوظ رہتا یہاں۔فطرت نے کنٹرول کیا ہوا ہے ان کے اوپر۔اسی کائنات میں آگے بڑھتی ہوئی چیز انسان کی آئی۔انسان میں اور باقی حیوانات کہہ لیجیے یا اشیائے کائنات کہہ لیجیے بڑھی ہوئی شکل حیوانات ہی کی ہے نا۔تقاضے انسان کے بھی بنیادی وہی ہیں جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے جو حیوانات کے ہیں: کھانا پینا سونا جاگنا افزائشِ نسل کرنا اس کے بعد طبعی موت مر جانا۔تو یہ تقاضے تو وہی ہیں کہ جو ہر حیوان کے تقاضے ہیں۔تو کھانا پینا تو اس کے اندر آتا ہے اور تقاضوں کی تسکین کے سامان بھی اس میں آتے ہیں وہ تو سب وہی ہیں۔لیکن انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا گیا ہے فطرت نے اس پر سے اپنا کنٹرول اٹھا لیا ہے۔اس لیے کہ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں تھا کہ ایک طرف اسے صاحبِ اختیار وارادہ بناتا دوسری طرف اس کا اختیار سلب کر کے اس کو حیوان کی سطح پہ رکھ دیتا۔اس کا ارادہ چھینا نہیں ہے۔(**ان ھدینٰہ سبیل**) بکری کو بھی اس نے راستہ دکھایا ہے شیر کو بھی اس نے راستہ دکھایا۔راستہ دکھانے کے بعد کیفیت یہ نہیں ہے کہ (**اما شاکرًا و اما کفورًا**) اس کا جی چاہے تو اس راستے پہ چلے جی چاہے تو نہ چلے۔وہاں جی چاہے گا سوال نہیں ہے۔شیر کو راستہ دکھایا کہ گوشت تم پر حلال ہے گھاس اور پھل حرام ہیں۔اب اس پہ اس کا اختیار نہیں ہے کہ یہ ایک راستہ چھوڑ کے دوسرا راستہ اختیار کر لے۔تقاضے انسان کے بھی وہی ہیں جو اُن کے تقاضے

ہیں۔ یہاں یہ صورت نہیں ہے' راستہ تو اسے بھی دکھایا اختیار وارادہ سلب نہیں کیا۔لیکن آگے چلئے۔اگر تو انسان کو اکیلے اکیلے کہیں جنگل میں کسی غار میں ایک فرد کو رہنا پڑے تو ٹھیک ہے اس کو بلا حدود اختیار وارادے دیے ہوئے ہوں یہ کسی دوسرے کو نقصان ہی کچھ نہیں پہنچا سکتا۔ وہاں اپنے ارادے کا استعمال اپنے اختیار کا استعمال کرے گا کس چیز میں۔یہی ہوگا نا کبھی جی میں آیا پھل کھالیا کبھی جی میں آیا اس نے کوئی شکار مارلیا ۔لیکن سوچئے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور ہر انسان صاحبِ اختیار ہے۔وہ کہتے ہیں ایک مملکت پہ دو بادشاہ نہیں رہ سکتے' یہ معنی کیا ہیں اس کے۔دو صاحبِ اختیار ایک مملکت میں نہیں رہ سکتے بات ٹھیک ہے۔خدا کہتا ہے اگر اس کائنات میں دو الٰہ ہوتے تو تم دیکھتے کہ کس طرح سے یہ تہس نہس ہو کے رہ جاتی' بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں تو دو کی بات تھی اور یہاں کروڑوں اربوں' ہر ایک صاحبِ اختیار وارادہ' ہر ایک کے وہی تقاضے جو دوسرے کے تقاضے ہیں۔تو سوچئے تو سہی انہیں اگر اسی طرح سے چھوڑ دیا جائے تو کس قدر ٹکراؤ پیدا ہوگا آپس میں' کس قدر فساد پیدا ہوگا آپس میں۔اس کی ضرورت ہے نا کہ یہ یہاں جو زندگی بسر کریں اپنی تمدنی زندگی' کوئی کنٹرول ان کے اوپر ہو۔یہ جسے آپ فساد کہتے ہیں لاقانونیت کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے؟ کنٹرول اٹھ جاتا ہے نا۔دوسری طرف مشکل یہ ہے کہ کنٹرول عائد کیجیے تو اس کا وہ جو شرفِ انسانیت ہے اختیار وارادہ وہ سلب نہیں تو محدود ہو جاتا ہے۔کنٹرول کا ہونا بڑا ضروری ہے۔پھر میں کہدوں ہونا ضروری' عائد کیا جائے تو اس کے راستے میں رکاوٹ بندش۔اسے کہتے ہیں نا میری آزادی سلب کر لی۔سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگیا۔اسے آزاد چھوڑتے ہیں تو وہ فساد برپا ہوتا ہے جو تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پابندی عائد کرتے ہیں تو چیختا ہے میری آزادی سلب کر لی۔کیا کیا جائے؟ آزاد چھوڑ دیا جائے وہ آزاد جسے مادر پدر آزاد کہتے ہیں؟ ایک دن نہیں چل سکتا نظام آپ کا۔ پابندیاں عائد کرنی ہونگی۔عزیزانِ من! سارا مسئلہ انسان کا یہ ہے کہ اس پہ پابندیاں کون عائد کرے اور وہ کیسی ہونی چاہئیں۔ایک ہی مسئلہ ہے سارا صاحب اور یہی مسئلہ ہے جسے اصطلاح میں حلال وحرام کہتے ہیں۔حلال کے معنی ہی آزادی کے ہیں۔حلہ کے معنی ہوتے ہیں اس رسی کی گرہیں کھول دینا جس سے جانور کو باندھا ہوا ہوتا ہے۔غور فرمایا کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے انسان کی زندگی کا۔نزولِ قرآن کا ذکر کرنے کے بعد کہ کتنی بڑی متاع یہ دی ہے اور کتنی اہمیت ہے۔کہتا ہوں غور کیجیے اس ربط پہ اس قرآن کے۔اس کے فوری بعد پہلی آیت وہ لایا ہے جس کے لیے ضرورت پڑی ہے وحی کی۔اس نے کہا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے دوسرے انسان کی آزادی کے اوپر پابندی عائد کرے۔تم تو دونوں برابر کے صاحبِ اختیار وارادہ ہو تمہیں کیا حق حاصل ہے میرے ہی جیسا اختیار وارادہ رکھنے والے کو میرے اختیار وارادے کے اوپر پابندی عائد کرے۔کیا حق ہے تمہیں۔کوئی شخص پسند نہیں کرتا اس چیز کو کہ اس کے ارادے پہ اسی جیسا دوسرا انسان کوئی پابندی عائد کرے۔ پابندی عائد ہوتی ہے تو اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اسے توڑ دے۔پہلی چیز تو اس کے پندارِ نفس کی شکست اس میں ہوتی ہے ''تو ہوندا کون ایں روکن والا''۔آپ نے دیکھا کہ یہ کیا بات ہے ''ہوندا کون ایں'' یہ بڑی چیز ہے۔الفاظ کی تہ میں بڑی چیزیں ہوتی ہیں عزیزانِ من!۔اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے ہی جیسا تو تُو انسان ہے تجھے کیا حق حاصل ہے کہ

میری آزادی پہ پابندی عائد کرے۔اور ابھی ابھی میں نے کہا ہے کہ پابندی عائد نہ کی جائے تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا عزیزانِ من! انسان کی پرابلم ساری یہ ہے کہ اسے بغیر پابندیوں کے چھوڑا نہیں جا سکتا سوال یہ ہے کہ پابندی عائد کون کرے۔کوئی انسان کسی دوسرے انسان پہ پابندی عائد کرنے کا اختیار نہیں رکھتا حق نہیں رکھتا جائز نہیں ہوتا۔(**ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتٰب والحکمۃ والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللہ**) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ اسے قانون سازی کے اختیار مل جائیں Executive کے اختیارات مل جائیں وہ نبی بھی کیوں نہ ہو کہ کسی دوسرے انسان کے اختیار کے اوپر خود پابندی عائد کرے۔اللہ اکبر اللہ اکبر۔ دیکھتے ہیں مقامِ انسانیت کیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ یہاں ہر فرد کے بنیادی شرف کو کس طرح تحفظ دیا گیا ہے۔خواہ اسے نبوت بھی کیوں نہ مل جائے ۔ صاحب اور گوشہ کونسا ہوتا ہے ۔ یا واضح قوانین ہونگے جسے آپ Constitutional Government کہتے ہیں یا وہ؟؟ کی ڈکٹیٹر شپ؟؟؟ چیز ہوگی جسے آپ حکومت کہتے ہیں اور تیسری بات آپ کی عالمِ مذہب کی رہ جائے گی نا اور اس کی انتہا یہ ہے جسے نبی کہتے ہیں۔نبوت بھی مل جائے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے۔(**کونوا عبادًا لی**) کہا کہ میں جو پابندی عائد کرتا ہوں تم اس پابندی کو قبول کرو اس کے مطابق' کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔تو اگلی بات تو یہ ہوگئی کہ پابندیوں کے بغیر چھوڑا جائے' چھوڑا جائے بغیر تو ٹکراؤ ہوتا ہے۔(**کونوا عبادًا لی من دون اللہ**) یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔انسان کسی کو نہیں' خدا کو یہ حق حاصل ہے۔اس حق کا وہ کس طرح سے بتاتا ہے کہ پھر کیسے معلوم ہو؟ وہ تو ذات وہ ہے کہ جو خیال و قیاس و گمان و وہم میں بھی نہیں آ سکتی۔کیسے وہ یہ پابندیاں عائد کرتا ہے معلوم کیسے ہو کہ پابندی عائد کی ہے۔(**ولٰکن یکونوا ربانین بما کنتم تعلمون الکتٰب بما کنتم تدرسون**) اس کتاب کے ذریعے سے یہ پابندیاں عائد ہم نے کی ہیں اور جن کو تم پڑھتے پڑھاتے ہو۔دیکھا کہ نزولِ قرآن کے بعد پہلی آیت حلال و حرام کی کیوں آ گئی۔یہ حرام و حلال مرغی اور کوے تک کی صرف بات نہیں ہے یہ تو انسان کے اوپر پابندی عائد کرنے کی بات ہے کہ کہاں تک یہ آزاد رہے گا اور کہاں جا کے ایک پابندی عائد ہو جائے گی۔ یہ ہے حرام و حلال جسے آپ کہتے ہیں۔ یہ ہم نے اس کو سمٹا دیا کہ کھانے کی چار چیزوں کے متعلق یہ بات کہہ دی۔سوال یہ ہے کہ کہاں تک یہ اپنے اختیارات کے استعمال میں آزاد رہ سکتا ہے کہاں جا کے ایک پابندی عائد کی جاتی ہے اس کے اوپر۔ یہ پابندی ہے جسے حد کہا جاتا ہے' ایک لائن Draw کی جاتی ہے۔اور اسی لیے قرآن نے اسے حدود اللہ کہا ہے۔ یہ صرف خدا کو حق حاصل ہے اس کا' وہ پابندیاں عائد کر سکتا ہے۔لیکن معلوم ہے آپ کو کہ یہ پابندیاں عائد کرنے والے نے اپنے متعلق کیا کہا ہے۔ خدا اختیاراتِ مطلق کا مالک ہے اس کے اختیار کے اوپر کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی۔ پابندی تو اس سے اونچا جو ہے نا وہ عائد کرے گا نا جیسے یہاں کہا کہ برابر کے انسان وہ تو کر ہی نہیں سکتے پابندی عائد ایک دوسرے پہ۔تو اس سے اونچا جو ہے وہ کرے گا نا۔انسانوں سے تو اونچا خدا ہو گیا' خدا کے اختیارات کے اوپر کوئی پابندی عائد ہی نہیں کر سکتا کہ اس سے اونچا کوئی ہے نہیں۔لیکن سنیے کہ اس نے یہ کیا کہا ہے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے ہمارے اختیارات مطلق ہیں لیکن ہم نے اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کر لی ہیں۔(**کتب علٰی نفسہ رحمہ**) ہم نے واجب کر رکھا ہے اپنے اوپر۔ جب بھی کوئی کہے کہ یہ میں نے واجب کر رکھا ہے اس سے بڑی پابندی کیا ہوتی ہے۔ اور ایسے کر رکھا ہے کہ (**لا یخلف المیعاد**) پابندی ہم نے یہ عائد کر رکھی ہے کہ اگر ہم وعدہ کرتے ہیں تو اس کے خلاف کبھی نہیں کرتے۔(**لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلًا**) پابندی یہ عائد کر رکھی ہے کہ ایک روش کا ہم نے اعلان کر دیا ہے کبھی اس میں ہم تبدیلی نہیں کرتے۔ کتنی بڑی پابندی ہے۔ معاف رکھئے گا اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے متعلق تو یہ چیز کہ ہم نے تمہیں راستہ دکھا دیا(**فمن شآء فلیؤمن فمن شآء فلیکفر**) پابندی ہم نے تمہیں بتا دی ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کر جس کا جی چاہے توڑ دے۔ اپنے اوپر جو پابندی عائد کی ہے وہ کہتا ہے ہم توڑ ہی نہیں سکتے توڑیں گے نہیں۔ معاف رکھئے گا اگر میں Quotation میں کہوں کہ ہم سے بھی زیادہ مجبور۔ شانِ خداوندی یہی ہے عزیزانِ من! اتنی لا انتہا قوتوں اختیارات کا مالک اپنے اوپر آپ پابندی عائد کرے اور اس کے بعد پھر کوئی اختیار اپنے لیے نہ رکھے کہ جب جی چاہے توڑ دے۔ اسے ہی تو کہتا تھا خدا ہونا۔ یہ جو چیز ہے انسانی اختیارات کو ایک حد کے اندر رکھنا تا کہ یہ آپ کے ہاں کا یہ نظام جو ہے تمدنی اور معاشرتی یہ قائم رہے۔ یہ ہے جسے حرام اور حلال کا مسئلہ کہا گیا ہے۔ یہ گدھا اور کوے اور مرغی اور بٹیر کا ہی سوال نہیں ہے وہ تو بڑا چھوٹا سا ایک مسئلہ ہے زندگی کا۔ اس نے حلال کہنے کے بعد آگے پھر یہ کہا کہ حلال میں سے بھی طیب' جو تمہیں اچھا لگے۔ مجبوری نہیں ہے کہ ہر شے جو حرام نہیں کی گئی وہ ضرورت تمہیں کھانی ہوگی۔ یہاں پھر اختیار ہے تمہارا جو خوشگوار نظر آئے جو سازگار ہو مزاج کے' یہ تمہاری مرضی پہ ہے۔ کچھ پابندیاں ہم عائد کرتے ہیں۔ اور وہ آگے چل کے میں بیان کرونگا کبھی یہ چیز آئی کہ وہ پابندیاں کیا ہیں جو اس نے عائد کی ہوئی ہیں وہ پابندیاں انسان کیوں نہیں دوسرے انسانوں پہ عائد کر سکتا۔ وہ پابندیاں کیا ہیں۔ سوال کی اہمیت جو تھی یہیں سے میرے ذہن میں یہ ایسی آئی ہے۔ پاکستان کے آئین میں آپ نے دیکھا ہوگا پہلی ہی لائن کے اندر یہ لکھا ہوا ہے''وہ اختیارات جو مقدس امانت ہیں مملکت کو حاصل ہیں وہ ان حدود کے اندر استعمال کیے جائیں گے جو خدا نے عائد کی ہیں''۔ پہلی سطر ہے یہ' لیکن سارے آئین میں کہیں نہیں یہ کہا گیا کہ وہ پابندیاں ہیں کیا' کہاں ملیں گی۔ مسئلہ ہی اصل یہ تھا عزیزانِ من! بنیاد ہی ساری یہ ہے مذہب کی دین کی۔ اس کی اہمیت یہ تھی میں نے جب اس پہ غور کیا تو میرے ذہن میں ہے کہ یہ' ہمارے ہاں اگلے مہینے وہ طلوعِ اسلام کی کنونشن آ رہی ہے۔ تو آپ کو معلوم ہے اس کنونشن میں میرے کچھ خطابات ہوتے ہیں۔ مسئلے کی اہمیت جو تھی یہاں بھی میرے سامنے تھی لیکن وہ جو آئین میں بات آئی تو اور ابھر کر سامنے آ گئی۔ اور جو اس میں کچھ نہیں کہا گیا تو وہ اور زیادہ گہرائی میں میرے دل میں چلی گئی کہ بڑی اہم چیز ہے۔ تو میرے ذہن میں یہ ہے کہ اس سال میں اس کنونشن میں اپنے خطاب کا موضوع ہی یہ رکھوں کہ یہ پابندیاں یہ حدود اللہ اور یہ علت و حرمت جو کہا گیا ہے یہ ہیں کیا۔ کیوں عائد کی گئی ہیں' اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنانے کے بعد اس کے ارادے کو محدود کیوں کیا گیا ہے اور وہ حدود ہیں کیا جو قرآن نے عائد کی ہیں خدا نے عائد کی ہیں۔ کچھ بات تو سمجھ میں آئے گی کہ

اختیار دینے کے بعد ان کو محدود کیوں کیا گیا ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ لائنز جو ہیں وہ خدا نے کھینچی ہیں انسان کا اختیار سلب نہیں کیا ہے (**فمن شآء فلیؤمن فمن شآء فلیکفر**) جب کہا اختیار سلب کیا۔ ہدایت ہے Indication ہے لکیریں ہیں جو کھینچ دی گئی ہیں بتا دیا گیا ہے کہ یہ کیوں کھینچی گئی ہیں۔ ان کی پابندی سے کیا ہوگا اور ان سے تجاوز کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا یہ سب کچھ بتا دیا گیا ہے۔ اور بتا دینے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ یہ اب تمہاری اپنی مرضی کے اوپر ہے کہ ان کی پابندی کرو یا ان کی پابندی نہ کرو۔ (**فمن شآء فلیؤمن فمن شآء فلیکفر**) ۔ کیا بات ہے!! اختیارات باقی بھی رکھے گئے ہیں اور بے مہابہ اور بے مہار بھی نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ ہے عزیزانِ من! جسے آپ حلال اور حرام کا مسئلہ کہتے ہیں۔ جب بھی آپ کے ہاں کوئی بنیادی نظریہ تصور قدر اصول مسئلہ بن جاتا ہے وہ پھر اختلافی اور متنازع فیہ ہو جاتا ہے اور ان کے بس میں جا پڑتا ہے۔ گفتگو ہی اس پہ مسئلے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ یہ مسئلے نہیں ہیں عزیزانِ من! زندگی کی بنیادی Problems ہیں زندگی کے بنیادی تقاضے ہیں یہ اصلِ دین ہیں۔ یونہی حدود اللہ نہیں کہہ دیا اس نے۔ تجاوز تو ایک طرف وہ تو کہتا ہے (**لا تقربوھا**) ان لائنز کے قریب بھی نہ جانا کہ ہو سکتا ہے کہ قریب جا کے یونہی ذرا پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جائے اور پاؤں آگے چلا جائے۔ ذرا دور دور رہا کرو۔ یہ ہے عزیزانِ من! یہ اتنا اہم سوال جس کے لیے اس نے نزولِ قرآن کے بعد فوراً یہ چیز کہی کہ ہم نے تو قرآن نازل کیا تھا کہا ذرا اس کے مقابلے میں تم نے دیکھا بھی ان لوگوں کو کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ یہ بیٹھے ہوئے خود ہی یہ حرام وحلال کی فہرستیں مرتب کرتے رہتے ہیں یہ پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ تمہیں یہ خدا بننے کا اختیار کس نے دیدیا ہے۔ اس مسئلے پہ اس پرابلم پہ (اس کا ترجمہ پرابلم کا اور ہے نہیں ہمارے ہاں) قرآنِ کریم نے مختلف مقامات میں اس چیز کو بڑا واضح کیا ہے۔ وہ درس آئے گا جس میں میں بنیادی طور پہ اسی سوال کو لونگا تو آپ دیکھیں گے وہاں زیادہ تفصیل سے میں بیان کرونگا۔ یہاں دو تین آیات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ (**ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھٰذا حلٰل و ھٰذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب**) (16:116) کہتا ہے یونہی نہ بیٹھے ہوئے بکتے چلے جایا کرو یہ حرام ہے یہ حلال ہے۔ حرام اور حلال کی بات تم کرتے ہو خدا کے خلاف یہ افتراء ہے کیونکہ یہ بات وہی کر سکتا ہے دوسرا نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ تم اپنی طرف سے اس کی طرف منسوب کر کے کہتے ہو جھوٹ ہے کذب ہے افتراء ہے۔ تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے یہ کہنے کا۔ یہ تو چیز میں نے کہا ہے کہ کھانے پینے کا ہی مسئلہ نہیں ہے زندگی کے مختلف گوشے ہیں کھانے پینے کا مسئلہ ان میں یہ ایک گوشہ ہوتا ہے۔ جو باقی چیزیں کچھ پہننا کچھ زیب وزینت کی چیزیں کچھ سنوارنا تحسینِ ذوق جسے کہتے ہیں Asthetic Taste جسے آپ کہتے ہیں یہ چیزیں بھی انسان کے تقاضے ہیں زندگی کے حیوانات سے آگے بڑھ کے۔ ان کے ہاں صرف طبعی چیز ہے۔ یہ فطرت کی ان چیزوں کو جو دی ہوئی ہیں اپنے ذوق کے مطابق ان میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے سنوارتا ہے۔ بکری اور ہرن اسی شکل میں سبزی کو کھا جاتا ہے یہ اُسے چٹ پٹی بھی بناتا ہے۔ یہ جو اس کے اندر ہے ذوقِ تحسین کی چیزیں جو ہیں قرآن اس کو سامنے رکھتا ہے۔ دیکھئے کن الفاظ میں کہتا ہے۔ (**قل**) (7:32) اے رسول ذرا پوچھو ان سے (**من**

حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ و الطیبٰت من الرزق) (7:32)ان سے پوچھو کہ کون ہے وہ جوان چیزوں کو جسے خدا نے اپنے بندوں کے لیے زینت کی چیزیں اور رزق کی چیزیں جنہیں اس نے حلال وطیب قرار دیا ہے کون ہے کہ جوانہیں حرام قرار دے سکتا ہے۔ یہ خدائی کا دعویٰ ہے۔ بات ساری وہ شرفِ انسانیت کا تحفظ ہے عزیزانِ من! کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کسی دوسرے انسان کے اختیار کے اوپر کوئی پابندی عائد کرے' کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ خدا بننے والی بات ہے۔(**من حرم زینة اللہ**) (7:32)۔ بڑی چیز ہے عزیزانِ من!۔اور آگے بڑھیے عزیزانِ من! معاملے کی اہمیت یہاں آ کے واضح ہوتی ہے۔سورۃ تحریم کی پہلی آیت غور سے سنیے گا۔ وہاں یہ کہا گیا تھا نا کہ خواہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے یہ حق نہیں حاصل ہوسکتا کہ انسانوں کے اوپر کوئی پابندی عائد کی جائے۔ یہاں آپ دیکھئے شدت کتنی بڑی ہے۔

کہا گیا ہے کہ (**یایھا النبی**) (66:1)اے نبی! (**لم تحرم ما احل اللہ لک**) (66:1)دوسروں پہ پابندی نہیں' کہا کہ تو نے اپنے اوپر کیوں وہ چیز حرام کرلی کہ جو ہم نے حلال کی ہوئی تھی۔ میرے اللہ۔(**یایھا النبی**) ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک حلال چیز کو آپ پسند نہیں کرتے ناخوشگوار ہے مزاج سے سازگار نہیں ہے اسے نہ کھایئے آپ اسے حرام نہیں قرار دے سکتے۔یعنی دوسروں کے اختیار پہ تو پابندی عائد کرنا ایک طرف' جو اختیار خدا نے آپ کو دیا ہے اور اس پہ خدا نے پابندی عائد نہیں کی ہے وہ کہتا ہے کہ تم اپنی ذات کے لیے بھی ایسی پابندی عائد نہ کرلو کہ غیر متبدل ہو۔ کہو مجھے پسند نہیں ہے ٹھیک ہے تمہارا اختیار ہے نہ کھاؤ۔ یہ پابندی جذباتی ہوجائے گی۔اور آپ کو معلوم ہے اس قسم کی پابندیاں عائد کرنے والے پھر کس طرح سے تڑپا کرتے ہیں۔ کہ صاحب وہ جلدی میں غلطی میں آ کے قسم تو میں کھا بیٹھا اب اس کے بعد صاحب؟؟ ہوئی ہوئی ہے۔ یہ ہوتی ہیں ناقسمیں۔(**یایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک**) (66:1)۔اب آپ سوچ لیجیے عزیزانِ من! دین کیا ہے۔اس اختیار کو صرف اپنے لیے اس نے رکھا ہے۔ رکھنے کے بعد اس نے کیا کیا؟ یہ نہیں ہے کہ اچھا بھئی چلتے رہو جب ہمارا جی چاہے گا آواز دیدیا کریں گے کہ نہیں بھئی یہ حرام ہے۔''اجی پہلے کیوں نہیں دسیا ہیگا''۔ یہ کیفیت اگر پیدا ہوجائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اس کی طرف سے جو اس نے قوانین دیے ہیں وہ قوانین کی جگہ Ordinance آنا شروع ہوجائیں۔ پتہ ہی نہ ہو آپ کو کہ ٹھیک ہے راستہ کھلا تھا اس نے کہا تھا یہاں No Entry تو لکھا ہوا نہیں تھا وہ چلا ہوں اور ذرا آگے دو قدم آگے گئے ہیں موڑ کے دو پہیے ابھی پیچھے ہیں اور وہاں سے آ گیا ہے کہ نہیں صاحب بند ہے یہاں جانا۔اگر خدا کی طرف سے یہ سلسلہ ہوجائے پہلی بات تو یہ ہوجائے کہ بتایا نہ جائے۔اس نے کہا تھا یہ چیز ہمارے ذمہ تھی اتنا بڑا اہم سوال جو تھا تمہارے اختیار وارادے کے اوپر پابندی عائد کرنا ایسا نہیں تھا کہ ہم اس کو واضح نہ کرتے۔ بالکل واضح کردیا ہے۔وحی کے ذریعے دیا وحی قرآن کے اندر ہے۔

(**قل**) (6:146)اعلان کردو اے رسول۔رسول سے کہا جارہا ہے کیونکہ سب سے بڑی امتیوں کے لیے سب سے عظیم ترین ہستی تو

رسول کی ہوسکتی تھی۔ یہ اسی سے کہلوایا جارہا ہے کہ کہیں ان کے ذہن میں یہ چیز نہ آ جائے کہ یہ یہ کچھ بھی کر دے گا یا کر سکتا ہے۔(**قل لا اجد فی ما اوحی الی محرمًا علیٰ طاعمٍ یطعمه الا ان یکون میتة او دمًا**) (6:146)ان سے کہدو کہ جو مجھ کو وحی دی گئی ہے اس کے اندر تو یہ چیزیں ہیں جنہیں حرام کیا گیا ہے۔ وحی جو مجھے دی گئی ہے میں اپنی وحی میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں پاتا یہ ہے بھئی۔ بات صاف ہوگئی کہ وہ وحی کے اندر ہے' قرآن میں دیدیا اس کو۔ اس دینے کے بعد یہ کہدیا کہ (**لا مبدل لکلمت الله**) کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اچھا جی۔ خدا کی وحی تو کر سکتی تھی نا۔ کہا کہ وحی کا سلسلہ اب ہم نے بند کر دیا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ عزیزانِ من! اتنی بڑی آزادی کہیں میسر آ سکتی ہے؟ کہ جن چیزوں کو حدود کہا ہے انہیں صرف متعین کر کے نشاندہی کی' تمہارا جی چاہے مانو جی چاہے نہ مانو۔ نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اختیار نہیں سلب کیا۔ واضح کر کے بتا دیا کہ یہ بات نہ ہو کہ صاحب پتہ ہی نہیں تھا۔ محفوظ کر دیا کہ صاحب اس دن تو پتہ تھا کہیں مٹ گئی۔ یہ کہدیا کہ نہیں بدلیں گے ہم اسے' اطمینان ہوگیا کہ صاحب یہی ہیں غیر متبدل ہیں۔ صاحب آج آپ نہیں بدلتے آپ کل بدل دیں گے۔ کہا ہم نے وہ بدلنے والی بات جو تھی جسے وحی کہا جاتا تھا اس کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اسے ختمِ نبوت ﷺ کہتے ہیں عزیزانِ من!۔ دنیا میں ختمِ نبوت ﷺ کو ماننے والی قوم سے زیادہ آزاد قوم کوئی نہیں ہوسکتی عزیزانِ من!۔ یہ جو آپ کے ہاں یہ ہیئت حاکمیہ یا نظام ہیں آپ کے ہاں کے حکومتوں کے' آج ایک پابندی عائد کرتے ہیں کل اس کو توڑتے ہیں آپ ہی نظام کو بدل دیجیے یا سارے قوانین از سرِ نو بنا دیجیے۔ یہ ساری جتنی چیزیں ہیں ان کو بدلنے کا ان کو توڑنے کا وہ بات ہی کونسی ہے جس کا جی چاہے۔ ایک ہی چیز اور ہوسکتی تھی نا کہ کوئی یہ آ کے کہے کہ صاحب خدا نے یہ پابندی عائد کر دی ہے۔ یہ بات ہوسکتی تھی نا۔ اب اس کے بعد ختمِ نبوت ﷺ کے بعد دنیا میں کوئی شخص آ کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا نے تمہارے اوپر یہ پابندی بھی عائد کر رکھی ہے۔ کہنے لگے بھاگو! جو عائد کرنی تھی کر دی اس نے وہ ہے قرآن کے اندر۔ اب اس کے بعد پھر یہ بات جو ہے کہ کسی سے وہ یہ کہے کہ ہم نے اور پابندی بھی عائد کر دی ہے اس کو اس نے ختم کر دیا ہوا ہے اس سلسلے کو۔ مجھے معلوم ہے کہ کیا پابندیاں ہیں اور کیا آزادیاں ہیں میری اور وہ غیر متبدل ہیں محفوظ ہیں اور اس کے بعد اب کوئی انسان ایسا نہیں آ سکتا جو یہ کہے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ یہ چیز تم پہ حرام ہے پابندی یہ ہے۔ اب کوئی آ ہی نہیں سکتا۔ واہ واہ واہ۔ عزیزانِ من! انسانی آزادی کی اس سے بڑی ضمانت دنیا میں کوئی اور ہوسکتی ہے؟ یہ جسے آپ نظامِ حکومت کہتے ہیں یہ ضروری چیز ہے تمدن کا نظم و نسق رکھنے کے لیے۔ انہیں تو یہ کہدیا کہ یاد رکھو(**ان الحکم الا لله**) اختیارات پہ پابندیاں کرنے کی اجازت تمہیں نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی عظیم چیز ہے عزیزانِ من! جو انسانی آزادی کو دی گئی تھی۔ اور جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ سارا مسئلہ پرابلم ہی انسان کا یہ ہے اختیارات کے اوپر پابندیاں عائد کی جائیں تو کہتے ہیں آزادی سلب ہوگئی آزاد کیا جائے تو روز سر پھٹول ہوتی ہے اس کی۔ پرابلم ہی یہ تھی۔ انسان کی عائد کردہ پابندی کو مجبوراً تو انسان مرتا کیا نہ کرتا برداشت کر لیتا ہے بطیّب خاطر نہیں کرتا۔ یہ وہ پابندیاں ہیں جن کو بتا دیا گیا اور اس کے بعد کہدیا گیا کہ بطیّب خاطر اگر ان کو قبول کرنا چاہتے ہو تو قبول کرو' نہیں قبول کرنا چاہتے تو اس کے نتائج بھگتو

۔سیدھی سی بات ہے آگ میں انگلی ڈالو گے تو جلا دے گی۔ ہمارا کام یہ بتا دینا تھا کہ یہ حد ہے تمہاری حفاظت کی ۔ یہ ٹھیک ہے ۔ چڑیا اور چیونٹی بھی نہیں اس حد کو توڑتی ' لے جایئے جبراً اس کو آگ کے قریب دیکھیئے وہ کیا کرتی ہے ۔انسانی بچہ بلا محابہ ہاتھ ڈال دیتا ہے اس میں ۔ہمیں اختیار دیا گیا جی چاہے ہاتھ ڈال دو جی چاہے اس کو روکو۔ ہاتھ ڈال دو گے وہ جل جائے گا' محفوظ رہنا چاہتے ہو نہ کرو بس یہی ہے جی وہ حد۔ ہمیں اختیار دیا گیا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! جو قرآن لے کے آیا ہے۔ یہ ہے جو اس نے کہا تھا کہ اس لیے اس قرآن کو یہ نازل کیا گیا تمہاری آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے شرفِ انسانیت کے تحفظ اور ضمانت کے لیے۔ضمناً یہ بات آ گئی حــرامًـا و حللًا کی اس لیے میں نے عرض کیا ہے کہ اس وقت تو صرف یہیں تک اکتفا کرتا ہوں ۔سوال کی اہمیت میرے سامنے ہے میرے ذہن میں ہے کہ اس دفعہ میں کنونشن میں ذرا اس سوال کو وضاحت سے سامنے لاؤں کہ یہ بات کیا ہے۔ یہ ہے وہ ساری چیز۔

(فـجـعـلتـم مـنـه حرامًا و حللًا) (10:59) بیٹھ گئے انسانوں کی آزادیوں پہ پابندیاں عائد کرنے والے۔**(قـل آللّه اذن لـكـم)** (10:59) کہا فرمایئے تو سہی خدا نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی کہ یہ کر سکتے ہو تم؟ دکھاؤ تو سہی ہماری طرف سے اجازت نامہ جو تمہیں حاصل ہوا تھا۔اجازت نامہ!! وہ تو نبی سے یہ کہتا ہے کہ تم نے یہ حرام کیوں قرار دیدیا اپنے اوپر۔کس کو یہ اجازت مل سکتی ہے؟ **(قل آللّه اذن لـكـم ام على الله تفترون)** (10:59) اور یہ کرنے کے بعد خدا بننا چاہتے ہو تم اس کے خلاف افتراء کرتے ہو یہ بات۔جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے عزیزانِ من! یہ سوال صرف اس جانور کھانے پینے کی چیزوں تک کی بات نہیں ہے۔ یہ بڑا وسیع سوال ہے انسانی آزادی پر پابندی عائد کرنے کا سوال ہے۔زندگی کے کسی شعبے میں کیوں نہ ہو' کوئی انسان بھی خواہ وہ فقہ کی رو سے یہ حرام حلال اشیاء میں یہ کچھ کرے یا ایوانِ حکومت میں بیٹھ کے قوانین وضع کرنا شروع کردے۔ وہ قوانین کیا ہیں؟ قانون ہوتا یہ ہے کہ اگلے کی آزادی کے اوپر پابندی کہاں تک عائد ہو۔جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآن کی رو سے کوئی حکومت یہ حدود کی لائنز خود نہیں کھینچ سکتی ان حدود کی پابندی صرف کرا سکتی ہے۔**(وما ظـن الذين يفترون على الله الكذب يوم القيٰمة)** (10:60) اللہ اکبر۔کہا کہ یہ جو بیٹھ کے دوسرے انسانوں کے ان اختیارات پہ حد بندیاں کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں یہ ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کے متعلق سمجھے کیا بیٹھے ہیں کیا خیال ہے ان کا اس کے متعلق۔ بڑا اندازہ ہے۔ یہ جتنے انسان اپنے ہاتھ میں اختیار لے لیتے ہیں دوسروں کی آزادیاں سلب کرنے کا' بنیاد یہ ہے نا کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہ جسے آپ عزیزانِ من! Sovereignty کہتے ہیں نا اقتدارِ مطلق جسے کہتے ہیں اس کے معنی ہوتا ہے Accountability to None کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔کوئی آخری اتھارٹی جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو اس سے اوپر کوئی اور اتھارٹی نہ ہو وہ اس میں آخری اتھارٹی ہو۔قرآنِ کریم نے اس بات کو واضح کر دیا۔اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو صرف خدا وہ ہے کہ جس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے کہ جس سے پوچھا نہ جائے ۔ٹھیک ہے تم اپنے ہاں Constitution میں اپنے ہاں قانون میں یہ بات رکھ لو کہ فائنل اتھارٹی

آئینی رو سے فلاں ہوگی: پارلیمان ہوگی وزیراعظم ہوگا صدر ہوگا ڈکٹیٹر ہوگا ملوکیت میں بادشاہ ہوگا۔ اپنے طور پہ تم یہ چیز کہہ سکتے ہو قرآن کی رو سے یہ چیز نہیں ہوسکتی۔ وہ کہا کہ جہاں تم جا کے یہ کہو کہ اس کے اوپر کوئی اور نہیں ہے جس کے سامنے یہ جوابدہ ہو (**مسئول عنہ**) یا اسے کوئی پوچھ نہ سکے (عام الفاظ میں) کہا یہ غلط تم کہتے ہو۔ تم میں سے بڑی سے بڑی اتھارٹی بھی جو ہے وہ اس سے ایک بڑی اتھارٹی ہے کہ جسے خدا کہا جاتا ہے اس کے سامنے وہ جوابدہ ہے۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ یہ ہے وہ چیز جسے آپ کہیں گے کہ اختیارِ مطلق خدا کو حاصل ہے کسی انسان کو حاصل نہیں ہے۔ یہ ہیں وہ معنی اس چیز کے جسے کہتے ہیں خدا کے سامنے جوابدہی' مواخذہ' محاسبہ' قیامت' آخرت' قانونِ مکافاتِ عمل۔ وہ سارا جتنا جو کچھ ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ انسان کے اوپر کوئی اتھارٹی نہیں جس کے سامنے یہ جوابدہ ہے یہ غلط ہے' یہ بھی جوابدہ ہے۔ اب میں آتی رہیں گی باتیں کسی اور وقت بتاؤنگا کہ اس کی جوابدہی کس طرح سے اس کی جوابدہی یہ آتی ہے۔ قرآن کی یہ اصطلاحات ہیں ان میں سے ایک اصطلاح یہ **یوم القیٰمۃ** بھی جسے اس نے کہا ہے۔ بات وہ یہی کہتا ہے حرام اور حلال کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے والو' دوسروں کی آزادیوں کو سلب لینے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے والو تم کیا سمجھے ہو اس بات کو کہ تمہارے اوپر کوئی ایسا نہیں ہے جس کے سامنے تم جوابدہ ہو۔ تم یہ کہتے ہو کہ اختیارِ مطلق حاصل ہے۔ عزیزانِ من! آپ نے ملوکیت کو مسترد کیا آپ نے ڈکٹیٹر شپ کو ملعون قرار دیدیا سارے نظاموں کو یہ کچھ کہنے کے بعد آپ نے کہہ دیا نظامِ جمہوریت جو ہے یہ ہے وہ نظام۔ کیا فرق اس میں پڑا ہے صاحب؟ وہ بنیاد تو وہاں موجود ہے۔ وہاں ایک شخص تھا کہ جس کا فیصلہ کیا ہوا ایسا تھا کہ اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ آپ یہاں ایک اشخاص کا گروپ ایسا بنا لیتے ہیں کہ آپ کہتے ہیں کہ ان کے فیصلوں کے اوپر کوئی پوچھنے والا نہیں ہے' اسی کو تو سیکولر نظام کہتے ہیں کہ جن کے اوپر کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ یہ جو آپ کے ہاں سیکولر نظام کو خلافِ اسلام کہا جاتا ہے نا وہ نظام کی کوئی شکل نہیں ہے کہ اس شکل والا جو ہے وہ تو وہ اسلامی نظام ہے اور یہ ہیئت اگر یوں ہوجائے گی تو غیر اسلامی ہوجائے گا۔ وہ اصلِ بنیاد یہ ہے کہ اگر یہ تصور یہ ہے کہ جو میرا فیصلہ ہے میرے اوپر کوئی ہے جس کے سامنے میں جوابدہ ہوں مجھ سے پوچھنے والا کوئی ہے یہ ہے اسلامی نظام۔ آپ کا جی چاہتا ہے تو اس میں یہ آخری اتھارٹی ایک فرد کو قرار دیدیجئے بشرطیکہ وہ اس پہ ایمان رکھے کہ مجھ سے پوچھنے والا ہے۔ اور اگر یہ چیز ہے کہ ہم سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے تو پورے کا پورا آپ تو نمائندگان کو کہتے ہیں کہ یہ سات کروڑ کے ڈیڑھ سو دو سو پانچ سو نمائندے' میں کہتا ہوں پورا سات کروڑ آپ کا بھی اکٹھا ہو کے یہ کہے وہ پھر بھی غیر اسلامی ہے۔ اگر تصور یہ ہے کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! بنیادی فرق اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں۔ یورپ نے خدا کو نکالا درمیان میں سے۔ کیا بات تھی خدا کو درمیان میں رکھنا اور نکالنا کیا معنی ہیں؟ انہوں نے کہا یہ کہ ہم اپنا آخری اختیارات رکھتے ہیں کلی اختیار ہمارا ہے ہمارے اوپر کوئی اور نہیں ہے کہ جو اختیار رکھے۔ اسے کہتے ہیں مادہ پرستی جسے آپ کہتے ہیں Materialistic Life جسے آپ کہتے ہیں۔ وہ مادہ پرستی کیا؟ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے ایک دن ایک بات کہی تھی دہراؤں اس کو

بڑی اہم چیز ہے وہ۔ہمیں کوئی پوچھنے والانہیں ہمیں کوئی ٹوکنے والانہیں۔یہ بت پرستی کیوں اختیار کرتا ہے انسان؟ بت کے سامنے جاتا ہے اپنے ذہن میں جس طرح سے آتا ہے پھول چڑھایئے ڈنڈوت بجالایئے کچھ نذرانہ پیش کیجیے کچھ اس کے بعد بھجن پڑھیے یہ کچھ کیجیے۔کچھ کیجیے وہ سامنے سے تمہیں ٹوکتا ہی نہیں۔اور انسان ایسا معبود چاہتا ہے اگر رکھنا بھی پڑے کہ جو اسے ٹوکے نہیں' اختیار جو اسے حاصل ہیں اس کے اوپر اتھارٹی نہ بن بیٹھے' بیٹھا رہے بدھو بن کے۔بڑا مزہ لیتا ہے۔یہ ہے جس لیے یہ بت پرستی پہ بہت خوش ہوتا ہے۔خدا پرست بھی بت پرست ہو جاتا ہے جب وہ خدا کو تو بٹھا رکھے عرش پہ اور جہاں اس نے یہ اپنی حدود عائد کی ہوئی ہیں اس کو محض تلاوت کرے ثواب کی خاطر' نہ یہ ٹوکے نہ وہ ٹوکے۔عزیزانِ من! اس سے بڑی بت پرستی کیا ہے۔یہ چاہتا یہ ہے کہ مجھے ٹوکے کوئی نہ۔یہاں سے بات شروع ہو جاتی ہے''اباجی تسی تے ہر ویلھے ٹوکدے ای رہندے او''۔یہ ایسے ہی خداؤں سے خوش ہوتا ہے''جیہڑے ٹوکن نہ''جس کے سامنے یہ جوابدہ نہ ہو۔یہ جو قرآنِ کریم کا میں تو کہتا ہوں سو فیصد حصہ ہی لیکن اگر آپ الفاظ حروف میں بھی کہیے تو 75 سے تو کم نہیں جو قانونِ مکافاتِ عمل کے متعلق جو کچھ ہے۔یہ ایک اصطلاح ہے یہ صرف اتنی سی بات ہے کہ تم سے پوچھنے والا ایک ہے' تم سے پوچھا جائے گا۔وہ جو سورۃ انبیاء کے اندر اس نے کہا ہے کہ یہ بدعنوانیاں کرنے والے یہ دوسروں کی محنت سے اپنے ایوانوں کی سرخیاں بنانے والے' جب ان کے اوپر اس نظام کے مضر اثرات کے بعد تباہی آتی ہے محسوس شکل میں' تو پھر یہ بھاگتے ہیں۔بھاگتے ہیں تو پیچھے سے آواز دیتا ہے ہمارا قانون' مت بھاگو تم بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے' واپس آؤ اپنے انہی ایوانوں میں۔اور آگے یہ ہے کہ تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ دولت کہاں سے لی تھی۔'پوچھا جائے' کی بات ہے ساری عزیزانِ من! اور وہ سمٹ کے یہ آ جاتی ہے کہ تم نے ان اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا تھا یا ان سے تجاوز کر گئے تھے۔بات یہ ہے ساری پوچھنے اور نہ پوچھنے کی عزیزانِ من!۔آپ کو معلوم ہے یہ کھیل کے میدان کے اندر یہ ریفری کیا کرتا ہے؟ اس کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ پوچھتا رہتا ہے جونہی کسی نے لائن کے اوپر وہ پھندا بھی نہیں پاؤں بھی رکھا'شٹر' کیوں حدود شکنی کی فرمایئے یہاں آ جاؤ۔اس کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے۔ذرا ایک کھیل کا تصور لایئے ذہن میں' ہاکی ہو فٹبال ہو۔پہلے تو تصور یہ لایئے کہ لائنز نہ لگی ہوئی ہوں گراؤنڈ میں۔چھوڑ دیجیے دو ٹیموں کو۔اب وہ لائنز حدود نہ ہوں اس کے اندر' دیکھئے تماشہ کیا ہوتا ہے۔کھیل کا میدان میدانِ جنگ نہیں بن جاتا ؟۔یہ تو پھر بھی میں نے یہ کہا ہے کہ اتنی بڑی کھیل کی چیز ہے۔عزیزانِ من! یہ جو یونہی آپ؟؟اوقات کے لیے ہی تاش لے کے بیٹھ جاتے ہیں اس میں کچھ حدود نہ مقرر کیجیے جسے اس کے قاعدے کہتے ہیں' لذت ہی نہیں ملتی انسان کو۔کھیل کے میدان میں حدود مٹا دیجیے آپ دیکھئے گا کیا بنتا ہے۔حدود رکھئے ریفری بیچ میں سے ہٹا دیجیے؟ یہ ہے جسے آپ پوچھنے والا کہتے ہیں۔وہ جو ریفری سے تنازع ہوتا ہے کس بات پہ ہوتا ہے؟ یہ کبھی یہ نہیں کہتا ہے کہ ہاں صاحب میں نے وہ حدود سے باہر تو قدم رکھا تھا آپ نے کیوں سیٹی بجائی۔صرف یہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! میں نہیں رکھا تھا۔یہ چیز تو متنازع فیہ ہو سکتی ہے رکھا تھا یا نہیں تھا' یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اگر آپ نے رکھا تھا تو اس کے بعد آپ کہیں کہ آپ کون

ہوتے ہیں یہ سیٹی بجانے والے۔ کیونکہ آپ نے پہلے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ میں کھیل کے میدان میں اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر استعمال کرونگا اور اس کے لیے جواب دہ ہونگا ایک اور اتھارٹی سے جسے ریفری کہا جاتا ہے۔ سارا کھیل ہی زندگی کا اتنا ہے عزیزانِ من!۔ حدود کے تعین کے بغیر فٹبال اور ہاکی کا میچ تو آپ نہیں کھیل سکتے زندگی کا اتنا بڑا کھیل جو ہے وہ چاہتے ہیں آپ کہ حدود کے بغیر کھیلا جائے۔ اور حدود کے اندر آپ ریفری کے بغیر تو آپ فٹبال ہاکی بھی نہیں کھیل سکتے لیکن زندگی کے وسیع وعریض میدان میں چاہتے یہ ہیں کہ کوئی ریفری ہمارے اوپر نہ ہو کسی کے سامنے ہم جوابدہ نہ ہو۔ اسے کہتے ہیں سیکولر نظامِ حکومت عزیزانِ من!۔

(وما ظن الذين يفترون على الله الكذب يوم القيٰمة) (10:60) کہا یہ جو آپ ہی اپنے اختیارات استعمال کرنے لگ جاتے ہیں ان سے پوچھو کہ ریفری کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے یونہی کھڑا کردیا ہوا ہے؟۔ کوئی ٹیم اگر یہ کچھ کرنے لگ جائے کہ وہ سیٹیاں بجاتا رہے یہ اپنا جو کچھ جی میں آئے کرتا رہے' وہ کیا ہوتا ہے؟ بہرحال کچھ انہوں نے اور ایک بنادی ہے سوسائٹی وہ کہتے ہیں کہ تین سال کے لیے دس سال کے لیے ان لوگوں کو ہم نے بین کردیا ہے یہ کھیل نہیں سکیں گے۔ کوئی ہے نا اوپر رکھا ہوا آپ نے۔ لیکن زندگی کے میدان میں یہ اس سے بھاگتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں کا موجودہ آگے نوجوان طبقہ ہے مذہب گزیدہ جسے آپ کہتے ہیں کہ صاحب خوامخوہ کے لیے یہ دخل دیتا ہے یہ مذہب درمیان میں۔ مشکل یہ ہے کہ ان کو سمجھایا ہی نہیں گیا کہ مذہب ہے کیا۔ اور مذہب تو یہ کرتا ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں' وہ ان حدود کے اندر بھی ان کو اپنا صاحبِ اختیار وارادہ نہیں رہنے دینا چاہتا۔ دین یہ نہیں کرتا۔ انہیں اگر یہ سمجھا دیا جائے کہ دین تو بابا اتنے کا نام ہے: زندگی کے میدان میں کچھ حدود ان حدود کے اندر ایک ریفری۔ کیا خیال ہے تمہارا یہ اچھا ہے انداز کھیل کھیلنے کا یا وہ اچھا ہے انداز جو تم کہتے ہو کہ نہ حدود نہ حدود کے اندر ریفری۔ کیا بات کہا کہ وہ جو اس چیز کو نہیں مانتے انہوں نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ یہاں لفظ **يوم القيٰمة** آیا ہے نا یہ وہی مسئولیت جسے آپ کہتے ہیں کہ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے' غلط ہے۔ اس ریفری کی تو ہوسکتا ہے کہیں آنکھ ہی چوک جائے مغالطہ ہی لگ جائے وہ دور ہو آپ اُدھر ذرا دور ہیں۔ اُس ریفری کے متعلق تو وہ یہ کہتا ہے **(هو ما كم اين ما كنتم)** ہر کھلاڑی کے ساتھ ایک ریفری ''جا بچو کتھے جانا ایں''۔ پھر یہ بھی نہیں کہ وہ ساتھ تو ہے دس قدم پہ رہ گیا یہ تیز بھاگ گیا۔ **(نحن اقرب عليه من حبل الوريد)** ہم یہاں اندر ''جانٹھ کے کتھے جانا ایں''۔ کیا باتیں قرآن کہہ رہا ہے۔ ہاں کبھی آئے گا یہ موضوع تو عرض کرونگا کہ وہ کس طرح سے بتاتا ہے کہ یہ اس ریفری کی؟؟ سے تم نہیں کہیں جاسکتے۔ یہ ہے **يوم القيٰمة**۔ **(وما ظن الذين يفترون على الله الكذب يوم القيٰمة)** (10:60) انہوں نے کیا سمجھ رکھا ہے اس کو۔

(ان الله لذو فضل على الناس) (10:60) وہاں بھی کہا تھا **(قل بفضل الله)** (10:57)۔ یہ کہا ہے یہ کہ یہ انسانوں کے ہاتھ سے جو ہم نے اقتدار چھین لیا ہے دوسرے انسانوں کے اختیارات کے اوپر حد بندیاں عائد کرنے کا۔ **(ان الله لذو فضل على الناس)** (10:60) یہاں کہا ہے۔ دیکھو تو انسان کے اوپر کتنا فضل ہے ہمارا یہ کہ ہم نے یہ کیا ہے۔ انسان پہ۔ یہاں ابھی مومن وکافر کی تمیز نہیں آئی یہ

انسان کے اوپر ہے۔ وہاں بھی اس لیے کہا تھا(یایھا الناس قد جآء تکم موعظة من ربکم) یہ تو انسانی اختیار وارادے کی بات ساری یہاں ہو رہی ہے وہ تفریق تو بعد میں جا کے آئے گی۔ عزیزانِ من! قرآن کی رو سے خدا کی عائد کردہ حدود کی رو سے مومن و کافر نہیں کوئی انسان دنیا کا وہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اگر آپ اس کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں تو وہ خدا کے دیے ہوئے شرف کے منافی ہو جاتی ہے۔ صرف انسان ہونا کیونکہ یہاں یایھا الناس کہا ہے ان کے لیے فضل ہے۔ یہ آگے بات ہے کہ (ھدًی و رحمة للمؤمنین) کہ جو اس کو مانتا ہے اس کی پابندی کرتا ہے اس کے بعد یہ چیز ہے۔ ورنہ یہ جو چیز ہے کہ ہم نے ایک ایسا نظام دیا ہے جس میں کسی انسان کی یہ جو اختیار وارادہ کی قوت ہے کوئی دوسرا انسان نہیں چھین سکتا' یہ فضل ہے خدا کا۔ (ولٰکن اکثرھم لا یشکرون) (10:60) بڑا ہی ناشکرا واقع ہوا ہے۔ یہ لا یشکرون پھر کیا آیا ہے؟ میں بتائے جا رہا ہوں ایک ایک لفظ قرآنِ کریم کا مفہوم سمجھنا پڑے گا۔ یہ اختیار وارادہ جو ہے یہ حدود جو ہیں ان کے اندر اس کے استعمال کرنے سے ہوتا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے انسان کی کوششیں بھرپور نتائج نکالتی ہیں۔ یہ حدود کی پابندی سے جو کھیل کھیلا جاتا ہے اس کے بعد یہ پتہ چلتا ہے نا کہ صاحب اس نے اتنے گول کیے یہ جیت گیا اس کو تمغہ ملنا چاہیے۔ یہ نہ ہوں تو یہ معلوم ہی نہ ہو۔ کسی کی کوششوں کا صحیح اور بھرپور نتیجہ نکالنا جو ہے اسے شکر کہتے ہیں۔ کہتا ہے مصیبت یہ ہے کہ الناس کے لیے ہم نے یہ سارا کچھ انتظام کیا ہوا ہے وہی اسے تسلیم نہیں کرتے' تسلیم نہیں کرتے تو ہمارا تو کچھ نہیں بگڑتا انہی کی کوششیں بے نتیجہ رہ جاتی ہیں۔ ایسا میچ کھیل کے آجاتے ہیں جس میں پتہ ہی نہیں چلتا کس نے کتنے گول کیے۔ وہ جو میں نے بات کہی تھی کہ وہ ریفری اس قسم کا ہے جس کے سامنے جوابدہی ہے۔

(وما تکون فی شانٍ وما تتلوا منه من قراٰن ولا تعملون من عمل الا کنا علیکم شھودًا اذ تفیضون فیه) (10:61) کہا تم تو کھیل میں اتنے غرق ہوئے جذب ہوئے ہوتے ہو تمہیں ہوش ہی اس بات کا نہیں ہوتا سٹک کہاں چلی گئی قدم کہاں پڑ رہا ہے۔ کہنے لگا ہم ہوتے ہیں Ever Visioner تمہارے اوپر' ایک ایک کھلاڑی کے اوپر نگاہ ہماری ہوتی ہے۔ اور کہا کہ یہ کھلاڑیوں کی بات نہیں ہے ٹیم کے کپتان خود پہلے رسول اللہ ﷺ سے کہا جب تم ان کے سامنے قرآن پیش کر رہے ہوتے ہو اس وقت بھی ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ جب یہ اس کے مطابق آگے جا کے عمل کر رہے ہوتے ہیں ہم اس وقت بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ جب تم اس؟؟ کاروبار کے اندر غرق ہوئے ہوتے ہو تمہیں کچھ اس وقت ہوش نہیں ہوتا ہم اس وقت بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ قدم تمہارا کہاں پڑ رہا ہے۔ تم اس میں جذب ہوئے ہوتے ہو ہم نہیں اس میں جذب ہوئے ہوئے ہوتے۔ اگر ریفری بھی کھیل میں اتنا جذب ہو جائے کہیں تو پھر وہ سیٹی ہی مارنا بھول جائے۔ کہنے لگے ہم ایسے نہیں ہیں۔ (وما یعزب عن ربک من مثقال ذرةٍ فی الارض ولا فی السمآء ولا اصغر من ذٰلک ولا اکبر الا فی کتٰب مبین) (10:61) تمہاری دنیائے عمل کے اندر ایک ریت کے ذرے کے برابر کوئی چیز اس سے بھی چھوٹی یا اس سے بھی بڑی کہیں ہو تمہارا عمل جو ہے وہ سارے کا سارا جو سٹور یک رکھی ہوئی ہوتی ہے اس میں لکھا جاتا ہے۔ کتاب اور کتابِ مبین۔ یہ نہیں ہے کہ تمہارے

امتحان کے پرچے دیکھے اور پھر وہ جو نمبر و مبر ہیں وہ گم کر کے رکھ دیے وہ نہیں دکھائیں گے ہم صاحب۔ارے بھئی میرا نتیجہ ہے مجھے دکھاؤ کتنے کتنے ہیں'' کہنے لگے سٹوپیے''۔وہ پیپر دیکھنے کے نتیجہ دیکھنے کے آپ کو پتہ ہے پیسے مانگتے ہیں۔اس نے کہا(**کتٰب مبین**) چھاپ دیتے ہیں' بالکل واضح ہوتی ہے۔یہ واضح کیسے ہوتی ہے۔سورۃ اسرائیل میں ہے نا۔کہا یہ کہ یہ ہوتا یہ نہیں ہے کہ ممتحن کے پاس ہوتی ہے لکھنے والے کے پاس ہوتی ہے' ہر شخص کے گلے میں لٹکا ہوا ہوتا ہے اس کا اعمالنامہ ۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ پہلے وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور جب Announcement کرنی ہوتی ہے تو پھر اسے کھول دیا جاتا ہے اور کھولنے کے بعد کہا جاتا ہے(**اقراء کتٰبک**) اپنا اعمالنامہ آپ پڑھ ۔پڑھنے والا بھی دوسرا نہیں ہوتا۔(**کفٰی بنفسک یوم علیک حسیب**) کسی اور کے حساب لینے کے بھی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اور آ کے حساب کرے گا۔نہیں صاحب۔تمہارے گلے میں لٹکا ہوا تھا کہیں گم نہیں ہوا۔ہوا صرف یہ ہے کہ پہلے لپٹا ہوا تھا کھل گیا ہے۔کھلنے کے بعد یہ نہیں ہے کہ کوئی دوسرا آ کے پڑھے اور تم کہو کہ نہیں صاحب

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس نے کہا تم تو کہتے ہو کوئی آدمی ہمارا' یہ تو تم نے خود لکھا ہوا ہے' خود پڑھو اس کو اور آپ ہی حساب کر کے بتا دو تم۔(**کتٰب مبین**) یہ ہے عزیزانِ من! کتاب مبین۔اتنا کچھ سننے کے بعد تو آدمی واقعی کانپ اٹھتا ہے ڈر جاتا ہے۔صاحب کسی کے متعلق یہاں پتہ چل جائے کہ ہسٹری شیٹ کھل گیا ہے اس کا' وہ کانپتا پھرتا ہے۔اور اگر وہ ہسٹری شیٹ اس قسم کا ہو خود ہی اس میں اندراج کرے خود ہی اس کو پڑھے خود ہی حساب کر کے سزا اپنی تجویز کرے۔ڈرنے کی بات تو ہے۔اور ڈر پیدا ہو گیا اس قسم کا تو وہ تو پھر بھی شرفِ انسانیت کے خلاف ہے عزیزانِ من! ۔کہتا ہے اونہ نہ نہ نہ! ڈرنے کی بات نہیں ہے(**الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) (10:62) جو ان حدود کی نگہداشت کرتا ہے اسے کچھ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اُسے حزن کی بھی ضرورت نہیں ہے۔او بالکل نہیں ہے بابا کوئی ڈر نہیں ہے کوئی حزن نہیں ہے۔خوف بھی نہیں ہے حزن بھی نہیں ہے۔خوف تو وہ ہے کہ وہاں جا کے سامنے نظر آئے ٹکٹکی باندھی ہوئی ہو نظر آ رہا ہے ایک کو پڑ رہی ہے مجھے بھی پڑے گی۔حزن یہ ہے گھر میں بیٹھے ہوئے ہر وقت ڈر ہو کہ کہیں پکڑا ہی نہ جاؤں صاحب' کہیں کوئی مخبری نہ کر دے' کہیں کوئی جا کے غلط بات ہی نہ کہہ دے۔یعنی ہوا بھی کچھ نہیں ہے اندر ہی اندر ڈوبے چلا جا رہا ہے۔یہ جو ہے نا اندر ہی اندر ڈوبے چلے جانا یہ ہے حزن۔بعض ایسے حالات معاشرے میں پیدا ہو جاتے ہیں کہ جس میں اس کی کیفیت بڑی ہی شدید ہو جاتی ہے۔یوں جگر کا ہی شعر سہی کہ

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

پھر اس کی تسکینِ خاطر سے بھی اس کو اطمینان نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس پہ اطمینان نہیں ہوتا۔ جب اعتماد اٹھ جاتا ہے تو پھر اس کی تسکینِ خاطر سے بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! حزن کا ترجمہ۔ معلوم نہ ہو لیکن مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے۔ حفیظ صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں یہ کہہ دیں گے کہ تم کون ہوتے ہو یہ خوامخوہ ہمارے مملکت میں دخل دینے والے۔ پھر میں کہونگا کہ ''نہیں صاحب تہاڈے سٹے جیہڑے نیں اواسی ہنجے ہوئے ہیگے نیں' خوشے تہاڈے ای ہیگے'' جسے خوشی چینی کہتے ہیں'' سٹے چنن والیاں ہوندیاں نیں نا پیچھے پیچھے واڈیاں دے لگیاں ہویاں''۔ حزن کی کیفیت صاحب: بیٹھے رو رہے ہیں۔

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

عزیزانِ من! یہ جو بلاسبب جی چاہتا ہے رونے کو یہ حزن ہوتا ہے اور یہ انتہائے شدت ہوتی ہے اس کے اندر' سنگینی بڑی ہوتی ہے مایوسی کی۔ جی بہت چاہتا ہے رونے کو۔ خوشی اسے کہتے ہیں عزیزانِ من! کہ آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں کیوں خوش ہوں اور حزن یہ ہوتا ہے کہ

ہے کوئی بات آج ہونے کو
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

اور عزیزانِ من! جب یہ معاملہ افراد سے گذر کر معاشرے تک آ جائے کہ بہت جی چاہتا ہے رونے کو' مایوسی کی انتہا ہے۔ اس مقام پر آ کے قرآن آ کر دیکھئے کہاں یہ آئی ہے وہ آیت' لایا ہے وہ سارا اعمالنامہ سامنے' کانپ اٹھتا ہے آدمی اس چیز سے۔ اس وقت اگر اس کی گرفت میں ابھی نہیں بھی آیا تو یہ جو چیز ہے کہ ہے کوئی بات آج ہونے کو' اس ہونے کو بات جو ہو رہی ہے اس میں دل ڈوب رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے اسی وقت اس نے یہ کہہ دیا ہے (الا) (10:62) الا سنتے ہیں کہاں کہا ہے۔ او مرتے نہ جاؤ ڈوبتے نہ جاؤ او بابا کچھ نہیں کچھ نہیں ہوا (**الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) (10:62)۔ آہاہاہا۔ کتاب ہے عزیزانِ من! یہ خدا ہی کی ہو سکتی ہے۔

تصور میں جو آپ کے ذہن میں آ رہا ہے نا اولیاء اللہ سے نکال دیجیے اس کو۔ قرآن کو معلوم تھا کہ تمہارے ذہنوں نے کیا تصورات پیدا کر لینے ہیں اس زمانے میں نہیں جب یہ قرآن نازل ہوا تھا' اس زمانے میں تو غیر از قرآن تصور ہی ذہن میں نہیں آتا تھا وہ جانتے تھے کہ یہ کیا کہا ہے اس نے اولیاء کس کو کہتے ہیں۔ یہ جو بعد میں آنے کے بعد آپ نے مستعار لیے تصورات دوسروں کے ہاں سے تو پھر اولیاء اللہ بھی آپ کے ہاں الگ ایک گروہ بن گیا۔ وہ الگ گروہ ہو گیا۔ اگر یہ چیز جو ہے معاف رکھیے گا صحیح ہے یہ تو صرف ان کے حصے میں آئی وہ جو کہیں کہیں دو چار آپ کو نظر آتے ہیں تاریخ میں بھی یہ یہ' وہ جن کے مقبرے آپ نے ان کے بنا دیے ہیں۔ یاد رکھئے سب سے بڑا اولیاء وہ ہوتا ہے جس کا سب سے بڑا مقبرہ ہوتا ہے' جن قبروں کا نام و نشان بھی نہیں ہے ان کے متعلق آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے نیچے کیا ہے۔ بہرحال۔ میں

نے کہا ناسب سے بڑا اولیاء وہ ہوتا ہے' آپ کہیں گے کہ جاہل ہو یہ تو جمع کا صیغہ ہے ولی کا۔آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ لفظ جو ہے نظام الدین اولیاء کہتے ہیں نا سارے' وہ دلی کے جو ہیں نظام الدین اولیاء۔سب کہتے ہیں بڑے بڑے مصنف اپنی کتابوں میں یہی لکھتے ہیں۔ بہرحال یہ تصور کہ صاحب وہ ایک الگ گروہ ہوتا ہے یہ ان کے متعلق ہے۔قرآن کو پتہ تھا کہ بعد میں دور آنے والا ہے کہ انہوں نے یہ گروہ بنا لینا ہے۔عزیزانِ من! یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی علیم وخبیر کی کتاب ہے۔(**الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) (10:62) تمہاری نگاہیں ادھر اُدھر جارہی ہیں۔(**الذین**) (10:63) یعنی وہ لوگ(**اٰمنوا و کانوا یتقون**) (10:63) بات صاف ہوگئی۔سیدھی سی بات ہے ایمان لائے اور ان حدود کے مطابق انہوں نے زندگی بسر کی وہ ہیں جنہیں اولیآءاللہ کہا جاتا ہے۔الگ گروہ کوئی نہیں ہے۔وہیں کہدیا صاحب وہیں۔(**الذین**) یعنی وہ لوگ(**اٰمنوا و کانوا یتقون**) (10:63)**اٰمنوا** میں تو تمام مؤمنین آ گئے اس میں' صداقتوں کا یقین رکھنے والے۔آگے اگلی چیز ضروری ہے ان حدود کو صحیح ماننے والے ہی نہیں' تقویٰ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان سے اپنا دامن بچا کے سنبھا کے چلنا۔وہ حضرتِ عمرؓ نے پوچھا تھا نا ایک بدو نے آ کے کہ حضورؐ یہ تقویٰ کیا چیز ہے؟ کہنےؐ لگے کہ کبھی کسی ایسے راستے پہ بھی چلے ہو جہاں اِدھر اُدھر خاردار جھاڑیاں ہوں۔کہنے لگے جی ہاں چلا ہوں۔کہنےؐ لگے کہ پھر کیسے چلتے ہو؟ تو عربوں کا تو آپ جانتے ہاں نا وہ ''برقعہ وانگوں کھلڑیا ہوندا اے'' وہ پرانا برقعہ جی نیا نہیں ''اے نواں تے او ہوندا اے جیویں کوکا کولا دی بوتل ہوندی اے''۔وہ پھیلا ہوا ان کا تو لباس ہی یہ ہوتا تھا۔کہنےؐ لگے پھر کیسے چلتے ہو؟ کہنے لگا میں دیکھتا ہوں نا ادھر کانٹا ہوتا ہے تو یوں ادھر کر لیتا ہوں کپڑے کو' اُدھر کانٹا ہوتا یوں ادھر کر لیتا ہوں' یوں کرتا ہوا بچتا بچاتا۔کہنے لگے اسی کو تو تقویٰ کہتے ہیں۔کیا بات تھی ان لوگوں کی!! کیسے سمجھے تھے یہ۔یہ ہیں حدوداللہ۔(**لا تقربوہ**) اس نے کہا تھا کہ اس جھاڑی کے ذرا سا قریب بھی نہ جانا۔یہ نہ کہ اس کے اندر دامن نہ پھنسا بیٹھنا' پاس بھی نہ جانا پتہ نہیں کونسا کانٹا ایسا ہو جو بظاہر نظر آئے وہی لپٹ جائے۔قریب بھی نہ جانا۔اسے تقویٰ کہتے ہیں۔(**اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) (10:62) یعنی(**الذین اٰمنوا**) (10:63) سب سے پہلے تو یہ کہ وہ ان حدود کی صداقت پر ایمان رکھیں کہ یہ ٹھیک ہیں صاحب' میں مانتا ہوں۔(**و کانوا یتقون**) (10:63) اور پھر ان سے اس طرح سے بچ کے ان کے اندر چلیں جیسے خاردار جھاڑیوں میں تم دامن بچا کے چلتے ہو۔انہیں اولیاءاللہ کہا جائے گا۔(**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) (10:62) انہیں کوئی خوف وحزن نہیں ہے۔خوف اور حزن نہیں ہے یہ تو عزیزانِ من! صرف بچ کے نکل جانے والی بات ہوئی نا' کمائی تو اس میں کچھ نہیں ہے۔یہ تو ایسے ہی نا کہ صبح آپ بالکل محفوظ و مامون بیٹھے ہوئے تھے کوئی خوف حزن نہیں تھا' درمیان میں کہیں سے کوئی آواز آئی دھڑکا لگا آپ کو ذرا خوف پیدا ہوا۔کسی نے آ کے کہدیا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے وہ فوجی مشق کر رہے تھے اپنی اس کا وہ گولہ چلا تھا۔اچھا وہ یہ ہوگیا تو اسکے بعد خوف اور حزن دور ہوگیا جیسا آپ پہلے تھے ویسے ہی ہوگئے نا' کیا یہی ہے مقصد؟ اس نے کہا غلط ہے۔یہ سنیے پہلے یہ چیز ہے اتنی سی بات نہیں ہے(**لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ**

الدنیا) (10:64)ان کے لیے ایک فردوس بداماں زندگی کی خوشخبریاں۔ یہ Possitive چیز آ گئی نا۔وقت ہوگیا ہے اسے پھر ہم آ گے لیں گے کہ یہ بشارتیں کیا چیز ہیں ان کے حصے میں آتی ہیں جو ان حدود کی نگہداشت کر کے چلتے ہیں۔ہم سورۃ یونس کی آیت 63 تک آ گئے 64 سے ہم آئندہ لیں گے۔شکریہ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ گیارہواں باب (آیات 64 تا 69)

عزیزانِ من!

آج اکتوبر 1973ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 64ویں آیت سے ہو رہا ہے۔ (10:64)

چونکہ یہ آیت بھی سابقہ آیت کے تسلسل میں ہے اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ اس میں کہا گیا تھا کہ (**الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) (10:62) میں نے عرض کیا تھا کہ آج کل تو ہمارے ہاں اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ آج کل کی بات نہیں ہے صدیوں سے یہی صورت چلی آ رہی ہے۔ وہ الگ گروہ بھی ہوتا ہے اور وہ بلند ترین مقام پر بھی سمجھا جاتا ہے عام مومن بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے۔ ایسا ہے جیسا ان میں سے بھی ان کا خلاصہ ان سے بلند ایک مقام پہ ان کا نچوڑ وہ سارا ان کا وہ اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ بالکل الگ تھلگ یہ سب سے۔ ان کا مقام روحانیت کا مقام ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ اخلاقی اور روحانی قدریں بلکہ اب تین لفظ اس کے لیے بولنے شروع کر دیے ہیں مادی ترقی اخلاقی ترقی اور روحانی ترقی۔ گویا اخلاق تو سیرت اور کردار کا نام ہو گیا۔ گویا یہ ایک چیز ایسی ہے جو سیرت و کردار و کریکٹر سے بھی کوئی اونچی چیز ہے اور۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق کے بہر حال جو معنی بھی ہوں کچھ روحانیت کے یا ان مدارج کے تو حضور ﷺ تو ان کے معراجِ کبریٰ پر فائز تھے۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ حضور ﷺ کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے یہی کہا ہے کہ (**انک لاعلٰی خلق عظیم**) حضور ﷺ کی اخلاقی بلندی کا قرآن نے ذکر کیا ہے روحانی بلندی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن میں یہ تصور ہی نہیں ہے وہ انسان کی سیرت و کردار و کریکٹر سے بحث کرتا ہے اسی کو معیار قرار دیتا ہے وہ۔ ایک مومن کے ایمان اور اعمال کو پرکھنے کی بات ہے اور یہی اس کا آخری زینہ ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق جب یہ فرما دیا قرآن نے تو اب اس کے بعد اور ہمیں کسی سند کی ضرورت کیا ہے کہیں تلاش کرنے کی۔ لیکن یہ الگ دنیا بسائی جاتی ہے اولیاء اللہ کی۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ درس میں ضمناً بات آئی ہے میں اس کی تاریخ میں سرِ دست نہیں جانا چاہتا اس کے لیے کوئی وقت آئے گا۔ یہ تصور کہاں سے ہمارے ہاں آیا یہ قرآنی تصور نہیں اسلامی تصور نہیں ہے اولیاء کا الگ گروہ Saints وہ عیسائیت کے جو ہوتے تھے۔ وہ ترجمہ ہی یہ کرتے ہیں عیسائی' Saint کا ترجمہ ہی ولی ہوتا ہے۔ تو یہ تاریخ تو ایک بڑی دلچسپ ہے بعد میں آئے گی۔ ہمارے ہاں ایک تو خلافت آئی وہ خلافت جو تھی وہ تو رسول اللہ ﷺ کے بعد یعنی حکومت کی خلافت۔ خلفائے راشدینؓ میں آئی حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمانِ غنیؓ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ۔ اور یہ بات ہمارے ہاں بہر حال ایک گروہ بندانہ اور فرقہ بندانہ چیز ہے میں فرقوں میں تو الجھا نہیں کرتا۔ اس ترتیب سے حضرتِ علیؓ خلافت کی ترتیب میں چوتھے نمبر کے اوپر چوتھے درجے پہ آئے۔ اس میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی بعد میں آ کے

کچھ؟؟ ہوئی سی نظر آئی۔تو ہمارے ہاں دو متوازی حکومتیں قائم ہوئیں ایک یہ دنیاداروں کی حکومتیں جس میں خلافت آئی اور ایک یہ روحانیت کی دنیا۔آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں دو لفظ ہیں ایک تو ہے ولایت 'و' کی زیر کے ساتھ یہ تو حکومت کے معنوں میں آتا ہے۔یہ ولایتی مال جسے آپ کہتے ہیں یہ وہی تھانا جہاں سے یہ انگریز آئے تھے اس کو ہم ولایت کہا کرتے تھے یہ دیسی ہے یہ ولایتی ہے۔تو ولایت جو ہے وہ آپ کے ہاں والی ہوتے تھے گورنر کو کہتے تھے اسلامی حکومت میں۔اور والی کا لفظ اب بھی چلا آرہا ہے اس معنی میں۔یہ تو تھی ولایت دنیاوی حکومت۔اور چیز آئی ولایت 'و' کے زبر کے ساتھ۔آپ کو پتہ ہے حضرتِ علیؓ کو شاہِ ولایت کہتے ہیں۔تو یہ جو خلفاء ہوئے آپ کے ہاں یا خلیفہ ہوئے یہ تو بہرحال وہ تھے جن کا تعلق ولایت سے تھا دنیاوی حکومت سے تعلق تھا۔اور وہ جو روحانیت کی بادشاہت ہے اس میں وہ شاہِ ولایت وہ 'و' کے زبر کے ساتھ آیا۔آپ نے دیکھا کس طرح سے زندگی کے دو حصے ہو رہے ہیں نہایت غیر محسوس طور پر۔یہ جتنے سلسلے تصوف کے ہیں یہ سارے اپنے پیر یا مرشد سے لے کر ان کی ایک کڑی ہوتی ہے اسے شجرہ کہا جاتا ہے ہر صبح اسے پڑھا جاتا ہے۔اس میں وہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے آپ کہیں کہ میں ان کا مرید وہ اُن کے مرید وہ ان کے مرید۔یہ سارے سلسلے جو جاتے ہیں آخر میں جا کر حضرتِ علیؓ کرم اللہ وجہہ کی ذات تک مل جاتے ہیں۔صرف ایک سلسلہ نقشبندیہ ہے جو حضرت صدیقِ اکبرؓ تک جاتا ہے۔سارے تصوف کے سلسلے اور وہاں سے پھر آگے وہ سیدھے جاتے ہیں۔یہ جو ہے نا یہ سلسلہ ادھر کا یہ خلفائے راشدین یا تینوں باقی خلیفے جو آپ کے کہتے ہیں وہ بالکل بائی پاس ہو جاتے ہیں اور سیدھا اس راستے سے یہ سلسلہ جاتا ہے اور اسے پھر بڑی اہمیت حاصل ہے۔اصل شے تو یہ روحانیت کی دنیا پھر ہوگئی یہ دنیاوی بادشاہتیں یہ حکومتیں جو ہیں اور دنیا تو وہ کہتے ہی ایک لاش ہیں اور اس کے چاہنے والے کتے ہوتے ہیں (معاذ اللہ)۔پھر یہ روحانیت کی دنیا تو ہر دور میں قائم ہے آج بھی آپ کے ہاں ان کے تصور کی رو سے یہ یہاں کے آپ کے ہاں کے پریزیڈنٹ یا بادشاہ یا یہ گورنر یہ کمشنر یہ ڈپٹی کمشنر یہ زمین کے اوپر اوپر ہیں۔اصل حکومت جو ہے وہ اسکے نیچے ہے غوث اور قطب اور ابدال۔یہ ڈیپارٹمنٹ ان کے بانٹے ہوئے ہوتے ہیں سارے' گورنر کے مقابلے میں یہاں ایک قطب ہوتا ہے پھر نیچے کمشنر کے مقابلے میں ڈپٹی کمشنر کے مقابلے میں وہ سارے کے سارے یہ ہوتے ہیں۔اور وہاں سے احکام نازل ہوتے ہیں اور یہ اوپر والے بیچارے ان احکام کو صرف Carry-out کرتے ہیں تعمیل کرتے ہیں ان احکام کی۔اصل حکومت جو ہے وہ وہاں ہوتی ہے۔تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ ایک الگ دنیا بنی ہوئی ہے ہمارے ہاں اور یہ اس دنیا سے بلند دنیا ہے اور اُس دنیا میں یہ جنہیں کہا گیا ہے اولیاء اللہ۔میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے یہ اولیاء کا واحد لفظ ولی ہے۔قرآن نے بتایا ہے کہ خدا مؤمنین کا ولی ہوتا ہے مومن خدا کے ولی ہوتے ہیں: رفیق مددگار دوست مقرب قریبی تمام معنی اس کے اندر آجاتے ہیں۔اور ان معنی کے علاوہ آپ دیکھئے میں نے کہا تھا نا کہ قرآنِ کریم تو جہاں یہ بات آئی پہلی دفعہ اولیاء اللہ کی فوراً یہ وہ خدائے علیم وخبیر اس کے علم میں تھا کہ یہ بعد میں ایک گروپ اور الگ گروہ بنے گا۔اس نے وہیں وضاحت کر دی کہ یہ کوئی الگ گروہ نہیں ہے۔(الذین اٰمنوا و کانوا یتقون) (10:63) یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور

انہوں نے تقویٰ کی زندگی بسر کی۔تو یہ تو تمام مؤمنین کا شیوہ ہے مومن ہونا متقی ہونا بس یہی ہیں وہ جو کہا گیا ہے۔ان کی خصوصیت بتائی (**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) (10:62) ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔تو گویا یہ ایک خصوصیت بتائی اولیاءاللہ کی اور اس سے پہلے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں یہ بات کہی گئی۔آدم سے یہ کہا گیا کہ (**فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) (2:38) یہی الفاظ ہیں جو یہاں مختص بتائے جاتے ہیں اولیاءاللہ کے لیے۔وہاں یہ پوچھا ہماری طرف سے ہدایت آیا کرے گی (**فمن تبع ھدای**) جو بھی اس ہدایت کا اتباع کرے گا اس کا نتیجہ ہوگا (**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) انہیں خوف اور حزن نہیں ہوگا۔تو یہ صاف نظر آ گیا کہ یہ جو پہلی خصوصیت بتائی ہے **لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون** کوئی اولیاءاللہ کا الگ گروپ یا گروہ نہیں ہے کہ جن کے لیے یہ چیز ہے اور باقی مؤمنین جو ہیں وہ اس سے الگ کر دیے گئے ہیں۔وہ کہتا ہے (**فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) اتباعِ ہدایتِ خداوندی کا نتیجہ ہے کہ خوف اور حزن باقی نہیں رہتا۔اور قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں یہ الفاظ آئے ہوئے ہیں خوف اور حزن نہیں رہتا۔انہی کے لیے مؤمنین کے لیے ہی آئے ہیں۔یہاں خدا نے خود کہہ دیا ہے کہ (**الذین اٰمنوا و کانوا یتقون**) (10:63) پہلی خصوصیت تو ان کی یہ بتائی۔اگلی خصوصیت بتائی کہ (**لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ**) (10:64) ان کے لیے اس دنیاوی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں خوشخبریاں ہیں مژدہ جاں فزا ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لیے یہی وعدے ہیں۔اب یہ آیا بشریٰ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں۔نبوت تو ختم ہوگئی ذاتِ رسالت مآب ﷺ پر خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ اختتام کو پہنچ گیا اسی کو خدا سے ہمکلام ہونا کہا جاتا ہے۔قرآن نے وحی کے علاوہ کوئی اور سلسلہ نہیں بتایا خدا سے ہمکلامی کا۔اور جب وحی کو ختم کر دیا حضور ﷺ کی ذات پر خدا سے ہمکلامی کا سلسلہ ختم ہوگیا اسی کو ختمِ نبوت کہتے ہیں۔لیکن آپ کے ہاں اس بات نے چرچا تو اب اختیار کیا ناجب کہا کہ صاحب وہ مرزا غلام احمد نے دعویٰ نبوت کر دیا اب ختمِ نبوت کا ایک تصور ہوا پھر ایک Movements پیدا ہوئیں یہ سارا کچھ قصہ ہوا۔کبھی سوچا بھی ہے آپ نے کہ ختمِ نبوت کی یہ مہر یا دروازہ جو تھا یہ ٹوٹا کب۔یہ نبوت کیا تھی؟ خدا سے ہمکلامی تھی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا تھا۔یہ ختم ہوا تو خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا یا خدا سے ہمکلام ہونا ایک بات ہے۔وحی کو خدا نے اپنا کلام کہا ہے اسے قرآن کو آپ کلام اللہ کہتے ہیں یا نہیں؟ یہی کلام ہے خدا کا۔تو یہ وحی کے ختم ہونے کے معنی ہمکلامی ختم ہوئی نا۔نہیں! ختمِ نبوت پر تو ایمان ہے اور ہمکلامی جو ہے اس کا سلسلہ جاری ہے۔اور پھر نبی کی تو یہ صورت تھی کہ جب بھی اُدھر سے وحی آتی تھی اُسے یہ وحی ملتی تھی چنانچہ یہ چیز ہے کہ درمیان میں وقفہ بھی پڑتا تھا وحی نہیں آتی تھی۔نبی کے یہ اختیار میں نہیں تھا کہ جب جی چاہے خدا سے بات کر لے یعنی خدا اُدھر سے بات کرتا تھا۔یہ سلسلہ ختم ہوا۔جب یہاں آگے چلے یہ اولیاءاللہ کی ہمکلامی تو جب ان کا جی چاہے خدا سے بات کرتے ہیں۔اور پھر یہ تو ہر رات کو اس کے ہاں اس کی مجلس میں ہوتے ہیں جو جی میں آئے اس سے کرالاتے تھے دستخط کرالاتے تھے۔یعنی آپ دیکھ رہے ہیں کہ وحی کا سلسلہ ختم ہے ختمِ نبوت ہے اس کے متعلق ہمارے ہاں اتنی

شہرت بھی برپا کی جاتی ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ دین کی بنیاد ختمِ نبوت کے عقیدے پہ ہے۔لیکن آپ دیکھئے لفظ وہ نبوت اور وحی تو چھوڑ دیا ہمکلامی سے باقی رہی یہ الہام ہے یہ کشف ہے وحی نہیں کہتے۔ایک اور چیز آگے یہ بشریٰ ان کے لیے دنیاوی زندگی میں بشریٰ بشارتیں۔کہا کہ وحی کا سلسلہ تو ختم ہوگیا مبشرات خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔آپ کو پتہ ہے یہ ایک اصطلاح ہے ان کے ہاں کی' مبشرات کا سلسلہ جاری ہے۔یہ یہیں سے ہی اولیاء اللہ کے بشریٰ مبشرات۔مبشرات خدا کی طرف سے ان کو بشارتیں ملتی ہیں۔اور مبشرات میں یہ کہتے ہیں کہ یہ؟؟ سابقہ خوابیں جو ہیں یہ اس میں شامل ہیں خوابوں کے ذریعے سے بھی یہ خوشخبریاں ملتی ہیں اولیاء اللہ کو۔ان کو بتا دیا جاتا ہے آنے والے واقعات کو اور ان تمام چیزوں کو۔اور یہ مبشرات بتائی گئی ہیں۔ان کے خوابوں کی تو یہ کیفیت کہ یہ ساری اپنی پیشگوئیوں کا مدار خوابوں پر رکھتے ہیں انہیں مبشرات کہتے ہیں۔اولیاء اللہ کی ان لوگوں کی خوابوں کی تو یہ کیفیت اور ساتھ ہی ہمیں یہ بتایا جاتا ہے یہ حدیث ہے آپ کے ہاں کی اور احادیث کی تمام کتابوں میں یہ چیز موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں خواب دیکھا مکہ ابھی فتح نہیں ہوا تھا حج کے لیے یہ جا نہیں سکتے تھے مدینہ کے مسلمان وہاں' خود رسول اللہ ﷺ بھی ہجرت کے بعد مکہ تشریف نہیں لے گئے عربوں نے قریش نے وہاں اتنی پابندی لگا رکھی ہوئی تھی۔تو یہ چیز قرآن میں ہے کہ رہ رہ کے حضور ﷺ کے دل میں مقدس آرزو بن کے اٹھتی تھی کہ اس نظام اس خلافت اس حکومتِ خداوندی کا مرکز تو مکہ ہے اور وہ ان کے قبضہ میں ہے اور ہماری یہ کیفیت کہ ہم وہاں جا بھی نہیں سکتے۔تو یہ ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ ﷺ مکہ گئے ہیں اور طواف کر رہے ہیں۔میں وہ روایت بیان کر رہا ہوں۔تو یہ بات جب آگے بڑھی حضور ﷺ نے فرمایا اور حضور ﷺ اس خواب کی بنیاد پر تیار ہوگئے حج کے لیے۔تو جب حضور ﷺ تیار ہوئے تو پھر تمام صحابہ کرامؓ یعنی جتنے بھی جماعتِ مؤمنین تھیں حضور ﷺ کی معیت میں ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے کے لیے ساری جماعت ساتھ ہوگئی اس خواب کی بنیاد پر۔اور آگے جا کے بتایا جاتا ہے کہ قریش نے انہیں مکے سے ورے ہی روک لیا حدیبیہ کے مقام پر اور وہاں سے آگے نہیں بڑھے نہ حج کیا نہ مکے میں داخل ہو سکے وہیں ان سے صلح کر کے وہیں سے واپس لوٹ آئے۔میں کہہ یہ رہا تھا کہ ایک طرف حضورِ نبی اکرم ﷺ کے خواب کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ اس خواب کی بناء پہ اور حضور ﷺ کو اس خواب پر اتنا بھروسہ تھا اتنا یقین تھا کہ اس خواب کی بناء پر حضور ﷺ حج کے لیے ارادہ ہی نہیں کیا تشریف لے گئے وہاں تک۔کہتے ہیں کہ پچاس ہزار کے قریب حضور ﷺ کے ساتھ معیت تھی۔اور اس روایت کے مطابق خواب پورا نہ ہوا واپس آنا پڑا۔حضور ﷺ کے مبشرات کی تو یہ کیفیت اور ان کے مبشرات کی یہ کیفیت کہ جناب ہر پیشن گوئی کا مدار خواب کے اوپر اور کہا کہ ہمارے اس دعوے کی دلیل جو ہے وہ ہمارے خوابوں کا پورا ہونا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے خواب کی تو یہ صورت ان کے خوابوں کی یہ کیفیت' مبشرات ان کے ہاں کی۔سوچئے عزیزانِ من! ہم کہاں ہیں۔یہ تو دوسری چیز ہے کہ پھر اس کے بعد مکہ فتح ہوا حضور ﷺ گئے یہ سب چیزیں اور ہیں میں اتنا سا ٹکڑا لینا چاہتا ہوں جن کو یہ مبشرات کہتے ہیں۔وہ خوابوں کی دنیا اس کے اوپر صاحب ایک ہمکلامی کا سلسلہ وحی کی نوعیت میں سے وہ کہتے ہیں چالیسواں حصہ وہ ہوتا ہے

وحی کے پھر حصے کئے گئے۔آپ دیکھئے تو سہی کہ ایک قدم وہی جو میں کہا کرتا ہوں کہ ریل گاڑی کی جب پٹڑی بدلتی ہے کانٹا بدلتا ہے تو پہلی پٹڑی اور دوسری میں ایک انچ کا فرق بھی نہیں ہوتا۔وہ دوسری پٹڑی کا تو پچھلا حصہ جو ہے اس کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے جبھی وہ اُدھر جاتی ہے نا۔اور اس کے بعد پھر جتنی آگے بڑھتی چلی جائے اپنی منزل سے اتنی دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔یوں آپ کی گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑی ہوئی ہے۔ختمِ نبوت پہ صرف عقیدہ ہی نہیں اس کے اوپر جانیں دینے کے لیے تیار اور ختمِ نبوت کی اصل و ماہیت کو ختم کرنے کے لیے یہ کیفیت آپ کے ہاں چلی جا رہی ہے۔یہ کشف اور الہام اور مبشرات اور؟؟ سابقہ اس پہ آج بھی ان کا ایمان ہے۔الفاظ کی رو سے وحی ختم ہے نبوت ختم ہے' یہ کیا ہو رہا ہے؟ خدا کی طرف سے ہمکلامی۔عزیزانِ من! کلام خدا کا کتاب اللہ کے اندر ہے جب آپ کتاب اللہ کو خدا کی اس کتاب کو پڑھتے ہیں خدا آپ سے کلام کر رہا ہوتا ہے۔یہ ہے ہمکلامی۔(**لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا**) (10:64) آپ نے دیکھا کہ یہ بشریٰ کا یہ لفظ جو آیا وہ اولیاء اللہ اوپر آیا ہوا ہے نا پہلے تو (**لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) ۔صاحب! **یہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون؟** کہتے ہیں دیکھ لیجیے صاحب وہاں بیٹھے ہوئے ہیں ننگ دھڑنگ گالیاں دے رہے ہیں ساری دنیا کو' کسی کی جرآت نہیں پڑتی کچھ کہہ جائے۔اوکسی دیوانے کو بھی کوئی کچھ نہیں کہتا ''ایویں ای پتھر کھانے نیں اوہدے کول''۔کہ جی دیکھئے یہ تکیوں کے اندر یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں کہیں جاتے نہیں آتے نہیں ان کو کسی کی محتاجی بھی کچھ نہیں۔ٹھیک ہے وہ تو نہیں جاتے آتے' تم ذرا جانا آنا چھوڑ دو نا پھر دیکھیں ان حضرت صاحب کو ہم۔یہ ہے (**لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) ۔(**لھم البشریٰ**) (10:64) میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو ہمکلامی ہے یہ تو خدا کی کتاب ہے۔خود قرآنِ مجید کو خدا نے خود بشریٰ کہا۔پہلی چیز تو یہ ہے۔دو ایک آیتیں پیش کرتا ہوں۔(**و نزلنا الکتٰب تبیانًا لکل شیءٍ و ھدًی و رحمۃً و بشریٰ للمسلمین**) (16:89)

دیکھتے ہیں آپ کیا ہے چیز بشریٰ۔(**کتٰب تبیانًا لکل شیءٍ و ھدًی و رحمۃً و بشریٰ للمسلمین**) ۔یہاں خوابوں کو بشریٰ بتایا جاتا ہے۔میں نے عرض کیا ہے نا کہ اس ہمکلامی کو ہی کہتے ہیں نا یہ۔اب ہمکلامی آپ نے دیکھ لی کہ خدا خود کیا کہہ رہا ہے یہ بشریٰ کسی خاص گروہ کے لیے نہیں ہے (**بشریٰ للمسلمین**) ۔(**قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق لیثبت الذین اٰمنوا**) (16:102) قرآن نازل ہوا تا کہ وہ لوگ جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں ان کو زندگی میں ثبات و استقامت و استقلال حاصل ہو جائے۔کتنی بڑی خوشخبری ہے یہ۔زندگی میں ثبات حاصل ہو جانا' ان کا Establish ہو جانا اس دنیا کے اندر۔کتنی بڑی خوشخبری ہے جو دی گئی ہے۔اسی لیے کہا (**ھدًی و بشریٰ للمسلمین**) یہ ہے بشریٰ ان کے لیے۔اب رہا یہ کہ ان کے لیے یہ بشارتیں جن کو کہا گیا ہے یہ بشارتیں کیا ہیں۔یہ فی الحیٰوۃ الدنیا ہے کہا ہے نا پہلی چیز جو ہے اسے ذہن میں رکھیے گا۔بشریٰ۔(**وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصٰلحٰت**) (24:55) ان میں سے جو بھی ایمان لائے اور اس کے اعمال صالح ہوں اس کے لیے خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔یہ جو وعدہ ہو

کسی کے ساتھ کہ اچھا بھئی ٹھیک ہے پرسوں تم نے آ جانا تمہیں ضرورت ہے نا میں تمہیں دو ہزار روپیہ تمہیں چاہیے دیدوں گا۔ بڑی خوشخبری ہے ۔ پرسوں آ جانا کہ تمہیں میں تمہاری کامیابی کا سرٹیفکیٹ دیدوں گا۔ یہ وعدہ ان چیزوں کا کسی کی کامیابی و کامرانی اور مراد پوری ہو جانا یہ وعدہ یہی تو خوشخبری ہے یہی بشریٰ ہے آنے والی کامیابی کا۔ یہاں وعدہ کہہ کے قرآن نے پکارا ہے اور دوسری جگہ یقین دلا دیا کہ یاد رکھو (**لا یخلف المیعاد**) ہمارے وعدے عام وعدے نہیں ہیں ہم کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ کتنی بڑی یقینی ہے یہ بشارت۔ (**وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصٰلحٰت**) بہت بڑی بشارت ہے یقینی بشارت ہے' کس چیز کی بشارت ہے؟ (**لیستخلفنھم فی الارض**) . (**لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا**) تھا نا یہاں دنیاوی زندگی میں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں ایمان او اعمال صالح کے نتیجے میں اسی ارض پہ اسی زمین پہ تمہیں استخلاف حاصل ہوگا حکومت حاصل ہوگی۔ یہ ہے **بشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا** ۔ اور پھر اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ یونہی نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ذہنی سی روحانی سی چیز ہے۔ آپ کو پتہ ہے میں آگے چل کے بتاؤنگا اس آیت کی پھر جو اس کے بعد تفسیریں آپ کے ہاں ہوئیں کہا یہ استخلاف جو ہے یہ روحانیت کا استخلاف ہے۔ قرآن تھا یہ تو۔ (**کما استخلف الذین من قبلھم**) (24:55) جیسا ان سے پہلی قوموں کو استخلاف حاصل ہوا۔ تو وہ تو کوئی ایسی چیز ہے جسے قرآن نے شہادت میں پیش کیا ہے۔ شہادت میں تو وہ چیز پیش کی جا سکتی ہے جو محسوس طور پہ سامنے نظر آئے۔ کسی کی ذہنی چیز تو شہادت میں پیش ہی نہیں کی جا سکتی۔ روحانیت ایک ذہنی چیز ہے ذہنی سے بھی آگے ہے کچھ۔ قوموں کے متعلق ہے پھر۔ اس سے پہلے بھی قوموں کو یہ چیز حاصل ہوئی۔ مقصد اس سے کیا تھا؟ (**ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضٰی لھم**) (24:55) جس نظامِ زندگی کو ان کے لیے خدا نے پسند کیا ہے اس کا تمکن ہو جائے۔ یہ تمکن کا لفظ آپ دیکھئے کیا ہے: Establish کر دینا۔ قرآن میں یہ لفظ خود حکومت کے معنوں کے اندر سارے قرآن میں ہے۔ (**ان مکنٰھم فی الارض تامرون الناس**) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن زمین میں حاصل ہوگا تو پھر یہ ہمارے معروف کو نافذ کریں گے؟؟ کو روکیں گے۔ تمکن ہے۔ تا کہ دین کو تمکن حاصل ہو جائے۔ استخلاف کی پہلی شرط نہیں بلکہ مقصد استخلاف کا نتیجہ استخلاف کا دین کا تمکن ہے نظام زندگی جو قرآن دیتا ہے اس کا تمکن ہے۔ وہ تو حکومت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اور اگلی چیز۔ (**ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنًا**) (24:55) اور تا کہ ان کا جو موجودہ خوف ہے وہ اسکے بعد امن سے بدل جائے۔ یہ یہی (**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) ہے۔ یہ جو کہا تھا تا کہ انہیں خوف نہ رہے حزن نہ رہے۔ کہا کہ یہ ہو ہی اس صورت میں سکتا ہے جب انہیں تمکن حاصل ہو دنیا کے اندر۔ تمکن کے بغیر آپ سمجھتے ہیں حزن کو تو چھوڑ دیجیے خوف جا سکتا ہے؟ تمکن کے بغیر تو کمزوری آ جائے عزیزانِ من! دن رات خوف طاری رہتا ہے جیسا ہم پہ خوف طاری رہتا ہے۔ حالانکہ مملکت اپنی ہے۔ وہ قوت جو تمکن جسے کہا جاتا ہے اس میں کچھ ضعف آ گیا ہے نا۔ آپ دیکھئے وہی چیز جو وہاں کہی گئی تھی کہ خوف نہیں ان کے اوپر ہوگا بشریٰ حیات دنیا میں' اس کے لیے استخلاف فی الارض کہا اسی دنیا میں اسی زمین پہ تمکن۔ اور اس تمکن کا نتیجہ کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا۔

تا کہ (یعبدوننی) (24:55) یہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف میری محکومیت اختیار کریں۔اور یہ تو قرآنی نظامِ مملکت میں ہی ہوسکتا ہے عزیزانِ من!۔ یہاں بشریٰ اور مبشرات جو مل رہے ہیں وہ انگریزوں کی غلامی کے زمانے کے ہیں۔اور مبشرات ملنے والے جو ہیں انہوں (مرزا غلام احمد) نے لکھا یہ ہے کہ ''میں نے حکومتِ برطانیہ کی مدح وستائش اور ان کی مدد اور تائید کرنے کے لیے اور ان کی اطاعت اور فرماں برداری کے لیے جتنا کچھ لکھا ہے اس سے پچاس الماریاں بھر جاتی ہیں۔'' کہتا ہے خوف نہیں رہے گا۔ایک عرضداشت گذاری ہوئی ہے بحضورِ لیفٹنٹ گورنر صاحب بہادر' ان سے کہا یہ گیا ہے اس کے اندر کہ میں نے اتنا کچھ لکھا ہے آپ لوگوں کی حکومت کے استحکام تمکن اس کی اطاعت فرماں برداری وفاشعاری میں تو اس وفاشعاری کا اتنا تو مجھے صلہ دو کہ یہ مولوی میرے پیچھے پڑ گئے ہیں ان سے حفاظت کا سامان کرو۔(لا خوف علیھم) والے مبشرات۔اس خوف سے کپکپا رہے ہیں اور اس سے درخواست کی جا رہی ہے کہ اتنا میرا حفاظت کا تو سامان کرو۔یہ مبشرات ملنے والوں کی کیفیت ہے۔(**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) ۔اس کا طریقہ تو قرآن نے یہ بتایا تھا(**استخلاف فی الارض**) ہے ۔اور استخلاف فی الارض کی انہوں نے یہ تفسیر کر دی۔اور یہ پہلی نئی چیز نہیں تھی بڑی پرانی چلی آ رہی ہے کہ صاحب یہ استخلاف روحانیت کا استخلاف ہے۔اور آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے ہاں ان تصوف کے خانوادوں میں معلوم نہیں آپ ان وادیوں میں گئے یا نہیں ہم سے پوچھئے۔ ان کے ہاں خلیفہ ہوتا ہے۔ایک تو وہ مرشد اس وقت کا ہوتا ہے نا اس کے بعد ان کے خلفاء ہوتے ہیں پھر۔یہ جو آپ کے سامنے اس وقت بیٹھا ہوا ہے اس بارگاہِ خداوندی کا؟؟؟ دو خانوادوں کی خلافت تو مجھے حاصل ہے چشتیہ نظامیہ اور چشتیہ صابریہ۔خلافت ملتی ہے وہاں۔ Parallel ??? آپ نے دیکھا کیسے چلائی ہوئی ہیں انہوں نے۔اور پھر وہ قابلِ نفرت اس دنیا کی حکومت یہ ساری خلافت۔یہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی کی علامتیں ہیں۔وہ زمانہ یاد آتا ہے تو بے اختیار وہ میر کا شعر یاد آ جاتا ہے۔

شریفِ مکہ رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

ان کے ہاں خلافتیں ملتی ہیں۔یہ آیہ استخلاف کی ان کے ہاں یہ تفسیریں ہوتی ہیں۔خوف کا یہ عالم ہوتا ہے۔کہا کہ (**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) ۔میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے بتایا یہ ہے کہ بشریٰ خود یہ قرآن ہے۔(**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) کا طریقہ تمکن فی الارض ہے۔اور کہا ہے کہ اسی صورت میں آپ خدا کی عبادت جسے کہتے ہیں' وہ کہتا ہے تا کہ (**لا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا**) (24:55) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمہیں اپنی استخلاف فی الارض اپنی مملکت حاصل ہو صرف اس میں خدا کی عبادت تم کر سکتے ہو شرک سے بچ سکتے ہو۔وہ عبودیت جس کے معنی تھی محکومیت' اس کے معنی ہوئے پرستش' شرک کے معنی ہوئے بت پرستی تو وہ تو ہر جگہ جہاں جی جائے آپ بچ سکتے ہیں۔خوف اور حزن سے بچنا صاحب قلب کی بات' دل میں نہیں یہ ہوتا ''اوتوں بھاویں جتیاں پین ڈیاں ہون''۔وہ خوف مٹا رہا

ہے تمکن فی الارض سے' یہاں روحانیت کی ایک دنیا قائم ہورہی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ گاڑی دوسری پٹڑی پہ پڑے پھر کیا کچھ ہوتا ہے۔ یہ تمکن کس قسم کا حاصل ہوتا ہے۔عزیزانِ من! قرآن کے دعاوی(**لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**) دیکھئے تفسیر قرآن کی۔کہا سنیے یہ تمکن کس قسم کا ہوتا ہے اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ (**ولن یجعل اللہ للکٰفرین علی المؤمنین سبیلًا**) (4:141) یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دنیا میں کفار کا کسی طرح بھی مؤمنین کے اوپر غلبہ ہوجائے۔اللہ اکبر۔کتنی بڑی بشارت ہے صاحب۔ ہو ہی نہیں سکتا۔(**لن یجعل اللہ للکٰفرین علی المؤمنین سبیلًا**) وہ راہ ہی نہیں پاسکیں گے غلبہ اور تسلط کی۔یعنی وہ تسلط اور غلبہ ہونا تو ایک طرف رہا راستہ ہی نہیں پاسکیں گے وہ غلبہ اور تسلط کا۔مؤمنین کے تمکن فی الارض کی کیفیت ہوگی لاخوف علیھم ولاھم یحزنون کی۔اور یہ تو پھر بھی ابھی منفی چیز ہے کہ وہ غلبہ نہیں پاسکیں گے قرآن تو آگے جاتا ہے۔سنیے قرآن کے متعلق(**ھٰذا بیان للناس و ھدًی و موعظۃ للمتقین**) (3:138) تمام عالمِ انسان کے لیے حقائق کو واضح بیان کرنے والا ہدایت اور موعظت متقین کے لیے۔اوران کی خصوصیت کہا(**ولا تھنوا ولا تحزنوا**) (3:139) وہاں خوف تھا یہاں یہ حزن آ گیا۔(**ولا تھنوا ولا تحزنوا**) مت خوف کھاؤ مت افسردہ ہو مت غمگین ہو مت اداس ہو۔کیوں؟ (**و انتم الاعلون**) (3:139) تم ساری دنیا میں غالب آؤ گے۔(**ان کنتم مؤمنین**) (3:139) اولیاء ہونے کی تو ضرورت نہیں بتائی یہ تو مومن ہی یہاں صرف کہا ہے اس لیے کہ وہ تو دونوں ایک ہیں نا قرآن کی رو سے۔کیونکہ تم مومن ہو اس واسطے(**اعلون**) ۔عربی جاننے والے جانتے ہیں اس سے اوپر کا صیغہ ہی کوئی نہیں ہوتا Supernative ڈگری ہے۔کائنات میں(**سبحان ربی الاعلٰی**) وہی ہے نا اعلیٰ۔اوراس کی اطاعت کرتے اس کی راہنمائی میں چلتے ہوئے اس کے یہ بندے جو ہیں ان کی کیفیت یہ(**اعلون**) اس ارض میں اعلون انہیں حاصل ہوگا۔غور فرمایا **لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** کی کیا تفسیریں ہورہی ہیں قرآن کی رو سے۔کوئی غیر مسلم تمہارے اوپر غلبہ نہیں حاصل کرسکے گا تم اعلون ہوگے ساری دنیا کے اندر۔(**الا انا اولیاء اللہ لا خوف علیھم . الذین اٰمنوا و کانوا یتقون**) (10:62-63) وہاں مومن صرف کہا تھا یہاں **موعظۃ للمتقین** کہا ہے دونوں ہی تو چیزیں یہاں کہی تھیں ایمان اور تقویٰ۔دونوں کے متعلق یہ بتایا گیا۔اس سے بڑی اور بڑی بھی کوئی ہوسکتی ہے۔لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے مبشرٰت اس کو کہا جاتا ہے۔قرآن نے مبشرٰت کا لفظ استعمال کیا ہے کتنا خوبصورت لفظ ہے۔زمینِ مردہ کہ جس میں کچھ نہیں اگا ہوا قرآن کہتا ہے کہ دیکھو ہم اسے کس طرح سے حیاتِ تازہ عطا کرتے ہیں۔زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرنی ہے اس کے لیے وہ کہتا ہے کس سے یہ ہوتی ہے؟ وہ کہتا ہے ٹھیک ہے آسمان سے بارش برستی ہے زمین میں چھپی ہوئی زندگی محسوس شکل میں تمہارے سامنے آجاتی ہے۔محسوس شکل میں سامنے آتی ہے روحانی دنیا کے اندر ہی نہیں صرف ہوتا۔روحانی دنیا میں تو روٹی نہیں پک سکتی۔یہ ہے جس کے لیے وہ کہتا ہے کہ ہم زندگی دیتے ہیں اس زندگی کے لیے کہا(**و من اٰیٰتہ ان یرسل الریاح**) (30:46) تم دیکھتے نہیں ہو کہ سخت گرمی جب ہوجاتی ہے حبس ہوجاتا ہے بارش نہیں برستی کسان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف آرزوئیں بن کر تکتی ہیں تو

وہاں ہم کرتے کیا ہیں؟ (یرسل الریاح) پہلے ہم پروا کی ہوائیں چلا دیتے ہیں وہ آتی ہیں ہوائیں۔ہمیں آپ کو تو کچھ پتہ نہیں لگ سکتا کسانوں سے پوچھئے جب وہ ہوائیں آتی ہیں کہیں ابھی بادل نہیں ہوتے کہیں بارش نہیں برس رہی ہوتی کسانوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھتے ہیں۔کیا ہوتا ہے ان ہواؤں میں؟ کہا(مبشرٰتٍ) (30:46) آنے والی بارش کی بشارتیں دینے والی ہوائیں۔انہیں کہتا ہے قرآن مبشرٰت۔پھر ان کے بعد وہ آتے ہیں بادل پھر برستی ہے بارش پھر ملتی ہے حیاتِ تازہ زمینِ مردہ کو پھر اس میں زندگی انگڑائیاں لیتی ہوئی ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی ابھر آتی ہے۔یہ ہے مبشرٰت جنہیں یہ اب کہا جاتا ہے۔(لھم البشرٰی فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ) (10:64) آپ نے عزیزانِ من! سن لیا کہ یہ مؤمنین اولیاء جن کو کہا ہے ان کی علامات کیا بتائیں۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ(الذین اٰمنوا و کانوا یتقون) (10:63) کوئی الگ گروہ نہیں۔ایمان اور تقویٰ والے سیدھی بات۔ایک چیز یہ کہ (لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون) خوف اور حزن نہیں ہوگا جماعتِ مومنین کے لیے۔پہلی چیز۔خوف اور حزن جائے گا تمکن فی الارض سے جسے استخلاف کہا گیا ہے اپنی مملکت متمکن ہوئی ہو Establish ہوئی ہو۔اس کی قوت کا یہ عالم کہ کوئی کافر کوئی غیر مسلم اس پہ غلبہ اور تسلط کی راہ نہیں پا سکے گا۔اور اس کی کیفیت یہ کہ یہ اعلون ہونگے غالب ہونگے ساری دنیا پہ۔یہ ہے وہ بشرٰی بشارتیں جو دی ہیں ان کے لیے۔اور سنیے عزیزانِ من! کہ یہ شاعری نہیں ہے غور سے سنیے گا کیا کہا ہے۔کہا(لا تبدیل لکلمت اللہ) (10:64) یہ ہمارے وہ قوانین ہیں جن میں کبھی تبدیلی نہیں آتی۔کیسا واضح عمدہ محسوس معیار ہمارے سامنے آ گیا اس بات کے پرکھنے کا کہ کوئی مومن ہے یا نہیں کوئی مسلم و متقی ہے یا نہیں کوئی اولیاء اللہ ہے یہاں یا نہیں۔(لا تبدیل لکلمت اللہ) یہ نہیں ہے کہ کسی زمانے میں یہ بات ہوئی تھی پھر اس کے اندر یہ بات کچھ تبدیل سی ہوگئی۔پہلے استخلاف فی الارض کے معنی دنیا کی حکومت تھی پھر یہ روحانیت کا عالم آ گیا وہ مبشرٰت وہ تھیں کہ جو اعلون کی خوشخبریاں دیتی تھیں اب وہ روحانی دنیا کے اندر کی خوشخبریاں رہ گئیں، وہ وِلایت تھی یہ وَلایت ہوگئی وہ زمین کے اوپر تھی یہ نیچے چلے گئے۔(لا تبدیل لکلمت اللہ) ان میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔مستقل غیر متبدل محکم معیار یہ پرکھنے کے لیے کہ یہ ہم مومن ہیں یا نہیں۔مومن بتایا ہے اور بشرٰی تو للمسلمین کہا تھا وہ تو ذرا پہلی سٹیج ہوتی ہے جھکے ہوئے قوانین کے سامنے ان کے لیے یہ بشارتیں تھیں۔کیسی عمدہ کسوٹی ہے عزیزانِ من! لا تبدیل لکلمت اللہ ۔کلمت اللہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ چلیے جی انہوں نے کیا کیا؟ کلمات سے کلام، کلام سے لیا ہمکلامی۔کہا کہ جی ٹھیک ہے ہم سے جو باتیں کرتا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔یہ جتنی یہ کی ہوئی ہیں باتیں یہ تو (معاذ اللہ) پرانا کلینڈر رہو گیا۔(لا تبدیل لکلمت اللہ) اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے اوپر یہ کسی مصیبتوں سے چھٹکارے کا نام نہیں ہے کہ چلیے صاحب

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ ہے نا نجات آپ کے ہاں کا تصور جو ہے۔نجات کا تصور غیر قرآنی ہے' Salvation کے معنی ہیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا۔وہ کہتا ہے یہ کوئی مصیبت میں تم پھنسے ہوئے ہو؟ چھٹکارے کی بات ہی نہیں ہے۔(ذٰلک ھو الفوز العظیم) یہ Acheivement ہے عظیم Acheivement۔ایمان واعمالِ صالح کا نتیجہ فوز ہے عزیزانِ من! نجات نہیں ہے۔نجات کا تصور تو مذہب میں ہوتا ہے وہ پہلے انسان کو کسی مصیبت میں پھنسا ہوا دکھاتا ہے۔ ہر انسانی بچہ عیسائیت کے عقیدے کی رو سے اپنے اولیں ماں باپ کا اپنی کمر کے اوپر لاد کے آتا ہے اس گناہ سے وہ چھوٹ نہیں سکتا اعمال کی وجہ سے۔سارے انسان اس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں اعمال کے ذریعے ممکن ہی نہیں ہے۔وہ جیسا میں آپ کو سمجھایا کرتا ہوں ان کے عقیدے کی رو سے میں بات کیا کرتا ہوں کہ وہ خدا انسان پیدا بھی کیے چلا جاتا ہے ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ گناہ کا بوجھ اپنی کمر پہ لاد کے آتا ہے یہ بوجھ وہ اتار سکتا نہیں اس کی وجہ سے اس نے جہنم میں جانا ہے۔تو ان کے عقیدے کی رو سے جب اسکے اوپر نگاہِ بازگشت ڈالی اللہ میاں نے تو اس نے کہا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔نہ وہ پیدا کرنا بند کر رہا ہے نہ وہ ان کا بوجھ اتار سکتا ہے وہ جہنم میں بھیجنے کے لیے چلائے جا رہا ہے۔خود ہی کچھ افسوس آ رہا ہے کہ یہ میں کر کیا رہا ہوں۔ان کے عقیدے کی رو سے بات کر رہا ہوں (معاذ اللہ معاذ اللہ) ۔تو جب مغموم سا دیکھا اس بیٹے نے باپ کو تو اس سے پوچھا ابا جان کیا بات ہے آج بڑے افسردہ سے نظر آتے ہیں مغموم سے نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا بیٹا بات اصل میں یہ ہے سمجھ میں میری آتا نہیں کہ کیا کیا جائے پیدا بھی کیے چلا جاتا ہوں سلسلہ بند بھی نہیں کرنا۔ ہوتا بھی یہ ہے کہ ہر ایک وہ گناہ کو لے کے آتا ہے گناہ چھوٹ نہیں سکتا وہ جہنم میں جائیں گے تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ بات ہو جائے گی۔اب سمجھ میں نہیں آتی کہ کریں کیا۔اُنہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں بیٹے کاہے کے لیے دنیا میں ہوتے ہیں باپ کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے ہوتے ہیں نا کوئی بات نہیں۔اس نے کہا کہ سمجھاؤ میری سمجھ میں تو بات آتی نہیں۔اُنہوں نے کہا کہ یہ اکیلا ہی تو آپ کا بیٹا ہوں قربانی آپ کو کچھ دینی پڑے گی۔اُنہوں نے اس مصیبت سے تو بچ جاؤنگا بتائیے کیا قربانی ہے۔کہنے لگے مجھے بھیج دیجیے وہ مجھے سولی چڑھا دیں گے میرا خون جو ہے وہ ایک طرف رکھ دینا میزان میں اور یہ ساری مخلوق کے گناہ دوسری طرف رکھ دینا۔ یہ پلڑا جھکے گا سب جنت میں چلے جائیں گے۔اُنہوں نے کہا جیتا رہ بیٹا دیکھا نا سعادت مند بیٹا ہے۔اندازہ لگائیے۔اسے Salvation کہتے ہیں۔دیکھا نجات کیا ہوتی ہے۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہر پیدا ہونے والا جو ہے اپنے پچھلے جنم کے پاپ جو ہیں ان کا عذاب ساتھ لے کے آتا ہے اور پھر یہ چکر چلتا ہے کم از کم ستر کروڑ چکر۔تین چکر کسی کو دے تو بے ہوش ہو جاتا ہے آدمی۔ یہ گھن چکر ہوتا ہے ان کے ہاں۔آپ کو پتہ ہے اسے کہتے ہی ہیں دنیا چکر' دنیا چکر جو ہے نا ان کے ہاں تناسخ کے لیے لفظ ہی یہ ہے۔مل رہا ہے چکر۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ان چکروں سے آخر ملنے کے بعد کیا ہوگا کہ جی وہ پہلا جو پاپ یا گناہ کی آلائش جو تھی ناوہ دھل جائے گی۔یعنی As you were ہو جائے گا۔ملاحظہ فرمائیے۔''اوالیس سیاپے اچ پہلاں پھنسایا کیوں جیہدے اچ کڈن لئی ایہ کچھ چکر دینے پئے تہانوں''۔ان سے پوچھا کہ صاحب کیوں یہ کچھ ہو رہا ہے؟ کہنے لگا یہ ایشور کی لیلا رچائی ہوئی ہے ڈرامہ کر رہا

ہے۔ ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ اسے نجات کہتے ہیں' مکتی' ان کے ہاں یہ صورت ہے۔ یہ آپ کے ہاں کے تصوف اور ویدانت والے اور آ گئے انہوں نے کہا نہیں یہ سب غلط ہے۔ یہ جو آتما ہے جسے روح کہا جاتا ہے وہ پرماتما جو ہے ناروحِ مطلق اصل یہ اس سے کسی طرح سے چھوٹ کے الگ ہوگئی ''جس طراں میلے اچ چھوٹا جیہا بچہ ماں پیو کول الگ ہو جاندا اے ناتے روندا رہندا اے''۔ یہ آتما اس پرماتما سے کسی طرح سے الگ ہوگئی۔ پھر؟ یہاں آ کے جوگری تو اس مادے کے دلدل میں پھنس گئی۔ اب یہ بچہ الگ ہوا ہوا رو رہا ہے۔ آپ کے ہاں اسے ہما اوست کہتے ہیں۔ وہاں روحِ خداوندی سے انسان کی روح الگ ہوئی ہوئی آتما کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور یہاں جیسے میں نے کہا ہے رو رہی ہے یہ میں نہیں کہتا۔

بیش میں از مے چوں حقائق می کند

از جدائی آ ؟؟ می کند

تشبیہ میں وہ کہتے ہیں اس بنسری کو سنو یہ روتی کیوں ہے؟ اس لیے کہ نیستاں جو تھا وہاں سے کٹ کے الگ ہوگئی ہے رو رہی ہے۔ علاج اس کا کیا ہے؟ یہ جتنا یہ مادی دنیا ہے ان کا ترک' الگ کردو' ہر چیز کو چھوڑتے چلے جاؤ ہر چیز جو مادی ہوئی۔ جتنا اسے چھوڑتے چلے جاؤ گے اتنی ہی یہ آپ کی آتما پوتر ہوتی چلی جائے گی۔ ویدانت ہندوؤں کا بالکل لفظاً لفظاً یہ ہے آپ کے ہاں جو ترجمہ ہوا ہوا ہے۔ اور جس وقت یہ ساری آلائشیں دھل جائیں گی یہ جو الگ ہوئی ہوئی روح یا آتما ہے یہ پرماتما میں جا کے مل جائے گی اسے وصال کہتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس کے لیے واصل بالحق ہوگیا۔ بڑا فریب ہوتا ہے لفظوں کے اندر عزیزانِ من!۔ وصال مل جاتا ہے۔ فراق کے صدمے۔ اور ہر ایک بولتا ہے ان میں سے واصل بالحق ہوگیا۔ عیسائیوں نے اس ترکِ دنیا کے لیے جو Saints تھے ان کے ان کی تو خیر کہانیاں چھوڑیے۔ یہ حوا کی بیٹیوں نے کہا کہ صاحب ہمارے لیے بھی کچھ کیجیے۔ یہ سارا کچھ جو تھا اس نے تو اپنا بیٹا بھیجا تو بیٹے کو تو لے گئے بیٹی اس کے تھی نہیں جو وہ بھیجتا تو ہم بیٹیوں کا کیا بنے گا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ بھی یہ نن کی زندگی بسر کیجیے تجرد کی زندگی' شادی نہیں یہاں ہوگی۔ آپ کو پتہ ہے کہ انہیں وہ جو ابن اللہ ہے یا مسیح ہے ان کی عروس یا دلہنیں کہا جاتا ہے۔ تو یہاں تو وہ چیز جو ہے وہ منگنی تک ہی رہتی ہے آگے نہیں بڑھتی۔ مرنے کے بعد یہ چیز جو ہے ان کے ہاں عروسی کہلاتی ہے کہ اصل رخصتی جسے اب ہمارے ہاں کہتے ہیں نا وہ مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ اسے ان کے ہاں اس نسبت سے عروسی کہا جاتا ہے۔ اور آپ کے ہاں آپ کو معلوم ہے جتنے ولی اللہ ہیں ان کا عرس ہوتا ہے۔ کر رہے ہیں ڈھول بجا رہے ہیں گانے گا رہے ہیں چراغاں ہو رہی ہے دیگیں پک رہی ہیں سارا قصہ شادی والا ہو رہا ہوتا ہے۔ ساری چیز اس Christianity کا تصوف جو تھا وہاں سے آئی ہوئی۔ یہ نن کہلاتی ہیں دلہنیں۔ وہ تو کہلاتی تھیں آپ کے ہاں ایک سلسلہ ہے تصوف کا وارثیہ جنہیں کہتے ہیں۔ وارثیہ سلسلے کے اندر ہمارے ہاں تو بہر حال وہ عورتوں کو تو لاتے ہی نہیں نا ان سلسلوں کے اندر' بچ گئیں بیچاریاں' مرد ہی تو ہوتے ہیں۔ ان میں سے آپ دیکھیں گے کچھ مرد گیسو سنوارے

ہوئے اور زعفرانی کپڑے پہنے ہوئے وہ کہلاتے ہی دلہنیں ہیں ۔ یہاں پتہ نہیں آپ نے کہیں دیکھا یا نہیں وہاں یوپی میں یہ عام ہوتی تھیں دلہنیں وارثی فرقے کی ۔ یہ سارا قصہ کس چیز نے پیدا کیا ہے؟ نجات نے ۔اس کے بغیر چھٹکارا نہیں ہوسکتا ۔اور جیسا میں نے عرض کیا ہے آپ کے ہاں اگر انتہا لے لی جائے شریعت کی طرف آ کے جو لوگ کہتے ہیں تو ان کے ہاں بھی یہ چیز ہے یہ بڑے بڑے آپ کے ہاں کے جو بظاہر محقق کہلاتے ہیں یا بڑے بڑے فلاسفر کہلاتے ہیں اس دنیا کے آپ کے ہاں کے ۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ جہنم میں بھیج دیا جائے گا گناہوں کے لیے اور اس کے بعد پھر وہ کچھ عرصے کے بعد جنت میں بھیج دیا جائے گا ۔بھئی یہ کاہے کے لیے یہ پراسیس ہوگا ۔ یا تو وہ قید والی بات کیجیے کہ قید سے باہر آ جائے گا ۔ کہنے لگے نہیں اس میں بڑی حکمت ہے اصل میں ۔حکمت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ گناہ جو ہیں اس سے جیسے کپڑا داغدار ہوجاتا ہے نا میلا ہوجاتا ہے ۔ دھوبی بھٹی چڑھاتا ہے تو یہ جہنم اصل میں دھوبی کی بھٹی ہے اس میں گناہگاروں کو ڈالا جاتا ہے تو وہاں ان کے گناہ دھل جاتے ہیں یہ پاک صاف ہوکر پھر جنت میں چلے جاتے ہیں ۔یعنی کپڑا جیسے پہلا تھا نا دوکاندار کے ہاں سے جب لائے تھے تو وہ تو تھا نا صاف ۔ پھر اس کے بعد آپ نے اسے پہنا وہ ہوگیا میلا' بھٹی پہ چڑھایا میل جو تھی وہ بیچ میں سے اتر گئی اس سے نجات حاصل ہوئی ویسا ہی ہوگیا جیسا پہلے تھا ۔اور ان کا فلسفہ ہوتا ہے کہ یہ Sanitorium ہے ۔تندرست توانا' اس کے بعد تپ دق کے جراثیم پیدا ہوئے اسے سینی ٹوریم میں جا کے رکھا وہاں اس کا اس طرح سے علاج کیا اس نے اس مرض سے نجات پائی ۔ واپس آیا کیا حاصل ہوا؟ جیسا مرض سے پہلے تھا ویسا بن گیا ۔نجات کے تصور میں ہے ہی As you were 'جیسا پہلے تھا ویسا ہوجانا ۔ایک سیکنڈ کے لیے کھڑے ہو کے سوچیے عزیزانِ من! کہ اگر مقصد یہ تھا کہ جیسا انسان اس سے پہلے تھا پھر کسی طرح سے ویسا ہی ہوجائے ۔ کیا خدا کا یہ سارا پروگرام تخلیقِ کائنات کا اور سلسلۂ ارشاد و ہدایت کا انبیائے کرامؑ کا اپنی کتابیں بھیجنے کا یہ شریعتیں نافذ کرنے کا یہ سارا اس لیے تھا کہ انسان جیسا اس سے پہلے تھا ویسا پھر ہوجائے ۔ اگر ویسا ہی کرنا مقصود و مطلوبِ خداوندی تھا یہ درمیان میں سے گذارنے کی ضرورت کیا تھی صاحب ۔عزیزانِ من! قرآن نے یہ تصور نہیں دیا ۔

وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ اس دنیا کے اندر ایک کلین سلیٹ لے کر آتا ہے اور اس کے بعد اسے بتا دیا جاتا ہے کہ یہ ہیں وہ ہدایتیں یہ ہیں ضوابط جن کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے ۔ بسر کرنے سے معنی کیا ہیں؟ اس نے کہا ہے کہ زندگی نشوونما پاتی ہے زندگی ارتقاء پاتی ہے اس میں Evolution ہوتی ہے یہ آگے بڑھتی ہے ۔اس نے کہا ہے کہ زندگی کی ابتداء ایک اولیں جرثومۂ حیات سے ہوئی جسے لائف سیل کہتے ہیں وہ سوئی کے نکے سے بھی چھوٹا مائیکروسکوپ میں نظر آتا ہے ۔ وہاں سے زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی بڑھتی ہوئی آگے آئی اس پیکرِ انسانیت میں اور یہ ارتقاء کی منزلیں ختم نہیں ہوئیں یہ آگے بھی جانی ہیں اس دنیا اور اس طبعی زندگی سے آگے بڑھنا ہے اس نے ۔اس آگے بڑھنے کے لیے اس نے کچھ حاصل کرنا ہے اپنے اندر نشوونما پانا ہے اس نے ۔تو Acheivement اس کو ہونی چاہئیں تاکہ یہ کچھ بن کے یہ مرنے کے بعد زندگی کی اگلی بلند منزل میں جانے کے قابل ہوسکے ۔اسے کہتے ہیں فوز ۔ فائز المرام تو لفظ آپ نے سنا ہی ہوگا ۔ یہاں نجات نہیں

ہے یہاں کچھ حاصل کرنا ہے کچھ اور بننا ہے بلند منزل پہ جانے کے قابل بننا ہے یہاں' حاصل کی جائے گی کوئی چیز۔ یہاں تزکیۂ نفس کے معنی یہ بتائے گئے انسان کی روح کو پاک کرنا۔ دیکھا لفظ۔ میں کہتا ہوں بڑی بلا ہے عزیزانِ من! کچھ پتہ نہیں چلتا انسان کو کہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ یہ تزکیہ کے معنی یہی ہوتی ہے ناپاکیزگی اور پاک ہونا۔ پاک ہونے کے معنی ہیں ناناپاک تھا وہی دھونے کا تصور جیسا پہلے تھا کپڑا ویسے کر دینا۔ تزکیہ کے معنی نشوونما کے ہیں Growth کے ہیں نمود کے ہیں بلند ہونے کے ہیں۔ وہ تو توہین کہتا ہے انسانیت کی' کہا جائے کہ ہر بچہ جو ہے آلودہ اور آلائش گناہوں کی اپنے ساتھ لے کے آتا ہے ناپاک ہوتا ہے انسان۔ (**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**) اللہ اکبر' تقویمِ احسن میں پیدا کر رہا ہے۔ کونسی آلائش وہ دیتا ہے جس کو دھونے کی ضرورت پیدا ہو؟ کہتا ہے بڑھتے چلے جاؤ' بڑھو آگے اس میدان کے اندر' چلو بھاگو آگے۔ کہا یہ نہ کرو (**الھٰکم المتکاثر**) اس ریس میں نہ جاؤ کہ اس پاس یہ دس لاکھ ہیں اور میرے پاس بیس لاکھ ہو جانے چاہئیں۔ یہ اتنا تغلب حاصل کرنا چاہتا ہے مجھے اتنا تغلب حاصل کرنا ہوگا۔ کہا یہ ٹھیک ہے آگے بڑھنے کا جذبہ ہوتا ہے انسان میں' جس نے بھی زندگی کے اندر ارتقاء حاصل کرنا ہے اس کے اندر یہ جذبہ ہوگا آگے بڑھنے کا۔ کہتا ہے آگے بڑھنا ہے آؤ میں تمہیں میدان بتاؤں۔ اس نے کہا کہ یہ جو خیرات کے کام ہیں یعنی اختیارات بڑھانے کے کام ہیں نیکیوں کے کام ہیں اس میں مسابقت کرو' دوڑ کے آؤ اس کی طرف۔ (**فلیتنافسوا المتنافس**) آگے بڑھنے کا جذبہ دل میں؟؟ کرتے ہو آؤ تمہیں میدان بتاؤں آگے بڑھنے کا۔ وہ یہ میدان دیتا ہے' آگے بڑھاتا ہے وہ۔ اور آپ کو پتہ ہے جحیم جو لفظ آیا ہے جہنم کے لیے' جہنم تو عبرانی لفظ ہے' جہنم کے معنی ہیں جہاں انسانیت جلا دی جائے۔ جس معاشرے میں انسانیت کو جلا دیا جائے وہ جہنم ہوتا ہے۔ اُس نے تو لفظ جحیم استعمال کیا ہے جہاں کسی کو روک دیا جائے جہاں کوئی رک جائے۔ زندگی بڑھنے والی چیز ہے۔ زندگی جوئے رواں نست و رواں خواہد بود۔ اس نے تو جنت کو بھی آخری مقام قرار نہیں دیا اسے بھی راستے میں ستانے کا مقام کہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اہلِ جنت کی پیشانیوں کا نور اگلے راستوں کی طرف راہنمائی کرتا چلا جائے گا بڑھتا چلا جائے گا آگے جائے گا۔ (**و الٰی ربک المنتھٰی**) بات کہیں اور چلی جائے گی۔ زندگی نے آگے بڑھنا ہے عزیزانِ من! اوپر بلند ہونا ہے۔ ان کا خدا ذی المعارج ہے سیڑھیوں والا خدا ہے۔ اس میں ہر قدم جو اٹھتا ہے بلندی کی طرف جاتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا (**ذٰلک ھو الفوز العظیم**) (10:64)۔ حالات کیا تھے جن میں یہ آیتیں نازل ہو رہی تھیں۔ مکے کی زندگی دیکھئے تو سہی یا ابتدائی مدینے کی زندگی۔ چاروں طرف سے مشکلات و مصائب کا ہجوم تھا پریشانیوں میں گھری ہوئی تھی یہ قوم' یورشیں کر کے آ رہے تھے یہ سارے حملہ آور۔ ان حالات میں ان سے کہا جا رہا ہے کہ (**لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا**) (10:64) تمہارے لیے بشارتیں ہیں۔ (**لا تخف و لا تحزن ان اللہ معنا**) وہ کہہ رہا ہے۔ اس؟؟ کی تنہائی میں جہاں نظر بظاہر مایوسیوں نے گھیرا ڈال رکھا ہوا تھا وہ وہاں کہہ رہا ہے کیوں خوف کھاتے ہو کیوں حزن پیدا ہو رہا ہے' خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ان حالات میں جہاں یہ گھرے ہوئے تھے ان سے کہا (**لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا**)

(10:64)اورکہا(**لا تبدیل لکلمت اللہ**) (10:64) قطعاً تبدیلی نہیں آئے گی یادرکھو۔(**ذٰلک ھو الفوز العظیم**) (10:64) ۔اورآگے پتہ ہے کیا کہا(**ولا یحزنک قولھم**) (10:65)ان کی باتیں تمہیں غمگیں نہ کردیں تمہیں۔یہ**قولھم** ہی تو ہے یہ ڈگڈگی جو بجاتے ہیں یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے یہ بڑی بلا ہے۔یہی نہیں**قولھم** کہ انہوں نے آکے ایک بات کی تھی۔اس لفظ کا ترجمہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ابلیس نے جب کہا تھا اللہ میاں سے کہ کوئی بات نہیں ہے آپ نے مجھے دھتکار تو دیا اسے بہت سر پہ تو چڑھالیا ہے۔چہیتا بنا کے بھیجئے زندگی میں اسے' چھوڑیئے اس میدان کے اندر مجھے بھی اسے بھی چھوڑ دیجیے اور پھر دیکھئے میں کرتا کیا ہوں اس کے ساتھ۔وہاں جو لفظ آیا ہے اس میں ہے وہ کبھی دیتے ہیں ناوہ رسی سے تھوتھنی کو باندھ دیتے ہیں اس کے لیے پھر لگام بھی نہیں۔کہا چھوڑیئے ذرا اپنے اس چہیتے کو پھر دیکھئے اس بنی آدم کے ساتھ میں کیا کرتا ہوں' کبھی دونگا اس کو۔اورآگے ہے کیا کیا چیزیں کرونگا اس میں ایک چیز ہے صوت' آوازوں سے اس کو اتنا گھبراہٹ پیدا کرونگا کہ میدان چھوڑ کے بھاگ جائے یہ۔یہ صوت کے ذریعے اس نے جو کہا تھا کہ پاؤں تلے سے زمین نکلوادونگا ان کی۔کونسی یہ صوت ہے؟ چلا رہے ہیں نا آپ کہ امرتسر کے ٹی وی نے ستیاناس کردیا سارے ملک کا۔یہ صوت ابلیسی ہے۔آپ کے ہاں سے صوت بشریٰ ملنی چاہیے تھی قوم کو۔(**لا تحزن ولا تھنوا و انتم الاعلون**) عزیزانِ من! اگر پچیس سال تک یہ آواز بلند کی جاتی اس قوم کی۔وہ تو تصویروں کے اوپر جاذبیت پیدا کرتی ہیں (معاف رکھیں بیٹیاں میری) محسوس پیکروں میں جاذبیتیں یہاں پیدا کرنے آجاتے ہیں۔کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔بشریٰ نہیں دیا اس قوم کو' یہ ہے علاج جو قرآن بتاتا ہے۔(**و ھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا**) یہ بشریٰ ہے جس سے آگے بات ہوجاتی ہے۔(**ولا یحزنک قولھم**) (10:65)ان کا پروپیگنڈہ' جس کو خدا کی طرف سے بشارتیں مل رہی ہوں وہ اس پروپیگنڈے سے مغموم وافسردہ ہوجائے؟ وہ تو اس لیے ہوجائے کہ یہاں بشارت ہی نہیں تھی پچیس برس سے مایوسی کی فضا اس قوم کے اوپر طاری کی جائے۔مایوسی کو تو قرآن نے کفر کہا تھا۔سوچتے ہیں کبھی آپ۔یہ پھر سہی بتاؤنگا۔(**ولا یحزنک قولھم**) (10:65)ان کا یہ پروپیگنڈہ تمہارے دل میں حزن نہ پیدا کردے۔پروپیگنڈے سے خوف نہیں عائد ہوتا دل ڈوبتا ہے۔کوئی توپ نہیں چلائی انہوں نے لیکن یہاں دل ہیں کہ ڈوبے جارہے ہیں۔(**ولا یحزنک قولھم**) کیوں یہ تمہیں غمگین نہ کردے۔کہا تم نے ہی تو کہا تھا اس غار کی تنہائی میں کہ (**لا تخف ان اللہ معنا**) خدا ہمارے ساتھ ہے۔جس خدا کی معیت کا تم نے اعلان رکھا ہوا ہے تمہیں پتہ ہے(**ان العزۃ للہ جمیعًا**) (10:65) قوت اور اقتدار تو سارا اس کے اختیار کے اندر ہے ان سے کیوں ڈر رہے ہو۔(**العزۃ للہ**) عربی زبان میں عزت ذلت کے مقابلے میں آتا ہے اس کے معنی غلبہ ہوتا ہے قوت ہوتی ہے اقتدار ہوتا ہے۔خدا جب اپنے آپ کو عزیز کہتا ہے تو صاحبِ اقتدار کہتا ہے معنی اس کے یہ ہوتے ہیں۔وہاں سے جو گاڑی پڑی دوسری پٹڑی پہ۔عزیزانِ من! آپ کو یہ بات سمجھ نہیں آئی دیکھا یہ لفظ کیا بن گیا ہوا ہے' میری اس سے عزیز داری ہے'۔آگے بڑھے یہاں آگئے' وہ مجھے بڑا عزیز ہے'۔ہے کوئی نسبت اس لفظ کے اصلی معنوں سے اس چیز کی۔اور پھر جسے آپ

عزت کہتے ہیں وہ بھی بہرحال ایک ذرا سی شرافت کے ہی معنوں میں رہ گئی یہ معزز صاحبِ قوت کوئی بھی ان میں سے نہیں ہوتا۔ یہاں تو جو ذرا سب سے زیادہ جھکا ہوا ہوتا ہے جس کے لیے تلقین ہمارے ہاں ہوتی ہے کہ ''ہوجا کُکھ مسیت دا'' سب روندتے چلے جائیں تمہیں اور جھکتا چلا جا۔ یہ شریف اور عزت والے جتنے بھی ہیں ان کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ عزت کے معنی یہ آ گئے یعنی وہ چیز جس کے بالکل ضد میں یہ لفظ آتا تھا۔ ذلت کے معنی توہین نہیں ہوتی اس کے معنی کمزور ہونا ہوتا ہے عربی زبان میں' عزت کے معنی قوت والا ہونا ہوتا ہے۔ خدا العزیز تھا تو اس کے بندوں کو عزیز ہونا تھا۔ یہ تھی جو عزت تھی۔ اب وہ ذہنی؟؟ ہمارے ہاں رہ گیا ایک عزت کا۔ یہاں کہا ہے (**لا یحزنک قولھم**) (10:65) ان کا یہ پروپیگنڈہ تمہیں مغموم نہ کردے کہیں اس لیے کہ (**ان العزۃ للہ جمیعًا**) (10:65) قوت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں نہیں ہے وہ تو قوانینِ خداوندی کے اتباع کرنے سے حاصل ہوگا۔ اور پھر یہ نہیں ہے کہ جس کے پاس یہ عزت اور اقتدار ہے پتہ نہیں کہ اس تک خبر بھی ہونے پائے کہ نہیں۔ اس لیے تو غالب تو روتا تھا کہ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے

یقین ہے اس پہ نہ کرو گے تم۔ لیکن

خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مشکل یہ ہے کہ تم تک خبر ہی نہیں پہنچ سکے گی ہماری۔ کہا یہ کہ کیوں ان سے ڈرتے ہو ان کے پروپیگنڈے سے کیوں مغمومِ خاطر ہوتے ہو قوت و اقتدار ہمارے پاس ہے۔ باقی رہا تمہارا یہ خوف کہ خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک' بالکل نہیں۔ (**ھو السمیع العلیم**) (10:65) کیا کتاب ہے یہ!! بسیار خودہ دیدہ ام اما تو چیزے دیگری۔ خسرو نے بھی جو انتہائی بات کہی تھی بڑی خوبصورت تھی محبوب کے لیے۔ اقبالؒ نے اس کتاب کے لیے کہا 'ایں کتابِ نیست' یہ کتاب نہیں ہے۔ اس کے بعد ذہن میں تھا کہ اب دیکھیں کیا کہتا ہے یہ کہ کیا ہے۔ اس کے لیے میں کہتا ہوں کہ سات جلدیں بھی لکھ جاتا تو وہ تو قرآن کہتا ہے کہ سات سمندر بھی ہوجائیں گے تو یہ چیز جو ہے اختتام پہ نہیں پہنچے گی۔ کہ کیا کہتا ہے پھر یہ کہ کتاب نہیں ہے تو کیا ہے اس نے کہا کہ ایں کتابِ نیست چیزے دیگر است۔ ساری بات کہہ گیا۔ (**ھو السمیع العلیم**) (10:65) اس لیے اب یہ دیکھئے قوت ہو ساری اس کے پاس' صاحبِ اقتدار وہ ہو' وہ ہو ہمارے ساتھ۔ یہاں تو کہتے ہیں کہ سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا' یعنی تھانیدار واقف کسی کا دوست ہوجائے تو وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے اب کس سے ڈرنے کی بات ہے۔ تو کہتا ہے کہ تم کیوں ڈر رہے ہو۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ (**ان العزۃ للہ جمیعًا**) قوت اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہے سارے کا سارا۔ اور ہم وہ ہیں کہ یہ نہیں کہ تمہاری حالت سے بےخبر رہیں گے' ہم تک تمہاری بات اس وقت پہنچے گی جب تم ڈوب چکے ہوگے (**السمیع العلیم**) سننے والا پہلی چیز تو یہ ہے۔ سننے والا تو یہ ہے کہ تم کچھ کہو تو سنا جائے۔ کہنے کی بات نہیں ہے وہ تو دل میں گذرنے والے خیالات سے واقف ہے العلیم ہے وہ' علم رکھتا ہے۔ اس لیے

گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کہا اب یہ کچھ اندازہ لگانا چاہتے ہو کہ یہ جو العزۃ للہ کہا ہے اسکی عزت اس کا اقتدار کتنا بڑا ہے۔ ہوسکتا ہے نا کہ جس نے ہمیں کہا ہے کہ گھبرایئے نہیں ہم آتے ہیں جنگ میں تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم یہ کہیں کہ صاحب ان کے اپنے پاس کیا ہے وہ معلوم نہیں کہاں تک دے گا اس کی؟؟ شیری کے اوپر میں کود جاؤں۔ کہا ہم نے کہا ہے (**ان العزة لله جميعًا**) (10:65) یہ کہا ہے نا اب **جميعًا** کی تفصیل سنیے۔ (**الا**) (10:66) سن رکھو (**ان لله من فى السمٰوٰت و من فى الارض**) (10:66) یہ جمیعًا کی تفسیر ہوگئی۔ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے سارا اس کے قبضہ اقتدار کے اندر ہے۔ اور یہ جو تمہیں کھڑ کھڑا کے گھبرا رہے ہیں پروپیگنڈے سے' تمہیں پتہ ہے کہ یہ جن جن کو آوازیں دے رہے ہیں کہ آنا ذرا' ان کی کیا کیفیت ہے۔ (**وما يتبع الذين يدعون من دون الله شركآء ان يتبعون الا الظن و ان هم الا يخرصون**) (10:66) ان کو بلا رہے ہو یہ تو برف کے بنے ہوئے بادشاہ ہیں سورج نکلنے دیجیے پگھل کے پانی ہو جائیں گے۔ ان کا خارج میں وجود ہی کچھ نہیں ہے ظن و قیاس ہے ان کے ذہن کے بنائے ہوئے خدا ہیں ان کے اپنے خیالات کی بخشی ہوئی عزت۔ پہلے تو یہ بات شاید نہ سمجھ میں آ سکتی ہو عزیزانِ من! اس دور میں تو یہ بالکل سمجھ میں بات آتی ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں جمہوری دور کہلاتا ہے اس میں یہ اتنا بڑا اختیار اتنی بڑی قوت حاصل ہوتی ہے صاحبِ اقتدار یا حکومت کو۔ یہ کس کی دی ہوئی ہوتی ہے؟ یہ میری آپ کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے جن کو دی آپ نے اور اس کے بعد ان کا دور ختم ہوا ان کے نام تک بھی یاد ہیں؟ یہیں پھر رہے ہیں۔ جنہیں دی گئی ہے اگر اس کے بعد نہ یہ دینا چاہیں ان لوگوں کو' کوئی اختیار و اقتدار ان کے پاس نہ ہو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ چیز اس دور میں کیسے سمجھ میں آئی۔ تو یہ جنہیں بلا رہے ہیں پکار رہے ہیں اپنا حامی مددگار بنا رہے ہیں بلکہ اپنا متبوع بنا رہے ہیں جن کی اطاعت کر رہے ہیں جن کی فرماں برداری کر رہے ہیں جس چیزوں پہ ناچ رہے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ یہ تو ان کے اپنے ذہن کے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ذہن کا بنایا ہوا کیا ہے۔ ایک فیصلہ تھا نا ذہنی ووٹ دینے کا' بدل لیجیے ذہن میں اس فیصلے کو' قوت کی بنیادیں ہل جائیں۔ اس لیے یہ چیزیں جو ہیں یہ تو حقیقی جسے قوت کہتے ہیں وہ تو اس کے قوانین میں ہے۔ یہ دی ہوئی قوتیں ہیں بخشی ہوئی قوتیں ہیں۔ پھر اقبالؒ آتا ہے

ایں خدا تا سجدہ ؟؟ خدا است

یہ خدا وہ ہیں کہ جب تک ان کے سامنے سجدے میں پڑے رہیے خدا ہیں۔

تو یکے اندر قیام آئی فنا است

تو اگر کھڑا ہو جائے ان کے سامنے ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔

(**ان يتبعون الا الظن و انهم الا يخرصون**) (10:66) یہ جن کے متعلق تمہارے ذہن میں شاید ہو ان کو بھی اس کا زعم ہو کہ یہ قوت آئی ہوئی صاحب کون چھین سکتا ہے۔ کہتا ہے یہ گردشِ دولابی ہے یہ تو اختلافِ لیل و نہار کہتا ہے اس کائنات کے اندر باہر غور کرو کتنی بڑی

قوتوں کے مالک تمہیں یہ نظر آتے ہیں یہ چاند اور سورج اور زمین مہیب کرے یہ کیفیت۔(**هو الذی جعل لکم الیل لتسکنوا فیه و النهار مبصرًا**) (10:67) یہ گردشیں تم دیکھ رہے ہو اس کے قبضۂ قدرت اس کے قانون کی قوت کو دیکھو اتنا بڑا اعظیم الجثہ یہ زمین کا کرہ اس سے تیرہ لاکھ گنا بڑا تو یہ سورج کا کرہ اور یہ پورا نظامِ شمسی یہ ماہرِ فلکیات بتا رہے ہیں اس کائنات میں سارے کی حیثیت اتنی بھی نہیں جتنی سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت ہوتی ہے۔ کہتا ہے اس کے اختیار و اقتدار و عزتِ خداوندی جو ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے لگامیں ڈال رکھی ہیں ان کو۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ سورج کی رفتار میں انچ کے کروڑویں حصے کا بھی کبھی فرق آ جائے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنے وقت سے ذرا بعد ڈیوٹی کے اوپر آئے۔ سوچتے ہو یہ قوت' وہ ان قوتوں کا مالک ہے۔ اور ہم تو صرف یہ لیل و نہار کی بات بتا رہے ہیں کہ یہی تمہاری سمجھ میں سرِ دست آئے گی۔ اس کی قوت کا اندازہ ہے؟ کہتا ہے بات ایسی یہ ہے کہ ہم نے تمہیں تو یونہی سطحی طور کے اوپر تمہارے ذہن کے مطابق سمجھائی ہے۔(**ان فی ذٰلک لاٰیٰت القوم یسمعون**) (10:67) یہ باتیں جو ہم کہہ رہے ہیں ان میں حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ تشبیہات استعارات ہمیشہ نشانیاں ہوتی ہیں عزیزانِ من! اصلِ حقیقت تک پہنچنے کی۔ 'یہ بڑا شیر ہے' یہ ایک تشبیہ ہے یہ آیت کہلاتی ہے۔ بچہ تو یہ دیکھنے لگے گا کہ پھر اس کی دم کہاں ہے اس کا یہ کچھ کہاں ہے۔ لیکن جو سمجھ سوچنے والا ہے وہ اس سے سوچے گا کہ اس سے مراد شجاعت ہے بہادری ہے دلیری ہے۔ دیکھا نا یہ آیت کیسے بنتی ہے۔ وہ کہتا ہے جو کوئی یہ بات ہم کہتے ہیں کہ وہ **لقومٍ یسمعون** اس قوم کے لیے جو سننا جانتی ہے۔ وہ سنتے تو سارے ہی ہیں طبعی طور پہ۔ آپ کو یاد ہے ایک آیت پہلے آئی تھی کہ تو سمجھ رہا ہے کہ تمہاری محفل میں بھی یہ بیٹھے ہیں تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ کہا تھا نا وہ(**ینظرون یبصرون**) فرق بتایا تھا اس کا۔ دیکھ رہے ہیں اور پھر وہی بات جو میں نے کہی تھی دوسرا لفظ ہے نہیں ہمارے ہاں۔ کہا تھا کہ بظاہر نظر آئے گا سن رہے ہیں کانوں سے تو بہرے نہیں ہوتے' سن نہیں رہے ہوتے۔ سننے اور سننے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ علامات ان کے لیے جو سننا جانتے ہیں۔ ہم آپ تو طبعی طور پہ سنتے ہیں نا صرف۔ بولتے ہم بھی ہیں بات کہہ کے ایک سے تو اسے کہتے ہیں او سنا ہے تم نے' یہ نہیں معنی کہ کان میں ڈاٹ لگ رہی ہے' اس کے معنی ہوتا ہے سمجھ گئے ہو۔ جی سن لیا ہے۔ کہتا ہے یہ جو ہیں مدِ مقابل اس زمانے میں سامنے قریش کے علاوہ مذہب کی دنیا میں یہ عیسائی اور یہودی تھے۔ یہودیوں کی تو کوئی سلطنت ہی نہیں تھی حکومت ہی نہیں تھی The Woundring Judes تھے۔ عیسائیوں کی مملکت تھی اور مملکت بھی رومن امپائر تھی۔ کہتا ہے یہ ناسب سے بڑی سلطنت جو تمہیں نظر آتی ہے ان کی قوت ہے نا جس سے یہ وہاں بارڈرز کے اوپر سرحدوں کے اوپر ڈگڈگی بجا دیتے یہ رومن بازنطینی امپائر والے۔ کہنے لگا سنو تو سہی کہا اس نے کہ تمہیں ہم نے بتایا ہے کہ یہ قوت اور غلبہ اور اقتدار صرف اس کے ہاتھ میں ہے یہ تمہارا ہے تصور خدا کے متعلق جو قرآن نے دیا ہے خدا نے خود دیا ہے۔ ان کا تصور تمہیں بتاؤں خدا کے متعلق کیا ہے' یہ کہتے ہیں(**قالوا اتخذ الله ولدًا**) (10:68) ان کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے بڑھاپے میں بیٹے کی ضرورت پڑتی ہے یہ کہتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا ہے یہ نہ ہوتا کام ہی نہ چلتا۔ کہتا

ہے جن کے ہاں خدا کا تصور یہ ہے کہ ان کا خدا بیٹے کا محتاج ہے اواس خدا کو قوت کیا حاصل ہوسکتی ہے ۔ بیچارہ سطح بیں ملا کہتا ہے صاحب! قرآن کی آیتوں میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آتا۔ مکے کی بات ہورہی تھی بیچ میں لیل ونہار آ گیا فوراً ہی اس کے بعد یہ ابنیت کا عیسائیوں کا بیچ میں لے آئے' کوئی تک ہی نظر نہیں آتی کوئی ربط ہی نظر نہیں آتا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(**لقوم یسمعون**) (10:67) کہا تھا قرآن نے تو یہ کیا جانے کہ کیا کہہ گیا ہے۔اور یہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! جو کہہ گیا ہے ؟؟ نے غالباً یہ کہا ہے نا کہ تم کسی قوم کے متعلق جس کی کوئی تاریخ اور کچھ معلوم نہ ہو تمہیں' مجھے یہ بتادو کہ اس قوم نے اپنی پرستش کے لیے خدا کس قسم کا تجویز کر رکھا تھا میں اس قوم کی تہذیب وتمدن نفسیات کے متعلق سب کچھ بتادونگا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے معبود کس قسم کا تصور کر رکھا ہے ۔کہا اس بازنطینی امپائر سے ان کے ان دھاکوں سے ڈرنے کی بات تم کہہ رہے ہو جنہوں نے جو سب سے بلند و بالا تصور ہوسکتا ہے ان کے ہاں خدا کا وہ تصور ہے ایک ایسے محتاج کا جو اپنی بادشاہی یا خدائی ہونے کے لیے بیٹے کا محتاج ہے۔(**سبحٰنہ**) (10:68) تمہارا خدا بہت اونچا ہے۔ سنتے ہیں آگے کیا کہتا ہے(**ھو الغنی**) (10:68) وہ کسی کا محتاج نہیں ہوسکتا محتاج؟ (**لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض**) (10:68) کائنات کی پستیوں بلندیوں میں سب کچھ اسکے حیطۂ اقتدار کے اندر ہے۔(**ان عندکم من سلطٰن بھٰذا**) (10:68) ان سے کہا ہے کہ وہ تو تمہارا ذہنی عقیدہ ہے نا کہ جی بیٹا ہے اور یہ سب کچھ ہے۔ کہا یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ سارا سلسلۂ کائنات جو ہے اس کے قوانین کے تابع چلا جارہا ہے کہا اس کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل ہے۔ کہاں دلیل مانگ رہا ہے۔ یہ ذہنی مباحثے کرتا ہی نہیں ہے۔ ورنہ وہاں کہنا چاہیے تھا کہ اس کے لیے آؤ بحث کرلو بیٹا ہوسکتا ہے یا نہیں ہوسکتا۔ یہ جو چیز یورپ کا مادہ پرست خدا کا منکر دہریہ سائنٹسٹ وہ بھی یہ مانتا ہے کہ عظیم قوت ہے اس قانون میں جس کے تابع یہ سلسلۂ کائنات کارفرما ہے۔ یہ لا کے دلیل کہا(**لہ ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض ان عندکم من سلطٰن بھٰذا**) (10:68) ہے کوئی دلیل اس کے خلاف تمہارے پاس؟۔(**اتقولون علی اللہ ما لا تعلمون**) (10:68) تو کہا کہ جس چیز کی شہادت تمہارا علم نہیں دیتا اسے خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔(**قل ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون**) (10:69) ان سے کہہ دو خدا کی طرف جو اس قسم کی افتراء کر کے اس کا تصور ایسا؟؟ ہیں ان کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ سورۃ یونس کی آیت 69 تک ہم پہنچے۔ 70 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ بارھواں باب (آیات 70 تا 82)

عزیزانِ من!

آج نومبر 1973ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی آیت 70 سے ہو رہا ہے۔ (10:70)

سابقہ اتوار درس کا ناغہ رہا عید الفطر کی وجہ سے۔ اس سے پہلے اتوار میں درس کا موضوع خصوصی تھا۔ تو دو اتوار درمیان میں پڑ گئے اس لیے ذہن سے شاید ربط اور اس کا تسلسل کچھ دھندلا ہو گیا ہوگا۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ بات یہ چلی آ رہی تھی کہ قوانینِ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھنے والے خدا کے تعمیری پروگرام میں اس کے رفیق بنتے ہیں اور اسی لیے وہ مومنوں کو اولیاء اللہ کہتا ہے۔ یہ کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے اور خدا اس کا ولی ہوتا ہے۔ دونوں ہی چیزیں قرآن نے گنائی ہیں۔ ان کے لیے اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں بھی ملتی ہیں اور آخرت کی زندگی تو اسی تسلسل میں آتی ہے۔ جو یہاں قرآن کے معیار کے مطابق سرفرازیوں کی زندگی بسر کرتا ہے وہ وہاں بھی مقرب ہوتا ہے اور سرفراز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ چیز تھی خالص قوانینِ خداوندی سے حاصل ہونے کی چیز لیکن اس دین کو پھر مذہب میں تبدیل کر دیتے ہیں اور انہیں کہا گیا یہ مذہبی پیشوائیت۔ یہ عجیب وغریب قسم کے عقائد وضع کرتے ہیں۔ خصوصیت سے قرآن نے کہا یہ ہے کہ ویسے تو فریب دینے والے دنیا میں مختلف اقسام کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے فریب کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ (**یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ**) یہ خود اپنی طرف سے کچھ باتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ یہ خدا کی شریعت ہے۔ اسے کہتے ہیں افتراء علی اللہ: اپنی طرف سے کچھ چیزیں وضع کرنا اور اسے خدا کی طرف سے منسوب کر کے پیش کرنا۔ اور یہی وہ چیز یہی ہے وہ تکذیب کہ جو ان کی اس عوام میں کامیابی کا راز ہوتا ہے کہ جب بھی یہ کبھی حق کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ کہہ کے نہیں کرتے کہ ہم اس کے مخالف ہیں کہتے یہ ہیں کہ یہ خدا اور رسول کے خلاف ہے۔ اور خدا اور رسول سے مراد ہوتا ہے ہر وہ کچھ جو ان کے اپنے ذہن کا وضع کردہ ہوتا ہے لیکن اسے (**لیقولون ھذا من عند اللہ**) اسے منسوب کرتے ہیں خدا کی طرف۔ یہ سوال صرف مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کا نہیں بلکہ پہلے دن سے یہ ساتھ کے ساتھ بات چلی آ رہی ہے۔ اُدھر سے سلسلۂ رشد وہدایتِ خداوندی شروع ہوتا ہے اور اِدھر سے یہ جماعت جو ہے یہ آ جاتی ہے۔ ہر رسول جانے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ اس کے دین کو مذہب میں یہ جماعت تبدیل کر دیتی ہے۔ عجیب قسم کے عقائد وضع کرتی ہے اور پھر دنیا میں مذہب ہی باقی رہ جاتا ہے دین نہیں رہتا۔ ہر نیا رسول آتا تھا اسی دین کی تجدید کے لیے کہ جسے انہوں نے مذہب میں تبدیل کر دیا ہوتا تھا۔ یہ کشمکش ہی ساری یہی ہے۔ سوال یہ ہوا کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اور یہاں سے آج ہمارے درس کی ابتداء ہوتی ہے۔

کہا کہ بات بڑی صاف ہے (**متاع فی الدنیا**) (10:70) یہ ان کا پروفیشن ہوتا ہے کمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ پیشوائیت کی پوری

تاریخ پہ غور کیجیے قرآن نے ان کے متعلق کہا تھا کہ (**یاکلون اموال الناس بالباطل**) یہ اس کا ترجمہ یہ نہیں کہ ناجائز طریقوں سے کھا جاتے ہیں وہ جائز اور ناجائز تو ان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ تو اپنے ہر طریقے کو جائز ہی نہیں عینِ اسلام بنا کے دکھاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں آپ الفاظ کے گورکھ دھندے میں کس طرح الجھاتے ہیں یہ چیز۔ بالباطل اس نے کہا ہے۔ یہ دنیا میں باہمی تعاون کا سلسلہ ہے میں نے کچھ کام دوسروں سے کرانے ہوتے ہیں اپنے' دوسرا میرے کچھ کام کرتا ہے یہ باہمی تعاون ہوتا ہے۔حتیٰ کہ موچی بھی اگر جوتا گانٹھتا ہے تو وہ میرا کچھ کام کرتا ہے میں اس کے معاوضے میں کچھ دیتا ہوں۔ یہ تعاون کی چیز ایسی ہے کہ اس میں وہ کچھ کرتا ہے میرے لیے اور میں اس کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جو کچھ نہیں کرتا دوسروں کے لیے' موچی جتنا بھی کام نہیں کرتا نائی جتنا بھی کام نہیں کرتا اور؟؟ لیتا ہے سب سے زیادہ۔اسے کہتے ہیں(**یاکلون اموال الناس بالباطل**) کے معنی ہوتا ہے کوئی تعمیری کام دوسرے کا کیے بغیر دوسرے کا مال کھا جانا۔اور پھر یہ کہ اس طرح سے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں فریب کار' گرہ کٹ نوکر باز قانون کی نگاہوں میں مجرم معاشرے کی نگاہوں کے اندر ذلیل۔اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سب سے بڑے گرہ کٹ اور نوسر باز سب سے زیادہ معزز معاشرے کے اندر۔ یہ عجیب قسم کی ایک تکنیک ہے۔قرآن نے ایک لفظ کہہ کے(**متاع فی الدنیا**) (10:70) اور پورے کا پورا نقاب چہرے سے الٹ کے رکھ دیا کہ یہ سارا راز یہ ہے اس کا۔ یہ ایک وقت کی روٹی کمانے کے قابل نہیں ہوتے کوئی فن کوئی ڈھنگ جانتے ہی نہیں ہیں۔اور کیفیت یہ ہے کہ بالباطل کھاتے ہیں لوگ آ کے دیتے ہیں منتیں کرتے ہیں پاؤں پڑتے ہیں گھٹنے چومتے ہیں۔اور دنیا میں باہر کی سوسائٹی میں معزز ترین القابات ان کے لیے مختص ہوتے ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کتنی کامیابی کی یہ چیز ہے۔کہا کہ یہ ٹھیک ہے لیکن یہ کاروبار ہمیشہ کے لیے نہیں چل سکتا۔(**ثم الینا مرجعھم ثم نذیقھم العذاب الشدید بما کانوا یکفرون**) (10:70) اس کے بعد آہستہ آہستہ پھر یہ قوانینِ خداوندی کی طرف آنا پڑتا ہے ان چیزوں کو اور جب یہ یہاں آتی ہیں اور اسکے بعد پھر دیکھئے کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کا دوسرا ورق ہے مذہبی پیشوائیت کی تاریخ کا کہ جب ان کے خلاف کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ یورپ جکڑا ہوا تھا Preast Hood کے اندر۔ یہ کیتھولک جن کو کہتے ہیں عیسائیت کی۔اس کے بعد لوتھر کی ایک تحریک اٹھی اور وہ تحریک ہی یہ تھی کہ صاحب یہ چرچ یہ ہے کیا اس کی حیثیت کیا ہے اس کا اختیار کیا ہے اس کی اتھارٹی کیا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے طور پر بائبل سمجھ سکتا ہے انہیں درمیان سے الگ کرو۔ان کی اتھارٹی کی کیفیت یہ تھی کہ بادشاہ چرچ کے مقروض ہوتے تھے۔اور جو کسی کا مقروض ہو پھر آپ جانتے ہیں کہ اس کی اپنی ذات کیا باقی رہتی ہے اور اپنی اتھارٹی کیا باقی رہتی ہے۔ یہ تھی کیفیت جب یہ لوتھر کی وہاں تحریک آئی۔لیکن اس کے بعد خود اس لوتھر کی تحریک کے اندر پھر یہ مذہبی پیشوائیت پیدا ہوگئی یعنی پروٹیسنٹ کے ہاں پھر یہ پادری پیدا ہوئے۔اب اس کے بعد یورپ میں یہ تحریک جب اٹھی ہے نئے دور کی' اُس نے تو پھر مذہب کو دوسرے مذہب میں بدلنا چاہا تھا' تنگ آنے کے بعد انسانیت اس لبادے کو اٹھا کے پھینک دیتی ہے'نہ رہے بانس نہ بجے بانسری'۔ یہ یورپ میں جو آپ تحریک

Materialism کی دیکھ رہے ہیں مادہ پرستی کی دہریت کی خدا سے انکار کی یہ ردِعمل ہے اس پیشوائیت کا۔اور جب اس کا ردِعمل ہوتا ہے کسی جگہ تو سب سے جگہ قابلِ نفرت یہ گروہ ہوتا ہے۔یورپ میں یہ چیز اٹھی تو ٹھیک ہے وہ مذہب یا خدا اور رسول کے نام تو ان کے ہاں انہوں نے الگ کیے لیکن یہ آکاس بیل انہوں نے اتار کے پھینک دی اپنے شجرِ ملت سے۔یہ پنپنے نہیں دیتی قوموں کو۔دنیا میں جہاں جہاں آپ دیکھیں گے Preast Hood کا غلبہ وہ قوم کبھی سر ابھار ہی نہیں سکتی۔یہ درخت کی ساری نمی یہ چوس لیتی ہے وہ خشک ہوتا جاتا ہے یہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔یورپ کو یہ اتارنا پڑا۔آپ کو معلوم ہے کہ یورپ کی دہریت اور لادینی کے خلاف یہاں ہمارے ہاں سے یا ان مذہب پرستوں کے ملکوں سے سب سے بڑی آواز مذہبی پیشوائیت کی اٹھتی ہے ان کی لادینی کے خلاف۔ان کے دل میں کیا درد ہے یا صاحب' وہاں کی لادینی ہوتی یا وہاں کی عیسائیت ہوتی۔عیسائیت کو خود یہ باطل کہتے ہیں' یہ اس عیسائیت کے خلاف جو لادینی بقول ان کے پھیلی ہے یہ اس کے خلاف اس قدر کیوں جدوجہد کرتے ہیں اور نفرت پھیلاتے ہیں۔

بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

یہ ان کو کچھ اس سے محبت نہیں تھی کہ وہاں کا مذہب یا عیسائیت مٹا کے لادینی کیوں آ گئی اور لادینی سے نفرت ہوگئی۔بات ساری یہ تھی کہ مذہبی پیشوائیت کے خلاف کیوں تحریک اٹھی۔اور یہاں بھی جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام چھوڑ دیا اور سرکش ہو گئے یہ نوجوان۔یہ ردِعمل ہے اسی Preast Hood کا یہاں بھی۔لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس کے خلاف یہ جتنی آوازیں اٹھا رہے ہیں وہ اسلام کے خلاف کچھ ان کے دل میں درد نہیں ہے مذہبی پیشوائیت کے مٹنے کا درد ہے۔لیکن کہیں گے یہی (**هٰذا من عند الله**) اسلام نہیں رہے گا اس سے خدا اور رسول کا نام باقی نہیں رہے گا۔یہ نہیں کہیں گے کہ اس سے ہم ہی نہیں باقی رہیں گے۔کہا کہ یہ چیز جو ہے آپ دیکھیں گے کہ جب بھی علم کی بارگاہ آئی جب بھی انسانوں نے سوچنا شروع کیا تو یہ ان کے خلاف اٹھیں گے۔اور پھر یہ جن چیزوں پر اس طرح سے تکذیب کرتے چلے جاتے ہیں خدا کے قوانین کی صداقتوں کی اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کس کس قسم کے ذلت آمیز عذاب میں پھر یہ لوگ گرفتار ہونگے۔پہلا ذلت آمیز تو یہ عزیزانِ من! کوئی محنت کرنے والا کوئی کسب جاننے والا کچھ بھی یہ ہو مندا بھی اسے پڑ جائے کچھ نہ کچھ تو کما کھائے گا۔آپ سوچئے سہی کہ مذہبی پیشوائیت کہ جن کا پیشہ ہوا گر یہ پیشہ ان سے چھن جائے ایک وقت کی روٹی نہیں کما سکتے۔یہ تو اس سیاست میں آنے کے بعد یہ دھاندلیاں یہاں یہ پیدا ہو رہی ہیں ورنہ اس سے پیشتر بھی یہ صورت تھی گاؤں میں ہمارے ہاں گاؤں کا ملا مردم شماری کے رجسٹر میں جو خانہ کمینوں کا ہوتا تھا نا یہ اس میں لکھا جاتا تھا۔کمی جسے کہتے ہیں یہ اصل میں کمین ہوتے تھے وہاں کے۔قرآن نے کہا ہے کہ جب بھی اس کے خلاف یہ ردِعمل اٹھے گا تو آپ دیکھیں گے کہ یہ سب سے زیادہ یہ ذلیل ہو جائیں گے۔اس لیے کہ کوئی ان کو ایک وقت کی روٹی کمانے کا ڈھنگ ہی نہیں آئے گا۔یہ شدید ترین عذاب ہے دنیا کے اندر جو کسی قوم کو ملتا ہے۔اور یہ کہنے کے بعد پھر قرآن اپنے انداز کے مطابق آیا تاریخی شہادتوں کی طرف۔اور میں نے جیسا کہ

اپنے اس خصوصی عید کے پیغام والے خطبے میں میں نے کہا تھا کہ کشمکش پہلے دن سے یہی چلی آئی۔ یہ جو چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی کشمکش وہ کہہ رہا ہے یہ ہے ہی مذہبی پیشوائیت کی کشمکش۔ اور اسی سے قرآن پھر انبیائے کرام کی داستانیں اور اقوامِ سابقہ کے قصے ہمارے سامنے لاتا ہے۔ یہی بتانے کے لیے کہ وہ آ کر ایک خدا کے قوانین کی دعوت دیتے ہیں اور یہی گروہ تھا جو سب سے پہلے ان کی مخالفت کرتا تھا۔ اور یہاں سے قرآن نے شروع کر دیا پہلے سے ہی ان تاریخی شہادات کی ابتداء حضرتِ نوحؑ سے وہ کرتا ہے قصہ کی ابتداء۔

(**واتل علیھم نبا نوح**) (10:71) اب ان کے سامنے تم پیش کرو داستان قومِ نوحؑ کی۔ میں یہ عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم میں یہ جن انبیائے کرامؑ کے نام آئے ہیں اور جن اقوام کی سرگذشتوں کو بتایا گیا ہے یہ وہی تھے جو سامی النسل تھے عرب اور اس کے گرد و پیش کے علاقے میں جو آئے تھے۔ ورنہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے ہادی بھیجا ہر قریہ میں ہم نے رسول بھیجا ساری دنیا میں یہ کچھ کیا۔ تو چونکہ اولیں مخاطب قرآن کی یہی عرب قوم تھی اس لیے یہ قصص یہ داستانیں اسی صورت میں مؤثر ہو سکتی تھیں کہ یہ جانتے ہیں ان لوگوں کو جانتے ہیں ان اقوام کو کہ جن کے متعلق یہ کچھ کہا جاتا تھا۔ ورنہ اگر قرآن پہلے وہاں کہتا کہ تمہیں پتہ نہیں کنفیوژس کی قوم کے ساتھ کیا ہوا' تو وہ تو دیکھتے رہ جاتے کہ سرکار یہ نام کس کا لیا جا رہا ہے ہمارے تو باپ دادا نے بھی کبھی نہیں سنا یہ۔ تو پہلے تو یہی بتانا پڑتا۔ اور پھر یہ چیز مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ہمارے سامنے کسی کا کوئی انجام عبرت ناک ہوا ہو تو اس کی بات آپ کے سامنے کی جائے تو آپ دیکھتے ہیں کیسے دلنشین ہوتی ہے۔ اور غائبانہ جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں کچھ باتیں کی جائیں تو وہ افسانہ نظر آتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اپنے ہاں نام صرف ان انبیاءؑ کا لیا اور داستانیں انہی اقوام کی بیان کی جن سے عرب معروف تھے جو عربوں کے ہاں معروف تھے جنہیں وہ جانتے تھے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تم دن رات ان کی ویران بستیوں کے کھنڈرات پہ سے گذرتے ہو دیکھتے نہیں کہ کس طرح سے وہ اپنی اجڑی ہوئی ثروتوں کی داستانیں بتا رہے ہیں۔ تو گویا یہ ان کی باتیں کہہ رہے تھے کہ جن کے کھنڈرات سے یہ گذرتے تھے جن کی کہانیاں ان کے ہاں پہلے ہی چلی ہوئی تھیں جنہیں یہ جانتے تھے جن سے یہ واقف تھے۔ اور یہی ہیں وہ انبیاء جنہیں انبیائے بنی اسرائیل کہا جاتا ہے Samatic Race سامی النسل انبیاء اور اقوام۔ تو وہیں سے بات قرآن شروع کرتا ہے کہ قومِ نوحؑ کا ذکر ان کے سامنے کرو۔ کہا (**اذ قال لقومہ یقوم**) (10:71) میں عرض کر دوں کہ قرآن یہ ساری داستانیں یوں نہیں کرتا کسی ایک مقام پہ انہوں نے قصۂ نوحؑ لیا اور قومِ نوحؑ اور مسلسل اس کی پوری داستان ایک جگہ دہرا دی پھر کسی دوسری قوم کا قصہ لیا پھر اس کی دہرا دی۔ یہ نہیں اس کا انداز کیونکہ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ وہ تو جو ایک نقطہ لاتا ہے بنیادی اس نقطے کی تائید میں ایک شہادت پیش کرتا ہے اور جس قوم کی سرگذشت پیش کرتا ہے اس میں سے نمایاں طور پہ وہ واقعہ سامنے لاتا ہے جس کا تعلق اس نقطے سے ہے جو اس وقت زیرِ بحث ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ مختلف جگہ ان اقوام کے ان انبیاء کے تذکرے آتے ہیں۔ کسی جگہ ایک ٹکڑا ہوتا ہے کسی جگہ دوسرا ٹکڑا ہوتا ہے۔ وہ ملا کے نزدیک تو بے ربط ہے اسے کیا بتایا جائے کہ یہاں ربط کی تو کیفیت یہ ہے کہ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں۔ لیکن

'محرم تو نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا' اسے ربط نظر کب آتا ہے وہ تو قصہ گو ہیں وہ تو سامری ہیں سارے۔ اور قصے میں تو تسلسل ہونا چاہیے نا جہاں بات درمیان میں ٹوٹ رہی ہو وہاں اپنی طرف سے کچھ لگا دیا جائے۔ تو ان کے ہاں تو ربط اس کے معنی ہوتے ہیں۔ ربطِ معنوی کو تو یہ جانتے ہی نہیں ہوتا کیا ہے۔ معنی تو ان کے ناریل میں سما ہی نہیں سکتے۔ بے ربطی نہیں ہوتی' قرآن نے جس مقام پہ Stress دینا ہوتا ہے جس پوائنٹ کے اوپر ان داستانوں میں وہ ٹکڑا اس کے متعلق ہوتا ہے اسے وہ ابھار کے وہاں لاتا ہے۔ تو جب بھی مختلف مقامات پر ان اقوام کی سرگذشتیں آپ کے سامنے آئیں تو وہاں دیکھئے کہ بات وہ کیا کرتا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ حضرتِ نوحؑ نے کیا کہا' انہوں نے کس طرح مخالفت کی۔ بات یہاں سے شروع کرتا ہے کہ (**اذ قال لقومه يقوم ان كان كبر عليكم مقامي و تذكيري بايٰت الله فعلى الله توكلت**) (10:71) اگر میرا یہاں ٹھہرنا' میں جو کچھ تمہیں کہتا ہوں تمہاری غلط روش کے تباہ کن نتائج سے جو تمہیں آگاہ کرتا ہوں میری یہ تبشیر و تنذیر اگر اتنی سی گراں تم پہ گذرتی ہے تو گذرا کرے۔ تمہاری جمیعت خاطر کے لیے میں اپنے اس مشن کو تو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے تو یہ کہنا ہے کہے جاؤں گا۔ باقی رہا یہ کہ تم جو دھمکیاں دیتے ہو کہ ہم اس طرح مخالفت کریں گے اور یوں تباہ کر دیں گے اور تمہاری قوم کے ساتھ تمہارے ساتھیوں کے ساتھ یہ کریں گے۔ میرا بھروسہ خدا کے قوانین کے اوپر ہے تمہاری دھمکیاں اس کا جواب یہ ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! جو حق اور صداقت کا پیغام لے کر اٹھتا ہے وہ کسی سے Compromise نہیں کرتا۔ مفاہمت اور مصالحت یہ تو مفاد پرستیوں کے لیے ہوتی ہے' حق کی آواز اٹھانے والا مفاہمت کیا جانتا ہے مصالحت کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بات جو کی جاتی ہے وہ ایک حکمت کے ماتحت کرنی چاہیے ''جنوں کیندے نیں ڈانگ نیئں مار دینی چاہیدی''۔ لیکن یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سے کچھ مفاہمت یا Compromise یا مصالحت کی جاتی ہے' قطعاً نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ناگوار گذرتا ہے گذرا کرے۔ (**فاجمعوا امركم و شركآء كم**) (10:71) تم اور تمہارے ساتھی جتنے بھی ہمنوا ہیں اس معاملے میں' سب اکٹھے ہو جاؤ مل کے جو میں آتا ہے کرلو۔ (**ثم لا يكن امركم عليكم غمةً**) (10:71) اور دیکھو ڈھونڈ ڈھونڈ کے میرے خلاف تدبیریں اور سکیمیں اور حربے اور نشتر جمع کرلو' رہ نہ جائے کوئی بات کچھ حسرتیں رہ جائیں تمہارے جی میں کہ یہ کچھ نہ ہم نے کر کے دیکھ لیا۔ کیا بات ہے صاحب کہنے والے کی۔ للکار ہوئی نا ایک شخص کی۔ تم بھی آ جاؤ تمہارے ساتھی بھی آ جائیں جتنی تدبیریں تمہارے ذہن میں آتی ہیں ساری اکٹھی کرلو کوئی رہ نہ جائے اوجھل نہ ہو جائے تمہاری نگاہوں سے کہ بعد میں یہ کہو کہ یہ نہ ہم نے کیا۔ (**ثم اقضوا الى**) (10:71) پھر کر گذرو جو تم نے کر گذرنا ہے۔ (**ولا تنظرون**) (10:71) ہمیں مہلت بھی نہ دو۔ کتنا بڑا ایقینِ محکم ہوتا ہے اپنے بات کی سچائی پر اور اس کی آخرالامر کامیابی پر۔ ہر چیز کہدی۔ (**فاجمعوا امركم**) (10:71) مستحکم کرلو اپنی سکیم کو (**شركآء كم**) (10:71) ساتھیوں کو بلالو (**ثم لا يكن امركم عليكم غمة**) (10:71) کوئی تدبیر کوئی سکیم میرے خلاف تمہاری نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ اور اس کے بعد (**ثم اقضوا الى**) (10:71) ہمارے خلاف جو کچھ کرنا ہے کرو (**ولا تنظرون**)

(10:71) مہلت بھی نہ دو اس میں۔ کہا کہ یہ سب کچھ کر کے دیکھ لو۔ (**فان تولیتم**) (10:72) اور اگر اس کے بعد تم دیکھ لو کہ تم واقعی غلطی پر تھے اور اپنی اس روش سے باز آ جاؤ تو یہ نہ سمجھو۔ یہ دیکھئے جو پوائنٹ میں کہہ رہا تھا کہ Stress کرتا ہے قرآن۔ بات کہی تھی (**متاع فی الدنیا**) کہ یہ مذہبی پیشوائیت کا مدار دنیا کی مفاد پرستی ہوتی ہے یہاں کا کچھ فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے کمائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ چیز کہ تم اگر اس روش سے باز آ جاؤ تو اس کے بعد پھر تمہارے ہاں تو یہ ہوگا نا کہ تمہارے ہاں کا ایک مناظر ایک مولوی ایک پیشواء ایک مقتداء وہ سب کچھ مناظرے کرتا ہے مباحثے کرتا ہے جنگ و جدل کرتا ہے کچھ قوم ٹوٹ کے ادھر آ جاتی ہے تو وہ اس کے لیے مزید آمدنی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ کہا کہ اگر تم اپنی روش سے باز آ جاؤ تو ایک بات تمہیں میں بتاتا ہوں اور وہ یہ کہ (**فما سالتکم من اجر**) (10:72) میں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ یہ ہے توڑ اس کا۔ تجربہ تمہیں یہی ہے اس سے پیشتر کہ سارے جتنے مباحثے مناظرے کرنے والے ہیں وہ جب کسی جگہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور فریقِ مخالف کے کچھ لوگ آ کے ادھر مل بھی جاتے ہیں تو اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ جو چندا اُدھر دیتے تھے وہ اِدھر دو۔ بنیاد تھی نا (**متاع فی الدنیا**) کی۔ آپ دیکھتے ہیں ربط کہاں ہے یہ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نہ تو وہ جو دعوت تھی ان کی اس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے نہ ان کی مخالفت کے حربوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ میں ایک بات تم سے کہتا ہوں تم اس کی مخالفت کرتے ہو مصالحت اور مفاہمت کا سوال نہیں ہے جو جی میں آئے کرے دیکھ لو۔ اور اس کے بعد اگر تم ناکام رہ جاؤ تو اس روش کو چھوڑ دو اور یہ کہہ دو کہ ہاں میں ٹھیک کہتا تھا تو اس کے بعد پھر یہ صورت نہیں ہوگی کہ میں تم سے کچھ مانگوں گا۔ اور یہی فرق ہے۔ آپ دیکھیں گے قرآنِ کریم میں جتنے انبیائے کرامؑ کا ذکر آتا ہے بات پہلی یہ ہوتی ہے کہ (**یٰقوم اعبدوا اللہ**) پہلی چیز تو یہ کہ قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ تو ایک چیز تو یہ کہ میں اپنا کچھ تم سے منوانا نہیں ہوں۔ اور اس کے ساتھ آپ دیکھیں گے اسی سانس میں یہ کہا ہوا ہے ہر جگہ (**ما سالتکم من اجر**) اور میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ وہ پیشوائیت کی جو بنیاد ہے جڑ ہے یہاں کٹ جاتی ہے۔ یہ ہے دین جو خدا کے نام پہ تمہیں دعوت دیتا ہے اور اس کو ذریعہ معاش نہیں بناتا۔ ورنہ کبھی سوچو تو سہی کہ یہ اتنی بڑی چیز نبی آ کے کہتا ہے قرآن اس کو دہراتا ہے ایک پہلا ٹکڑا تو اتنا عظیم کہ (**اعبدوا اللہ**) صرف خدا کے قوانین کی اطاعت کرو کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو؛ ساتھ یہ کہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ ٹھیک ہے ملا کو تو بے تکی بات نظر آئے گی اس لیے کہ وہ تو پہلی بات جو ہے وہ کہتا ہے اس لیے ہے کہ دوسرے کے لیے کہے کہ میں تم سے تو یہ مانگتا ہوں۔ ہر مداری کی طرح: روپے کے دو؛ دو کے چار بناتا چلا جاتا ہے چھنن چھنن اور اس کے بعد جھولی دیتا ہے کہ دے جا بابا چنگڑی کی جھونپڑی میں آگ لگی ہے۔ یہ چیز جو ہے دین اور مذہب میں یہ بنیادی فرق ہے۔ (**متاع فی الدنیا**) وہاں یہ ہے جذبۂ محرکہ۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ اگر پھر تم اپنی غلط روش سے باز آ جاؤ تو اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ (**ما سالتکم من اجر**) میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ آہاہاہا۔ دین کی بات وہی کر سکتا ہے عزیزانِ من! جو اسے پیشہ نہ بنائے اُس سے کہے کہ (**ما سالتکم من اجر**)۔ قرآن ہے عزیزانِ من! بغیر کسی قسم کے معاوضے بغیر کسی اجر کے تو جذبۂ محرکہ ہی نہیں ہوتا کام

کرنے کا۔کسی کام کے لیے بھی میں اٹھوں اس میں مجھے کچھ حاصل ہوتا ہوگا تو میں اٹھوں گا ورنہ اٹھ ہی نہیں سکتا آدمی' کوئی کام نہیں کرسکتا اگر اس کے لیے یہ نہ سمجھے کہ میرا یہ فائدہ ہے مجھے یہ ملے گا۔میٹریل ہی نہ ملے سہی ذہنی طور پہ ملے جذباتی طور پہ ملے۔اجر کے بغیر تو انسان اٹھتا ہی نہیں بات ہی نہیں کرتا۔یہ ایک بنیادی چیز ہے انسان کی سائیکولوجی ہے اس کے اندر۔فرق دیکھئے۔(**ما سالتکم من اجر**) میں تم سے نہیں کوئی اجر مانگتا۔اور یہ نہ سمجھو کہ جذبۂ محرکہ اگر نہیں ہے(**ان اجری الا علی اللہ**) (10:72) یہ ہے قرآن عزیزانِ من!۔دلِ بے مدعا کا ہمارے ہاں بڑا کارنامہ' اگر دلِ مدعا پاتے تو صاحب وہ خدا ہوتے۔سانس نہیں لے سکتا انسان بے مدعا عزیزانِ من! جینے کی آرزو ہوتی ہے سانس لیتا ہے۔ایک قدم نہیں اٹھا سکتا ایک خیال ذہن میں نہیں آ سکتا کہ اگر انسان کے ذہن میں مدعا اور آرزو اور اس کے لیے ایک اجر جسے قرآن کہتا ہے یہ نہ ہو۔ہو نہیں سکتا' سائیکولوجیکل Impossibility ہے نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے کہ انسان کام کرنے کے لیے قدم اٹھائے اور کوئی ذہن کے اندر مقصد اس کا اور اجر نہ ہو۔ہو ہی نہیں سکتا۔یہ تصوف کی بھول بھلیاں نہیں ہیں جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ دلِ مدعا کارنامہ ہے۔یہ اس قسم کی چیزیں تو آپ کے ہاں بدھ مت نے دیں ویدانت نے دیں فریب تھا جو کچھ دیا۔پوچھو تو سہی وہ دلِ بے مدعا پا رہے ہیں؟۔یہ جو چیز تھی کہ ترکِ آرزو اور ترکِ مقاصد ترکِ مدعا یہ ہے اصلِ دین جوان لوگوں نے کہا ہے۔فریب تھا یا خود کھایا ہے یا دنیا کو فریب دیا ہے۔کوئی بات بے مدعا انسان سے نہیں ہوسکتی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مدعا اور آرزو کو اپنے دل سے نکال دے۔ترک کر ہی نہیں سکتا۔بڑا عمدہ اعتراض ہے جو اس کے اوپر کہا گیا۔کہا گیا کہ ترکِ آرزو' یہ ہے ہمارا مقصد۔کہا کہ سرکار یہ ترکِ آرزو جو ہے یہ خود آرزو نہیں ہے؟ یہ تو خود آرزو ہے کیا ترک کریں گے آپ۔قرآن یہ نہیں کہتا۔رسول جیسی شخصیت یہ کہہ رہی ہے' دیکھا انکار ہے تو اتنا بڑا(**فما سالتکم من اجر**) (10:72) تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔لیکن یہ نہیں ہے کہ یہ دلِ بے مدعا ہے یہ بغیر اجر کے یہ چیز ہو رہی ہے۔ہو ہی نہیں سکتا۔تو سوال یہ ہے کہ پھر کس سے اجر مانگتا ہوں؟ (**ان اجری الا علی اللہ**) (10:72) تو یہ اجر جو ہے یہ اتنا جو تم سے میں نے کہہ دیا ہے یہ وعظ کر دیا ہے یہ بات پہنچا دی ہے اس کا اجر مجھے مل جائے گا؟ یہ صرف بات پہنچانے کا اجر نہیں مل سکتا۔کہا وہ اجر اس بات کا ہے(**و امرت ان اکون من المسلمین**) (10:72) حکم مجھے دیا گیا ہے کہ تو اس جماعت کے اندر شامل ہو جو ہمارے احکام کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔اور اس کا اجر ہے جو مجھے ملے گا۔تم میں سے نہیں کیا کہا(**اعبدوا اللہ**) خدا کی محکومیت اختیار کرو یہ تو میں نے تم سے کہا۔تم سے اس کا کوئی اجر نہیں مانگتا اگر تم اِدھر آ بھی جاؤ۔اجر ہے خدا سے۔کیا اتنی سی بات کہنے کا اجر مل جائے گا وہاں سے؟ صرف کہنے کا اجر تو نہیں ملے گا۔اس نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ اجر لینا چاہتے ہو اور پھر یہ دیکھئے کہ کوئی نبی بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ مجھے کہا ہے کہ تم مسلم ہو جاؤ۔یہ بھی بڑا عجیب بنیادی فرق ہے عزیزانِ من! یہ انفرادی چیز ہوگی اگر وہ کہا جائے کہ بھی تم اپنے طور پہ اطاعت کر لیا کرو۔مذہب میں ہر شخص انفرادی طور پر اطاعت کرتا ہے جو بھی وہ کرتا ہے بھگتی اور پرستش اور بندگی اور عبادت سب انفرادی طور پر کرتا ہے۔دین انفرادیت نہیں دین ایک جماعت تیار کرتا ہے ان لوگوں کی کہ جو اس

طرح خدا کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی طرف دعوت دینے والا یہ کہتا ہے (ان اکون من المسلمین) (10:72) مجھ سے کہا گیا ہے کہ تو بھی اس جماعت کے اندر ایک فرد شامل ہو جا۔ پہلے دن جو یہ شخص اس کی دعوت دے رہا ہے نبی اکرم ﷺ اول پہلے ہیں وہ۔ وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ میں مسلم ہو رہا ہوں وہ کہتے ہیں (انا اول المسلمین) یہ نہیں ہے کہ میں الگ انفرادی طور پہ ایک مسلم ہو جاؤنگا میں نے یہ اطاعت اختیار کی تو بھئی میرا کام تو یہ ہو گیا۔ بس ٹھیک ہے میں نے بات بھی تم تک پہنچا دی۔ بالکل نہیں! یہ ایک جماعت بناتا ہے اور الگ بات ہے کہ اس جماعت کا First Crystal جو ہے خود بنتا ہے پہلا شخص (انا اول المسلمین) ۔ ہر نبی سے کہا گیا کہ (و امرت ان اکون من المسلمین) (10:72)۔ اور اگر یہ ایک فرد اس جماعت کا ایک فرد نہیں ہے نہ یہ اسلام رکھتا ہے نہ یہ مسلم کہلا سکتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں او ربیرونِ دریا کچھ نہیں

وہ تو دریا کے باہر کی ریت ہی اس کو جذب کر لیتی ہے کھا جاتی ہے۔ (ان اکون من المسلمین) (10:72) پہلی چیز وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ یہ جو مسلم ہمارے سامنے جھکنے والی جماعت ہے اس کا ایک فرد بن جاؤ مجھے یہ کہا گیا ہے۔ اگرچہ جماعت کی خود تخلیق و تشکیل و تعمیر اسی نے کرنی تھی۔ لیکن اپنا منتہا بتا دیا کہ یہ نہیں ہے کہ میں نے تم کہہ دیا تو بات ختم ہوئی خود میں نے اطاعت اس کی کر لی تو بس ٹھیک ہو گیا۔ نہ! (ان اکون من المسلمین) (10:72) یہاں ابتداء ہے اول المسلمین' انتہا یہ ہے (فادخلی عباد و ادخلی جنتی) میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو جا اور یوں جنت میں آ جا۔ انفرادی طور پہ تو جنت نہیں مل سکتی عزیزانِ من! ۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ سارا معاشرہ جہنم میں ہو اور فرد جنت کے اندر ہو۔ جہنم کا کوئی فرد بھی جنت کے اندر نہیں ہوتا عزیزانِ من! جیسے جنت کا کوئی فرد جہنم میں نہیں ہوتا۔ دین تو عجیب مقام ہے یہ انفرادی چیز نہیں ہے یہ نظام کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا جماعت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ رسول بھی انا اول المسلمین کہتا ہے۔ اس نے یہ چیز کہی (فکذبوہ) (10:73) اُنہوں نے اسے جھٹلایا۔ یہ جھٹلایا کیا چیز ہے؟ یہ چیز کہ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش کا یہ نتیجہ ہو گا غلط ہے یہ نہیں ہو گا' تم جو کہتے ہو بچے گا وہ جو اس طریق سے چلے گا جو میں کہہ رہا ہوں غلط ہے یہ۔ (فکذبوہ فنجینٰہ و من معہ فی الفلک) (10:73) درمیان کی کڑیاں یہاں دہرائی نہیں قرآن نے۔ اس سے پہلے ہی سورۃ اعراف کے اندر یہ پوری تفصیل دے دی ہوئی ہے ہر بار نہیں دہراتا وہ ان چیزوں کو جسے کہتے ہیں جی قرآن میں تکرار بہت ہے۔ تکرار تو کسی ایک جگہ بھی نہیں ہے اس کے اندر۔ کہا انہوں نے یہ تھا (فکذبوہ) کہا یہ تھا کہ تم جو کہتے ہو کہ ہمارا انجام یہ ہو گا جھوٹ بولتے ہو۔ کہا تاریخ سے پوچھو کہ اس کے بعد جھوٹ کس نے بولا تھا۔ اب وہ تاریخ سے پوچھتا ہے۔ غرق ہو گئے۔ میں ہر مقام پہ تفصیل میں نہیں جاؤنگا کہ قرآن نے یہ کیسے کہا ہے اور کس طرح سے وہ یہ کچھ ہو گئے۔ بات اتنی سی اس نے کہی ہے (و جعلنٰھم خلٰٓئف) (10:73) اور ان لوگوں کو ان کا جانشین بنا دیا۔ یہ ہے جو صرف یہاں سے نجات ہی نہیں ہے

کہ ان کو بچالیا اور وہاں سے الگ ہٹالیا بلکہ اس کے بعد یہ انبیائے کرامؑ کی جو جماعت ہوتی ہے یہ اس کے بعد وہیں غالب آتی ہے اس کے بعد یہ دین کو قائم کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اتنے ٹکڑے کہیں نہ دیے گئے ہوں لیکن ہوتا یہ ہے کہ وہ غالب آ کے رہتی ہے۔(**و جعلنٰھم خلٰئف و اغرقنا الذین کذبوا بایٰتنا**) (10:73) جنہوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی جھٹلایا تھا کہا تھا کہ نہیں یہ ایسے نتائج نہیں پیدا کر سکتے جیسے تم کہتے ہو۔ یہ ہے نا تکذیب جو قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے انجام دیکھ لیا ایسا کہنے کا۔ یہ جھٹلانا یہ نہیں ہے کہ وہ زبان سے یہ کہیں کہہ دیتے ہیں۔ اسے تو ہم اپنی حالت سے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے(**انہ لا یفلح الظٰلمون**) یاد رکھو ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ یہ ایک اس نے اصول دیا ہے یہ اس نے قانون بیان کیا ہے۔ روز دہرایا جارہا ہے معاشرے کے اندر۔ ہمارے معاشرے میں بھی دہرایا جارہا ہے۔ نہیں پنپ سکتا نہیں کامیابی ہوسکتی۔ کبھی کسی نے بھی ہمارے ہاں اس چیز کو سچ مانا ہے کہ واقعی یہ بات ٹھیک کہتا ہے ہم کامیاب نہیں ہونگے ظلم کی بناء پہ زیادتی کی بناء پر بددیانتی کی بناء پر۔ جو کچھ معاشرے میں یہ ہورہا ہے وہ ظلم اسی فرعونیت کی تعدی کا نام ہی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا کہ عربوں کے ہاں عربی زبان کے اندر ظلم کے معنی ہیں کہ جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔ بڑا ہی جامع لفظ ہے یہ۔ یہ اس کی تو ایک شق ہے کہ جس کا حق ہے وہ حقدار کو نہ ملے ہم اسی کو ظلم کہتے ہیں۔ بات ساری یہ ہے جس کو جس مقام پہ ہونا چاہیے وہ اس مقام پہ نہ ہو۔ کہا جس معاشرے میں یہ کیفیت ہوگی وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کون ہے جو قرآن کی اس آیت سے ناواقف ہے یہاں ہمارے ہاں' کون اسے نہیں جانتا؟ اور کون یہ پھر اس کے بعد عملاً کہتا ہے کہ یہ سچ کہہ رہا ہے قرآن واقعی نہیں کامیاب ہوسکیں گے ہم۔ لگے ہوئے ہیں اپنی اپنی روش کے اوپر کہ کامیابی اسی سے ہونی ہے۔ اسے کہتے ہیں تکذیبِ دین۔ ایک تو وہ ہیں نا کہ جو سرے سے اس کو مانتے ہی نہیں ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ نہیں یہ جتنے اصول یہ دیے ہوئے ہیں یہ ہیں ہی نہیں اصول' وعظ ہے نصیحت ہے' کفر ہوگیا۔ تکذیب یہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں یہ مانتے ہیں کہ خدا نے یہ کہا ہے اس کے باوجود عملاً اس کے خلاف کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جھٹلاتے ہیں اس چیز کو جس کا زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ یہ ہے جو شروع میں قرآن نے کہا پہلے پارے میں(**من یقول اٰمنا باللہ و بالیوم الاخر وماھم بمؤمنین**) جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پہ اور آخرت پہ(**وما ھم بمؤمنین**) پھر یہ کیا بات آگے اس نے یہ کہدی کہ اس کے باوجود کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ یہ جو ہیں نا یقولنا والے کہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں اس کو یہ ٹھیک ہے اور اس کے لیے بڑی کوشش بھی ہم کرتے ہیں خدمتِ دین بھی ہورہی ہے یہ سب کچھ(**وما ھم بمؤمنین**) ۔ یہ مومن ہوتا اس وقت ہے جب وہ کہتا ہے اس کو کر کے دکھاتا ہے' اگر وہ کہتا ہے کر کے نہیں دکھاتا تو تکذیبِ دین کرتا ہے۔(**ارءیت الذی یکذب بالدین**) (107:1) اس کو بھی تم نے دیکھا ہے جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ وہ کون ہے؟ (**یدع الیتیم . ولا یحض علٰی طعام المسکین**) (107:2-3) یہ وہ ہے کہ معاشرے میں جو تنہا رہ جاتے ہیں ان کو دھکے دیتا ہے' جن کی چلتے ہوئے کاروبار کی گاڑی رک جاتی ہے کسی طرح سے ان کی مدد کبھی نہیں کرتا۔(**فویل للمصلین .**

الذین ھم عن صلاتھم) (107:4-5) دیکھا آپ نے یہ دین والی بات' دین ہی نہیں یہ تو نمازیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں تو معاشرے میں بیشتر وہ بھی ہیں نا کہ نماز روزے کے قائل نہیں ہیں' وہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ نمازی ہیں۔ دیکھا تم نے ان نمازیوں کو' نماز کی حقیقت سے بیگانہ ہیں۔(یرآءون) (107:6) بس نماز اتنی ہی جتنی لوگ دیکھ سکیں۔ اور اس کے بعد تکذیب پھر کیا ہوئی(یمنعون الماعون) (107:7) رزق کے وہ سرچشمے جن کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے ان کو بند لگا کے روک دیتے ہیں۔(ارءیت الذی یکذب بالدین) (107:1) یہ تکذیب اور کفر میں فرق کرنا بڑا ضروری ہے قرآن کی رو سے آپ دیکھیں گے۔ تکذیب ہے یہ کہ اقرار کرتے جانا ایک چیز کا کہ ہاں ہم مانتے ہیں عملاً اس کو جھٹلاتے چلے جانا۔ تباہ ہو گئے وہ۔ اور یہ دوسری جماعت(جعلنٰھم خلٰئف) (10:73) ان کا جانشین بنایا۔ یاد رکھئے کہ یہ صرف جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ ان کے ہاں سے نجات مل گئی اور وہاں سے نکال کے ان کو لے گئے اور یہ چیز بچ گئے۔ یہی مقصد نہیں ہے یہ تو ایک Negative Aspect ہوتا ہے کسی چیز سے بچ جانا۔ قرآن تو فوز العظیم کہتا ہے Acheivement کہتا ہے۔ Acheivement کیا تھی؟ (جعلنٰھم خلٰئف) (10:73) ان کا جانشین بنا دیا ہم نے ان کو۔(فانظر کیف کان عاقبة المنذرین) (10:73) یہ فانظر جو کہا ہے اس قوم کو' تو وہ تو اسی صورت میں تھا نا کہ پہلے وہ قوم جانتی کہ یہ کونسی قوم تھی ان کا انجام کیا ہوا' وہی جوان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات ان کے سامنے تھے ان کی یہ داستانیں زباں زد تھیں اس قوم میں۔ کہا کہ دیکھو تو سہی کہ پھر جنہیں آگاہ کیا گیا تھا یہ ہیں نا منذرین۔ جنہیں آگاہ کیا گیا تھا اور اس کے باوجود وہ اپنی روش سے باز نہیں آئے تھے دیکھو تو ان کا انجام کیا ہوا۔ قرآن اپنا دعویٰ یونہی نہیں پیش کرتا وہ اپنے دعوے کی صداقت میں شہادت پیش کرتا ہے شہادت پیش کرتا ہے تاریخی نوشتوں سے۔ وہ ضروری نہیں کہ انہی اقوام کی تاریخ ہو جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ وہ تو اصول بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جس معاشرے کے اندر بھی مذہبی پیشوائیت غالب ہوگی وہ معاشرہ کبھی نہیں پنپ سکتا۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جس معاشرے میں بھی کیفیت یہ ہوگی کہ ظلم ہوگا ہر چیز اپنے اپنے مقام پہ نہیں رکھی جائے گی وہ معاشرہ کبھی نہیں پنپ سکتا۔ جس طرح یہ اصول عالمگیر ہیں اسی طرح ان کا اطلاق اور Application بھی عالمگیر ہے۔ دنیا میں ہر قوم کے ساتھ یہ ہوا آج بھی جہاں جہاں دنیا میں قومیں بستی ہیں ان کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ آپ کسی قوم کی تاریخ لے لیجیے ضروری نہیں کہ انہیں اقوام کی تاریخ تک اپنے آپ کو آپ محدود رکھیں۔ پوری نوعِ انسانی کی تاریخ آپ لے لیجیے۔ یہ ہے قرآن کی صداقت کہ جو اصول اس نے ایک جگہ بیان کیا ہے پوری نوعِ انسانی کی تاریخ میں کسی قوم کی ہسٹری آپ لے لیجیے گا وہاں یہ Truth جو ہے آپ کو نظر آ جائے گا کہ واقعی ایسا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں تو اس نگاہ سے خیر تاریخ ہی نہیں لکھی گئی۔ تھوڑی سی Attempt ابنِ خلدون نے کی تھی وہ بھی مقدمہ لکھ کے ہی رہ گئے آگے نہیں چلے۔ یورپ میں یہ چیز ہوئی اُنہوں نے یہ جو The Philosphy of History ایک چیز دی ہے نا ہیگل نے اس نے رخ بدلا ہے ان کی نگاہوں کا۔ ورنہ ہمارے ہاں ہسٹری ہوتی تھی وقائع نگاری ہوتی تھی یہ کہ وہ اس کی ایک فلاسفی بیان کی جائے کہ اس قوم

کے ساتھ یہ کیوں ہوا تھا اُنہوں نے یہ چیز کی ہے۔اوران کے ہاں پھر یہ ہسٹری اس انداز سے مرتب ہوئی۔گبن کی ہسٹری روما کی اگر آپ لے لیجیے اسی میں آپ دیکھئے کہ وہ جو جو واقعات بیان کرتا چلا جاتا ہے اس کے ساتھ اپنی نگاہ اور اپنی تحقیق کی رو سے جن اسباب پہ پہنچتا ہے اسباب و علل ساتھ بیان کرتا ہے کہ یہ وجہ تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا ۔ اور چھوٹے پیمانے پہ تو آپ بریفاٹ کی کتاب دیکھ لیجیے "Making of Humanity" اس میں آپ کو نظر آئے گا۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ یہ نہ تو سامی اقوام کی تاریخ ہے نہ یہ صرف عربوں سے کہی گئی ہے یہ تو Universal Truths ہیں ابدی حقائق ہیں جو بیان کیے ہیں قرآن نے۔ان کی صداقت پہ دنیا کی کسی قوم کی بھی تاریخ آپ لیں گے وہاں سے ان کی صداقتیں آپ کو ملتی چلی جائیں گی۔تاریخ کا مطالعہ' کسی قوم کی تاریخ کا بھی مطالعہ آپ نے کرنا ہو اس نگاہ سے کیجیے اور آپ دیکھیں گے کہ ان کی سرگذشتیں قرآن کے ان ابدی قوانین کی صداقتوں کی شہادتیں بنتی چلی جائیں گی۔(**فانظر کیف کان عاقبة المنذرین**) (10:73)۔(**ثم بعثنا من بعدہٖ رسلًا الٰی قومھم فجآء وھم بالبینٰت**) (10:74) اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا مختلف قوموں کی طرف اس طرح سے آگاہ کرنے والے آتے رہے واضح دلائل لے کر بینات۔(**فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہٖ من قبل**) (10:74) کہنے لگے وہاں ایک چیز تھی جو آڑے آجاتی ہے انسان کے اور وہ ہے اس کا پندارِ نفس۔کہتا ہے کیفیت یہ ہوتی ہے مذہب پرست قوم کی بالخصوص ان کے مذہبی پیشواؤں کی کہ یہ جس چیز پہ اڑے ہوئے ہوتے ہیں جس چیز پہ چلتے آرہے ہوتے ہیں۔مذہب تو وراثتاً چلا آتا ہے ناتسلسل کے ساتھ۔میں نے اس اپنے خصوصی خطبے میں بتایا تھا کہ دلیل ہی یہ ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو اس طریقے پہ پایا اور ہم اس پہ چلے جارہے ہیں۔کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب بھی ان کو کوئی ایسی بات کہی جائے جو ان کے اس متوارث اور متواتر اسلاف کے طریقے کے خلاف جائے ان کا پہلا ردِعمل ہوتا ہے 'نہ' کرنے کا۔اس کے بعد پھر کیفیت یہ ہے انسان کی ضد کی اس ابلیسیت کی (**فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہ من قبل**) (10:74) کہ جس چیز کے متعلق ایک دفعہ یہ یونہی یوں کر دیتا ہے نا پھر ضد میں آکے اس کو مانتا ہی نہیں ہے خواہ دل کیوں نہ مان جائے۔آگے کہا ہے اس قومِ فرعون کے متعلق کہ دل سے تو وہ یقین کر گئے تھے کہ بات تو یہ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ پہلے کہہ چکے تھے کہ نہیں ہم نہیں مانیں گے یہ غلط ہے ہمارے اسلاف کے طریقے کے خلاف ہے۔محض اپنی اس بات کی؟؟ میں آکے پھر نہیں مانتے۔مذہب میں اور مذہبی پیشوائیت میں یہ دوسری چیز ہوتی ہے صاحب۔اور جب بھی کوئی انسان اس مقام پہ آجائے کہ محض ضد کی بناء پہ اس نے نہ کرنی ہو پھر دلائل کارگر ہی نہیں ہو سکتے۔بڑی عظیم حقیقت قرآن نے کہی ہے کہ یونہی جس بات سے پہلے انکار کر دیا کہ ہم نہیں مانیں گے محض اس لیے پھر جھٹلائے چلے جائیں گے کہ پہلے کہہ بیٹھے ہوئے ہیں کہ ہم نہیں مانیں گے۔زندگی کا اصول عزیزانِ من! یہ یاد رکھئے کسی بات کے متعلق جو آپ نے کوئی فیصلہ کرنا ہو فوری جو ردِعمل آپ کے اندر آئے نا اس سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیے اس میں توقف کر دینا چاہیے اسے دوسرے وقت پہ اٹھا رکھنا چاہیے اور پھر اس پہ ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔یوں تو یہ ہو سکتا ہے اگر سینٹ پرسنٹ Cases

میں نہ بھی ہوگا تو بیشتر Cases میں یہ ہوسکتا ہے کہ دلائل و براہین پہ غور کرنے کا آپ کو موقع مل جائے اور آپ صحیح نتیجے پہ پہنچ جائیں۔لیکن اگر آپ نے پہلا ری ایکشن آپ کا جو ہے اس کی بناء پہ فیصلہ کیا تو فیصلہ جذبات پہ مبنی ہوتا ہے حقائق اور دلائل پہ نہیں ہوتا۔اور اس کے بعد پھر قرآن کہتا ہے کہ جب ایک دفعہ یہ انسان یوں کر دیتا ہے تو نفس کی ضد آ جاتی ہے پھر اس کے بعد کہ بات سمجھ میں آ بھی جائے تو محض وہ پندارِ نفس کی شکست سے بچنے کے لیے وہ جو Ego-hood جس کو کہتے ہیں پھر اپنی بات پہ اڑا رہتا ہے۔کہا اس لیے بھی یہ ان قوموں کی تباہی ہوئی کہ انہوں نے پہلے سے یہ کرلیا اور پھر اس بات کے اوپر اڑ گئے۔اور یہ مذہبی مناظرے اور مباحثے تو ہوتے ہی اس طرح سے ہیں پہلے فیصلہ کر کے جاتے ہیں نا کہ ہماری بات سچی ہے دوسرے کی جھوٹی ہے۔جو یہ پہلے فیصلہ نہ کرے مناظرہ کر ہی نہیں سکتا۔اب دونوں آپس میں پہلے فیصلہ کر کے آئے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ برسوں مناظرہ آپس میں کرتے رہیں یہ خاک کسی صداقت کے اوپر حق کے اوپر پہنچیں گے۔وہ تو (**لا یمسہ الی المطھرون**) قرآن کہتا ہے حقائق سے تو مس وہ کر سکتا ہے جو پہلے اپنے دل و دماغ کو ان چیزوں سے پاکیزہ کر لے۔(**و من یکفر بالطاغوت و یؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الاثقٰی**) پہلی شرط یہ ہے ایمان باللہ کی' کفر بالطاغوت پہلے یہ کر کے آئے۔اور اگر پہلی ہی چیز کو اتنا ضد کے ساتھ اپنے قلب کے اندر پیوست کر رکھا ہے اور اس کے بعد کیفیت یہ ہو کہ جو بات سامنے آئی ہے سوچے سمجھے بغیر محض اس روجہان سے جو جذبات پر مبنی ہے یوں کر دیا پھر آ جاتا ہے انسان جذبات کی طیش میں پھر نہیں مانتا۔انہوں نے یہ کیا۔کیا الفاظ ہیں عزیزانِ من! الفاظ نہیں کیا نتیجہ نکالا اس بات کا۔اللہ اکبر۔قرآن ہے عزیزانِ من! قرآن ہے۔یہ جو چیز تھی کہ پہلے ہی ری ایکشن کے ماتحت یوں کر دیا جو جذبات کا پیدا کردہ تھا اور پھر اس کے بعد لاکھ سمجھایئے لاکھ دلائل دیجیے لاکھ شواہد لایئے پھر نہیں مانا جاتا۔کہا یہ کیا ہے۔(**کذٰلک نطبع علٰی قلوب المعتدین**) (10:74) یوں مہریں لگ جاتی ہیں سمجھنے سوچنے والوں کے دلوں کے اوپر بھی۔پہلے ری ایکشن میں یہ تجاوز کر گیا اس حد سے' اس کو اس کے اندر رہنا چاہیے تھا کہ ہاں صاحب میں دیکھونگا سوچونگا غور کرونگا پھر کسی نتیجے پہ پہنچونگا۔پہلا ہی اس کے اندر جوری ایکشن ہوا نا جو زن کر کے وہاں پہنچا تھا کہ نہیں صاحب غلط ہے جھوٹ کہتے ہو۔کیا کہا ہے معتدین یہاں' یہ اس انکار کرنے میں حد کے اندر نہیں رہا۔اور اس کے بعد پھر (**نطبع علٰی قلوب المعتدین**) (10:74) مہریں لگ جاتی ہیں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔(**لھم قلوب لا یفقھون بھا**) سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں لیکن ان صلاحیتوں سے پھر کام نہیں لیتے۔اسے کہتا ہے قرآن مہریں لگ جانا۔یہ ہیں وہ جن کے متعلق کہا (**سوآء علیھم ء انذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون**) پھر اس کے بعد تم انہیں ان کے نتائج سے آگاہ کرو نہ کرو وارننگ دو نہ وارننگ دو انہوں نے جو وہاں اپنے آپ کی اس سمجھنے والے صلاحیت کے اوپر سیل کر دیا اب وہ بوتل ہے Sealed ہوگئی ہوئی اندر کوئی جا ہی نہیں سکتا۔کیسے سیل ہوتی ہے۔کہا وہ کہ جو پہلے ہی جذبات سے ایک فیصلہ کر بیٹھتا ہے انسان۔یہ ہے قرآن۔آج کی سائیکولوجی ایک ایک چیز کی شہادت دیتی چلی جاتی ہے قرآن جو کہتا ہے۔ابھی تو ابتداء ہوئی ہے اس سائیکولوجی کی۔وہ جتنی اس قسم کی چیزیں

لوگوں نے مانی ہوتی ہیں یہ Psycho Analysis والے کرتے ہی یہ ہیں کہ پہلے سے جو چیزیں پیوست ہوتی ہیں ان کے Unconscious Mind کے اندران کو Dig-out کرتے ہیں وہاں سے' ان پھانسوں کونکالتے ہیں۔اوران کے تجربے یہ ہیں کہ اس نکالنے کے بعد کچھ پھر کہنا ہی نہیں پڑتا خود ہی وہ ایک چیز کو مان لیتے ہیں۔یعنی یہ جو سیل تھی انہوں نے خود لگا رکھی یہی مانع تھی حقیقت میں۔ یہ اگر اتر جائے تو خود قبول کر لیتا ہے اس چیز کو۔تو قرآن نے جو کہا تھا نا کہ (**یکفر بالطاغوت**) کا وہ یہ ہے کہ یہ جو پہلے سے تم نے یہ غلط چیزیوں کو اپنے قلب میں پیوست کیا ہوا ہے انہیں پہلے نکالنے کی ضرورت ہے۔کم از کم ذہنی طور پہ تو اس کے لیے آمادہ ہو کے آجاؤ کہ ہم سوچیں گے سمجھیں گے پھر کسی نتیجہ پہ پہنچیں گے۔پھر ٹھنڈے دل سے اس کے بعد غور کرو۔اس نے کہا کہ پھر سوال ہی نہیں کہ پھر نہ مانو بجز اس کے کہ وہی چیز پھر ضد کی نہ درمیان میں آجائے۔کہا کہ پھر ہم انبیاء کا سلسلہ حضرتِ نوحؑ کے بعد آگے چلا۔

(**ثم بعثنا من بعدھم موسٰی و ھٰرون الٰی فرعون و ملائہٖ**) (10:75) پھر ہم نے موسٰیؑ اوران کے بھائیؑ کو فرعون اوران کے سردارانِ قوم کی طرف بھیجا۔اُن کی کیا کیفیت تھی؟ (**فاستکبروا**) (10:75) وہی جو میں نے کہا ہے۔اِنہوں نے کہا یہ تھا اور وہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے عزیزانِ من!۔ یہ جب آئے تھے حضرتِ موسٰیؑ اور حضرتِ ہارونؑ دونوں بھائی بنی اسرائیل کی قوم سے تھے۔بنی اسرائیل کی قوم یہ قومِ فرعون کی محکوم تھی غلام تھی۔ یہ جب آئے ہیں اور انہوں نے آ کے ان سے کچھ کہنا چاہا ابھی کہا نہیں تھا کچھ۔تو وہ فرعون اور اس کے جو اہلِ دربار تھے یہ جو لوگ بڑے بڑے تھے کابینہ وغیرہ والے سردارانِ قوم۔اُنہوں نے کہا یہ تھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں۔وہ جو ذہن میں ایک چیز تھی نا کہ روحانیت والے جو ہیں ان کے ماتھے پی سینگ ہونے چاہئیں اس قسم کی کوئی بات فوق الفطرت تو ہے نہیں۔اور دوسری بات یہ کہا تھا کہ ہم ان کی بات سن لیں (**و قومھما لنا عٰبدون**) او یہ تو اس قوم کے فرد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔محکوم کی کوئی بات اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ سنی بھی جائے عزیزانِ من!۔ان افراد کے متعلق نہیں ابھی انہوں نے کہا یہ جو دونوں بھائی آئے تھے کہ ان کی ہم کیوں سنیں۔ان کے متعلق تو یہی کہا کہ نظر بظاہر کوئی ایسی خارقِ فطرت چیز تو ہے نہیں کہ ہم سنتے آئے تھے کہ صاحب ان لوگوں کی یہ ہوتی ہیں۔اور اگلی بات جو کہی ہے کہا یہ اس قوم کے افراد ہیں کہ جو ہماری محکوم ہے۔عزیزانِ من! محکوم قوم کا تو کوئی فرد کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو ذلیل کا ذلیل ہی رہے گا۔ یہاں تو عزت و ذلت قوم کے ساتھ وابستگی میں ہے قوم ذلیل ہے تو ہر فرد ذلیل ہے دنیا کے اندر' قوم سربلند ہے تو اس کا پست انسان بھی سربلند ہوتا ہے دنیا کے اندر۔افراد کا سوال نہیں ہے سوال ہی یہاں قوم کا اور جماعتوں کا ہے۔ان کی قوم ہماری محکوم ہے اس لیے ان کی بات ہم سن لیں؟ یہ بھی ایک Universal Truth ہے' محکوم کی بات کوئی نہیں سنتا' اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا کہ توجہ دی جائے اس کے اوپر۔چھوٹے سے پیمانے پہ میں عرض کرونگا یہ بات اگرچہ وہ بات چلی ہے۔کسی معاملے کے اوپر آپ بیٹھے ہوئے اپنے میں غور کر رہے ہوں آپ کا کوئی ملازم جو ہے وہ آ کے درمیان میں یہ کہے کہ جی میں آپ کو بتاتا ہوں کیا کرنا چاہیے اسے کہتے ہیں ''او جا جا اپنا کام کر بھانڈے

مانج جائے‘‘۔یعنی یہ نہیں کہ اس کی سننے کے بعد ہم کہیں گے کہ یہ کیا کہہ یا تم نے‘ یعنی وہ اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس موضوع کے اوپر کوئی بات بھی کر سکے‘ بات ہی ایسی ہی نہیں ہوسکی جو سننے کے قابل ہو سکے۔اور یہ تو ابھی محکوم نہیں ہوتا جی۔ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔(**فاستکبروا**) (10:75) یہاں فاستکبروا کہا ہے قرآن نے‘ قومِ نوحؑ کے متعلق یہ بات نہیں کہی تھی۔استکبار تھا یہ‘ ہمارے محکوم ہمارے سامنے آ کے باتیں کرنے لگ گئے۔محکوم قوم ہم سے کہتی ہے کہ تم تباہ ہو جاؤ اور ہم حاکم ہو جائیں گے کہتا ہے دیکھو تو سہی یہ پاگل کہیں گے۔(**و کانوا قومًا مجرمین**) (10:75) کہا یہ تکبر یہ ہٹ دھرمی کا ہے کی تھی کیوں تھی؟ اس لیے کہ یہ اس محکوم قوم کا جو کچھ ان کا مال ہوتا تھا اس کا استحصال کرتے تھے Exploite کرتے تھے۔ظلم یہ تھی کہ اس قوم کی محنت کو غصب کرتے تھے‘ چاہتے تو اس لیے نہیں تھے کہ یہ قوم چلی جائے ہاتھ سے۔استکبار اس بناء کے اوپر تھا کہ ہم حاکم ہیں یہ محکوم ہیں۔دونوں چیزیں عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ عربی زبان میں ہی جرم کے بنیادی معنی ہوتے ہیں دوسرے کے درخت سے پھل کاٹ کے اپنے ہاں لے آنا۔اسے ہی Exploitation کہتے ہیں۔کہا استکبار اس بناء پہ تھا اور ذہنیت یہ تھی کہ محکوم قوم کی بات ہم کیسے سنیں۔اور بات یہاں جس پہ میں Stress دے رہا ہوں اس نقطے پہ وہ یہ ہے کہ ہم نے بھیجا موسٰیؑ اور ہارونؑ کو (**بـاٰیٰتنـا**) (10:75)۔اور ہمارے ذہنوں میں وہ ہے نا آ گے کہ پھر وہ بلایا انہوں نے جادوگروں کو اور پھر وہ میدان لگایا اور اس میدان میں وہ کوئی انہوں نے جادو کے کچھ انہوں نے دکھائے انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں وہ سانپ بن کے چلے پھر انہوں نے عصا پھینکا وہ اژدھا بن گیا۔سارا قصہ اس جادو کے زور کے اوپر یہ لگایا جا رہا ہے۔یہاں تو ہے کہ بھیجا ہم نے اپنے قوانین دے کے موسٰیؑ کو اور ہارونؑ کو ان کی طرف۔بھیجا تو اس طرح سے۔یہ دیکھئے اگلی آیت میں بات کیسی قرآن صاف کرتا ہے۔یہ تو میں آ گے چل کے عرض کرونگا۔(**فلما جآء هم الحق من عندنا**) (10:76) جب ہماری طرف سے ان کے سامنے Truth پیش کیا گیا الحق پیش کیا گیا۔پہلے تو الحق پیش کرنے کے لیے گئے تھے اسی کو آیات کہا ہے قرآن نے۔یہ پیش کیا الحق آیات قانون۔(**قالوا ان هٰذا لسحر مبین**) (10:76) لفظ آ گیا یہاں سحر۔کیا پیش کیا تھا جی انہوں نے؟ قوانینِ خداوندی پیش کیے تھے۔یہی کہا تھا کہ یہ استحصال جو تم کرتے ہو اس قسم کی ایک محکوم قوم پر اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔یہی کہا تھا کہ ایک قوم کو جو اس طرح سے اپنا محکوم بنا کے ان پہ اپنا استبداد اور اپنا ظلم روا رکھتے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔حضرتِ موسٰیؑ نے تو ڈیمانڈ ہی اتنی کی تھی کہ تمہیں تمہارا ملک اور تمہاری مملکت مبارک میں تمہیں کچھ نہیں کہتا‘ میں تو صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ محکوم قوم جو ہے اس کو میرے ساتھ جانے دو اس کو خدا کی آزاد فضا میں سانس لینے کا قابل بنا دوں۔اتنی ڈیمانڈ تھی نا۔جانے کیسے دیتے۔(**و کانوا قومًا مجرمین**) (10:75) وہ تو ان بھیڑوں کی اون مونڈھ رہے تھے۔اپنے کمبل کس طرح سے بناتے جب ان بھیڑوں کو جانے دیتے تو۔آئے تھے یہ آیات لے کر یہ قوانین لے کر آئے تھے الحق لے کر آئے تھے نا۔اب یہاں جو کہا ہے کہ انہوں نے کہا (**هٰذا لسحر مبین**) (10:76) تو ابھی تو انہوں نے نہ کوئی جادو کا اپنا نمونہ دکھایا تھا نہ کوئی اس قسم کا کرشمہ سامنے آیا تھا۔کس بات کو انہوں نے کہا تھا سحر مبین ہے؟ غور کیجیے گا

کہاں بات آئی ہے کہ ہمارے قوانین لے کے گئے الحق انہوں نے پیش کیا اُنہوں نے کہا کہ یہ سحر مبین ہے۔تو ابھی تو کچھ انہوں نے نہ ڈگڈگی بجائی نہ کوئی انہوں نے؟؟ بنا کے دکھائے تو یہ کس بات انہوں نے سحر کہا۔سحر کا ترجمہ ہم اپنے ذہن میں جادو کرتے چلے گئے۔ پوچھو ان عربوں سے کہ کس معنوں میں وہ یہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ وہ فریب جو سچ بن کے سامنے آئے اسے وہ سحر کہتے ہیں وہ جھوٹ جو سچ بن کے سامنے آئے۔اس کے اندر وہ کہتے تھے کہ ایک تو جھوٹ وہ اکھڑ سا آدمی بولتا ہے جھوٹ بولا پتہ چل گیا۔ کہتے ہیں ایک اس قسم کا لطیف جھوٹ ہوتا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے اور نظر بظاہر سمجھ میں نہیں بات آتی وہ سچ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ جو جھوٹ اس قسم کا لطیف ہوتا تھا اُسے وہ سحر کہتے تھے۔اور جتنا کچھ بھی آپ کو بعد میں یہ جادو کہہ کے بتایا گیا ہے اس کی حقیقت بھی یہ ہوتی ہے جھوٹ ہی ہوتا ہے وہ' وہ سچ بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ وہ جو ایک روپے کے یوں دو روپے بنا دیتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ مانگنے والا بھکاری ہے بعد میں وہ خود بھی یہ کہہ دیتا ہے۔ جتنا وقت وہ سٹیج پہ آ کے کرتا ہے اور سٹیج میں جو وہاں کے بھکاری آتے ہیں ان اقوام کے وہ تو کبھی پہلے یہ بتاتے نہیں نا کہ ہم بھکاری ہیں۔ بھکاری تو ادھر والا ہوتا ہے پہلے دکھاتا ہے بعد میں مانگتا ہے' وہ تو پہلے لے لیتا ہے بعد میں دکھاتا ہے اس لیے وہ بھکاری نہیں ہوتا۔تو وہ جو کچھ کر رہا ہوتا ہے وہ سارے کا سارا بتاتا یہ ہے کہ دیکھئے صاحب یہ سردا ہے میرے ہاتھ پہ یہ روپیہ ہے میرے ہاتھ کے اوپر' حالانکہ وہ یہ کچھ نہیں ہوتا۔آپ کی نگاہیں دھوکہ کھا رہی ہوتی ہیں' وہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ وہ پہچان نہیں سکتیں۔ یہ دیکھئے یہ قوم چودہ سو سال پیشتر اس کو سحر کہتی تھی وہ جھوٹ جو سچ کے پردے میں آئے لطیف اتنا ہو کہ بظاہر پہچان نہ سکے آدمی اس بات کو۔انہوں نے یہ کہا تھا کہ تباہ ہو جاؤ گے تمہاری روش جو ہے یہ نہیں چل سکتی' ظلم پنپ نہیں سکتا۔اُنہوں نے کہا کہ یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو جھوٹ ہے لیکن دلائل ایسے دیتے ہو اس کے لیے' منطق اتنی ہے تمہاری کہ اچھے سے اچھا سمجھدار بھی اس فریب میں آ جاتا ہے۔تو یہ تھی ساری بات جو وہ کہتے تھے کہ یہ قوم ان کی باتیں سن نہ پائے ورنہ یہ دلنشین ہے جو چیزیں یہ کہہ رہے ہیں۔بات ہے سچی۔قرآن میں آگے آیا ہے اس نے کہا ہے کہ یہ قوم اور فرعون اپنے دل میں یقین رکھتی تھی کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں۔خود تو مانتے نہیں تھے کہ اتنی بڑی حکومت جا رہی تھی' عوام کو سننے نہیں دیتے تھے۔اب یہاں انہوں نے دیکھا کہ خود کام نہیں چلتا موسیٰؑ کے دلائل کا تو جواب نہیں دیا جا سکتا۔انہوں نے اپنے ہاں کے مذہبی پیشواؤں کو بلا بھیجا تھا کہ یہ تمہارے بس کی بات ہے' مذہب کی سطح کے اوپر لاؤ اس کو۔ کیونکہ یہ جو کچھ پیش کر رہا ہے خدا کے نام پہ پیش کر رہا ہے تو مشترک تو چیز ہو گئی نا خواہ یہ دین تھا وہ مذہب تھا وہ بھی تو خدا کے نام پہ ہی دھوکہ دیتے تھے۔ ویسے آپ دیکھئے کہ یہ لوگ جانتے کس طرح ہیں ایک دوسرے کو' سب جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔ پتہ تھا کہ یہ ہامان اور یہ جنود اس کا یہ مذہبی پیشوائیت اور یہ مندروں میں جو کچھ ہوتا ہے یہ جانتا تھا فرعون اور اس کے مجاور کہ یہ سب جھوٹ و فریب ہے جو کچھ وہاں ہوتا ہے۔اُنہوں نے کہا کہ اس جھوٹ کا علاج ان جھوٹوں کے پاس ہے انہیں بلاؤ۔ یہ تھا جو وہاں ہوا تھا۔میں سورۃ اعراف میں یہ الفاظ جہاں آئے تھے وہاں بتا چکا ہوں آگے بھی جہاں آئیں گے میں عرض کرونگا قرآن نے یہاں اتنا ہی کہا ہے۔اتنا صرف یہاں میں یہ کہتا ہوں کہ قوانین

دے کر بھیجا الحق انہوں نے پیش کیا ابھی کوئی کسی قسم کی وہ جس کو آپ جادو کی بات کہتے ہیں وہ نہیں دکھایا اور انہوں نے کہا کہ (**ان ھٰذا لسحر مبین**) (10:76) دیکھا نا آپ نے کس چیز کو کہا۔ سحر کے یہ معنی ہیں یہ جھوٹ ہے جسے سچ کے پردے میں تم پیش کر رہے ہو۔ (**قال موسٰی اتقولون للحق لما جآء کم اسحر ھٰذا**) (10:77) کہا الحق (The Truth) تمہارے سامنے آ رہا ہے اور اس کو تم کہتے ہو کہ یہ اس قسم کا جھوٹ ہے جو سچ کے پردے میں تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے کہا اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا دلیل یہ ہے کہ (**ولا یفلح الساحرون**) (10:77) جھوٹ کو سچ کے پردے میں لا کے دکھانے والے تھوڑے سے وقت کے لیے تو مقصد براری ہو جاتی ہے کامیابی ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہاں لفظ فلاح قرآن نے کہا ہے فلاح ہوتا ہے جو بیج ڈالا جائے اس کا اسی قسم کا پھل آ جائے۔ ہنگامی طور پہ یونہی کرشمہ سازیاں کر کے تو وہ دکھا سکتا ہے یہ کہ اس کا وہ جھوٹ کا بیج سچ کا پھل لے آئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا (**لا یفلح الساحرون**) (10:77)۔ انتظار کرنا پڑتا ہے اس کے جھوٹ کے پردے کو بے نقاب ہونے کے لیے وقت لگتا ہے جتنا بیج کو پھل بننے کے اندر لگتا ہے۔ پہچان اس کی پھل میں جا کر ہوتی ہے یہ کہ اس نے جھوٹ کہہ کے آپ کو یہ کہا کہ صاحب یہ اس دفعہ گندم بوئیے دیکھئے سو من جھاڑ ہو گا اس کا۔ کہا کہ یہ اس کے بعد یہ بات کہ جھوٹ کہتا ہے اس کے لیے چھ مہینے کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے یہ بات صاف نہیں ہو سکے گی۔ بونا ہو گا محنت بھی کرنی پڑے گی انتظار بھی کرنا پڑے گا۔ آخر میں کیا ہو گا؟ یہ ہے وہ جو لفظ ہے (**لا یفلح الساحرون**) (10:77) جھوٹ کا بیج سچ کا پھل نہیں لا سکتا۔ انتظار کرنا پڑے گا دیکھنا ہو گا۔ اب آ گئے جناب وہی پروپیگنڈہ کرنے والے مذہبی پیشوائیت بڑھ گئی آگے۔ دیکھا یہ ساحر جو بلائے تھے انہوں نے کہا' پہلے ہی ڈگڈگی بجائی۔

(**قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه اٰبآء نا**) (10:78) چل بھئی! کہہ دیا قوم کو اور تمہیں اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں دیکھو ان کی بات نہ سن لینا کہیں۔ سلفِ صالحین کا مسلک اس کے خلاف یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ کوئی دلیل نہیں کوئی برہان نہیں وہ تو جھوٹے تھے خود وہ دلیل کیا دیتے۔ یہ جھوٹ کس نقاب میں آ رہا ہے سچ کیا ہے اس میں؟ سلفِ صالحین کا مسلک تواتر سے چلا آ رہا ہے توارث سے چلا آ رہا ہے۔ کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تم غلط کہتے ہو۔ میں یہ کہتا ہوں حضرتِ امام فلاں علیہ الرحمۃ جو ہے ان کا ارشاد ہے یہ ان کو جھوٹا کہہ رہا ہے۔ چل بھئی۔ یہ کہا آپ اِدھر ہو لیے اور یہ بھڑوں کا چھتہ چھڑ کے اس کے پیچھے۔ عزیزانِ من! اگر وہ ہار جیت اس میدان کے اندر آ کے جادوگروں اور ان کے معاملے میں ہی ہونی تھی تو اس پروپیگنڈے کی کیا ضرورت تھی کہ تمہیں اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کر رہا ہے۔ یہ جو آ کے انہوں نے اگر وہ جادو کی کچھ چیزیں دکھانی تھیں تو وہ اسلاف کا مسلک کونسا تھا جسے جھٹلا رہا ہے۔ اگر انہوں نے بھی مقابل میں جادو کی چیزیں دکھانی تھیں تو یہ بھی تو انہی کے اسلاف کا مقصد تھا جسے یہ پیش کریں گے۔ جادو کی ہی کوئی چیزیں پیش کرنی تھیں تو جادو کی چیزیں وہ پیش کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اسلاف کا ہمارے مسلک ہے۔ یہ تو ان سے بھی بڑا جادو پیش کر رہے تھے اُنہوں نے کہا تھا

سبحان اللہ سبحان اللہ ہمیں تو فلاں حضرت صاحب کی بات تھوڑی سمجھ میں آئی تھی ان کو بہت زیادہ سمجھ میں آ گئی ہوئی ہے یہ شیخ المشائخ ہیں۔او دونوں میں کوئی ٹکراؤ ہو رہا تھا نا۔ٹکراؤ یہ تھا بات یہ کہی گئی ہے تمہیں بہکا رہا ہے اسلاف کے مسلک کے خلاف کہہ رہا ہے۔وہی مذہبی پیشوائیت کا حربہ۔عزیزانِ من! یہاں رسیوں کا سانپ بن جانا عصا کا اژدھا بن جانا یہ تو نہ الحق ہے نہ آیات اللہ ہیں قوانین بھی نہیں ہیں نہ یہ ہیں کہ یہ تمہیں ان کے مسلک سے برگشتہ کر دے گا۔دلیل یہ دی ہے۔یہ تو ہوئے مذہبی پیشوائیت والے۔اب آئے یہ اربابِ سیاست وہاں۔انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ آباؤ اجداد کا مسلک ہے اسلاف کی راہ ہے یا کدھر بہکاتا ہے۔اس کے لیے تو انہوں نے یہ مذہب پرست جو تھے وہ ہامان اور اس کے لشکر لائے تھے یہ بیٹھ کے کیا کہتے ہیں آپس میں؟ کہا کہ بڑا خطرہ نظر آ رہا ہے جو کچھ یہ باتیں کہہ رہا ہے۔یہ پروپیگنڈہ یہ کر رہا ہے کہ یہ ان کو کیا حق حاصل ہے یہ ایک گنڈلی جو اوپر بیٹھ گئی ہے کہ تمہاری محنت کی کمائی کو کھائے چلی جا رہی ہے ان کے ہاتھ سے یہ اقتدار چھینو۔ان کو یہ خطرہ تھا۔سنیے عزیزانِ من! قرآن کیا انداز بیان کرتا ہے کہ مذہبی پیشوائیت وہ دلیل لے کے آئی اور انہوں نے کہا کہ (**و تکون لکما الکبریآء فی الارض**) (10:78) چاہتے یہ ہیں کہ ہمیں اقتدار سے ہٹا کے خود اقتدار کی مسندیں سنبھال لیں یہ ہے ساری بات۔اربابِ اقتدار سے یہ کہا کہ یہ ہیں ان کے ارادے۔اگر ان کو اجازت دیدی گئی کہ یہ یہاں قوم میں پروپیگنڈہ یہ کر دیں کہ تمہارا سب کچھ لوٹ کے یہ کھا جاتے ہیں تو پھر تو یہ قوم چھوڑے گی نہیں۔کیونکہ خود کبھی ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ہم اقتدار لیتے ہیں قوم یا ملک یا عوام یا ان لوگوں کی فلاح کے لیے' بات تو اپنی کبریائی کی تھی نا۔اس لیے ان کے متعلق بھی ذہن ادھر گیا کہ چاہتے یہ ہیں کہ ہمیں ہٹا کے خود ان کرسیوں کو سنبھال لیں۔ہمارے ہاں جو ہوتا ہے روز۔کتنی نیک نیتی سے کوئی حزبِ اختلاف والا کیوں نہ اٹھے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مقصد اصل میں یہ ہے کہ یہ کرسی اس سے چھین کے ہمارے حصے میں آ جائے۔ان سے کہا(**و تکون لکما الکبریاء فی الارض**) (10:78)۔دونوں گروہ آ گئے عزیزانِ من!۔اور یہ دونوں نے فیصلہ کیا اور کہا(**وما نحن لکما بمؤمنین**) (10:78) ان سے کہا کہ بابا ہم تمہاری کوئی بات نہیں ماننے والے۔یہ جو ہوتا ہے ناب کے ساتھ یہ ہے وہ چیز یعنی یہ یہاں ابھی وہ سحر اور جادو اور یہ بات نہیں آئی بات یہی ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو ہم اسے ماننے والے نہیں ہیں اس پر ہم ایمان نہیں لا سکتے۔اور اس کے بعد جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ پھر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ عوام میں یہ ان خیالات کو پھیلا رہے ہیں۔میں آگے چل کے عرض کرونگا جہاں یہ آیا ہے کہ فرعون سے کہا گیا تھا کہ ان کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے تم نے' پکڑو ان کو پھانسی دو ان سب کو' بات ختم ہو۔اس نے کہا تھا کہ اتنی جلد بازی نہ کرو میں جانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔اور یہ چیز نہیں کی انہوں نے' ہاتھ نہیں ڈالا ان پہ۔اس سے نظر آتا ہے کہ وہ قوم تھی تو محکوم اور اقلیت بھی لیکن اس کا وزن بڑا تھا اس قوم کا۔انہوں نے ان پہ ہاتھ نہیں ڈالا موسیٰؑ پہ۔اس لیے فرعون نے کہا تھا کہ نہیں! یہ غلط ہے جو تم کہتے ہو' میں اور سوچتا ہوں۔اُنہوں نے کہا کہ کیا کرو گے۔انہوں نے کہا کہ یہ عوام کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں نا' عوام ہے مذہب پرست اس لیے مذہب کی سطح کے اوپر ان کو لے آؤ۔اور ہمارے مذہب پرست علماء ہمارے یہ پیشواء

ہمارے یہ برہمن ہمارے یہ پجاری یہ عوام کو بھڑکائیں ان کے خلاف۔ یہ ہے علاج۔ ان کو علاج دینا پھانسی نہیں ہے اس کا' قوم اٹھ آئے گی ان کی جو ہے۔ کیا تدبر ہے۔ یہ ہے جسے اقبالؒ نے سیاستِ فرعونی کہا حکمتِ فرعونی کہا۔ حکمتِ فرعونی: مذہب کی سطح پہ آ جاؤ۔ یہاں بھی بڑے گہرے کاریگر ہوتے ہیں وہ سیاستدان جو مہب کے رنگ میں سیاست پیش کرتے ہیں آ کے۔ یہ سیاسی لیڈروں کی باتوں کو تو آپ یوں جھٹلا سکتے ہیں عوام کی سمجھ میں بھی آ جاتی ہیں۔ جب اسی چیز پہ وہ یہ کہہ کے آئیں کہ یہ اقامتِ دین ہے یہ خدا اور رسول کا ارشاد ہے بڑا مشکل ہوتا ہے اس وقت۔ بڑی گہری چیز ہوتی ہے۔ یہ ہے جسے حکمتِ فرعونی کہا ہے اقبالؒ نے۔ فرعون نے یہ کہا اپنے امراء وزراء سیاستدانوں سے کہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے یہ۔ عوام کو بھڑکاؤ ان کے خلاف اور وہ صرف مذہبی پیشواء بھڑکا سکتے ہیں۔ (**و قال فرعون ائتونی بکل سٰحر علیم**) (10:79) اس کے مقابلے میں انہی کو لاؤ وہ جو ہمارے ہاں کے بڑے بڑے فریب دینے والے ہیں بڑے بڑے دوام جسے کہتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے پڑھے لکھے جتنے بھی ہیں فقیہ ہیں اس قسم کے مفسر ہیں اس قسم کے محدث ہیں اس قسم کے شیخ المشائخ بنے ہوئے ہیں علمائے کرام نام رکھا ہوا ہے بلاؤ ان کو۔ اور کہا ہیں وہ سارے فریب کار۔ اس کا علاج اُن کے ہاتھ میں ہے بلاؤ ان کو۔ (**فلما جآء السحرة قال لهم موسٰی القوا ما انتم ملقون**) (10:80) میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہ وہ تفصیل میں یہاں نہیں دے رہا میں وہ سب کچھ بیان کر آیا ہوں کیسے ہوا تھا۔ اور قرآن بھی یہاں وہ الفاظ نہیں لایا وہ' وہ آگے آئے گی بات۔ کہا کیا ہے موسٰیؑ نے؟ کہا کہ ہاں بھئی پیش کرو جو کچھ تم پیش کرنے کے لیے آئے ہو' سامنے لاؤ بلکہ یہ چیز ہے ٹھیک ہے مناظرہ ہے۔ لاؤ کیا دلائل ہیں تمہارے پاس' کیا پیش کرنا چاہتے ہو۔ یہ ترجمہ ہے اس کا' عجیب لفظ قرآن لے آیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ دکھاؤ کیا تم دکھانا چاہتے ہو' وہ محسوس جادو کی چیز تو دکھانے کی تھی نا۔ یہ نہیں کہا۔ کہا یہ ہے کہ وہ لاؤ پیش کرو کیا چیز ہے تمہارے پاس۔ (**فلما القوا**) (10:81) انہوں نے اپنے دلائل پیش کیے۔ (**قال موسٰی ماجئتم به لسحر**) (10:81) فریب ہے بالکل جسے سچ کے پردے میں پیش کر رہے ہو تم۔ (**ان الله سيبطله**) (10:81) تم دیکھو کہ خدا کس طرح سے اس کو باطل؟؟ کرتا ہے کس طرح سے تمہارے جھوٹ کی پردہ دری ہو جاتی ہے۔ ابھی کرتا ہوں۔ کہا یہ (**ان الله لا يصلح عمل المفسدين**) (10:81) یہاں یہ دیکھئے جرم ان کے خلاف کیا ہے؟ فساد برپا کرنا چاہتے ہو معاشرے کے اندر عوام کو بھڑکا کے۔ دیکھا آپ نے کہاں بات لے آیا قرآن۔ یہ ہے نا نیت تمہاری۔ یہاں مفسدین کیوں کہا جی ان کو' یہ کیا فساد' موسٰیؑ کے خلاف اگر یہ آئے تھے مناظرہ کرنے یا جادو کی چیزیں دکھانے' یہ فساد کیا تھا؟ فساد تو وہ تھا وہ جو حکمتِ فرعونی تھی کہ عوام کو بھڑکا دو ان کے خلاف۔ کہا میں جانتا ہوں جو کچھ تمہاری نیت ہے لیکن اس طرح سے فساد برپا کرنے سے تو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تم دیکھو گے کہ یہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اور یہاں سے بات ساری صاف ہو گئی برادرانِ عزیز! کہ یہ بات کیا تھی۔ کوئی جادو کی کرشمہ سازیاں عجوبہ پسندی والی بات کوئی نہیں تھی۔ بات تھی (**و يحق الله الحق بكلمٰته**) (10:82) تمہاری ان چیزوں کو جو تم اس قسم کے یہ دعوے کر رہے ہو اور فریب کارانہ دلائل دے رہے ہو دیکھو یہ باطل کس

طرح سے ابھی بے نقاب ہوتا ہے۔خدا حق کو Establish کرے گا' کس چیز کے ساتھ (بکلمٰتہ) اپنے قوانین کے ذریعے سے۔تو حق نے تو یوں Establish ہونا تھا۔شروع میں کہا کہ وہ ہمارے قوانین لے کر گئے الحق انہوں نے پیش کیا اس کی یہ ساری مخالفت ہوئی۔حکمتِ فرعونی یہ تھا کہ ان کو مذہبی سطح پہ لاؤ پیشوائیت کو بھڑادو عوام کو ان کے خلاف مشتعل کردو۔یہ ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔اُنہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آؤ ناذرا عوام کے سامنے ہی سہی بات کروا بھی دیکھو کیسے پول کھل جاتا ہے تمہارے اس سارے فریب کا۔اور یہ ہے عزیزانِ من! وہ جو چیز میں پیش کرنا چاہتا تھا۔(یحق اللہ الحق بکلمٰتہ) (10:82) خدا اپنے قوانین کے ذریعے سے حق کو Establish کرے گا۔شعبدہ بازیوں سے تو یہ بات نہیں ہے۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جی وہ دور تھا جادوگروں کا اس واسطے خدا نے بھی اپنے پیغمبروں کو بھیجا اسی قسم کا جادو دے کے۔اور ایک ہی سانس میں وہ کہتے ہیں کہ جی جادو برحق ہے کرنے والا کافر۔معاذ اللہ معاذ اللہ۔یہاں کرنے والا پہلے تو حضرتِ موسٰیؑ خدا کا پیغمبر اور اس سے اگر آگے چلیں گے تو(یحق اللہ الحق بکلمٰتہ) اگر یہ جادو ہے تو خدا بھی اس جادو کے ذریعے سے آیا نا اپنا حق Establish کرنے کے لیے۔کرنے والا کافر۔ہے کوئی کھڑا ہو کے پوچھے۔پوچھے کیا وہ تو حکمتِ فرعونی چلتی ہے بھڑکا دیتے ہیں عوام کو۔(و یحق اللہ الحق بکلمٰتہ) (10:82) کیا بات ہے قرآن کی عزیزانِ من! وہ تو بات صاف کرتا چلا جاتا ہے۔اس کے ذریعے سے اس نے حق کو Establish کیا تھا۔شعبدے دکھا کے الحق Establish ہوتا ہے؟ ہوا ہے کبھی آج تک؟ معاف رکھئے گا اگر یہ بات مانی جائے جس کا نام یہ معجزہ کہتے ہیں وہ بھی اتنا بڑا معجزہ دکھا دیا حضرتِ موسٰیؑ نے باطل ہو گئیں وہ رسیاں نکل کے آئیں اژدھا اتنا بڑا یہ ہو گیا۔وہ ساری قوم کافر کی کافر رہی پھر بھی۔یعنی معاف رکھئے گا یہ آخری حربہ جو استعمال کیا گیا (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا نے حق کو Establish کرنا کا اور ناکام رہ گیا۔اور جتنے بھی یہ پیغمبروں کے اس قسم کے معجزات بتاتے ہیں کسی معجزے کے بعد بھی قرآن نے کہا ہے کہ وہ ساری قوم ایمان لے آئی اس کے بعد۔تو قوم تو اسی قسم کی کافر کی کافر رہی۔یہ پھر کیا ہوا یہ خدا نے یہ جو آخری حربہ جسے کہتے ہیں وہ بھی دکھا دیا اور وہ بھی پھر کارگر نہ ہوا قوم کافر کی کافر رہی 'تیلی وی کتا روکھاوی کھادا'۔معاذ اللہ معاذ اللہ۔کتنا بڑا اعتراض آ کے پڑتا ہے۔اور پھر وہ کیفیت یہ ہے کہ ناکام رہ رہے ہیں حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں ناکام رہا ہے تو اس کے بعد صالحؑ کے زمانے میں دہرا رہا ہے وہاں ناکام رہا ہے ھودؑ کے زمانے میں۔چلا جا رہا ہے اور ہر جگہ یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب اس کے بعد بھی وہ قوم ایمان نہ لائی۔اور یہ پھر دکھائے چلے جا رہے ہیں۔عزیزانِ من! (یحق اللہ الحق بکلمٰتہ) (10:82) وہ حق کو Establish کرتا ہے اپنے قوانین کی صداقتوں سے۔اور آگے ہے(و لو کرہ المجرمون) (10:82) دیکھئے وہ کونسا حق ہے جو Establish کرتا ہے؟ Exploitation کو روکنے والا جرم کو روکنے والا حق۔وہ تو شعبدہ بازی سے Establish نہیں ہوتا عزیزانِ من! یہ تو Establish ہوتا ہے کہ حق کو دنیا کے اندر سامنے لایا جائے اور حق کی علمبردار ایک قوم تیار کی جائے ایک نظام بنایا جائے جو اس حق کی بنیادوں کے اوپر اٹھے۔اور یہ ہے وہ الحق ثابت ہوتا ہے کلمات اللہ سے جو پھر

روکتا ہے مجرمین کوان کے جرم سے۔ورنہ نہ یہ زبانی دلائل روک سکتے ہیں نہ آپ کے ہاں کی کرامات روک سکتی ہیں نہ یہ شعبدہ بازیاں روک سکتی ہیں۔ یہ تونہیں جرم سے مجرمین کوروک سکتے ان کے جرائم کو۔کوئی مجرم قوم ان باتوں سے نہیں رکی۔ میں نے کہا ہے نا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ انبیاء نے یہ دکھایا قوم پھر ویسے کی ویسی رہی۔لہٰذا سوال یہ نہیں تھا۔الحق وہی تھا جو خدا کے قوانین کوانہوں نے پیش کیا تھا اور یہ رکنا اسی طرح سے تھا کہ اس مقابلے میں قوم اٹھی جوالحق کی علمبردار ہوتی تھی۔سورۃ یونس کی آیت 82 تک ہم آ گئے عزیزانِ من! 83 سے ہم آئندہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ تیرہواں باب (آیات 83 تا 93)

عزیزانِ من!

آج نومبر 1973ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی آیت 83 سے ہو رہا ہے۔ (10:83)

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس کے آخر میں جو آیات ہمارے سامنے آئی تھیں اس سلسلے میں میں نے عرض کیا تھا یہ آیات تھیں متعلق وہ صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسٰیؑ اور فرعون اور اس کے سرداروں کے مقابلے میں۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں عام تصور ہے کہ وہاں ان دونوں میں کچھ جادو کے مظاہرے ہوئے تھے۔ وہ جوان کے جادوگر تھے انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں وہ سانپ سپولیے بن گئے۔ حضرتِ موسٰیؑ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا اژدھا ان رسیوں کو نگل گیا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ قرآن نے جو حقائق بیان کیے ہیں ان کی صحیح تعبیر نہیں ہے۔ یہ اسرائیلیات جسے کہتے ہیں تورات کے بیان یہودیوں کے لٹریچر میں جو کچھ آیا ہے یہ وہی چیزیں جو ہمارے ہاں بھی متوارث چلی آ رہی ہیں۔ اور اس میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان چیزوں کو ہمارے ہاں پیش کیا گیا ہے گویا کہ خود نبی اکرم ﷺ نے ان آیات کی وہ تفسیر بیان فرمائی ہو۔ یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ نہ تو رسول اللہ ﷺ کی کوئی تفسیر ہمارے پاس ہے اور نہ ہی یہ چیزیں قرآن کی نسِ تعلیم کے ساتھ کچھ؟؟؟؟ ہیں۔ اور پھر آخری آیت تو جو ہمارے سامنے آئی تھی قرآن نے کہا تھا کہ (**و یحق اللہ الحق بکلمٰتہ و لو کرہ المجرمون**) (10:82) یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کہ جو اس طرح سے ظلم اور زیادتی کرتی تھی یہ قوم ان قوم کو کچھ روکنے کی بات ہے کچھ ایسا پروگرام ہے کہ جوان پہ ناگوار گذرے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ ظلم اور استبداد اور استحصال (Exploitation) پہ جو قوم اتری ہوئی ہو اس پہ تو کچھ اس کے مقابل میں ایسا نظام قائم کیا جائے قوت اس کے سامنے کھڑی جائے اس سے وہ روک ہوتی ہے۔ اور پھر قرآن نے یہ کہا تھا کہ وہ حق کو Establish کرنا چاہتا تھا خدا (**بکلمٰتہ**) اپنے قوانین کے ذریعے سے۔ یہ بڑی چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے وہ اس کے ذریعے سے حق کو Establish کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ہم قانون کی رو سے Establish کرنا چاہتے تھے حق کو متمکن کرنا چاہتے تھے اور ہم اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ ایک خلافِ قانون ایک روش اختیار کی گئی وہ جسے آپ جادو کے ذریعے سے عصا بن جانا اور رسیوں کا سپولیا بن جانا ہے وہ تو قانون کے مطابق نہیں ہے وہ تو قانون کے خلاف ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ ہم اپنے قانون کے ذریعے سے حق کو Establish کرنا چاہتے تھے' ہم کہتے ہیں کہ خلافِ قانون خلافِ فطرت خارقِ فطرت کوئی چیزیں وہاں لائی گئیں اور اس کے ذریعے سے حق کو Establish کیا۔ اور میں نے پھر آگے عرض کیا تھا کہ اس کے بعد جو یہ چیز کہی جاتی ہے کہ صاحب وہ یہ آخری ایک اسے تدبیر کہیے یہ آخری تدبیر ہے جو ہمارے ہاں کہی جاتی ہے کہ پھر انبیائے کرامؑ ایک معجزہ دکھاتے تھے۔ تو معجزے کے بعد تو ہونا چاہیے کہ وہ جتنی پوری کی پوری قوم ناظرین وہاں کے ہوں

وہ سارے ہی جھک جائیں۔ معجزہ کہتے ہی وہ ہیں کہ عاجز آ جائے اگلا۔ اس کے بعد تو ان سب کو ایمان لے آنا چاہیے نا اتنی بڑی چیز جو ہے۔ اور جتنی تاریخ ہمارے پاس انبیائے کرامؑ اور ان اقوام کی آتی ہے جن کے متعلق ہم یہ ذہن میں سمجھتے ہیں اور کہتے چلے آ رہے ہیں کہ انہوں نے انہیں معجزے دکھائے وہ قومیں ویسی کی ویسی کافر ہوتی ہیں۔ یعنی یہ آخری تدبیر بھی جو ہے یہ ضربِ آخر جسے کہا جا سکتا ہے کہ خارقِ فطرت ایک طریق Adopt کر کے اس کے ذریعے سے انہیں مجبور کیا جائے ایمان لائیں تو وہ ایمان تو پھر بھی نہ لائیں۔ قرآن خود بتاتا ہے کہ وہ ویسی کی ویسی رہیں۔ تو یہ ان چیزوں کی تعبیر و تفسیر ہی صحیح نہیں ہے۔ یہ انبیائے کرامؑ آتے تھے غلط اور صحیح کے اندر فرق کرنے کے لیے' صحیح اقدار اصول قوانین اور احکام دینے کے لیے۔ دلائل و براہین کی رو سے پیش کرتے تھے اور انہیں بھی کہتے تھے کہ تم دلیل و برہان کی رو سے انہیں مانو۔ جو مانتے تھے وہ اپنی غلط روش کو بدل لیتے تھے اس لیے اس کے نقصان رساں نتائج سے بچ جاتے تھے۔ جو اس روش کو نہیں بدلتے تھے غلط روش کے جو تباہ کن نتائج ہوتے ہیں وہ تھا جسے عذاب کہا جاتا ہے۔ یہ تھا سارا سلسلہ جو چلا آ رہا تھا۔ ہر چیز قاعدے قانون کے مطابق ہر چیز دلیل و برہان کی رو سے پیش کردہ دلیل و برہان کی رو سے تسلیم کردہ۔ کوئی چیز اس سارے سلسلے میں کوئی خارقِ عادت خارقِ فطرت Super-Natural جسے کہتے ہیں کوئی چیز ایسی نہیں۔ سوائے اس کے کہ نبی کو خدا کی طرف سے ایک علم ملتا تھا وہ تو ایک چیز تھی کہ جو عام قاعدے کے مطابق نہیں تھا وہ نبوت یا اس کی وحی۔ اور اس کے بعد جو کچھ بھی آگے ہوتا تھا وہ سارا قاعدے اور فطرت اور قانون کے مطابق ہوتا تھا۔ یہی چیز جو میں نے کہی ہے کہ اگر یہ چیز مانی جائے کہ صاحب اُنہوں نے اتنا بڑا معجزہ جسے آپ کہتے ہیں صاحب اور وہ فرعون نے اپنے سارے ملک کے جسے کہہ رہے ہیں ساحرین بلا لیے ہوئے تھے۔ اور پھر اس نے یہ کہا تھا کہ جشن کے دن یہ اجتماع ہوگا اور بہت بڑا اکھاڑہ تھا جو اس نے اکٹھا کیا۔ تو اتنی بڑی چیز اس کے سامنے پھر معرکہ ہوتا ہے اس معرکے میں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی یہ چھوٹی چھوٹی رسیوں کی سانپ سپو لیے جتنے بنے حضرتِ موسٰیؑ کا عصا اژدھا بن کے ان کو نگل گیا۔ تو وہ تو پورے کا پورا ملک وہاں موجود تھا ان تمام کو وہاں سجدہ ریز ہو جانا چاہیے تھا۔ ایسا تو نہیں ہوا۔ جو ہوا وہ اگلی آیت میں قرآن بتا رہا ہے۔

(فما اٰمن لموسٰی الا ذریۃ من قومہ علٰی خوف من فرعون و ملائھم ان یفتنھم) (10:83) حضرتِ موسٰیؑ کی اپنی قوم کے کچھ نوجوان تھے جو ایمان لائے تھے۔ یہ باقی قوم وہ قومِ فرعون جو تھی اس کو تو الگ چھوڑیئے وہ تو انہوں نے بتایا ہے کہ ساحرین میں سے کچھ تھے جنہوں نے حقیقت کو دیکھا۔ اور میں نے کہا تھا کہ وہ ساحر کے معنی جادوگر نہیں ہیں اس کے معنی باطل پرست ہیں' غلط مذہب کے پیراؤ جو مذہبی پیشوائیت لے کے آتے ہیں انہیں کہا جاتا ہے۔ کئی دفعہ میں ان کو پیش کر چکا ہوں آگے بھی جب وہ آئیں گے الفاظ تو میں عرض کرونگا کہ ان کا مفہوم قرآن کی رو سے کیا ہے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا وہ جو باطل کے دلائل پیش کرنے والے آئے تھے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ حق ہمارے پاس نہیں ہے یہ بات حقیقت کی کہہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی قوم میں سے بھی قرآن کہتا ہے خود حضرتِ موسٰیؑ کی قوم میں سے کچھ

نوجوان ایمان لائے حضرتِ موسٰیؑ کے اوپر۔اس لیے کہ فرعون کے استبداد سے سب ڈرتے تھے انہیں خوف تھا کہ اگر ہم اس طرح سے موسٰیؑ پر ایمان لے آئے تو ہمیں یہ تختۂ مشق بنادے گا ہم پہ ظلم وستم کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔آیت کے اگلے حصے میں بتایا ہے کیوں وہ ڈرتے تھے۔(و **ان فرعون لعالٍ فی الارض و انه لمن المسرفین**) (10:83) وہ بڑا ہی سرکش تھا ملک کے اندر۔اور اپنے مخالفین سے انتقام لینے میں حدود فراموش واقع ہوا تھا۔مسرفین کا عجیب لفظ یہاں آیا ہے۔انتہا تک چلا جاتا تھا۔آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ من! کیا چیز ہے جس نے فرعون کو فرعونیت کا مجسمہ سرکشی اور بغاوت اور ظلم اور استبداد کس بات میں ہے۔یہ کہ کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل نہ کرے یہی کہا گیا ہے نا۔تو وہ لوگ اس ڈر کے مارے کہ فرعون اس قدر وہ مجسمہ ہے فرعونیت اور استبداد کا وہ ہم پہ ظلم نہ کرے وہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کر رہے۔تو قرآن نے یہ چیز فرعونیت کا استبداد کہی کہ کسی کو مجبور کیا جائے کہ وہ مذہب تبدیل نہ کرے۔اور آج آپ کے ہاں معلوم ہے کہ اسلام میں کیا چیز فخر سے بیان کی جاتی ہے 'مرتد کی سزا قتل ہے' یعنی یہاں مذہبی آزادی نہیں ہے۔کیا فرق ہے اس میں اور اُس میں۔وہ بھی تو یہی کہتا تھا نا کہ جس مذہب کے اوپر تم ہو اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔تبدیل کرنے والوں کے ساتھ جو کچھ وہ کرتا تھا قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ اتنے سخت مظالم تھے کہ اس کے ڈر کی وجہ سے لوگ ایمان نہیں لا رہے تھے۔بڑا ہی مستبد اور ظالم تھا حدود فراموش تھا۔اس سے زیادہ حدود فراموشی کیا ہوگی کہ صاحب آپ مذہب تبدیل کرنے والی کی سزا موت تجویز کر رہے ہیں۔وہ تو شاید اس سے کچھ کم ہی سزا دیتا ہوگا۔آپ غور کرتے ہیں قرآن جس پہ وہ کہتے ہیں کہ کہاں ہے یہ مذہبی آزادی اور کہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ تبدیلیِ مذہب جو ہے اس کے خلاف ایکشن لینا جرم ہے۔دیکھئے تو سہی قرآن کن الفاظ میں کہتا ہے کہاں کہا ہے اس چیز کا کہ فرعون جو تھا بڑا ہی سرکش تھا بڑا ظالم تھا بڑا مستبد تھا کس مقام پہ کہا ہے؟ کہ وہ لوگوں کو اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ مذہب تبدیل کریں۔اور جہاں اس کے اپنے ہاں کے وہ کچھ جو پروہت آئے ہوئے تھے انہوں نے حضرتِ موسٰیؑ کی طرف حق کو دیکھ کر یہ کہا کہ ہاں ہم تسلیم کرتے ہیں ان صداقتوں کو جو تو پیش کرتا ہے۔تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ گرجتے کڑکتے برستے ہوئے فرعون نے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ میری اجازت کے بغیر ہی تم نے یہ تسلیم کرلیا۔یہ ہے استبداد۔استبدادِ ملوکیت Conscious یا دلیل کی آزادی نہیں دینا چاہتا وہ تبدیلیِ مذہب کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔قرآن وہاں بتاتا ہے کہ فرعون نے کہا یہ تھا کہ میری اجازت کے بغیر تم نے یہ کچھ کرلیا۔اور اس کے بعد تم نے کہا کہ دیکھو میں کس طرح سے تمہیں صلیب پہ دیتا ہوں کس طرح سے تمہارے اعضاء کاٹتا ہوں کس طرح ٹکڑے ٹکڑے تمہارے کر دیتا ہوں کھال کھنچوا دیتا ہوں درختوں کے ساتھ پھانسی پہ لٹکا دیتا ہوں۔یعنی یہ سزا وہ دے رہا ہے۔کس بات کی صاحب کس جرم کی سزا دے رہا ہے؟ اور اس کا تو جواب خود ان ساحرین ان کے اس مذہبی پیشواؤں نے دیدیا تھا جنہوں نے مذہب تبدیل کیا تھا۔کہا تھا کہ الحمدللہ کہ ہمارے خلاف تم نے کوئی اور جھوٹا الزام عائد نہیں کر دیا اتنا ہی کہا ہے نا کہ تم نے اپنا یہ عقیدہ تبدیل کیوں کیا۔ہم نے کیا کہ ہم نے صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا۔باقی رہی تیری یہ دھمکیاں اور تیری یہ انتقام لینے کی اس قدر؟؟؟؟ اور ترغیب۔عجیب چیز ہے

عزیزانِ من! آزادقوم کے افرادکفر میں بھی آپ دیکھئے کتنی بڑی جرآتوں کے مالک ہوتے ہیں۔کہا کہ فرعون تجھے اپنے متعلق کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ تیرے اختیارات حدودفراموش ہیں اس کی حدیں بڑی وسیع ہیں۔کہا یہ غلط فہمی ہے۔سنیئے عزیزانِ من! کیا کہا ہے کہا کہ تیرااختیارزیادہ سے زیادہ انسان کی طبعی زندگی تک ہے اسے تو لے سکتا ہے۔اورزندگی تو اس سے بھی آگے چلتی ہے وہاں تو تیرے باپ کا بھی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔آہاہاہا۔اوراس کے بعد یہ کہاانہوں نے کہ (فـقـذما انت ؟؟) جوتو کرنا چاہتا ہے کرلے۔تو کرہی کیا سکتا ہے؟ یہ طبعی جسم کی جوجان ہے اسی کو لے لے گا نا زیادہ سے زیادہ۔اوراس کی حیثیت کیا ہے اس زندگی کے مقابل میں جوحیاتِ جاویداں انسان کو ملتی ہے وہاں تک تو پہنچ ہی نہیں سکتا تیراخیال نہیں پہنچ سکتا ہاتھ کہاں پہنچے گا۔یہ تھا جواب جوانہوں نے دیا تھا۔تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ فرعون کے خلاف جرم کیا عائد کیا جارہا ہے؟ وہ اجازت ہی نہیں دیتا تھا کہ اگر کسی مذہب کو کوئی اپنی دانست میں صحیح سمجھتا ہے تو اسے اختیار کرے۔اسی کو آپ کے ہاں ارتداد کہا جاتا ہے نا۔

ایک طرف آپ ساری دنیا کو یہ کہتے ہیں کہ قرآن آزادیٔ فکراورحریتِ نگاہ کا پیغامبر بن کے آیا۔بڑے فخر سے دنیا میں کہتے ہیں صاحب۔اوراس کے بعدصورت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں کہیں بھی یہ چیز نہیں ہے' اس کے بعد کہتے یہ ہیں کہ کسی شخص کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا مذہب یہاں تبدیل کرلے۔ہاں غیر مذہب والے مذہب تبدیل کرکے اسلام میں تو آسکتے ہیں وہاں تک کی تو اجازت ہے انہیں۔اور اگر یہاں کسی کا دل نہ ٹھکے تمہارے اس اسلام پہ جوتم پیش کررہے ہواوراس کے بعد یہ واپس جانا چاہیے تو یہ کہدو کہ نہیں صاحب ون وے ٹریفک ہے یہاں سے تم واپس نہیں جاسکتے۔کہ جی کوئی اورراستہ بتا دیجیے؟ جی سب راستے بند ہیں۔اوراگروہ یہاں اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق چلنا چاہتا ہے جس کو صحیح سمجھتا ہے کرتا ہے اس کو کہتے ہیں سزائے موت ہے تمہاری۔کیا فرق ہے اورفرعونیت میں اورآپ کے اس فتوے کے اندر۔بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے اس کو۔قرآن کہتا یہ ہے کہ وہ فرعون کے استبداد کے ڈر کے مارے وہ لوگ تبدیل نہیں کررہے تھے اپنا مذہب' ایمان نہیں لارہے تھے۔ہاں یہاں جو بات قرآن نے کہی کچھ نوجوان قومِ موسٰیؑ کے اور یہاں یہ بتایا فرق وہ بڑے بوڑھے جنہوں نے اپنی عمرغلامی کے اندربسر کی ہوان کے حوصلے پست ان کی جرآتیں مسلوب ہوچکی ہوتی ہیں۔ان میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اتنا بڑا رسک مول لے لیں اتنے بڑے خوف کے مقابلے میں ڈٹ کے کھڑے ہوجائیں۔نوجوانوں میں یہ بات ہوتی ہے وہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔تو قرآن آپ دیکھتے ہیں صدیوں پہلے کی جو بات تھی وہ آج بھی حقیقت ہے۔اس قسم کی جرآت کی آماجگاہ نوجوانوں کا عزم اوران کا سینہ ہوتا ہے صاحب۔یہ بڑے بوڑھے جو ہیں ان میں یہ ہمت باقی نہیں رہتی۔وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ وہ بڑا بوڑھا تو اگرکسی دن اس کی چارپائی اس کمرے سے ہٹا دی جائے جہاں روزسوتا ہے دوسرے کمرے میں اسے نیند نہیں آتی بیچارے کو۔وہ اتنی سی تبدیلی بھی کو وہ Adopt نہیں کرتا' اتنی بڑی تبدیلی اتنا بڑاانقلاب بڑی مشکل ہوتی ہے اس کے لیے۔میں یہ نہیں کہتا کہ یہ Rule ہے قانون ہے قاعدہ ہے۔یعنی عمومی حالت یہ

ہوتی ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ قومِ موسیٰؑ کے بھی چند نوجوان تھے وہ ایمان لائے باقی ڈرتے رہے کہ معلوم نہیں اس کا استبداد کیا کردے۔ وہی ارتداد کی سزا جو تھی۔

(و قال موسیٰ یقوم ان کنتم اٰمنتم باللہ فعلیہ تو کلوا ان کنتم مسلمین) (10:84) بڑی عجیب چیز یہاں آئی ہے عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ کہی کہ جب تم خدا پر ایمان لے آئے ہو آگے ہے تو پھر تمہیں چاہیے **(علیہ تو کلوا)** ۔

لفظِ توکل اگر میں بولوں تو آپ دیکھیں گے ذہن کہاں چلا جائے گا۔ یہ توکل علی اللہ جسے ہم کہتے ہیں وہ کیا ہوتا ہے یعنی کچھ نہ کرنا کوئی تدبیر نہ کرنا کوئی وسیلہ کوئی ذریعہ کچھ نہ کرنا بیٹھے رہنا' بیٹھے ہیں جی توکل علی اللہ۔ یہ ہے نامفہوم آپ کے ہاں آ گیا توکل علی اللہ کا۔ اللہ توکلی صاحب چل پڑے ہیں ہم دیکھئے جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ ہے اللہ توکل کے معنی آپ کے ہاں۔ اور خود عربی زبان کے اندر یہ توکل ہے وہ مضبوط رسی جس کے اوپر اتنا بھروسہ ہو کہ جتنا وزن اس کے ساتھ باندھا گیا ہے یہ آخر تک اٹھالے گی ٹوٹے گی نہیں۔ یہ کلمات تھے ناجن کے ذریعے سے خدا اپنے حق کو Establish کر رہا تھا متمکن کرتا تھا۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ یاد رکھئے کہ یہ **(فمن یکفر بالطاغوت و یؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لن فساملھا)** جس نے غیر خداوندی قوانین سے انکار کیا اور خداوندی کی صداقتوں کو مان لیا اُنہوں نے اتنا محکم سہارا تھام لیا کہ جو کبھی ٹوٹے گا نہیں دغا نہیں ان کو دے گا۔ یہ کیا چیز ہے محکم سہارا: خدا کے قوانین' وہ کبھی ٹوٹتے ہی نہیں ہیں کبھی دغا ہی نہیں دیتے صاحب۔ آپ کچھ کیجیے آگ پر پانی رکھئے وہ گرم کرے گی۔ کبھی ساری عمر میں اس نے دھوکا دیا ہے اس قانونِ خداوندی نے؟ کبھی ایسا ہوا ہے کہ یہ کیا ہوا اور ایک دن بھی وہ آگ کہدے کہ میں تو ٹھنڈک پہنچاؤنگی؟ کبھی ایسا ہوا ہے کہ پیاس کے لیے پانی پیا ہو آپ نے وہ پیاس بجھائے نہیں وہ آگ لگا دے کہیں پر۔ یہ ہیں جنہیں قوانینِ خداوندی پر توکل جسے کہتے ہیں۔ یہ ہے محسوس دنیا کے اندر جسے ہم روز دیکھتے ہیں۔ اور یہ جو چیز ہے کہ ظلم پنپ نہیں سکتا یہ بھی اسی قسم کا ایک قانون ہے یہ قانون ہے قرآن کہتا ہے۔ سوال اتنا ہی ہے کہ کیا آپ اس کی محکمیت پر بھی اسی قسم کا یقین رکھتے ہیں جیسے اس پہ یقین رکھتے ہیں کہ آگ ضرور جلائے گی۔ اسے توکل کہتے ہیں: خدا کے ان قوانین پر اتنا بڑا اعتماد کہ نہیں یہ کبھی دھوکا نہیں دیں گے۔ ہم جو بعض اوقات کبھی خدا پرست بننے کا خیال بھی کرتے ہیں اور اس کے اوپر عمل بھی شروع کرتے ہیں کہ ہاں صاحب ہم دیانتدار رہیں گے ہم امانتدار رہیں گے۔ وہ دو ایک جب آپ کو سامنے سے ناکامیاں آتی ہیں تو آپ حوصلہ چھوڑ دیتے ہیں کہ نہیں صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ یہی طریقہ ٹھیک ہے جو دنیا نے اختیار کر رکھا ہے' صاحب بس طریقہ یہی ہے۔ کیا کیا آپ نے؟ آپ نے کہدیا کہ میں نے جو پہلے دن کہا تھا کہ خدا کا یہ قانون جو ہے وہ قابلِ اعتماد ہے وہ حقیقی ہے یقینی ہے' چار ہی قدم کے بعد آپ نے کہدیا کہ نہیں غلط ہے۔ یہ ہے عدمِ توکل: آپ کو بھروسہ نہیں رہا اس قوانین کی صداقت پر۔ وقت لگے گا اس کے لیے بیج ڈالنے میں اور کھیتی کے پکنے میں تو ایک وقت لگتا ہے۔ اس دوران میں اس کسان کا یہ یقین توکل ہے نا اس کسان کا جو اس کو چھ مہینے تک ہر روز برابر محنت

پہ مصروف رکھتا ہے۔ حالانکہ شام کو کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں آتا محنت ہی محنت کیے چلا جاتا ہے۔ یہ کس بھروسے پہ یہ چھ مہینے تک محنت بلا مزدو معاوضہ کیے جا رہا ہے؟ خدا کے اس قانون کے توکل پر کہ ایک دن ایک ایک دانہ سات سات سودانے مجھے دے گا۔ راستے میں جہاں یہ توکل ٹوٹے سبز کھیتی بیلوں کو چرا دیتے ہیں وہ کسان۔ اسے کہتے ہیں توکل۔ کہا کہ جب تم ان قوانین کی صداقتوں پر ایمان لے آئے ہو ان کو مان لیا ہے تم نے کہ یہ واقعی ہے تو اس کے بعد (**فتوکلوا**) ان پہ بھروسہ کرنا ہوگا اعتماد کرنا ہوگا۔ موانعات بہت آئیں گی' ابھی تم دیکھو گے کہ فرعون کیا کچھ کرے گا۔ اور اگر وہیں سے تم نے یہ کہہ دیا کہ نہیں صاحب بات تو وہی ٹھیک ہے جو فرعون کہتا ہے ہم نے یونہی کچھ کیا تو پھر غلط ہے۔ یہاں کہا ہے جب تم ایمان لے آئے ہو (**ان کنتم باللہ فعلیہ توکلوا**) (10:84) پھر تمہیں بھروسہ کرنا ہوگا راستے میں نہیں چھوڑ دینا ہوگا۔ آگے ہے (**ان کنتم مسلمین**) (10:84) میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہاں ایمان میں مسلم اور مومن میں فرق عجیب کیا ہے۔ حالانکہ ویسے تو مومن کا مقام بہت اونچا مقام ہے لیکن یہاں صرف معنوی اعتبار سے بات کہی کہ مومن تو صرف وہ ہوا کہ جس نے اس صداقت پر یقین کر لیا اور کہہ دیا کہ ہاں میں نے یقین کیا۔ بس یہ چیز جو ہے یہ کہہ دینے کی ہے' کیا اتنا کافی ہے کہ یہ اپنے نتائج بھی برآمد کر دے؟ اتنا کافی نہیں ہے۔ ایک قدم آگے چلئے۔ ہم یہ کہتے ہیں نا کہ چلئے ایک ایمان تو وہ ہوا جو ہم کہتے ہیں کہ صاحب وراثتاً پیدائشی طور پر ہم مسلمان ہو گئے اسلام پہ ہم ایمان لے آئے یہ ایمان نہیں ہے۔ دوسرا ایمان وہ ہے نا جسے ہم کہتے ہیں کہ عقل و بصیرت کی بنیادوں کے اوپر دلیل و برہان کی رو سے علم و بصیرت سے سمجھ سوچ کر اس طرح سے ایمان لایا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سمجھ سوچ کر ایمان لانے سے بھی آگے انسان اس چیز پہ آمادہ ہو جاتا ہے پھر کہ جتنی مصیبتیں راستے میں آئیں برداشت کرے اور اس یقین کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ایسا بھی نہیں ہوتا یا کم از کم کم ہوتا ہے۔

یہ صرف ذہنی طور پہ ایمان لے آنا بھی جو ہے یہ کافی نہیں ہوتا۔ اس سے Reason کے اعتبار سے آپ دوسروں کو قائل کر سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا یہ ایمان دلیلوں کے سہارے پہ ہوتا ہے لیکن وہ جو عمل کا محرک جذبہ ہے وہ انسان کا ذہن نہیں ہوتا۔ وہ جو قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے نا کہ (**ولما یدخلل ایمان فی قلوبھم**) ایمان دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ابھی۔ اس کی بھی ضرورت ہے اس کے ساتھ۔ یہ دل کی گہرائیوں میں ایمان کا اترنا کیا ہے عمل کا محرک کیا چیز ہوتی ہے۔ سمجھنا سوچنا ٹھیک ہے۔ عمل کا محرک انسان کا جذبہ ہوتا ہے کسی کام کرنے کی آرزو ہوتی ہے ایک خواہش ہوتی ہے۔ یہ خواہش صرف دلیل و برہان کی پیدا کردہ چیز نہیں ہے آرزو اور مدعا اور مقصد جو ہے اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پانی پیاس بجھاتا ہے بالکل علیٰ وجہ البصیرت آپ اس کو جانتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ پانی پینے کے لیے اٹھتے نہیں ہیں اٹھتے اس وقت ہیں جب اندر سے پیاس لگتی ہے آپ کو' پھر اٹھتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب پیاس کی شدت بڑھتی چلی جاتی ہے اس کے بعد کتنے ہی موانع کیوں نہ ہوں پانی کے اور آپ کے درمیان ان کو آپ ہٹاتے چلے جاتے ہیں۔ کتنی

مصیبتیں بعض اوقات اٹھانی پڑتی ہیں ایک مٹکی پانی کے لیے۔ یہ کس بات کے لیے ہے؟ یہ نہیں تھا کہ آپ نے ذہنی طور پہ یہ سمجھ لیا تھا Intelectually آپ Satisfy ہوگئے تھے کہ ہاں پانی پیاس بجھاتا ہے۔ اتنی سی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد پانی کے لیے آپ اٹھے اس وقت ہیں جب اندر سے پانی کا تقاضا ہوا ہے آپ کا۔ یہ تقاضا بڑی ضروری چیز ہے یہ ہے وہ جو عمل کا محرک بنتا ہے۔ صرف سمجھ لینا نہیں عزیزانِ من!۔ اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک فلاسفر جو ہے وہ پھر اس قسم کا مردِ غازی اور مردِ مجاہد بھی بن جائے۔ وہ بن جائے تو کیا کہنے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ خالی ذہن کا اطمینان انسان کو آمادہ باعمل نہیں کرسکتا۔ یہ اندر شدت ہے آپ کے ایک تقاضے کی ایک آرزو کی جو عمل کا محرک بنتا ہے۔ اور اسے قرآن نے کہا ہے دل کی گہرائیوں میں ایمان کا چلا جانا۔ یہ چیز کیسے حاصل ہوتی ہے؟ یہ چیز حاصل ہوتی ہے اس چیز سے کہ جس طرح سے ہم نے یہ دیکھا کہ سنکھیا کھانے سے انسان کی ہلاکت ہوجاتی ہے اسی طرح سے یہ آپ کو یقین کی چیز ہو کہ جھوٹ بولنے سے بھی انسان کی ہلاکت ہوجاتی ہے' ناجائز کمائی سے بھی انسان کی ہلاکت ہوجاتی ہے۔ اب جو آپ کے ہاں جذبہ ابھرے گا ناجائز کمائی کی طرف لے جانے کے لیے' عقلِ حیلہ جو تو آپ کو اس کے لیے طریقے بھی سجھا دے گی اس کی Justification کے لیے دلائل بھی بہم پہنچا دے گی ''سارا زمانہ ہی کچھ کرتا ہے میاں تم رہ گئے مومن بننے کے لیے اور دیکھ لیا تھا نا مومن بن کے بھی فلاں آدمی نے' پٹ رہا ہے کوئی پوچھ ہی نہیں رہا' چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ یہ آئی عقلِ حیلہ جوئی اس کو کون چیز روک سکتا ہے؟ ایک چیز یاد رکھئے جذبے کو ہمیشہ جذبہ روکتا ہے ذہنی دلیل نہیں روکتی۔ جذبہ یہ ہے مال کی محبت کہ جو طریقہ بھی ہو استعمال کرلو مال اتنا آئے گا دوسرا جذبہ یہ ہے کہ ناجائز مال سے میرا بہت بڑا نقصان ہوجائے گا میری ہلاکت ہوجائے گی وہ جسے آپ میں کہتے ہیں جسے آپ اپنی ذات کہتے ہیں۔ بہرحال یہ کہ میرا اتنا نقصان اس سے ہوجائے گا یہ جذبہ اگر شدید آپ کے ہاں کا ہے تو وہ مال کے محبت کی جذبے کا توڑ یہ جذبہ ہوسکتا ہے۔ ورنہ ذہنی طور پہ تو یہ سارے جانتے ہیں جتنا بھی یہ جو کچھ کرنے والے ہیں کسی وقت بھی ان سے بات کرکے دیکھئے وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے صاحب دیانتداری اچھی چیز ہے سچ بولنا بہت اچھا ہے یہ سب کچھ بھی ہے جانتا ہوں۔ بات دوسری طرف نکل جائے گی چھڑ گئی ہے تو جی نہیں چاہتا تشنہ چھوڑنے کو۔ بات یہ چلی تھی یونان کے فلاسفر سے سقراط کا مقام سب سے اونچا ہے ان میں۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ انسان غلط کوشی جو کرتا ہے غلط راستے پہ چلتا ہے تو اس لیے کہ اسے صحیح راستے کا علم نہیں ہوتا۔ اُس نے کہا تھا کہ Knowledge ہے جو Virtue کا ذریعہ بنتا ہے علم اگر صحیح ہوجائے انسان کا تو پھر وہ غلط کام نہیں کرتا۔ یہ اس کا فلسفہ ہے۔ بہرحال یہ جو تھے فلاسفران کا کمال یہ تھا کہ ان کے پاس Logic اتنا بڑا ہوتا تھا منطقی دلائل اتنے بڑے ہوتے تھے کہ وہ واقعی ایک عصا کو سانپ بنا کے دکھا دیتے تھے الفاظ کے ذریعے سے۔ دلائل اس کے پاس بھی بڑے ہیں لیکن اس اڑھائی ہزار سال میں اس کے خلاف بھی بہت کچھ کہا گیا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ صرف علم ہونے سے انسان کے لیے وہ محرک جذبہ نہیں بن سکتا عمل کا۔ اس کے لیے بھی بہت سے دلائل ہیں اور فلسفہ اس کے متعلق بھی آیا ہے۔ اور یہ تو اب ہمارا مشاہدہ ہے کہ واقعی جذبہ محرکہ نہیں بنتا' جانتے بوجھتے یہ کتنے ہیں آپ کے

ہاں کے معاشرے میں یہ غلط کوش اور غلط کار جو ہیں کیا یہ جہالت کی بناء پہ ایسا کرتے ہیں۔کون نہیں جانتا ان میں سے کہ یہ برا ہے۔اور اس کا تو تجربہ کرنا ہو کر لیجیے جو کچھ وہ دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں نا ایک دن ان کے ساتھ یہ کر دیکھئے' دیکھئے کیسے چلا اٹھتے ہیں کہ صاحب یہ حالت ہوگئی ہے دنیا کی آج۔تو گویا جانتے تو یہ سب ہیں۔تو میں نے یہ کہا تھا کہ بات اس نے وہاں یہ کہی سقراط نے۔ یہاں اس نے بڑے سادے الفاظ میں ہمارے اس غالب نے اس کو بیان کر دیا کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اور ہمارے ہاں تو ننانوے فیصد عزیزانِ من! ہیں ہی وہ کہ جانتے ہیں ثوابِ طاعت وزہد' پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ یہ کم بخت طبیعت کیا ہے جو اِدھر نہیں آتی۔جاننے کا تعلق انسان کے دماغ ذہن علم Intellect سے ہے۔اِدھر آنے کے لیے جو اس نے کہا یہ طبیعت یہ انسان کا جذبہ ہے جذبات ہیں۔قرآن انسان کے جذبات کا رخ موڑ دیتا ہے۔جاننا نہایت ضروری ہے پہلا چیز جاننا ضروری ہے کہ سنکھیا ہے یہ اور یہ مصری ہے ۔اس کا تعلق خالص علم سے ہے جذبات سے نہیں ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ دونوں میں فرق کریں۔اگلی چیز جو یہ ہے کہ ایک جذبۂ محرکہ وہ آتا ہے وہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب مجھے اب خودکشی کر لینی چاہیے وہ جانتا ہے خودکشی کے لیے سنکھیا مفید ہوتا ہے وہ اسے پھانک لیتا ہے۔ جذبہ ہے یہ ذہن کی بات نہیں ہے۔دوسرا کہتا ہے کہ نہیں مجھے تو ہلاکت سے بچنا ہے جان کی حفاظت کرنی ہے سنکھیے کی پڑیا نہیں کھائے گا۔ یہ جو دوسری چیز ہے نا یہ ہے جسے آپ کہتے ہیں محرک جذبہ کا۔ یہاں جو قرآن نے دو لفظ کہے ہیں اس بات کو تو پھیلانے سے بہت پھیلایا جا سکتا ہے بڑی اہم چیز ہے یہ۔ یہاں قرآن نے جو کہا یہ نا پہلا حصہ جو ہے(**ان کنتم امنتم باللہ**) (10:84)اب جبکہ تم ان صداقتوں کا اقرار کر چکے ہو تو پھر تمہیں ان کے اوپر پورا بھروسہ کر کے جم کے کھڑا ہونا ہوگا(**ان کنتم مسلمین**) (10:84)ایک ہی آیت میں دو دفعہ **ان کنتم** آیا ہے۔اگر تم واقعی ان کے سامنے پھر جھکتے ہو تو پہلا جو امنتم ہے وہ ہے اقرار صرف اور اقرار تو قرآن اسی کو اقرار مانتا ہے جو انسان اپنے ذہنی بصیرت علم فہم کے پورے اطمینان کے بعد اقرار کرے۔ یہ اقرار اس طرح سے تھا۔لیکن آگے ایک اور شرط ہے کہ ان کے اوپر پورا بھروسہ رکھو اگر واقعی تم پھر اب ان کے سامنے جھکتے بھی ہو تو۔ یہ جو ہے نا سامنے جھکنا یہ ہے جہاں جذبات جھک جاتے ہیں صحیح جذبات کے سامنے غلط جذبات کو جھکانا پڑتا ہے۔ یہ وہ چیز جو حضورِ نبی اکرم ﷺ نے وہ اپنے ایک فقرے میں کہا ہوا ہے کئی دفعہ دہرا چکا ہوں۔حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر شخص کا اپنا اپنا ابلیس ہوتا ہے' صحابہؓ نے پوچھا تھا کہ حضور ﷺ کیا آپ ﷺ کا بھی ابلیس ہے' کہنے ﷺ لگے ہاں میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہوا ہے۔بڑی عجیب چیز ہے عزیزانِ من! یہ ابلیس ہے جسے آپ جذبات کہتے ہیں۔جب آپ اسے بیباک چھوڑ دیتے ہیں تو آپ کو یہ غلط راستوں پہ لے جاتا ہے جس کا نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ابلیس کے معنی ہی مایوس ہیں۔اور جب آپ اسے مسلمان کر لیتے ہیں تو یہی

جذبات آپ کے لیے وہ جو جذبہ ہے آپ کو جو پہلا جذبہ جو تھا اپنی جان کی حفاظت کے لیے پھر وہ وہ کچھ آپ سے کراتا ہے جس پہ حیاء ماتم کرے شرم ڈوب کر مر جائے۔ وہی جذبہ جو ہے آپ کا پھر اس پہ آمادہ کرتا ہے کہ آپ ہنستے کھیلتے ہوئے میدانِ جنگ میں جان دیدیں۔ یہاں جو کہا ہے نا کہ جب تم اقرار کر چکے ہو کہ یہ صداقت ہے پھر اس پر جم کے کھڑا ہونا اور وہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے (**ان کنتم مسلمین**) (10:84) جب تم پھر یہ دل کی گہرائیوں سے اس کے سامنے جھک جاؤ۔ تو یہ دو چیزیں ضروری ہوئیں بلکہ تین عزیزانِ من! جیسے میں نے کہا تھا ایک تو یہ کہ محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے یاد رکھئے مسلمان نہیں ہوتا انسان۔ مسلمان قوم کا فرد تو وہ بن جاتا ہے اس کو سمجھ لیجیے گا شمار قومی اعتبار سے مسلمان کی قوم میں ہوگا کفار کی قوم میں نہیں ہوگا۔ لیکن ایمان ایک چیز ہے جو خود ایک چیز عمل ہے وہ کرنا ہوتا ہے کچھ یعنی عقل و فکر کی رو سے ان صداقتوں کو صحیح ماننا۔ اگر آپ ان کو صحیح ماننے کے قابل ہو جائیں تو پھر آپ مومن ہیں ورنہ نہیں۔ یہ صرف مان لینا ہوگا یہ بھی عمل کے لیے کافی نہیں ہے۔ عمل کے لیے اگلی چیز یہ ہے کہ آپ کے جذبات اس کے تابع آ جائیں ابلیس مسلمان ہو جائے گا۔ تو یہ کہا کہ (**ان کنتم مسلمین**) اقرار تو تم نے کر لیا ہے اور اگر واقعی اپنے جذبات کو اس کے تابع رکھنا چاہتے ہو تو پھر (**فتوکلوا**) (10:84) بھروسہ کرنا ہوگا اس لیے کہ راستے میں بڑی تکالیف آئیں گی۔ اور اگر ان تکلیفوں کا سامنا کرنے کے بعد آپ نے کسی وقت بھی کہہ دیا کہ نہیں صاحب اس پہ نہیں یہ بات' بات وہی ٹھیک تھی۔ تو پھر آج ہی یہ کچھ مصیبت سہیڑتے ہیں آپ' قصہ ختم کیجیے۔ (**فقالوا علی اللہ توکلنا**) (10:85) کیا بات ہے!!!

وہ نوجوان طبقہ جو قوم کا ہے یہ اس کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اُنہوں نے کہا کیا کہا ہے آپ نے۔ جواب دیا کہ جب ہم نے اقرار کیا ہے تو دل کی گہرائیوں سے اقرار کیا ہے (**علی اللہ توکلنا**) (10:85) ہم خدا کے قوانین پہ پورا پورا بھروسہ رکھیں گے۔ کبھی یہ واہمہ اور شائبہ تک بھی دل میں نہیں گذرے گا کہ شاید ٹھیک ہو یا شاید نہ ہی ٹھیک ہو' یہ جو اس نے کہا ہے کہ حق جو ہے ہمیشہ آخر میں غالب آتا ہے تو شاید نہ ہی ٹھیک ہو۔ کہا یہ کبھی نہیں ہوگا۔ **توکل** ہم اس پہ کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر اس بھروسے کے لیے ایک آرزو دل سے ابھرتی ہے (**ربنا لا تجعلنا فتنۃً للقوم الظٰلمین . و نجنا برحمتک من القوم الکٰفرین**) (10:85-86) اے ہمارے نشوونما دینے والے ! آرزو یہی ہے کہ ہمیں اس ظالم قوم کا تختۂ مشق نہ بنا۔ فتنہ وہ بھٹی ہوتی ہے جس کے اندر ڈالا جاتا ہے۔ اس بھٹی میں ڈالے جائیں تو ہم راکھ نہ بنیں کندن بن کے نکلیں۔ اور ہمیں اپنی رحمت سے (رحمت میں نے کہا ہے نا کہ وحیٔ خداوندی کو رحمت کہا گیا ہے) اس انکار کرنے والی سرکش قوم کے ظوالم سے محفوظ رکھنا ہم کو۔ یہ دعا تھی۔ اب پروگرام آیا سامنے۔ وہی بات دیکھتے چلے جایئے جو ذہن میں تھا کہ صاحب وہ تو انہوں نے عصا پھینکا اژدھا بنا بس معاملہ ختم ہو گیا۔ اس کے لیے تو نہ کسی نوجوانوں کے ایمان کی ضرورت تھی نہ کسی قوم کی تربیت کی ضرورت تھی نہ ان مشقتیں اٹھانے کی بات تھی۔ اوا تنا بڑا معجزہ جب دکھا دیا جائے اور وہ تو دکھانا تھا حضرتِ موسٰیؑ نے اکیلے' قوم نے تو کچھ کرنا ہی نہیں تھا۔ لیکن

آپ دیکھتے ہیں پروگرام کیا بنتا چلا آ رہا ہے وہ ایمان لا رہے ہیں اتنا بڑا یقینِ محکم پیدا ہو رہا ہے۔

(و اوحینا الٰی موسٰی و اخیه ان تبوا لقومکما بمصر بیوتًا) (10:87) آپ کو معلوم ہے کہ یہ قوم بنی اسرائیل محکوم تھی فرعون کی اور ان کے ملکِ مصر میں ایک اقلیت کی حیثیت سے رہتی تھی ۔ یہاں سے اس قوم کے لیے ایک نئی مملکت ایک نئی سرزمین سینا کی وادیاں یہ ان کے لیے حاصل کر کے وہاں ان کی اپنی آزاد مملکت قائم کرنی تھی۔ وہاں مصر میں ابھی یہ تھے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اٹھو آگ لگا دو توڑ دو پتھر مار دو یہ کچھ کرو۔ کچھ نہیں۔ قوموں میں انقلاب عزیزانِ من! فکری انقلاب سے ہوتا ہے نفسیاتی انقلاب سے تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کا اصول تو آپ کے سامنے ہے کہ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتی تاوقتیکہ ان کی نفسیات میں تبدیلی نہ پیدا ہو ان کی ذہنیتوں میں تبدیلی نہ پیدا ہو ۔ بین ہی میں کہا کرتا ہوں کہ ہماری نسل بھی بنی اسرائیل کی طرح تھی ہم بھی ہندوستان میں اسی طرح سے اقلیت کی حیثیت میں رہتے تھے ہم بھی وہاں محکوم ہو رہے تھے ان کے' پہلے انگریز کے محکوم تھے پھر ہندو کے محکوم بننا تھا۔ وہی کیفیت وہاں ہے۔ پروگرام کیا دیا جا رہا ہے کہا یہ جا رہا ہے کہ سرِ دست تم نے اپنی قوم کو اسی ملک میں رکھنا ہے۔ غور کیجیے گا ان الفاظ پہ۔ یہیں بیٹھے رہو جلدی نہ کرنا ابھی' قوم میں اتنی تربیت نہیں آئی۔ اب وہ جو حاکم قوم ہے وہ بھی مستبد اور ظالم قوم' ان کی بھی تو نگاہیں تھی ان کے اوپر۔ کہا کہ یہ قوم ابھی اس کو برداشت نہیں کرے گی کہ تم اعلانیہ اس قسم کی اپنی حرکتیں شروع کر دو سرگرمیاں شروع کر دو سیاسی کہ جھٹ سے دبوچ جاؤ۔ کر و کیا؟ (و اجعلوا بیوتکم قبلةً) (10:87) اپنے اپنے گھروں کو تربیتی مرکز بناؤ سرِ دست ۔ اور بات ساری گھروں کی تربیتی مرکز سے شروع ہوتی ہے عزیزانِ من!۔ عجیب چیزیں کہہ جاتا ہے۔ کہنے کو تو داستانِ بنی اسرائیل بیان ہو رہی ہے۔ ابدی قوانین دیے جا رہے ہیں قوموں کے لیے کہ ان حالات میں اگر تم گھر جاؤ پھنس جاؤ کبھی' محکومیت کی کیفیت ہو اقلیت کی کیفیت ہو قوت اتنی ابھی تمہارے پاس نہیں ہے تنظیم تمہارے پاس ابھی نہیں ہے کہ اٹھ کے یوں کھڑے ہو جاؤ۔ کیا کرو؟ وہیں رہو اپنے اپنے گھروں کو تربیتی مرکز بناؤ۔ آج بھی عزیزانِ من! یہی حقیقت ہے۔ جسے آپ معاشرہ کہتے ہیں وہ ہوتا کیا ہے۔ رات کو سمٹ کے گھروں میں آ جاتا ہے معاشرہ اور صبح کو گھروں سے نکل کے بازاروں میں چلا جاتا ہے۔ یہی تو معاشرہ ہوتا ہے۔ معاشرہ خراب ہو گیا!! کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے گھر کے اندر کی زندگی خراب ہو گئی۔ ہر گھر کے اندر کی زندگی اگر آپ صحیح کر لیں گے صبح کے وقت آپ کا معاشرہ صحیح ہو گا۔ آپ سوچتے ہیں کہ گھروں کے اندر تو ہم تربیت و تعلیم اور خیالات اور عقائد اور نظریات وہ کچھ پیش کریں۔ میاں باہر سے آ کے بیوی سے یہ کچھ Discuss کرے کہ میں نے آج وہ نوسر بازی کی اور اس کو یوں دھوکہ دیا اور وہاں رجسٹری بدلی اس کو دس ہزار روپیہ دیا' لے آیا ہوں جناب پچاس ہزار روپیہ کما کے۔ لڑکا اُدھر سن رہا ہے لڑکی اُدھر سن رہی ہے۔ بیوی یہ کہے کہ میں کلب میں گئی تھی' تمہیں اس نے ایسے یونہی دیدی ہے تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیا کچھ کیا تھا۔ بیٹی اُدھر سن رہی ہے۔ یہ بیٹا اور بیٹی صبح جو دروازہ کھول کے معاشرہ بنیں گے بازار میں جا کے اس معاشرے کو پھر آپ گالیاں دے کے گھر میں جا کے' معاشرہ بڑا خراب ہو گیا ہے۔ ہم نے ہر چیز یوں فرض کر لی ہے کہ

جیسے مریخ سے کوئی اتر کے آ جاتا ہے۔ بات تو گھروں سے شروع ہوتی ہے۔(**واجعلوا بیوتکم قبلةً**) (10:87)

عزیزانِ من! جو قوم بھی چاہتی ہے کہ اپنے اندر اس قسم کی انقلابی تبدیلیاں پیدا کرے انہیں سب سے پہلے اپنے گھر کی زندگی جو ہے وہ اس قالب میں ڈھالنی چاہیے۔ اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ۔ کیا بات ہے قرآن کی صاحب۔ جب یہ گھر جو ہیں وہ اس طرح تربیت یافتہ ہونگے تو پھر پوری قوم کا ایک قبلہ ہوگا پھر پوری عالمگیر ملت کا ایک قبلہ ہوگا۔ لیکن اس ایک قبلۂ واحد سے پہلے ہر گھر کو قبلہ بنانا پڑے گا۔ اور پھر قبلہ کے معنی بھی ہمارے ہاں اب سامنے آ گئے۔ وہ ریلوے سٹیشن پہ Arrow Mark کرنے کی؟؟ ہی نہیں ہے وہ' وہ تو تربیتی مرکز کا نام ہے۔ گھروں کو قبلہ بناؤ اور کرو کیا؟ (**و اقیموا الصلوٰة**) (10:87) وہی ایک جامع فقرہ قرآن کا' پورا پروگرام جس کے اندر آ جاتا ہے صاحب۔ پہلے انفرادی طور پر ایک ایک گھر کو قبلہ بنا کے وہاں قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنا سیکھو سکھاؤ۔ صلوٰۃ کے یہ معنی ہیں۔ گھروں کے اندر پہلے یہ چیز شروع کرو ماں باپ خود پہلے اس کے اوپر عمل کریں ہر بات میں یہ دیکھیں کہ قانونِ خداوندی کے پیچھے چلنا ہے' یہی تربیت بچوں کو دو وہاں۔ تو پھر میں کہوں کہ جب ہر گھر یہ کچھ کرنا شروع کر دے صبح جب گھر کے دروازے کھلیں گے تو اس تکلف سے کہ گویا میکدے کا در کھلا' یوں دروازے یہ کھلیں گے۔(**و اقیموا الصلوٰة**) (10:87) یہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ بڑا جامع پروگرام ہے صلوٰۃ کے قیام کا' آپ کو پتہ ہے قرآن نے آگے کیا کہا ہے؟ بات تو اتنی ہی کہی ہے اگر اتنی ہی بات کی جائے کہ ہاں صاحب گھروں کے اندر بیٹھ کے نماز پڑھ لیا کرو اور آگے پھر کیا ہوگا؟ (**و بشر المؤمنین**) (10:87) اور یہ کرو اور ان کو ان مایوسیوں اور محکومیوں کے حالات میں خوشخبری دید و آنے والے انقلاب کی۔ یہاں لاکھوں ہزاروں کروڑوں انسان گھروں کے اندر نہیں مسجدوں کے اندر بیٹھ کے اپنے تصور کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ دس دس لاکھ آدمی کعبے کے قبلے میں جا کے وہاں نمازیں پڑھتا ہے۔ کہتے ہیں وہاں کام ہی اور کوئی نہیں ہوتا دن رات وہاں نمازیں ہی پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ بشر المؤمنین کی بات آگے آتی ہے روتے ہوئے جاتے ہیں روتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ وہاں بھی آپ رو رو کے گڑگڑا کے دعائیں مانگ رہے ہو' رو رہا ہے مومن بیٹھا ہوا' دس لاکھ مومن بیٹھا ہوا رو رہا ہے روتا چلا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے(**و اقیموا الصلوٰة و بشر المؤمنین**) (10:87) عزیزانِ من! سجدے میں جاتے ہوئے اگر واقعی حالات کی نامساعدت سے آپ کی آنکھیں نم ہیں سجدہ تو وہ چیز انقلاب انگیز ہے کہ جب اٹھیں تو بشارتیں آ رہی ہوں آپ کے اوپر آسمان کے فرشتوں کی۔ صلوٰۃ یہ ہوتی ہے عزیزانِ من!۔ لمبے چوڑے اجتماعات کی ضرورت ابھی نہیں ہے' حالات اگر ایسے مساعد نہیں ہیں چھوٹے چھوٹے یونٹ بنا لو' گھروں کو قبلہ بنا لو وہیں آپ اقامتِ صلوٰۃ شروع کر دو۔ میاں بیوی میں بچوں میں یہ شروع کرو(**بشر المؤمنین**) بشارتیں ہیں مومنین کے لیے۔ پروگرام ہے عزیزانِ من! یہ یہ کرو۔

اور وہ سوال ایک پیدا ہوا جو روز ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ خوب ہے یہ داستانِ بنی اسرائیل۔ روز ہم یہ بات کہتے ہیں کہ

صاحب یہ جتنے ظلم اور استبداد کرنے والے جتنے ناجائز ذرائع اختیار کرنے والے روز پنپتے چلے جاتے ہیں صاحب۔ مال اکٹھا ہو رہا ہے دولت اکٹھی ہو رہی ہے قوت یہ سارا کچھ مل رہا ہے۔ اگر خدا واقعی عادل ہے اگر خدا کے نزدیک یہ چیزیں غلط ہیں تو وہ پھر کیوں نہیں ایسا کرتا کہ ان کے سارے مال ضبط کر لے ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں پتھر بنا دیتا ہو۔ روز ہم کہتے ہیں نا کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ خدا ظلم کو پسند نہیں کرتا ناجائز حرکات کو پسند نہیں کرتا خدا کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ تمام چیزیں جو ہیں وہ خود کر دے۔ روز ہمارے ذہن میں یہ خیال اٹھتا ہے روز یہ خیال ہوتا ہے کہ نہیں صاحب وہ خدا والی بات یونہی ایسے ہی ہے اگر خدا موجود ہو تو کیوں ظالم اتنا ظلم کریں۔ یہ غلط کوش اور غلط کار کیوں اتنی حرام کی کمائی سے یہ کچھ بنتے چلے جائیں۔ یہ سوال اس کا وہاں بھی پیدا ہوا۔(**قال موسٰی ربنا انک اتیت فرعون و ملاہ زینۃً و اموالًا فی الحیٰوۃ الدنیا**) (10:88)

بات تو کہلوائی گئی ہے جیسے حضرتِ موسٰیؑ کہہ رہے ہیں۔ ان کی قوم جو تھی وہ بار بار یہ کہہ رہی تھی کہ صاحب یہ جو اتنی جلدی ہم پہ اثر نہیں ہوتا اور ہم بھی نہیں اٹھتے اور یہ پروگرام بروئے کار بھی نہیں آتا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ جو ظالم مستبد استحصال Exploitation کرنے والی قومِ فرعون ہے وہ اتنی مال و دولت ان کے پاس جمع ہے وہ دن بدن پنپتی چلی جا رہی ہے۔ تو لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ نہیں صاحب وہی طریقہ وہ ٹھیک ہے ہم تو پٹتے چلے گئے پٹتے ہی رہے پٹتے ہی مر جائیں گے۔ اور اتنے دن ہو گئے اتنے سال ہو گئے ہمیں یہ کچھ کرتے ہوئے ہماری حالت تو بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ تو کہا یہ جو مال و دولت ان کو اس قدر زیادہ فراواں حاصل ہے(**ربنا لیضلوا عن سبیلک**) (10:88) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے صحیح راستے سے گمراہ کرتا ہے یہ۔ بڑی عجیب چیز ہے یہ۔ ایک طرف وہ دیانتدار دوکاندار گھرا ہوا بیٹھا ہے ان بددیانتوں کے حلقے کے اندر' یہ پنپنے دیتے ہیں اسے۔ اور اُس کی کیفیت یہ کہ وہ جو چار پیسے کی پونجی اس کے پاس تھی کچھ بیوی کے زیور بیچ کے اس نے وہ دوکان رکھی تھی وہ دن بدن سرمایہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ساتھ کے ساتھ دوسرا دوکاندار بیٹھا ہوا ہے چار سو بیس کرنے والا' اُس کو یہ دیکھتا چلا جاتا ہے کہ وہ جائیداد پہ جائیداد بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جو ایک دن اس کے دل میں ہو سکتا یہ خیال پیدا کر دے کہ بدھو میاں تو نے کیا لے لیا وہ دیانتدار بن کے۔ یہ نہ کہے گا بیوی کہے گی بچے کہیں گے۔ وہ دیکھتے ہیں ساتھ ہی اتنے دنوں میں وہ یہ کچھ بن گیا تم بیٹھے ہوئے صاحب اپنی حق پرستی کے اوپر۔(**لیضلوا عن سبیلک**) (10:88) عجیب بات کہی کہ ان کی یہ فراوانی سے مال و دولت یہ کثرت جو ہے یہ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ قوم اس کی وجہ سے تباہ ہو رہی ہے۔ وہ قوم بھی تو ہماری طرح کی قوم محکوم تھی نا کہ ہم تو کچھ نہ کریں۔(**ربنا اطمس علٰی اموالھم و اشدد علٰی قلوبھم فلا یؤمنوا حتّٰی یروا العذاب الالیم**) (10:88) یا اللہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں یا اللہ ان کا مال و دولت بھسم کر دے راتوں رات ہی اس کو آگ لگ جائے یا اللہ یہ جو اس قسم کی تدبیریں سکیمیں سوچتے ہیں یہ روز نئی نئی طرحیں لے آتے ہیں ان چیزوں کو جمع کرنے کی یہ چال چلو وہ چال چلو ان کی عقل و فہم جو ہے اس کو مفلوج کر دے۔ یہ چیز ہوئی نا کہ محکوم قوم کی

یہ آرزو یا اللہ! تو یہ کردے۔اس لیے کہتے ہیں دیکھئے کیا مزیدار بات ہے کہ یا اللہ ہم اپنے لیے نہیں کچھ کہتے یہ تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک ''تو ایہناں دی؟؟ نالہا ئیں گا''۔اصل میں بات یہ تھی کہ ہر روز ہم دیکھتے ہیں پنپتے چلے جاتے ہیں ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ہوسکتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح ایک دن گمراہ ہوجائیں تو بس ایسا کردے کہ راتوں رات آگ لگے نوٹ ہی تو ہیں سارے بھسم ہوجائیں گے ختم کران کا قصہ۔ یوں ایمان لائیں گے یہ۔بڑی اہم چیز آتی ہے عزیزانِ من! اس کے بعد۔قوم حضرتِ موسٰیؑ سے کہہ رہی ہے گویا۔خدا کا پیغمبر خدا سے ہی گویا یہ دعا کررہا ہے یہ مانگ رہا ہے۔

جواب آتا ہے(**قال قد اجیبت دعوتکما**) (10:89) دونوں بھائیوں کو موسٰیؑ اور ہارونؑ کو۔ہاں ہم نے قبول کرلی تمہاری دعا ۔موج ہوگئی۔یعنی آپ سوچئے کہ دعا کرنے والے خدا کا ایک نہیں دو پیغمبر اولوالعزم' جواب براہِ راست خدا کی طرف سے مل رہا ہے جس میں کوئی مغالطہ نہیں ابہام نہیں التباس نہیں کسی قسم کا' واضح الفاظ میں خدا کی طرف سے نبی کو جواب ملتا ہے۔نبی دعا کرنے والے خدا جواب دینے والا' جواب دیا یہ کہ ہاں تمہاری دعا قبول ہوگئی۔تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اِدھر یہ کہا اور اُدھر ان کی تجوریوں میں آگ لگے سب جلیں نوٹ ان کے ہاتھ پتھر کے بن جائیں شل ہوجائیں' دعا جو قبول ہوگئی۔ٹھیک ہے دعا تمہاری قبول ہوگئی۔اچھا جی پھر۔(**فاستقیما**) (10:89) جو پروگرام تم کو دیا گیا ہے استقامت سے اس کے اوپر عمل پیرا رہو دعا قبول ہوجائے گی۔جی!!۔دیکھا خدا کی طرف سے دعا کی قبولیت جو ہے اس کو مشروط کس چیز سے کیا گیا ہے۔جب پھر یہ دعا جو ہے سن لی ہم نے اس کے مطابق اس وقت ہوگا(**فاستقیما و لا تتبعآن سبیل الذین لا یعلمون**) (10:89) قوم کو سمجھاؤ کہ یہ اس قسم کے جہالت آمیز خیالات دلوں کے اندر آتے ہیں کہ ہم بیٹھے رہیں یہ تباہ ہوجائیں ان سے کہو کہ یہ جہالت ہے ان لوگوں کا راستہ نہ اختیار کریں۔(**فاستقیما**) جو پروگرام ہم نے دیا ہے اس پہ جم کے کھڑا ہو جا دعا قبول ہوجائے گی۔یہ ہے عزیزانِ من! اور یوں ہوتی ہے دعا قبول۔یا اللہ اس مریض کو آرام دیدے کسی طرح سے' آرام دیدے اس کو' آواز آتی ہے کہ ہاں تیری دعا قبول ہوگئی علاج صحیح ہورہا ہے بدستور کیے چلا جا۔یہ ہے عزیزانِ من! دعا قبول ہوگئی۔دوسرے مقام پہ بھی یہ آیا ہے سورۃ طٰہٰ میں۔وہاں بھی یہ دونوں بھائی ہیں وہاں بھی وہ یہی کچھ کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ یہ کردے اور وہ کردے اور فرعون کو تباہ کر ہمارے ہاتھوں سے اپنا انجام دیکھ لے۔ حضرتِ موسٰیؑ کہتے ہیں کہ میرے بھائی کو بھی ساتھ دیدے۔یہ سارا کچھ کتنی ہی دعائیں یہاں ہے مانگا ہے خدا سے کہ یہ دے اور وہ دے۔کہا ہے(**قال قد اوتیت سؤلک یٰموسٰی**) (20:36) اے موسٰی جو کچھ مانگا ہے تم نے ہم نے دیدیا تمہیں۔اسے سلام کرنا چاہیے تھا دعائے خیر دینی چاہیے تھی اور آجانے چاہیے تھا لو بھئی موج ہوگئی سب کچھ مل گیا۔یہاں ہے(**اوتیت سؤلک**) (20:36) وہاں تو صرف یہ تھا کہ دعا قبول تھی' یہاں یہ ہے کہ جو تو نے مانگا تھا دیدیا ہم نے تمہیں۔اچھا بھی پھر کیا کیا جائے۔(**اذھبا الٰی فرعون**) (20:43) جاؤ فرعون کی طرف بڑا سرکش ہوگیا ہے۔(**ولا تنیا فی ذکری**) (20:43) یاد رکھنا ہمارے قوانین کو اپنے سامنے رکھنے میں ذرا غفلت نہ برتنا

ایک سیکنڈ کے لیے نگاہوں سے کہیں اوجھل نہ ہوجائے۔ یہ ہے جو کچھ کرنا ہے' یہ کچھ کرو گے تو وہ جو تم نے مانگا ہے پھر وہ مل جائے گا۔ وہاں کہا (**فاستقیما**) (10:89) بات یہی ہے جو یہاں کہی ہے۔(**فاستقیما**) کہا کہ اس کے اوپر جم کے کھڑے ہوجاؤ دونوں بھائی' پھر سب کچھ مل جائے گا۔ اوران لوگوں کا راستہ نہ کبھی درمیان میں اختیار کر لینا جہالت کی بناء پہ جو اس قسم کی جلد بازیوں کے اوپر اتر آتے ہیں۔ اور پھر قرآنِ کریم یہاں وہ راستے کی سب چیزیں چھوڑتا ہے۔ میں نے کہا ہے وہ مختلف ٹکڑے داستانوں کے مختلف مقامات پہ بیان کرتا ہے جو with reference to context وہاں آنی چاہئیں۔ یہاں اس کا انجام لے آتا ہے۔

(و جاوزنا ببنی اسرآء یل البحر فاتبعھم فرعون و جنودہ بغیًا و عدوًا حتیٰ اذا ادرکہ الغرق قال اٰمنت انہ لا الٰہ الا الذی اٰمنت بہ بنوا اسرآء یل و انا من المسلمین) (10:90) وہی اہم مقام جو کئی دفعہ سامنے آیا ہے بڑا عجیب مقام ہے۔ بنی اسرائیل دریا وہ سمندر پار کر گئے۔ میں نے عرض کیا ہے اور وضاحت سے میں نے سورۃ اعراف میں بتایا تھا کہ وہ جو چیز ہے نا کہ وہ آئے نیل پہ۔ کبھی تو وہ نیل کا دریا کہہ دیتے ہیں کبھی سمندر کہہ دیتے ہیں ہمارے ہاں والے وہ صحرا کے رہنے والے یہ بیچارے مفسر شاید انہوں نے دیکھا ہی نہیں تھا کبھی کہ نیل کہا ہے اور سمندر کہا ہے۔ لیکن وہ تو سب متفق علیہ ہے نا کہ وہ آئے وہاں سمندر تھا یا وہ نیل تھا اور وہاں آ کے انہوں نے مارا وہ اپنا سوٹا اور دریا پھٹ گیا دو حصوں میں' درمیان میں ہوگیا راستہ خشک اس میں سے یہ پار چلے گئے۔ فرعون اور اس کا لشکر آیا اور اس کے بعد سمندر پھر مل گیا اور وہ غرق ہوگئے۔ یہ تو ہر جگہ یہی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ چیز بھی تورات کے اندر تھی۔ تورات کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے امریکہ کی یہودی یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں جہاں یہ چیز آئی ہوئی ہے کہ سمندر تھا وہ دو ٹکڑے ہوگیا تھا پھٹ کے اور اس میں سے وہ گذرے تھے۔ انہوں نے وہاں یہ چیز لکھی ہے کہ ہم ایک عرصے سے اس پہ ریسرچ کر رہے تھے وہ کونسا مقام تھا جہاں سے یہ بنی اسرائیل گذرے تھے اور یہ کیسے ہوا جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں سمندر کا پھٹنا۔ کیونکہ جو جغرافیہ ہمارے سامنے اس دور کا آتا ہے اس میں سمندر آتا نہیں اس طرح سے' اس کے پھٹنے کا سوال نہیں تھا۔ اُنہوں نے یہودیوں کی طرف سے شائع شدہ تورات کے اندر انہوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ یہ خیال جو تھا یہ غلط تھا ان لوگوں کا۔ یہ جو Read Sea ہے نا آج تو وہ Read Sea آگے جاتی ہے اس کے دوسری بحیرۂ روم (Meditarian Sea) آتی ہے درمیان میں خشکی کا ٹکڑا ہے اس میں سے ایک نہر نکالی گئی ہے جسے نہر سویز آپ کہتے ہیں۔ یوں یہ دونوں یہ بحیرۂ قلزم اور بحیرہ روم ان کو ملا دیا ہے۔ نہرِ سویز کاٹنے کے بعد یہ ملے ہیں۔ حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے میں یہ ملے ہوئے تھے اس درمیان میں خشکی کا ٹکڑا تھا۔ تو یہ جو ہے بحیرۂ قلزم یہ جہاں جا کے آگے خشکی کے ٹکڑے کے ساتھ ملتا تھا نا مصر کی سائیڈ میں' ظاہر ہے کہ وہاں قریب جا کے ساحل کے وہ سمندر سمندر بھی نہیں رہتا وہ قریباً خشک ہوجاتا ہے۔ کراچی کے ساحل پہ بھی ہم لوگوں نے دیکھا ہے جب وہ اس کا Tide آتا ہے جوار بھاٹا مدوجزر' جب اس کا مد ہوتا ہے تو پانی وہاں تک جاتا ہے اس کا' تو جب جزر ہوتا ہے تو پانی پیچھے کی طرف سمٹ جاتا ہے اور نیچے وہ

ریت رہ جاتی ہے خشک ۔عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے یہ کہا تھا چودہ سو سال پہلے جب ابھی یہ جغرافیائی ریسرچ کہیں نہیں ہوئی تھی کہ ہم نے موسیٰؑ سے کہا کہ آؤ ہم تمہیں راستہ بتاتے ہیں جانے کا۔ وہاں لے جاؤ اپنی قوم اس کے اُس آخری کنارے میں کہ یہاں جب پانی آتا ہے تو آخر تک چڑھ جاتا ہے جب اُتر جاتا ہے (قرآن کے الفاظ ہیں) تو پانی زمین کو خشک چھوڑ جاتا ہے۔(یبث رھون) عربوں کے ہاں یہ رہون اس وقت کہتے ہیں جب کسی وقت پانی ہو کسی جگہ اور دوسرے وقت میں وہ خشک ہو جائے ۔کیا بات ہے قرآن کی !!۔کہا یہ وہ مقام ہے کہ وہاں جا کے یہ دیکھو جس وقت پانی نیچے اترا ہوا ہو پار لے جاؤ۔ اتنی سی تو جگہ تھی اس زمانے کی ۔اور اس کے بعد جب یہ فرعون کے لشکر آئے انہوں نے دیکھا کہ پانی اترا ہوا ہے وہ گئے ۔سرکشی تو تھی ذہن میں اور پھر جب آدمی دشمن کے پیچھے جاتا ہے تو ملٹری والے جانتے ہیں وہاں کون سوچتا ہے کھڑا ہو کے کہ کھائی ہے گڑھا ہے اور نہیں کودنا۔ وہاں تو یہ سامنے دشمن ہوتا ہے اور اس کا اتباع کرنا ہوتا ہے۔اور یہ انہیں پتہ تھا کہ اگر یہیں گھیر لیا تو اچھا آگے چلے گئے تو مشکل آ جائے گی۔ اُنہوں نے سرپٹ گھوڑے دوڑا دئے اور یہ نہ سوچا کہ وہاں اب Tide کا وقت آ گیا ہے۔اور ان کے وہاں جاتے جاتے وہ Tide آ گیا۔قرآن یہ کہتا ہے۔اب وہاں انہوں نے نئی تورات کے ایڈیشن جو نکالے ہیں تو اس میں کہا ہے کہ یہ بحیرۂ قلزم یہ سمندر و مندر نہیں تھا جہاں سے وہ گئے تھے۔ Sea of Reads اس کو لکھا ہے' یہ جو سرکنڈا اگتا ہے نا آپ کے ہاں یہ دریاؤں کے کنارے پہ یہ وہاں اگتا ہے جہاں یوں پانی آتا ہے پیچھے چلا جاتا ہے اور وہاں یہ بڑا سرکنڈا ہوتا ہے۔اسے Sea of Reads کہتے ہیں ۔اُنہوں نے لکھا ہے کہ یہ Sea of Reads میں سے گذرے تھے یہ Tide کا سارا سوال تھا۔ وہاں جب وہ پانی آتا تھا تو وہ سرکنڈوں کے اندر بہت چڑھ جاتا تھا اوپر' پیچھے چلا جاتا تھا تو اس کے بعد یہ رہون رہ جاتے تھے سرکنڈے اور خشک زمین رہ جاتی تھی ۔ یوں گذرے تھے۔قرآنِ کریم نے یہی کہا ہے اپنے ہاں عزیزانِ من !۔اُنہوں نے اپنی تورات کی تصحیح کر لی ہمارے ہاں یہ تصحیح نہیں آج بھی ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں نہیں صاحب یہودی ہیں مسخ کر رہے ہیں آپ کے قرآن کو بھی۔ بالکل نہیں۔قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ گذر گئے یہ پیچھے سے آئے اور یہ غرق ہو گئے۔

کہا ہے کہ فرعون نے جب موت کو سامنے دیکھا (عجیب چیز لایا ہے قرآن) کہ یوں تو اتنا بڑا سرکش اتنی بڑی قوتوں کا مالک اتنا جابر اتنا مستبد نظر آتا ہے کہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کیفیت یہ کہ موت سامنے آئی تو چلا اٹھا کہ موسیٰؑ میں ایمان لایا تیرے خدا کے اوپر او بچا لے مجھے۔کیسے ایمان لایا؟ موت کو سامنے دیکھ کے اس سے ڈر کے۔نظر یوں آتا ہے یعنی ہم آپ کہیں ہوتے یا کوئی پولیٹکل لیڈر ہوتا الیکشن آنے والا ہوتا اور یہ وہ کہتا کہ ہاں صاحب ہم آپ کی پارٹی میں آتے ہیں صاحب ''چھی پالیندا جا کے اوہنوں''۔فرعون یہ کہہ رہا ہے کہ موسیٰؑ میں ایمان لایا تجھ پر اور بنی اسرائیل کے خدا کے اوپر ایسے مقام پہ۔ جواب کیا آتا ہے؟ (آلْـٰٔـنَ) (10:91) اولعنت ہے تجھ پر' در کفر ہم پختہ؟؟ زنار رار سوا مکن' موت کو دیکھ کے ڈر کے ایمان لے آئے اسے ایمان کہتے ہیں؟ لعنت ہے تیرے اس ایمان کے اوپر۔ایسے وقت میں اب

ایمان لانے سے(**وقد عصیت قبل**) (10:91)اس سے پیشتر اتنی سرکشی دکھایا کرتا تھا اتنی بغاوت کے شعلے تیرے دماغ میں اٹھتے تھے۔ کیفیت یہ نکلی تمہاری جرآتوں کی کہ موت سامنے آئی اوراس سے ڈر کے مارے کہتے ہو کہ ایمان لایا میں۔ یہ ایمان ہے جس کو تم ایمان کہتے ہو؟ (**آلـٰٔن و قد عصیت قبل و کنت من المفسدین**) (10:91)ہر قسم کی سرکشی فساد بغاوت استبداد یہ کچھ تیرے سامنے؟؟؟۔نظر یوں آتا تھا کہ بڑی سے بڑی چیز بھی سامنے آئے گی تو تُو مقابلہ کرے گا ڈٹ کے' کیفیت تیری یہ نکلی درمیان میں سے۔ایسے ایمان سے ہزار درجے تمہارا کفر وہ اچھا ہے۔ یہ ایمان جو تم اس وقت لا رہے ہو ہماری بارگاہ میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔اب ایمان لا رہے ہو۔کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب قرآنِ کریم ہمیں اپنی تفسیروں کی رو سے سمجھنا چاہیے۔ میں وہ باتیں بہت کم لایا کرتا ہوں لیکن جب ایسا Contrast آجاتا ہے نا کہ جہاں یہ چیز قرآن کی آپ دیکھئے' آپ دیکھئے عزیزانِ من! میری آپ کی نہیں بصیرت کی آنکھیں کھل جاتی ہیں یہ کچھ دیکھ کے کہ قرآن کہہ کیا جاتا ہے صاحب۔لیکن ہمارے ہاں کی تفاسیر جو مبنی ہیں روایات کے اوپر یعنی پھر وہی چیز کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ایک چیز کہی تھی (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔تفسیر اٹھا کے دیکھئے طبری ہو یا ابنِ کثیر کی تفسیر ہو معتمد علیہ تفسیریں ہیں صاحب۔پہلی چیز تو یہ کہ صاحب یہ فرعون کس طرح سے اندھا ہو گیا اور وہ سمندر میں گھس گیا۔کہا فرعون کا گھوڑا جانتا تھا نہیں جاتا تھا اندر' بہتیرا ایڑ لگاتا تھا نہیں جاتا تھا اڑ گیا''گھوڑا نہیں ٹٹو ہونا اے''۔نہیں جاتا تھا آسمان کے فرشتے دیکھ رہے تھے کہ''اے ساری سکیم ای فیل ہون ڈئی ہیگی اے''۔جبریلِ امین گھوڑی پہ وہ آئے اور اس کے گھوڑے کے آگے لگ گئے تو گھوڑا تو ہوتا ہے نا پیچھے چلنے والا وہ آگے لگے اب وہ پیچھے چل رہا ہے۔اب فرعون نے دیکھا اس کے بعد کہ اب تو وہ موت والی بات ہے یہ روک رہا ہے لیکن وہ جناب جبریل کی گھوڑی جو تھی وہ آگے آگے چلی جا رہی تھی اور یہ اس کے پیچھے پیچھے۔بس یہ پہلا گھوڑا اس کا گیا پیچھے لشکر۔کہنے لگے اب وہ جو جلدی نہیں ہو رہی تھی تو حضرتِ میکائیل آئے انہوں نے گھوڑا لیا اور وہ لشکر کے پیچھے وہ ہنٹر لگا رہے تھے ان کے گھوڑے کے اوپر''اگے اگے جبریل پیچھے میکائیل کہ بھئی لے ڈوبو ہن''۔اس کے آگے ہے تفسیر میں پھر۔عزیزانِ من! نہ ہنسئے خدا کے لیے رویئے ان چیزوں کے اوپر' کہا جاتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفسیر ہے۔کہا جاتا ہے کہ جبریل کو خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں فرعون ایمان نہ لے آئے بیڑہ غرق ہو جائے گا''اے ایمان لے آیا اسی کتھے جو گئیں رہنا''۔اندازہ لگایئے جبریل کو خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایمان نہ لے آئے۔اور وہ وہاں کھڑا ہوا کرے کیا۔کہنے لگا کہ اے پڑھنے والے تو کبھی دیکھتا وہاں کہ جبریل سمندر کی مٹی لے لے کے فرعون کے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔کیا عرض کروں عزیزانِ من! یہ تفسیریں آپ ترجمے کر کر کے بھیجتے ہیں یورپ میں۔جبریل' فرعون کے منہ میں مٹی ٹھونس رہا تھا کہ ایمان نہ لے آئے۔اور یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔یعنی وہ تفسیر والے نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ اس نے کہہ دیا تھا(**قال اٰمنت انه لا اله الا الذی**) (10:90)۔ذہن میں یہی رہا کہ اس نے جبریل نے لانے نہیں دیا ایمان جبھی تو وہ غرق ہو گیا ایمان لے آتا تو غرق کیوں ہوتا۔یعنی آیت قرآن کی سامنے پڑی ہوئی ہے۔اس کے بعد پھر بھی اس نے کہہ دیا اور وہ مٹی ٹھونستے رہ گئے جبریل۔

عزیزانِ من! کیا عرض کروں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا تاوقتیکہ یہ تفسیریں آپ کے سامنے نہ آئیں' سلفِ صالحین کا راستہ جو ہے وہ ہم سے اور تم سے زیادہ قرآن کو سمجھتے تھے۔(آلئٰن) (10:91) یہ بھی انداز عربی جاننے والے دیکھیں گے پچھلی آیت ختم کرنے کے بعد کہ اس نے کہا کہ اور پہلی جو ہے (قال اٰمنت انه) (10:90) یعنی ایسے جیسے کہ دہائی دیتا ہے' پکارا تھا او میں ایمان لے آیا ٹھیک ہے تم پہ تمہارے بنی اسرائیل کے خدا کے اوپر اور میں مسلمان ہو گیا۔ آیت میں کچھ نہیں قرآن نے کہا کہ کہاں سے آواز آئی کیا ہوا (آلئٰن) (10:91) جیسے گونج پڑ رہی ہو فضا کے اندر' کم بخت کہیں کا اب ایمان لا رہے ہو شرم نہیں تمہیں آتی۔(و قد عصیت قبل و کنت من المفسدین) (10:91) اس سے پیشتر اتنا پھنے خاں بنا پھرتا تھا اتنا سرکش اتنا مفسد اور اب کیفیت یہ (آلئٰن)۔

(فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک اٰیةً) (10:92) یہ ایمان اب تمہیں نہیں بچا سکتا اب غرق ہو۔ ایک بات ہم ضرور کریں گے تیری داستانیں دنیا میں باقی رہیں گی بڑا سرکش تھا بڑی قوتوں کا مالک تھا۔ کریں گے ہم کیا؟ ہم تیری لاش کو سمندر کی نذر نہیں ہونے دیں گے اسے ہم اٹھا کر باہر خشکی پر پھینک دیں گے اور اس کے بعد اسے محفوظ رکھا جائے گا تاکہ آنے والی نسلیں آ کے تجھ سے عبرت حاصل کریں تیری لاش کو دیکھ کے۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پیشتر قرآن کہہ رہا ہے۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیا کہہ گیا ہے تآنکہ اس صدی کے شروع میں مصر کے یہ مقبرے جو فراعنہ کے تھے ان کی کھدائی ہوئی ہے ان مقبروں کے اندر ان کی لاشیں ممی کی ہوئی برآمد ہوئی ہیں۔ اور ایک لاش کے متعلق میں نے آپ نے مسلمان نے نہیں' ہم تو ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں تھے' یورپ کے یہ جو آرکیالوجسٹ ہیں محققین ہیں انہوں نے اس کے متعلق وہ تختیاں بھی لکھی ہوئی وہاں اس کے سرہانے وہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے یہ چیز لکھی ہے ایک جو فرعون کی لاش ہے اُنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ہے فرعون جو موسٰیؑ کے زمانے میں غرق ہوا تھا۔ اس کی لاش ممی شدہ ملی ہے اور اس کے چہرے پہ اس قسم کے داغ ہیں جیسے مچھلیوں نے کہیں کہیں سے گوشت نوچ لیا ہوا ہے۔(فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک اٰیةً) (10:92) تیری لاش کو ہم محفوظ کر دیں گے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں جو ہیں اس سے عبرت پکڑیں کتنی سرکشی کا مالک کیفیت اس کی یہ تھی یوں ڈوب کے مرا مچھلیوں اور پتہ نہیں کچھوؤں نے گوشت تک نوچ لیا۔(و ان کثیرًا من الناس عن اٰیٰتنا لغٰفلون) (10:92) وہ اس لیے کہ کثیر لوگوں کی ایسی ہوگی کہ وہ ان ہمارے قوانین سے بے خبر ہونگے' تیری لاش کو آ کے دیکھنے سے ہی کم از کم ان کو آگہی ہو جائے گی کہ ہاں اتنی بڑی یہ آویزش ہوئی تھی حق اور باطل میں کسی دور میں اور اس کا عبرت آمیز مرقع یوں پڑا ہے ممی شدہ لاش کے اندر۔ پوری دنیا نے جا جا کے اس لاش کو دیکھ لیا ہے عزیزانِ من! ان تختیوں کو بھی جا کے پڑھ لیا ہے۔ اِدھر یہ کیا اور جھٹ سے قرآن لاتا ہے۔ یہاں یہ نظر آیا کہ اس کا انجام یہ ہوا' سوال یہ ہے کہ یہ جو تھے جن کی اتنی تربیت کی تھی اتنی تعلیم کی تھی گھروں کو قبلہ بنایا تھا یہاں محفوظ گذارا تھا اس کے بعد کیا ہوا؟ (و لقد بوانا بنی اسرآءیل مبوا صدق و رزقنٰھم من الطیبٰت) (10:93) اور وہاں پھر ہم نے بنی اسرائیل کو اعلیٰ مقامات دے اور اعلیٰ مقامات کے

ایک ہی ساتھ رزق دیا ان کو عزت کا کہ جو روٹی طیبات کی روٹی دی خوشگوار رزق دیا ان کو۔(بوانا مبوا صدق) Establish کیا وہاں ان کو اس قسم کی مملکت میں جو صدق اور عدل کے اوپر مبنی تھی۔ وہاں ہم نے ان کو Establish کیا کیونکہ وہ وارث تو ہوئے تھے زمین کے اعتبار سے فرعون جیسے سرکش کی ہی مملکت کے ایک حصے کے۔لیکن یہاں جو اسی سرزمین پہ ان کے ہاتھوں سے مملکت قائم ہوتی ہے وہ مبوا صدق ہوتی ہے وہ صدق اور عدل کی بنیادوں کے اوپر مبنی ایک مملکت تھی جو قائم ہوئی۔ زمین وہی ہے حکومت بھی وہی ہے جو ملتی ہے اختیارات بھی وہیں ہیں ۔فرق اتنا ہے کہ وہ سرکشی پہ مبنی تھی یہ صدق اور عدل کے اوپر مبنی تھی۔اس لیے یہاں کا رزق رزقِ طیب تھا۔روٹی تو بنی اسرائیل کو مصر میں بھی ملتی تھی لیکن محکوم کی روٹی میں اور آزاد کی روٹی میں جو فرق ہوتا ہے عزیزانِ من! رزقِ طیب اور رزقِ حلال صرف آزاد کی روٹی ہوتی ہے عزیزانِ من!۔آزاد کے معنی اپنی خود مختار مملکت والا نہیں ہے وہ تو دنیا میں قریباً قریباً ہر مملکت ہی آجاتی ہے۔آزاد کے معنی ہوتے ہیں کہ جو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے آزاد ہو اور صرف خدا کے قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔اس مملکت میں جو روٹی ملتی ہے وہ رزقِ حلال اور رزقِ طیب ہوتی ہے۔ورنہ جو بھی روٹی اس انداز سے ملتی ہے

ایں خدا نانِ بے حد جانِ برد

جہاں روٹی دیں اور اس کے بدلے میں تمہاری جان نکال لیں ایک وہ مملکت ہے اس میں روٹی ملتی ہے۔اور ایک یہ ہے کہ

آں خدا نانِ بے حد جانِ بے حد

روٹی بھی دیتا ہے زندگی بھی بخشتا ہے۔یہ جو زندگی بخش حلال اور طیب رزق ہے وہ اس مملکت میں ملتا ہے جو (مبوا صدق) ہوتی ہے جس کی بنیاد صداقت پر Truth پر رکھی جاتی ہے۔اس کے بعد کہا (رزقنٰھم من الطیبٰت) وہاں ان کو طیبات کا رزق دیا۔اور آگے پھر یہ ہے پوری داستان ان کی درمیان میں چھوڑ کے کہ یہ بنی اسرائیل پھر ان کے اوپر کیا بیتی۔(فما اختلفوا حتیٰ جآء ھم العلم) (10:93) العلم وحی کا آ گیا۔

انجام کے لیے ایک ہی لفظ کہا ہے کہ پھر ان کے بعد کیا ہوا جو اس حالت میں بدل گئی بنی اسرائیل کی قوم۔جن کا آغاز یہ تھا ان کا انجام یہ کیوں ہوا؟ (ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ و داؤد غضب من اللہ) ذلت اور مسکنت کی مار ماری گئی جہاں جہاں پہنچے ان کے پیچھے خدا کا کوڑا چلتا رہا Woundring Judes بن گئے یہ۔کیوں ہوا؟ عزیزانِ من! جرائم کی فہرست تو بڑی طول طویل ہے قرآن تو بعض اوقات ساری تفصیل کو سمٹا کے رکھ دیتا ہے ایک لفظ کے اندر اور وہ بنیادی جرم کیا تھا جس کی وجہ سے یہ ہوا۔(فاختلفوا) انہوں نے آپس میں اختلاف کرنا شروع کر دیا۔سمٹا کے رکھ دیا ایک لفظ میں ساری بات کو۔یوں وہ رزقِ طیب جو تھا اس ذلت اور مسکنت کے اندر تبدیل ہو گیا۔ وہاں ایک قبلہ تھا سامنے۔مرکوزِ نگاہ کہتے ہیں قبلے کو نصب العین کہتے ہیں قبلے کو۔ایک نصب العین جس کے اوپر تمام قوم کی نگاہیں تھیں۔

؟؟ ملت ہے کہ گوئی لا الہ

لاالہ کہنے والے تجھے پتہ ہے کہ امت یا ملت کس کو کہتے ہیں قوم کی Definition کیا ہے؟ لاالہ کہنے والوں سے کہہ رہا ہے۔

؟؟ ملت ہے کہ گوئی لا الہ

با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

لاکھوں آنکھیں لیکن نگاہ ایک' اسے ملت کہتے ہیں۔ یہاں ایک ایک آنکھ میں دس دس نگاہیں ہیں ہمارے ہاں' پتہ ہی نہیں کہ صبح کونسی نگاہ ہے دوپہر کو کونسی نگاہ ہے شام کو کونسی نگاہ ہے۔ وہاں لاکھوں کروڑوں باہزاراں چشم بودن یک نگاہ۔ اور یہ یک نگہی ہے جسے عربی میں قبلہ کہتے ہیں۔ کہا یہ کہ اس رزقِ طیب اور (**مبوا صدق**) وہ کیوں چھن گئے اس قوم سے؟ کیوں ذلیل ترین قوم ہوگئی وہ دنیا کی؟ (**فما اختلفوا حتیٰ جآء هم العلم**) (10:93) اب یہ چیزیں جن میں یہ اختلافات کرتے چلے آ رہے ہیں بہرحال اس نے کہا ہے کہ اب وہ دور آ رہا ہے نبی اکرم ﷺ کا دور کہ جس میں پھر سے وہی وحی وہی حق جو حضرتِ موسیٰؑ اور انبیائے کرامؑ کو ملا تھا اپنی اصلی شکل میں آئے گا۔ پھر اس کے ذریعے سے قومیں اٹھیں گی مردوں میں زندگی پیدا ہوگی اور اختلافات جو ہیں چھن کے سامنے آ جائیں گے چھٹ کے سامنے آ جائیں گے۔ مذہب تھا اس سے پیشتر مذہب میں اختلافات مٹنے کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ (**کل حزب بما لدیهم فرحون**) وہ کہتا ہے ہر فرقہ ہر گروہ مگن ہوتا ہے کہ میں حق پہ ہوں دوسرے باطل پہ ہیں۔ اونچی آمین کہنے والا بھی نیچی آمین کہنے والا بھی دونوں خوش نکل آتے ہیں مسجد سے کہ اللہ نے ہماری نماز قبول کر لی ہے۔ اس اختلاف کو آپ دیکھتے ہیں کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ اختلافات دین میں آ کے مٹتے ہیں جب ایک مرکز ہو ایک قبلہ ہو ایک قانون ہو ایک آواز ہو اس وقت یہ چیز ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں آمین یوں کہی جاتی ہے۔ اختلاف مٹ جاتا ہے۔ کہا کہ (**ان ربک یقضی بینهم یوم القیٰمة فیما کانوا فیه یختلفون**) (10:93) ہمارے ہاں بھی عام اس کے معنی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن پھر خدا ان کے اختلافات مٹا دے گا۔ وہاں مٹا دینے سے فائدہ کیا ہوگا۔ ان کے اختلافات کی وجہ سے تو انہیں جہنم میں بھیج دے گا ''او ہدے بعد ایہناں دی سلیٹ دھو دے گا''۔ یعنی یہ چیزیں غور طلب ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ ہم نے ایک جگہ جو لفظ قیامت کا دیکھا اور قیامت ہم نے سمجھ لیا کہ وہ مرنے کے بعد وہ جو آنے والی چیز ہے اسے کہتے ہیں۔ یہ نہیں سوچا کہ قرآن میں دیکھیں کہاں کہاں کن کن معنی میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۔**توالقیٰمة** کیا ہے؟ اٹھنے کا مقام' حیاتِ تازہ کا مقام' مردہ قوموں کے جی اٹھنے کے دن' ایک ایسا انقلاب کہ جس میں انسانیت اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے۔ قرآن نے یہ کہا ہے نا۔ (**یوم یقوم الناس لرب العٰلمین**) گروہ اور پارٹیاں ایک ایک قوم نہیں' جب پوری انسانیت خدا کی ربوبیتِ عالمین کے لیے اٹھ کے کھڑی ہو جائے گی کہا وہ القیٰمۃ ہے۔ اس کے تو معنی ہی ہیں کھڑے ہو جانا۔ اور پھر کھڑے ہو جانا ہے یہ جو آخر 'ۃ' ہے نا اس کے' عربی جاننے والے جانتے ہیں عجیب زبان ہے صاحب۔ یہ قیام کے معنی آپ تو جانتے ہیں نا' قیام تو ہم سمجھتے ہیں

یہاں بھی ہوتا ہے کھڑا ہو جاتا ہے اور جب اسی کے ساتھ 'ۃ' لگتی ہے قیامۃ ہے تو وہ وہ ہو جاتی ہے ہمارے ہاں۔ حالانکہ زبان والے جانتے ہیں کہ اگر تو آہستہ آہستہ یوں کر کے اٹھا جائے کھڑا بھی ہو جائے تو اسے تو وہ قیام ہی کہتے تھے۔ اور اگر جھٹکے سے یوں اٹھ کھڑا ہو تو اسکے ساتھ ۃ لگا دیتے تھے اُسے قیامت کہتے تھے۔ یہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے By Revolution۔ پھر تفصیل سے بتاؤنگا Revolution بھی یہ مار دھاڑ والی نہیں' اسے تو تخریب کہتے ہیں فساد کہتے ہیں۔ تو یہ قیامۃ ہے مردہ قوموں کا جی اٹھنا۔ عرب جیسی مردہ قوم جو تھی اس کے جی اٹھنے کا وہ دور آ گیا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تھے۔ القائم تھے حضور ﷺ ان کو قیام دینے والے ان میں قیامت برپا کرنے والے۔ یہ قیامت برپا ہونا حشر برپا ہونا الفاظ تو ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ بس شاعری میں ہوتے ہیں سارے' حقائق کی دنیا میں نہیں ہوتے۔ کہا کہ یہ اب دور آ گیا ہے کہ جس میں یہ جی اٹھیں گی قومیں ابھر آئیں گی اور اب یہ اختلافات مٹ جائیں گے۔ پتہ چل جائے گا کہ مذہب کیا ہوتا ہے اور دین کیا ہوتا ہے خدا کی وحی کیا کہتی ہے انسانوں کا خود ساختہ دین کہاں لے آتا ہے۔ سورۃ یونس کی آیت 93 تم ہم آ گئے اور 94 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم . بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ یونس۔ چودھواں باب (آیات 94 تا اختتام)

عزیزانِ من!

آج نومبر 1973ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یونس کی 94 آیت سے ہو رہا ہے۔ (10:94)

سابقہ آیات میں مجمل طور پر ذکر آ رہا تھا کشمکشِ صاحبِ ضربِ کلیمؑ اور فرعون کا۔ یعنی دنیاوی حکمرانوں کے استبداد اور اس کے مقابلے میں اقدارِ خداوندی کے علمبرداروں کے درمیان کشمکش کا۔ اور اس کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ (**فان کنت فی شکٍ مما انزلنا الیک فسئل الذین یقرء ون الکتٰب من قبلک لقد جآء ک الحق من ربک فلا تکونن من الممترین**) (10:94) کہا جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس باب میں تجھے کوئی شک ہو کہ یہ واقعات اس طرح نہیں ہوئے تھے کہ جن لوگوں کی طرف اس سے پہلے کتاب نازل کی گئی تھی وہ اہلِ کتاب ہیں ان کے متعلق تو ان سے دریافت تم کر سکتے ہو ان کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر تمہیں مل جائے گا۔ یہاں ایک چیز ہے صرف سمجھنے کے قابل۔

یہاں جو ہے نا (**فان کنت فی شکٍ فسئل الذین**) (10:94) یہ واحد کے صیغے آئے ہیں اگر تو اس بارے میں کسی شک میں ہو تو تُو پوچھ لے اہلِ کتاب سے۔ تو (معاذ اللہ) ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی انہی کی طرف یہ آیات آئی تھیں انہیں کی طرف یہ قرآن نازل ہوا تھا تو یہ جو تو کے ساتھ آیا ہے واحد کا صیغہ تو کیا اس میں مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں۔ (معاذ اللہ) یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہا گیا ہے کہ اگر تو اس بارے میں کسی شک میں ہو جو پیچھے کہا گیا ہے تو پھر ان سے پوچھ اس سے پہلے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہی ایک مقام نہیں قرآنِ کریم میں کئی ایک مقامات آئیں گے جہاں بات ہوتی چلی آئی ہے اور اس کے بعد پھر مخاطب واحد مخاطب کا صیغہ ہے جو تو کے ساتھ ہے اور جہاں یہ ایسا؟؟ ہوتا ہے کہ مخاطب نبی اکرم ﷺ کو کیا گیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ عربی زبان میں بھی یہ ان کے ہاں قاعدہ تھا اور یہ اکثر ان کے ہاں یہ چیزیں ملتی ہیں وہ بات کرتے کرتے' یعنی سامنے مخاطب کوئی بھی نہیں ہوتا تھا اور وہ بات کرتے ہوئے ایسے مخاطب کرتے تھے کہ جیسے کوئی سامنے ہے اور اس سے کہا جا رہا ہے۔ یہ ان کا انداز بھی تھا۔ اور پھر قرآنِ کریم تو اس طرح سے واحد کا صیغہ لیتا ہے کبھی تو اس سے مراد ہوتا ہے اے مخاطب' وہ سامنے ہو یا نہ ہو' کبھی مراد جمع کی ہوتی ہے کہ اے وہ قوم کہ جس کی طرف یہ کتاب بھیجی گئی ہے۔ یا اس کے بعد بھی وہ جو اس کتاب کو پڑھ رہا ہے وہی مخاطب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے قرآنِ کریم کو جب ہم پڑھتے ہیں تو اس سے خدا ہم سے مخاطب ہوتا ہے' ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ تو اب ہم جو وہاں پڑھتے چلے آ رہے ہیں تو (**فان کنت فی شکٍ**) (10:94) مجھ سے ہی مخاطب کیوں نہیں ہے قرآن' وہ مجھ سے ہی کیوں نہیں کہہ رہا یہ۔ وہ جو اس زمانے میں مخاطب تھے ان سے

یہی بات کہی جارہی ہے خواہ واحد کا صیغہ ہو' آج جو قرآن پڑھتا ہے اس سے متعلق بات ہے کہ اگر تجھے اس بارے میں کوئی شک ہو۔ اور یہ بات تو چلی آرہی ہے میں نے عرض کیا ہے کہ بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ اور اس کے متعلق تو اگر آج بھی ان کے ہاں یہ عہد نامۂ عتیق جسے کہتے ہیں یہ Old Testimon یہودیوں کی بائبل' اس میں آپ دیکھیں گے تو یہ واقعات اس کے اندر بھی ملیں گے آپ کو۔ کہنے کی بات یہ تھی کہ ان سے یہ (معاذ اللہ) مراد نہیں ہے (فان کنت فی شکٍ) (10:94) کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اگر تجھے اس بارے میں کوئی شک ہو تو اہلِ کتاب سے پوچھ لے۔ نبی کو اپنی وحی کے بارے میں شک کیسے ہوسکتا ہے' شک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں مخاطب رسول اللہ ﷺ نہیں ہیں مخاطب ہر پڑھنے والا ہے اس کتاب کا' مخاطب وہ قوم تھی جس کی طرف اس کتاب کو نازل کیا گیا۔ اور یہ میں نے جیسا عرض کیا ہے یہ عربوں کے ہاں کا انداز تھا۔

قرآنِ کریم پڑھتے وقت اسے سمجھتے وقت ہمیشہ یہ یاد رکھئے کہ وہ جو اس نے بار بار کہا ہے نا کہ یہ عربوں کی زبان میں نازل کیا گیا ہے بلسان قومہ دیا گیا ہے تیری قوم کی زبان میں اس کو نازل کیا گیا ہے عربی مبین میں اسے نازل کیا گیا ہے۔ یہ یونہی نہیں کہی گئی بات۔ ویسے تو آپ سمجھیں کہ عربی زبان میں ایک کتاب لکھی ہوئی ہے اور اگر اس کتاب میں دو چار مرتبہ یہ کہا جائے کہ صاحب یہ عربی زبان کی کتاب ہے تو ذہن میں آئے گا کہ عربی زبان کی تو ہے ہم جانتے ہیں عربی میں تو ہے۔ یہ کہا اس لیے گیا تھا کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھو کہ محاورۂ عرب جسے کہتے ہیں کہ عربوں کے ہاں اس انداز سے کیا مفہوم لیا جاتا تھا عربوں کے ہاں اس لفظ کے کیا معنی لیے جاتے تھے۔ یہ بڑا ہی ضروری ہے قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے۔ اور پھر یاد رکھئے عربی بھی اس زمانے کی عربی ہونی چاہیے جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا۔ زبان میں تو آپ کو معلوم ہے کہ کتنا فرق پڑتا چلا جاتا ہے زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معانی میں۔ ایک ہی لفظ اپنے اوریجن کے اعتبار سے اصل کے اعتبار سے کچھ اور معنی رکھتا ہے اور آہستہ آہستہ جوں جوں وہ استعمال کی وادیوں سے گذرتا ہے اس میں کتنی تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں۔ ہر زبان میں یہ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم کا ایک تو Style (انداز) جو ہے اس زبان کا وہ وہی ہے کہ جو عربوں کا انداز ہوتا تھا اسلوبِ بیان جسے آپ کہیں گے۔

ویسے تو اس کا انداز یا جو کچھ بھی اس کا اسلوب ہے وہ ایسا معجزانہ ہے کہ خود عرب بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اس قسم کی کتاب جیسا میں نے بتایا تھا کہ دسیوں دفعہ قرآن میں یہ چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں اس کا شک ہو کہ کسی انسان کی فکر کی تخلیق ہے یہ کتاب' اس نبی نے یہ خود کتاب لکھ لی ہے کسی سے لکھوالی ہے۔ تو اس کے لیے تو سیدھا سا یہ ٹیسٹ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ اور جو بھی تمہارے ہاں کے اور بڑے بڑے فاضل نظر آتے ہیں بڑے بڑے فنِ بلاغت اور فصاحت کے ماہر نظر آتے ہیں بلاؤ ان تمام کو اور اس قرآن کی ایک سورۃ کے مطابق سورۃ لے آؤ' دس آیتیں بنا کے لے آؤ اس قسم کی۔ اور وہ عاجز رہے اس کے لیے' وہ کسی نے چیلنج قبول نہیں کیا۔ حالانکہ عرب تو اپنی زبان پہ اتنے نازاں تھے کہ وہ

اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا کہا کرتے تھے عجمی کہہ کے پکارا کرتے تھے۔ نہ انہوں نے یہ چیلنج قبول کیا نہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں یہ اتنے بڑے بڑے فاضل مستشرق ہمارے ہاں گذرے ہیں عربی زبان کے عظیم لغت انہوں نے لکھے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے نہیں ہو سکا کہ قرآن کے سٹائل کی کوئی ایک چیز پیش کر سکیں۔ یہ عجیب وغریب اعجاز ہے قرآن کا۔ میں سٹائل کی بات ابھی کہہ رہا ہوں اسلوبِ بیان کی بات کہہ رہا ہوں۔ معنی کے اعتبار سے تو پوچھئے نہیں کہ اس کے حقائق جو ہیں کتنے قبل از وقت دنیا کو دیے گئے۔ اس کا جو سٹائل ہے کوئی دوسرا اس کی نقل ہی نہیں کر سکا آج تک۔ عجیب چیز ہے اس میں۔ لیکن قرآن کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے عربی زبان' وہ عربی زبان جو اس زمانے میں اور وہ انداز اور اسلوب جو عربوں کا تھا وہ سامنے رکھنا ضروری ہے پھر مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ یہ بھی انداز تھا عربوں کا کہ وہ بات کرتے کرتے خود ہی' عام طور پہ خطابت ان کے ہاں ہوتی تھی تقریریں کیا کرتے تھے' تو وہ اپنے خطابات کے اندر باتیں کر رہے ہیں خواہ وہ سامنے کوئی بھی نہیں ہے اور اس میں درمیان میں اس طرح سے کسی کو مخاطب کرنا شروع کر دیتے تھے۔ اصل میں شاعری ان کے ہاں بہت زوروں پہ تھی اور یہ انداز شعر کا ہوتا ہے کہ مخاطب ہو بھی نہ کوئی تو اسے مخاطب کر لیتے ہیں۔ یا خود ہی شاعر اپنا تخلص آخر میں لاتا ہے اور لاتا ایسے ہے جیسے کسی دوسرے شخص کی بات ہو رہی ہو۔ تو میں کہہ یہاں یہ رہا تھا کہ یہ جو ہے کہ اگر تو شک میں ہو اس بارے میں جو نازل کیا جا رہا ہے تیری طرف تو تُو اہلِ کتاب سے پوچھ لے۔ تو یہ یہ نہ سمجھئے کہ اس میں مخاطب خود نبی اکرم ﷺ ہیں۔ اس میں مخاطب وہ قوم تھی جس کے سامنے پہلے یہ قرآن آیا اور اس کے بعد قیامت تک جو بھی قرآن کا پڑھنے والا قاری ہے وہ بھی مخاطب ہے کہ اگر اس باب میں تجھے کوئی شک ہو کہ یہ جو تفصیل دی گئی یہ ایسے نہیں ہے۔ تو اتنی بات تو تمہیں اہلِ کتاب کی کتابوں میں سے بھی مل جائے گی۔ یہ بائبل میں سے بھی مل جاتی۔ (**لقد جآء ک الحق من ربک فلا تکونن من الممترین**) (10:94)

خدا کی طرف سے بہرحال الحق (The Truth) تمہاری طرف آ گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس میں کسی قسم کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا' حق تو ہوتا ہی وہی ہے کہ جس میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ یہ الحق تمہاری طرف آ گیا۔ اب اس کے بعد اس میں جھگڑے کی بات نہیں ہے تو خوانخواہ اس میں جھگڑے نہ نکال جھگڑے نکالنے والوں میں سے نہ ہو جا۔ الحق آ گیا ہے آن میرٹ اس کو پرکھ کے دیکھ لو کہ یہ حقیقت ہے یا نہیں۔ جو چیزیں اس میں اقوامِ سابقہ یا انبیائے گذشتہ کے متعلق آئی ہیں اس میں اگر کسی قسم کا کوئی شک وشبہ ہو تو بہرحال یہ اہلِ کتاب موجود ہیں تمہارے پاس' ان سے پوچھ لو کہ کیا ان کے ہاں بھی یہ باتیں ہیں یا نہیں۔ اور اس کے بعد یہ کہا کہ (**و لا تکونن من الذین کذبوا بـایٰت الـلـه فتکون من الخٰسرین**) (10:95) بات تو اصل میں یہ ہے کہ ان میں سے نہ ہو جاؤ کہ جو قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں جھٹلاتے ہیں انہیں' کہتے ہیں کہ نہیں صاحب یہ غلط ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو آج ہمارے ہاں قدم قدم پہ اقدارِ خداوندی کو جھٹلایا جاتا ہے' مسلمانوں کی قوم ہے مسلمانوں کی مملکت ہے دن رات پکارتے ہیں کہ اسلام کے لیے اسے حاصل کیا گیا۔ اتنا چرچا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد

اقدارِ خداوندی کی تکذیب کی یہ کیفیت ہے کہ ہاں صاحب ٹھیک ہے دیانتدار بن کے دیکھ لیا کچھ نہیں بنتا۔ تکذیب ہے یہ قانونِ خداوندی کی۔ وہ کہتا ہے کہ بددیانتی اور ظلم اور بے ایمانی جو ہے پنپ نہیں سکتی' وہ کہتا ہے کہ (**فتکون من الخٰسرین**) (10:95) تم دیکھو گے کہ آخر میں نقصان اٹھاؤ گے تباہ ہو جاؤ گے۔ کہا یہاں یہ جاتا ہے کہ نہیں صاحب پنپتا اسی طرح سے ہے یہ دیکھئے سارے پنپ رہے ہیں بددیانتی کرتے کرتے۔ ہم نے دیکھ لیا دیانتدار بن کے بھی' کچھ نہیں بنتا۔ یہ تکذیب ہے آیات اللہ کی۔

ٹھیک ہے آپ چھوڑ دیجئے دین کو چھوڑ دیجئے قرآن کو چھوڑ دیجئے اسلام کو' سیکولر ہو جائے Materialistic Life لے لیجیے جیسے یورپ نے لی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ اقدار کوئی شے نہیں ہیں اصل چیز جو ہے انسان کے اپنے منافع اور مصلحتیں ہیں "Means are justified by the aims acheived" مقصد جس طریق سے بھی حاصل ہو جائے وہ طریقہ مستحسن ہے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ فلاں بات جائز ہے فلاں ناجائز ہے فلاں سچی ہے فلاں جھوٹی ہے۔ ٹھیک ہے جس طریق سے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے وہ درست ہے۔ یا تو یہ انداز اختیار کیجیے یہ کفر کا انداز ہے کھلا ہوا کفر ہے ٹھیک ہے۔ لیکن یہ چیز کہ آپ اسلام کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں دن رات آپ کی زبانوں پہ یہ چیزیں ہیں اور اس کے بعد دھڑلے سے یہ کچھ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں یا کرتے ہیں' کرنے والا بھی تکذیب کر رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ (**انه لا یفلح الظٰلمون**) ظالم پنپ نہیں سکتا۔ یہاں دھڑلے سے ظلم اور استبداد اور جور اور سارا کچھ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا یہ جاتا ہے فخر کے ساتھ کہ دیکھئے کتنا کامیاب رہا ہمارا یہ طریقہ۔ وہ کہتا ہے کہ فواحش جو ہیں قوموں کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں عام چرچا چلا آ رہا ہے معاشرے کا یہ انداز ہو رہا ہے اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ صاحب دیکھ لیجیے کچھ بھی نہیں نقصان ہو رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں تکذیبِ آیات۔ یہ کفر نہیں ہے۔ کفر تو وہ ہے کہ جو اسے تسلیم ہی نہیں کرتا کہ اسلام ہے یا دین ہے یا مذہب ہے یا اس کے مطابق مجھے چلنا ہے۔ تکذیب یہ ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں اس کی تلاوت کرتے ہیں سنتے ہیں اس کو منسوب کرتے ہیں اپنے آپ کو اس کی طرف۔ ہر خط کے اوپر 786 لکھا ہوا ہوتا ہے جیسے آپ کے آئین کے اوپر بھی یہ لکھا ہوتا ہے کہ مملکت کے تمام کاروبار حدودِ خداوندی کے تابع رہتے ہوئے کیے جائیں گے۔ یہ اقرار ہے یہ ایمان ہے اور اس کے بعد یہ کہ جتنی اقدار اس میں دی ہوئی ہیں دھڑلے سے یا زبان سے ان کا اقرار کریں یا عملاً ان کی خلاف ورزی کرتے چلے جائیں گے۔ یہ تکذیب ہے یاد رکھئے عزیزانِ من!۔ اور تکذیب تو کفر سے بھی زیادہ بدتر جرم ہے۔ اس میں منافقت ہے ساتھ' زبان سے آپ اقرار کرتے ہیں عملاً اس سے انکار کرتے ہیں اس کے خلاف کرتے ہیں۔ اور پھر یہ کہتے ہوئے قطعاً آپ کو حیا نہیں آتی کہ نہیں صاحب ہم نے دیکھ لیا کر کے اس سے یہ نہیں ہوتا۔ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہے تم یہ کہہ رہے ہو کہ نہیں صاحب اس کا نتیجہ کامیابی ہے۔ چیلنج دے رہے ہو خدا کو۔ ٹھیک ہے خدا کا نام لینا چھوڑ دو جو جی میں آئے کرو چیلنج دیجئے۔ فرعون نے بھی چیلنج دیا تھا لینن بھی چیلنج دیتا ہے وہ بات بنتی ہے ان کی' انکار کرتے ہیں۔ او اقرار کرتے ہو اس کا اور اس کے بعد عملاً چیلنج دیتے ہو خدا کو کہ وہ کہتا ہے کہ تم تباہ ہو جاؤ گے یہ کہتے ہیں ہم پنپ رہے ہیں

صاحب کرلے کیا کرتا ہے تو۔اسے تکذیبِ آیات کہتے ہیں۔مذہب پرست قومیں تکذیبِ آیات کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کو دہرا عذاب ملتا ہے۔ٹھیک ہے کفر ایک انکار ہے وہ اپنے لیے اپنی عقل وفکر کی بناء پہ مصلحت کے لیے ہی سہی کچھ طریقے وضع کر لیتے ہیں لیکن ان میں منافقت نہیں ہوتی۔وہ بھی نتائج اپنے کچھ پیدا کر لیتا ہے عارضی سہی شعلۂ مستعجل سہی تھوڑے وقت کے لیے سہی۔لیکن ان کے سینے میں تضادات کی کشمکش نہیں ہوتی وہ کھلے بندوں یہ کہتے ہیں ہم نہیں مانتے ان اقدار کو۔یہاں کیفیت یہ ہے کہ دن رات ان اقدار کا چرچا کیا جاتا ہے اس کے بعد عملاً ان کے خلاف جایا جاتا ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دیکھئے ہم کتنے کامیاب ہو رہے ہیں۔یہ ہیں وہ Psychological Contradiction (نفسیاتی تضادات) یہ ہے جو لے ڈوبتا ہے افراد کو بھی اقوام کو بھی۔اور اسی کو اس نے شرک بھی کہا ہے شرک بھی تضاد ہی کا نام ہوتا ہے۔بات دوسری طرف چلی جائے گی۔(**ان الذین حقت علیھم کلمت ربک لا یؤمنون . و لو جآء تھم کل اٰیۃٍ حتیٰ یروا العذاب الالیم**) (10:96-97)

یہاں پھر عام ترجمے سے ایک الجھاؤ پیدا ہوتا ہے ذہن میں۔میں نے عرض کیا تھا عزیزانِ من! کہ عام ترجمے ہمارے ہاں جو ہیں یہ قرآن کو نہ صرف یہ کہ سمجھا نہیں سکتے بلکہ ان سے الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کے اوپر تیرے رب کی بات پوری ہو چکی ہے وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔تو گویا رب کی بات پہلے سے ایک لکھی ہوئی تھی کہ انہوں نے تو ایمان لانا ہی نہیں ہے وہ پوری ہوگئی ہے اس واسطے یہ ایمان ہی نہیں لائیں گے۔سیدھی سی بات ہے کہ اگر وہ پہلے ہی رب نے فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو اب ان کا جرم کیا ان کو سزائیں کیوں دی جا رہی ہیں جہنم رسید کیوں کیا جا رہا ہے۔سارا قرآن تو اسی چیز سے بھرا پڑا ہے کہ اگر یہ انکار کرو گے اگر اس کے خلاف جاؤ گے تو یہ ہوگا اور وہ ہوگا یہ سزا ملے گی تباہ ہو جاؤ گے آخرت میں جہنم میں جاؤ گے۔اور بات اگر یہ ہوئی کہ صاحب پہلے سے طے ہوا ہوا ہے تو پھر۔یہ بھی مانتے ہیں وہ بھی مانتے ہیں۔قیامت ہے کہ خدا کو ایک ہی زبان میں الھادی بھی کہتے ہیں ہدایت دینے والا' (معاذ اللہ) المذل بھی کہتے ہیں۔یہ جو ننانوے نام گنائے ہوئے ہوتے ہیں نا قرآن میں' آپ دیکھیں گے اس میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے الھادی ہدایت دینے والا' المذل گمراہ کرنے والا (معاذ اللہ)۔اوگمراہ کرنے والا۔کہاں سے یہ چیزیں آ رہی ہیں؟ ان ترجموں سے آ رہی ہیں جو میں نے عرض کیا ہے آپ سے۔ابھی بات آئے گی آگے۔یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ میں نے کہا ہے نا ترجمہ کر لیا کہ جن کے متعلق خدا کی بات کہی ہوئی پوری ہو بھئی وہ تو کبھی بھی ایمان نہیں لائیں گے۔اور پھر اس کی تفسیر میں آپ کی وہ حدیثیں آ جاتی ہیں روایات آ جاتی ہیں۔فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ آدم کی پشت سے جب پوری نوعِ انسانی نکالی گئی تو اللہ میاں نے دایاں ہاتھ پھیرا ایک طبقے کے اوپر وہ ساری کی ساری روحیں جنت کی تھیں' بایاں ہاتھ پھیرا وہ ساری کی ساری جہنم کی تھیں۔چلئے۔او پہلے ہی وہاں کہیں یہ سارے فیصلے ہو گئے بایاں ہاتھ پھیر دیا تو اِدھر' دایاں ہاتھ پھیر دیا تو اُدھر۔بلاتمثیل عرض کرونگا عزیزانِ من! اور کس طرح سے سمجھاؤں یہ بات جو یہ کہتے ہیں کہ وہ مہاراج رنجیت سنگھ کے زمانے میں

فائلیں بہت سی اکٹھی ہوگئیں مقدمات لوگوں کے تھے۔ وہ دہائی مچی کہ صاحب کوئی فیصلہ کیجیے۔ ان کو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ انبار اکٹھا ہوگیا ایک دن اُنہوں نے کہا ''لاؤ اوئے کی کہندے اوتسی' ہُنے فیصلہ کر دینے آں ایسی کیہڑی گل اے' اوہنے کہیا جی اوتے ہزاراں دی تعداد اچ ہے' کہن لگا بھاویں لکھاں ہون تسی ساڈے فیصلے ای نئیں تکنے''۔ لے آئے وہ انبار انہوں نے' اکٹھا کر دیا'' کہن لگا ادھیاں ایدھر رکھ دیؤ ادھیاں ایدھر''۔ وہ رکھ دیا انبار اِدھر اُدھر'' کہن لگا ایہہ منظور ایہہ نامنظور' لے جاؤ''۔ عزیزانِ من! کیا باتیں آپ کرتے ہیں۔ پشت پہ ہاتھ پھیرا دایاں ہاتھ پھیرا یہ سارے جنت والے بایاں ہاتھ پھیرا یہ سارے جہنم میں۔ وہاں وہ کہتا ہے (**و من یعمل مثقال ذرة خیراً یرٰی و من یعمل مثقال ذرة شرًا یرٰی**) عدل کے ترازو کھڑے کیے جائیں گے اور ایک ایک ذرے کے برابر وہاں کانٹے پہ وزن ہوگا۔ (**و من ثقلت موازنیه فهو فی عیشة راضیة و من خفت موازینه ؟؟؟**) جس کا تعمیری' نیکیوں کا پلڑا جھک جائے گا وہ ہے کہ جو جنت میں جائے گا' جس کا یہ پلڑا جو ہے اٹھا ہوا رہے گا وہ ہے جو اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے جہنم میں جائے گا۔ یہ کہنے والا خدا اور اس کے بعد صاحب یہ آ گئیں روایات وہ۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ جو اس قسم کی آیات کے یہ ترجمے ہیں اس سے یہ سارے الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔ (**ان الذین حقت علیهم کلمت ربک**) (10:96) کلمت ربک تو آپ کو معلوم ہے قانون کے معنی ہیں۔ جن لوگوں کے اوپر خدا کا قانون یہ صادق آ گیا کہ ان کی روش یہ ہے کہ انہوں نے اس کے مطابق جو روش اقرار کرنے کی ہے ابھی آگے آتا ہے وہ کیا ہے۔ ٹھیک ہے اور پہلے یہ بتا چکا ہے ابھی ابھی پیچھے تو یہ آ گئی ہے یہ بات اسی سورۃ کے اندر کہ وہ جو دلوں پہ مہر لگتی ہے وہ کن کے دلوں کے اوپر مہر لگتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رسولوں پہ رسول ان کی طرف خواہ آتے رہیں (**فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا به من قبل**) کیفیت ان کی یہ ہے کہ بات ان سے کی نہیں بغیر سوچے سمجھے جذباتی طور پہ ردِعمل یہ کہ نہیں صاحب ہم نہیں مانیں گے۔ او بھئی سن تو لو سمجھ تو لو۔ سمجھا ہوا ہے سنا ہوا ہے ہم نہیں ماننے کے' ہم تو اپنے اسی طریقے پہ چلے جائیں گے جس پہ چلتے آتے ہیں۔ (**کذٰلک نتبعوا علٰی قلوب ؟؟؟**) کہتا ہے کہ یہ یوں مہریں لگا کرتی ہیں ان کے دلوں کے اوپر کم بختوں کے جو سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔ دیکھا یہ مہریں کیسے لگتی ہیں؟ کہ تیار ہی نہیں سمجھنے سوچنے کے لیے سننے کے لیے تیار نہیں ہیں صاحب۔ تو کہا کہ جن کی یہ کیفیت ہو سوچو تو سہی تمہارے اس کہنے سے وہ ایمان کیسے لے آئیں گے وہ تو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں سوچنے کے لیے تیار نہیں سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ قرآن نے کہا یہ تھا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو سوچنے سمجھنے سے کام نہیں لیتا وہ نہیں ایمان لایا کرتا۔ تو یہ جو ہے (**ان الذین حقت علیهم کلمت ربک**) (10:96) کہ جو خدا کے اس قانون کے مطابق پہلے سے یوں سر مار دے کہ نہیں صاحب میں سننے کو تیار نہیں تو وہ ایمان ہی نہیں لائے گا۔ (**لو جآء تهم کل اٰیةٍ**) (10:97) ہزار قانون اس کے سامنے پیش کرو وہ مانے گا ہی نہیں۔ کتنی بات صاف ہے۔ مانے گا کس طرح سے؟ وہ جیسے فرعون مانا تھا' جب موت سامنے کھڑی آگے دیکھی تو وہاں یہ کہا کہ ایمان لایا۔ (**حتٰی یروا العذاب الالیم**) (10:97) وہ جو کچھ اس نے اپنے انکار کی روش اختیار کی تھی اس کے جب نتائج سامنے آئے تباہی کے تو اس وقت

چلا اٹھا کہ ہاں صاحب میں ایمان لاتا ہوں۔ کہا کہ اب نہیں۔ توبہ کے تو معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد تمہارے پاس وہ وقت ہو جس میں تم اپنی پہلی غلطیوں کا ازالہ کر سکو۔ اور جب اس کی گنجائش ہی نہ ہو وقت ہی نہ ہو تو پھر اس توبہ کے معنی کیا ہیں۔ یہ معنی تھے اس کے کہ اب کچھ فائدہ نہیں ہے۔ کہا ان لوگوں کی بھی یہ کیفیت ہے جو سمجھنے سوچنے سے کام نہیں لیتے پہلا ری ایکشن یہ ہوتا ہے کہ ہم نے مخالفت کرنی ہے۔ آپ کسی شخص سے بات کر کے دیکھئے جس کا First Reaction یہ ہو کہ ہم نے تو سننی نہیں بات لاکھ سر ماریئے اس کے ساتھ مجال ہے اپنے مقام سے ذرا سر کے ۔ یہ چیز ہے جو اس نے یہ کہا ہوا ہے کہ اس کی طرف آنا ہے (**لا یمستعوہ الی** ؟؟؟) تو پہلے دماغ کو غیر قرآنی غلط خیالات سے الگ کرو اس موڈ میں آؤ کہ ہاں صاحب ہم نے بات سمجھنی ہے سوچنا ہے اس کو دیکھنا ہے پرکھنا ہے۔ اگر اسکے بعد ہم سمجھیں گے کہ یہ ٹھیک بات ہے تو ہم اسے قبول کر لیں گے اگر دیکھیں گے غلط بات ہے تو ہم مسترد کریں گے۔ کہا کہ اس سے بات کر کے دیکھو پھر دیکھو کس طرح نہیں آتا وہ۔ اور جس نے پہلے ہی سر مار دیا کہ نہیں صاحب میں تو آؤنگا ہی نہیں تو اس کی یہ کیفیت ہے وہ نہیں ایمان لا سکتا۔ اقوامِ سابقہ میں ایک قوم کا ذکر قرآن نے ایسا کیا ہے ورنہ عام طور پہ تو انداز یہ آتا ہے کہ نبی ایک قوم میں مبعوث ہوتا ہے وہی اس کی اولیں مخاطب ہوتی ہے ان میں وہ تبشیر و تنذیر سے کام لیتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اس پہ ایمان لے آتے ہیں اور باقی قوم جو ہے مخالفت میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب ایسا وقت آجاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اب ان میں کوئی بھی فرد اور ایسا نہیں جس کی سعادت میں یہ بات ہو اور قوم مخالفت میں انتہا کر دیتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اب ان کے غلط اندازِ زندگی کے نتائج نکلنے کا وقت آ گیا اور یہ قوم تباہ ہو جائے گی تو وہ اپنی اس جماعت کو لے کے ان سے الگ ہو جاتا تھا۔ یہ اُس وقت ہوتا تھا جب وہ دیکھتا تھا قانونِ خداوندی کے مطابق کہ اب ان کے بچنے کی کوئی شکل ہے نہیں۔ تو وہ چلا جاتا تھا اور اس کے بعد پھر یہ ہے اسے ہجرت کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس قوم کی تباہی کا واقعی وقت آجاتا تھا۔ ایک استثنٰی اس کے اندر ایسا کیا ہے قرآن نے' وہ ہے حضرتِ یونسؑ کا قصہ۔

اس میں قرآن نے یہ بات کہی کہ یونسؑ نے اندازہ یہ لگایا کہ اب یہ قوم جو ہے بچ نہیں سکتی اس کی تباہی کا وقت آ گیا۔ اور وہ اپنے اس قیاس کے مطابق اس قوم سے ناراض ہو کے چلا گیا۔ ہجرت درحقیقت خدا کے پروگرام کے مطابق ہی انبیاء کرتے تھے' اس میں ان کے اپنے قیاس کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ قیاس میں گنجائش ہو سکتی ہے تھوڑی سی کہ اس میں اجتہادی غلطی ہو جائے گی۔ ہجرت تو بہت بڑی چیز ہے یہ تو ایک انقلابی موڑ ہوتا ہے تحریک کے اندر۔ کسی ناصح مشفق کا کسی طبیب کا کسی ڈاکٹر کا مریض کی بالی سے یہ کہہ کے اٹھ کے چلے جانا اب ختم ہے قصہ صاحب کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور یہ تو ایک فرد کی بات میں نے کہی ہے اگر ایک قوم کے متعلق' قوم کا ناصح مشفق جو ہے وہ یہ کہہ کے چلا جائے کہ اب یہ قوم بچ نہیں سکتی اور ان سے علیحدگی اختیار کر لے۔ بہت بڑا انقلابی موڑ ہوتا ہے یہ۔ دوٹوک فیصلہ ہوتا ہے اس کے اندر۔ تو اس کے لیے نبی کے قیاس پہ نہیں چھوڑا جاتا یہ۔ ہجرت خدا کے پروگرام کے مطابق اس کی وحی کے مطابق ہوتی تھی۔ قرآن یہ

دوسرے مقام پہ بتاتا ہے کہ وہ؟؟؟ چلے گئے وہ قوم سے ناراض ہوگئے اور وہ وہاں سے یہ کہہ کے چلے گئے کہ تم بچ نہیں سکتے۔ان کا اندازہ صحیح نہ نکلا' قوم نے اس کا احساس کیا کہ وہ ایسے وقت میں جب یہ یوں گئے ہیں تو واقعی تباہی آئی ہے اور وہ قوم جو تھی وہ راہِ راست کے اوپر آ گئی اور وہ بچ گئی۔حضرتِ یونسؑ کو اپنے اس اجتہادی غلطی جو تھی اندازہ جو غلط تھا ان کا وہ جو آگے واقعہ آتا ہے ان کا وہ جب آئیں گے یونسؑ کے واقعات تو میں عرض کرونگا کہ وہ کیا ہوا تھا پھر۔ان میں خود ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اندر دل میں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی میرا قیاس صحیح نہیں تھا۔لیکن بہرحال قرآن نے کہا یہ ہے کہ ایک قوم ایسی بھی تھی کہ جس کے متعلق اس کے نبی کا یہ اندازہ صحیح نہ نکلا وہ یہ سمجھ کے ان کو چھوڑ کے چلا گیا کہ قوم تباہ ہونے والی ہے۔لیکن وہ قوم جو تھی اس کے بعد فوراً ہی انہوں نے اپنی روش کے اوپر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ ہم سے غلطی ہو رہی ہے تو انہوں نے اس کی اصلاح کر لی اور بچ گئی۔اور اسی لیے حضرتِ یونسؑ پھر واپس آئے تھے اس قوم میں۔کہا کہ (**فلو لا کانت قریة اٰمنت فنفعها ایمانها الا قوم یونس**) (10:98) کوئی قوم بھی ایسی نہیں تھی کہ جب تباہی ان کے سامنے آ گئی وہ ایمان لانے کا انہوں نے کہہ دیا تو ان کے ایمان نے ان کو نفع دیا ہو۔میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! کہ یہ ایمان چار الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں ہے۔ایمان اپنی روش کو بدل لینے کا نام ہے۔اور جب پھر روش ہی ختم ہوگئی ہو تو بدلنا کیا' جب یہ فرصت کا وقت ہی باقی نہ ہو کہ جس میں اصلاح کر سکتا ہے انسان اپنی' توبہ کے معنی کچھ نہیں ہیں۔یہ چند الفاظ کے دہرا دینے کا نام نہیں ہے۔اسی طرح سے کہا کہ کوئی قوم بھی جب اس کی صورت یہ ہوگئی کہ وہ مکافاتِ عمل کے مطابق تباہی ان کے سر پہ آ گئی اس وقت اگر وہ زبان سے یہ بھی کہہ لیں کہ ہم ایمان لائے ہیں تو وہ ایمان فائدہ نہیں دے سکتا۔کہا یہ ایک قومِ یونسؑ تھی کہ جس کے متعلق نبی کا اندازہ یہ ہوا کہ ان کی تباہی اب یقینی طور پہ آ گئی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔انہوں نے اس تباہی سے آنے سی پیشتر صحیح روش اختیار کر لی اور وہ قوم بچ گئی۔کہا کہ اس کے سوا تو اور تاریخ میں کوئی قوم ایسی ہے نہیں کہ جس قوم کی یہ کیفیت ہو کہ اس نبی نے فیصلہ دیدیا ہو ہمارے پروگرام کے مطابق کہ اب یہ تباہی ان کی آ گئی ہے اور وہ اس کے بعد بچ گئے ہوں۔جیسا میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! قرآن میں یہ آتا ہے (**فلما احسوا باسهم**) کہ یہ ظلم اور استبداد پہ مبنی جتنے معاشرے ہوتے ہیں ان کی یہ غلط روش ان کا یہ استبداد اور ظلم کی چیزیں اندر ہی اندر نتائج مرتب کر رہی ہوتی ہیں۔یہ ایک ہی دن نہیں کہیں ہو جاتا کہ ان کی تباہی یکا یک زلزلے کی طرح آ جاتی ہے۔وہ اندر ہی اندر مواد پکتا ہے اس کا اور اس کے بعد جب وہ وقت آ جاتا ہے کہ وہ شاخ کے اندر سے وہ شگوفہ باہر آ جائے محسوس شکل میں جب تباہی ان کے سامنے آتی ہے تو وہ اس وقت اس سے پھر بھاگتے ہیں۔اور وہاں ہمارا قانونِ مکافات پیچھے سے آواز دیتا ہے (**لا تركضوا**) تم کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتے ٹھہر جاؤ' ٹھہر گئے' واپس آؤ اپنے ان محلات اور ایوانات کی طرف کہ جسے تم نے غریبوں کے خون کے پسینے سے تعمیر کیا تھا۔آؤ تا کہ تم سے ہم پوچھیں کہ یہ کہاں سے لیا تھا پیسہ کہ جس سے یہ محل تعمیر کرائے تھے۔اس وقت یہ انداز ہوتا ہے اور وہ وقت توبہ کا نہیں ہوتا۔وہ تو جو اپنی غلط روش ہے اس کی تباہی کے نتائج بھگتنے کا وقت آ جاتا ہے پھر کچھ نہیں ہو سکتا تمہارے ساتھ۔(**لما اٰمنوا كشفنا عنهم عذاب**

الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا و متعنٰھم الٰی حین) (10:98) قومِ یونسؑ کی یہ صورت ہوگئی تھی کہ وہ تباہی سے پہلے انہوں نے اپنی روش کو بدل لیا اور اسکے بعد ہم نے ان سے وہ تباہی جو آنے والی تھی اس کو اٹھالیا۔ کیا تباہی ہوتی ہے؟

عزیزانِ من! ہم تو اپنے ذہن میں یہی رکھتے ہیں نا کہ وہ؟؟ کی بارش ہوجاتی ہے آگ برسنے لگ جاتی ہے کہیں سے وہ زلزلہ آجاتا ہے طوفان آجاتا ہے' مرزا صاحب کے الفاظ میں طاعون پھوٹ جاتا ہے ہیضہ آجاتا ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں نا کہ خدا کا عذاب قوموں پہ یہ ہوتا ہے۔ یہ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے متعلق نہ یہ سمجھ لیں کہ خدا کے عذاب میں ہم گرفتار ہیں' یہ خود فریبی ہے۔ سنیے عزیزانِ من! کہ عذابِ خداوندی کیا ہے۔ الفاظ قرآن کے ہیں آپ کے سامنے' میں تو نہیں کچھ کہہ رہا میں تو اپنی طرف سے کبھی کچھ نہیں کہا کرتا۔ کیا تھا؟ عزیزانِ من! سنیے عذاب کیا ہوتا ہے۔ (عذاب الخزی فی الحیٰوۃ الدنیا) (10:98) اسی دنیا کی زندگی میں ذلت اور خواری اس قوم کے نصیب میں ہوجاتی ہے' ذلیل ہوجاتی ہے وہ قوم دوسری قوموں کی نگاہوں میں۔ کہا یہ ہے عذاب تمہارا۔ (خزی فی الحیٰوۃ الدنیا) (10:98) اسی دنیا کی زندگی میں ذلیل اور خوار ہوجاتی ہے وہ قوم۔ اب سوچ لیجیے عزیزانِ من! اس کے پہچاننے اور ماپنے کے لیے کسی قسم کا کوئی غلط قیاس ہوسکتا ہے غلط اندازہ ہوسکتا ہے کوئی غلطی لگ سکتی ہے کہ قوم عذاب میں مبتلا ہے یا منعم علیہ ہے یا خدا کے انعامات اس قوم کے اوپر برس رہے ہیں۔ ایک ہی لفظ ہے (خزی فی الحیٰوۃ الدنیا) (10:98) آخرت میں جا کے جو ہوگا اس کو تو چھوڑ دیجیے (فی الحیٰوۃ الدنیا) اسی دنیا کی زندگی میں ذلت۔ اور ذلت کی انتہا یہ عزیزانِ من! کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو ذلیل محسوس کر رہا ہے۔ اندازہ لگائیے کتنا بڑا عذاب ہے۔ اسی لیے میں یہ کہا کرتا ہوں کہ خدا کرے کہ ہم وہ قومِ یونسؑ ہی کی طرح ہوجائیں کہ اب بھی بات ہمارے سمجھ میں آجائے اور ہم اپنی روش کو بدل لیں تو یہ ذلت کا عذاب ہم سے اٹھ جائے کسی طرح سے۔ شاید اب بھی ابھی مہلت کا وقفہ ابھی ہو۔ تو یہ صورت اس کے بچنے کی ہے۔ ورنہ اگر وہ آخری وقت جو ہے قوم کی تباہی کا آجاتا ہے اس وقت تو پھر یہ ایمان اور یہ انفال اور یہ ندامت اور یہ Regret کوئی کام نہیں دے سکتا عزیزانِ من!۔ یہی نہیں کہا کہ پھر وہ ذلت ان کی جو تھی وہ دور ہوجاتی ہے (و متعنٰھم الٰی حین) (10:98) پھر ایک وقت تک کے لیے ان کو متاعِ حیات مل جاتی ہے۔ ذلت و خواریاں کیا ہیں؟ متاعِ حیات کا چھن جانا کسی قوم سے۔ اور پھر یہ متاعِ حیات ان کو مل گئی اس قوم کو۔ اب یہ آگے بات بڑی اہم آتی ہے صاحب۔

رسول اللہ ﷺ ایک طبیبِ مشفق کی طرح دل سے چاہتے تھے کہ یہ قوم تباہ نہ ہوجائے انسانیت اس طرح اپنے ہاتھوں سے ذلت اور خواری کے گڑھے میں نہ گر جائے۔ یہ ایک ایک فرد کو بچانا چاہتے تھے پوری قوم کو بچانا چاہتے تھے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ تو تو اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا اس غم میں کہ یہ لوگ کیوں نہیں ایمان لاتے۔ اور اس کے بعد جی میں یہ آتا ہوگا نا کہ کوئی طریقہ ایسا اختیار کرلیا جائے کہ یہ کسی طرح سے ایمان لے آئیں بچ جائیں۔ عزیزانِ من! رسول کو کوئی اپنی منفعت مقصود نہیں ہوتی۔ وہ تو جیسا قرآن کہتا ہے پہلے دن اعلان کرتا ہے (لا

اسئلکم علیه من اجر) جو کچھ میں کر رہا ہوں میں اپنے لیے کوئی اجر اس کا نہیں تم سے مانگتا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا کوئی صلہ نہیں مانگتا وہ ووٹ بھی نہیں لیتا ان کے لیے۔ وہ تو پہلے دن رسول ہوتا ہے جب کوئی ووٹ دینے والا بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ وہ ان کی خاطر سب کچھ چاہتا ہے ۔جی میں یہ آتا ہوگا کہ یا اللہ کچھ تو ایسا ہو جائے یہ کسی طرح کم بخت بچ جائیں سہی۔ **(و لو شآء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعًا افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین)** (10:99) اے رسول یہ جو تیرے دل میں بار بار یہ آرزو بیدار ہوتی ہے اٹھتی ہے کہ کچھ ہو جائے یہ کسی طرح سے یہ قوم ایمان لے آئے بچ جائے یہ چیز۔ کہا کیا تو مجبور کرنا چاہتا ہے ان کو کہ یہ ایسا ہو جائے۔ اگر مجبوری سے جبر سے ہی مومن بنانا مقصود ہوتا ہمارے لیے مشکل کیا تھی کہ ہم انسان کو پیدا ہی مومن کرتے۔ کائنات کی باقی چیزوں کو ہم نے پیدا کیا ہوا ہے نا' ہر ایک مسلم ہے ان میں سے' خدا کے قانون کے سامنے جھکی ہوئی۔ جرآت نہیں ہے یہ اتنے بڑے عظیم الجثہ سورج کو کہ قانونِ خداوندی اگر ہے کہ پانچ بج کے تین منٹ اور چونتیس سیکنڈ کے اوپر تو نے نمودار ہونا ہے کہ اس میں پینتسواں سیکنڈ ہو جائے کسی طرح سے۔ یہ ہے نا اطاعت۔ کہتا ہے کہ یہ سب مسلم ہیں۔ اسلام کے معنی یہ ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر یہ انسانوں کی بھی اسی طرح سے یہ کیفیت ہوتی کہ ان کے اختیار وارادے کے بغیر ہی یہ سارے کے سارے ایک روش پر چلنے کے لیے مجبور ہوتے تو ہم انہیں پیدا ہی اسی طرح کر سکتے تھے۔ ہمارے لیے مشکل ہی نہیں تھا یہ' اگر خدا چاہتا تو یہ اس طرح سے ہو سکتا تھا۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں چاہا ہم نے چاہا یہ ہے کہ یہ اپنے اختیار وارادے سے اپنے لیے راستہ کچھ اختیار کرے۔ راستہ متمیز کر کے ہم نے دکھا دیا انہیں یہ صحیح راستہ ہے یہ غلط راستہ ہے۔ دوراہے پہ تمہیں کھڑا کر دیا ہے اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ **(فمن شآء فلیؤمن فمن شآء فلیکفر)** جس کا جی چاہتا ہے یہ راستہ اختیار کرے جس کا جی چاہتے وہ اختیار کرے۔ اس کے بعد کہا کہ اے رسول تو کیا چاہتا ہے تو کیا مجبور کرے گا ان لوگوں کو کہ یہ ضرور صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ مجبور کرنا ہوتا تو ہم انہیں پیدا ہی ایسا کر دیتے کہ ان کا اختیار وارادہ ہوتا ہی نہیں۔ تو جب ہم نے صاحبِ اختیار وارادہ پیدا کیا ہے کہ ایک طرف ان کو یہ اختیار دیدینا کہ جونسا راستہ جی چاہے اپنے لیے خود اختیار کر لیں اور دوسری طرف یہ اختیار سلب کر لینا کہ مجبور کر کے ہمیں ایک ہی روش پہ چلانے کے لیے پیدا کرتے۔ خدا کے شایانِ شان نہیں تھا یہ' ہم نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اس میں جبر کی کوئی بات نہیں ہے **(لا اکراہ فی الدین)** کوئی جبر کی بات نہیں ہے۔ ایمان تو کہتے ہی اسے ہیں جو دل اور دماغ کی کامل رضا مندی سے اختیار کیا جائے۔ اور یہاں آپ کے ہاں چل رہی ہے ایک لمبی تحریک صاحب کہ کوئی شخص بھی جو مسلمان ہو کے' فرض کرو کہ اس بد بخت کے ذہن میں یہ چیز ہے کہ یہ جو مذہب تم پیش کر رہے ہو میں اسے پسند نہیں کرتا وہ بدلنا چاہتا ہے' کہتا ہے نہیں جا سکتے قتل کر دیے جاؤ گے۔ قرآن کہتا ہے رسول اللہ ﷺ سے کہ کیا تم جبراً ان کو مسلمان بناؤ گے۔ خدا کہتا ہے رسول سے۔

اور یہاں یہ صورت ہے کہ ہاں صاحب ہم تلوار کے زور سے ان کو رکھیں گے یہاں مسلمان' مرتد کی سزا جسے قتل آپ کہتے ہیں۔ کسی نے یہ سوچا نہیں کہ کتنی بڑی خطرناک تحریک ہے یہ جو پیدا کی جا رہی ہے عزیزانِ من!۔ جس دور میں انہوں نے اس چیز کے اوپر عمل شروع کیا تھا

اوراختیاران کو یہ مل گیا' ہر شخص کو اپنی جیب میں کارڈ رکھنا پڑتا تھا ان کے ہاں کے دستخط کا کہ یہ شخص صحیح العقیدہ ہے اسے کچھ نہ کہا جائے۔ جسے وہ کارڈ نہیں ملا تھا یعنی جس کا جی چاہے اسے قتل کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صدیوں تک بغداد کی گلیوں کے اندر کتنا مسلمانوں کا خون ہوا' کس بناء پہ؟ کہ جو صاحبِ اقتدار ملا تھے انہوں نے کہہ دیا تھا کہ ان کے عقیدے صحیح نہیں۔ عقیدہ' یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمان چھوڑ کے عیسائی ہو گئے تھے یا یہودی ہو گئے تھے یا ہندو ہو گئے تھے۔ جی نہیں صاحب ان کا عقیدہ صحیح نہیں رہا۔ وہ اپنی صحتِ عقیدہ کے لیے ان سے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ ہے جو کچھ آپ کے ہاں ہو رہا ہے۔ وہ تو شکر کیجئے خدا کا کہ آپ سانس لے رہے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں یہ اقتدار نہیں گیا یہ اقامتِ دین کے مدعیوں کے۔ سب سے زیادہ تیز اس کے اندر یہ جماعتِ اسلامی ہے۔ مودودی صاحب تو پوری کی پوری قوم کے متعلق فیصلہ کر چکے ہیں اور لکھا ہوا ہے ان کی کتاب میں مرتد کی سزا کہ اقتدار اگر ہمارے ہاتھ میں آیا تو ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا ان لوگوں کو۔ اور اس کے بعد جو بھی ان کے انداز کا جو صحیح اسلام ہے اس کے مطابق یہ نہ ہوا تو وہ کہتے ہیں کہ سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ خدا اپنے رسول سے کہہ رہا ہے کہ (**افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین**) (10:99) کیا تو مجبور کرنا چاہتا ہے ان لوگوں کو کہ یہ ایمان لے آئیں۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا ہے ہمارے لیے کیا مشکل تھا کہ ہم انہیں پیدا ہی اس طرح کرتے کہ ان میں سے کوئی انکار اور کفر اختیار ہی نہ کرتا۔ یہ بات نہیں ہے۔ اگلی بات جو ہے اس نے اگلی آیت میں صاف کر دی بات اور جس میں اس نے صاف کی تھی وہی اس ترجمے کی غلطی نے الجھاؤ پیدا کر دیا۔ یعنی پہلا جو کہا گیا ہے اس کے متضاد اگلی آیت آتی ہے۔ میں کیا عرض کروں عزیزانِ من!۔ یہاں یہ ہے کہ کیا تو مجبور کر سکتا ہے' اگر ایسا ہوتا تو ہم خود ہی نہ یہ کر دیتے۔ اگلی آیت ہے (**وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ**) (10:100)

ترجمہ کیا جاتا ہے کوئی شخص اسلام قبول نہیں کر سکتا اللہ کی اجازت کے بغیر۔ چلئے صاحب۔ یعنی پہلے وہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ تو انسانوں کے اختیار و ارادے پہ ہم نے چھوڑا ہے۔ مجبور کرنا چاہتے تو ہم انہیں پیدا ہی ایسے کرتے اور اے رسول تو کیوں اپنے ذہن میں یہ بات کہہ رہا ہے کہ زبردستی کسی طرح سے ان کو مسلمان بنا لیا جائے۔ اور ساتھ ہی اگلی آیت میں یہ ترجمہ کہ کوئی شخص خدا کے حکم کے بغیر ایمان ہی نہیں لا سکتا۔ تو یہ جتنے بھی آپ کے ہاں غیر مسلم ہیں جو ایمان نہیں لائے ہوئے سیدھی سی بات ہے کہ صاحب ہم تو مجبور ہیں خدا کا حکم ہی نہیں ہمارے لیے ہوا تو ہم ایمان کیسے لا سکتے ہیں۔ اُدھر سے حکم ہوگا تو ایمان لائیں گے۔ آپ دیکھتے ہیں دو آیتیں ساتھ کے ساتھ پڑی ہوئی' کتنی متضاد۔ پھر بات کیا ہے یہ۔ وہ ایک لفظِ اذن کے معنی انہوں نے لے لیے حکم' اجازت۔ قرآن میں دیکھئے کہ اس کے معنی کیا ہیں کس چیز کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ جو حکم دیا جائے اب دوسرے وقت میں کوئی دوسرا حکم تو وہ تو حکم ہوتا ہے۔ اور جب خدائے علیم ایک دفعہ ایک ایسا حکم دیدے جس کے متعلق وہ کہے کہ یہ قیامت تک بدل نہیں سکتا وہ قانون ہوتا ہے۔ اور اذن کے معنی قانون ہو جاتے ہیں جب وہ غیر متبدل ہو جائے تو۔ (**لا تبدیل لکلمت اللہ**) اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہر حکم جو غیر متبدل ہو وہ قانون ہوتا ہے عزیزانِ من!۔ کہا یہ کہ تو کہتا ہے زبردستی کسی طرح

سے یہ ایمان لے آئیں' اوایمان تو خدا کے ایک مقرر کردہ قانون کے مطابق لایا جاتا ہے۔ یہ آدھی آیت ہے عزیزانِ من! اگلی آدھی آیت میں تو بات واضح کر دی تھی۔لیکن ہم کیا کریں قیامت ہے یہاں کہ انہوں نے تو یہ جبر کرنا ہے اگلی آیت کی طرف توجہ ہی نہیں۔ سنیے کیا ہے پوری آیت۔(وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ و یجعل الرجس علی الذین لا یعقلون) (10:100) کوئی شخص ایمان نہیں لاسکتا' خدا کا قانون جو ہے اس کے مطابق اور قانونِ خداوندی یہ ہے کہ جو شخص عقل وفکر سے کام نہیں لیتا اس کے سامنے بات واضح نہیں ہوتی۔ پوری آیت ہے جی یہ۔اگر بات وہی ہوتی کہ خدا کے اذن یا حکم کے بغیر کوئی ایمان ہی نہیں لاسکتا اس میں اس کی عقل وفکر کا دخل ہی کیا تھا؟ اگلی آیت کے معنی کیا ہوئے؟ کہ جو شخص عقل وفکر سے کام نہیں لیتے تو معاملہ اس کے التباس میں رہتا ہے اضطراب ہے۔انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے رجس کے معنی پلیدی کر دیے ترجمہ اس کا پلیدی کر دیا کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان کو وہ پلیدی ان کے اوپر ڈال دیتا ہے۔بات کیا ہوئی صاحب یہ؟ یعنی کوئی ربط ان آیتوں میں پھر آپ کو یہ نظر آئے گا۔وہ مجبور نہیں کرسکتا' مجبور پیدا کرنا ہوتا تو ہم ہی ایسا کرتے۔کوئی ہمارے حکم کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا' جو عقل سے کام نہیں لیتا اس پہ ہم پلیدی ڈال دیتے ہیں۔سوچیے تو کیا سمجھے آپ۔اور سنئے کہ کیا کہتا ہے قرآن۔اے رسول کیا تو مجبور کرے گا ان لوگوں کو کہ ایمان لے آئیں' مجبوراً ہی ایمان لے آنا ہوتا تو ہم ان کو پیدا ہی کیوں نہ ایسا کر دیتے کہ ان میں انکار کی اجازہی نہ ہوتی اختیار ہی نہ ہوتا جبراً ہر شخص مسلمان ہوتا۔سوال یہ نہیں ہے۔ایمان تو انسان اپنے اختیار وارادے سے لائے گا اور اسکے لیے ہمارا ایک قانون مقرر ہے۔قانون یہ ہے کہ جو عقل وفکر سے کام لے گا اس کے لیے امکان ہے ایمان لے آنے کا۔اور جو ایسا نہیں کرتا ہے عقل وفکر سے کام نہیں لیتا ہے ہمارے قانون کے خلاف چلتا ہے تو وہ معاملہ اس کے التباس میں رہتا ہے مشتبہ رہتا ہے بات صاف نہیں ہوسکتی الجھاؤ میں رہتا ہے ہمیشہ وہ شخص جو عقل سے کام نہیں لیتا۔تو بات تو یہ ہوگئی۔ایمان لایا جاتا ہے عقل وفکر کی رو سے معاملات کے سمجھنے کا۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ہمارے قانون کے مطابق ایمان کی طرف نہیں آتا معاملہ مشتبہ رہتا ہے۔اور اگر تو رسول چاہتا ہے زبردستی اس طرح سے ایمان لے آئے بے شک وہ عقل وفکر سے نہ کام لیں کسی اور طریقے سے تو معجزے دکھا کے ان کو ایمان والا بنا دے۔تو پھر تمہاری ضرورت یہ کرنے کی کیا تھی' ہم پیدا ہی کیوں نہ اس قسم کا کر دیتے ان کو کہ سارے ہی مومن ہوتے۔کیسی صاف بات ہے عزیزانِ من!۔اب رہا یہ کہ اس کے لیے طریق کیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے یہ سارا کچھ نہایت حسن وخوبی سے چلتا ہے ہر چیز اپنے اپنے نتائج صحیح پیدا کرتی چلی جاتی ہے کسی قسم کا کوئی خلفشار کوئی انتشار کوئی فساد نہیں ہوتا۔عزیزانِ من! دیکھئے قرآن کا انداز کیا ہے۔اس نے بات یہ بتانی ہے کہ ان سے یہ کہو کہ دیکھو دونوں زندگیوں میں فرق ہے اور اس کے لیے کرتا کیا ہے۔(قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت و الارض) (10:101)

ان سے کہو کہ یہ باہر کی کائنات کا جو نظم ونسق ہے اس پہ غور کرو۔وہ یعقلون والی بات تھی نا کہ عقل وفکر سے کام لیں۔عقل وفکر سے کام لیں مشاہدے سے کام لیں یہ کہ دیکھتے نہیں کہ جو بیج ڈالا جاتا ہے اسی قسم کا پھل لگتا ہے اس میں۔یہ دیکھتے نہیں کہ یہ اتنے اتنے اجرامِ فلکی بھی

کس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس کے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دیکھتے نہیں کہ جو قانون کے مطابق یہ اشیاء عمل کرتی ہیں کس قدر ان میں امن ہے ان کے لیے۔ پتہ ہے آگ نے جلانا ہے پتہ ہے پانی نے پیاس بجھانی ہے۔(**قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت و الارض وما تغنی الاٰیٰت و النذر عن قومٍ لا یؤمنون**) (10:101) لیکن وہ لوگ جو پہلے سے یہ کہہ دیں کہ ہم نے ماننا ہی نہیں ہے انہیں یہ باتیں بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتیں۔ پھر وہی بات ہے کہ پہلا Attitude جو ہے وہ یہ نہیں ہوگا کہ ہم نے تو ماننا ہی نہیں کچھ۔ یہ نہیں ہے۔ خود ہی کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ ذرا ملاحظہ کریں مشاہدہ کریں قانونِ فطرت اس طرح سے کارفرما ہے۔ اس کے بعد یہ کہتا ہے لیکن یہ بھی انہی کو فائدہ دے گا جو اس طرح سے Open Mindedly آئیں اس بات کو سمجھنے کے لیے۔ اور جنہوں نے پہلے یہ طے کرلیا ہے کہ نہیں صاحب ہم مانیں گے ہی نہیں تو یہ بھی دکھاتے رہو ان کو صاحب۔ وہ دنیا کی ایسی بت پرست قومیں جنہوں نے دریاؤں کو پہاڑوں کو سمندر کو چاند کو سورج کو دیوی اور دیوتا بنا دیے تھے اور ان کے سامنے وہ ڈنڈوت کرتے تھے ان کے سامنے بھی تو یہ کائناتی قوتیں موجود تھیں۔ کہا جنہوں نے یہ پہلے ہی طے کرلیا ہو کہ ہم نے تو کوئی عقل وفکر سے کام ہی کچھ نہیں لینا تو ان کو لاکھ دکھاتے پھرو یہ انہیں بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں یہ چیزیں۔ کہا اتنا کچھ ان کو جو سمجھایا ہے تو پھر یہ کس بات کے انتظار میں ہیں۔(**فھل ینتظرون الا مثل ایام الذین خلوا من قبلھم**) (10:102) تو پھر اب اسی انتظار میں ہیں کہ جو کچھ پہلی قوموں کے ساتھ ہوا وہی کچھ ان کے ساتھ ہوگا۔ یہی انتظار ان کا بس رہ جاتا ہے۔ سب کچھ تو ہم نے کر دیا اس کے لیے۔ کہا اے رسول ان سے کہو(**قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین**) (10:102) کہا کہ دونوں راستے آ گئے میں اپنے راستے پہ چل رہا ہوں تم اپنے راستے پہ چلے جاؤ میں تمہیں مجبور کر ہی نہیں سکتا کہ جبراً دوسرے راستے پہ لے آؤں۔ تم انتظار کر رہے ہو کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' کہا ٹھیک ہے تم انتظار کرو اپنی روش کا نتیجہ دیکھنے کے لیے' میں انتظار کرتا ہوں اپنی روش کا نتیجہ تمہیں دکھانے کے لیے۔ دونوں انتظار کریں۔(**فسوف تعلمون**) دوسری جگہ ہے قرآن میں۔ اور اس کے بعد کہا یہ دیکھو مکے کی زندگی ہے عزیزانِ من! جہاں اس مٹھی بھر جماعت کو دنیا بھر کی مصیبتیں اذیتیں صعوبتیں تکالیف ان کے اوپر روا رکھی جا رہی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں سے یہ قوم بچ بھی جائے گی ان کے ہاں۔ قوم کیا تھی ایک مٹھی بھر جماعت تھی چند آدمی۔ کہا ان سے کہو کہ تم بھی انتظار کرو۔ کتنی بڑی عظیم قریش کی قوم سے مخاطب کر کے کہا جا رہا تھا یہ۔ نہ بھی انتظار کرتا کوئی بات نہیں۔(**ثم ننجی رسلنا و الذین اٰمنوا**) (10:103)

پھر تم دیکھو گے کہ ہم کس طرح اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو کہ جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے محفوظ رکھتے ان لوگوں کی گرفت اور اذیت سے۔ تم دیکھو لو گے خود۔ تمہارے ذہن میں ہے نا کہ کچھ کے رکھ دیں گے Press کر کے رکھ دیں گے۔ کہا یہ ٹھیک ہے دیکھ لو ذرا انتظار کرو۔ اور آگے ہے ایک عظیم چیز عزیزانِ من! کہا یہ جاتا ہے کہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں ہمارا ایمان پختہ ہے یا نہیں۔ کہا بات بڑی صاف ہے۔(**کذٰلک حقًا علینا ننج المؤمنین**) (10:103) کہا مومنوں کو اس قسم کی اذیتوں سے محفوظ رکھنا تو ہم پر واجب ہے

۔خدا کہتا ہے مجھ پہ یہ واجب ہے۔(**حقًا علینا**) کتنی بڑی چیز ہے۔ یہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ اتنی بڑی پابندیاں عائد کر لیتا ہے خدا اپنے اتنے ذی اقتدار ہونے کے باوجود۔(**حقًا علینا ننج المؤمنین**) (10:103) جہاں بھی کوئی مومن ہے اس کو ان چیزوں سے محفوظ رکھنا ہم پر واجب ہے۔ اللہ اکبر۔ تو جو قوم اس قسم کی اذیتوں صعوبتوں ذلتوں سے محفوظ نہیں ہے اگر اس کے باوجود وہ کہتی ہے کہ ہیں ہم مومن تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ (معاذ اللہ) خدا نے یہ یونہی کہہ دیا کہ (**حقًا علینا**) کہ ہم پہ واجب ہے۔ یا پھر یہ بات اس خدا کے متعلق یہ قوم کہتی ہے (معاذ اللہ) کہ ٹھیک ہے اس نے کہا تھا واجب ہے لیکن وہ بھی مجبور و معذور ہے صاحب کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ توبہ توبہ۔ بات ایک ہی رہ جاتی ہے کہ ہم ہی مومن نہیں ہیں کیونکہ اس نے تو یہ کہہ دیا ہے ہم پر فرض ہے مومن کو اس قسم کی اذیتوں سے محفوظ رکھنا۔ اور دوسری جگہ اس نے یہ کہا تھا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی غیر مسلم قوم مومن قوم کے اوپر غالب آ جائے دنیا میں۔ قرآن میں لکھا ہے یہ۔ دنیا بھر کی قوموں کی جوتیاں کھانا اور پھر اپنے آپ کو مومن اور مسلمان کہنا یہ تکذیب نہیں ہے قرآن کے ان دعاوی کی؟۔(**قل یایھا الناس**) (10:104) آیئے صاحب میں نے کہا ہے نا کہ ہر سورۃ کے آخر میں جو آیات آتی ہیں وہ نچوڑ ہوتی ہیں وہ ساری تعلیم کا جو اس سورۃ میں آتی ہے۔ اب وہ قومِ مخاطب عرب نہیں رہی وہ قومِ مخاطب ایک فرد نہیں رہا(**یایھا الناس**) (10:104)

اے نوعِ انسانی! سن لو(**ان کنتم فی شکٍ من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ ولکن اعبد اللہ الذی یتوفٰکم و امرت ان اکون من المؤمنین**) (10:104) اے نوعِ انسانی سن لو اگر تم میرے نگاہ میری روشِ حیات میں میرے نظامِ زندگی میں جسے میں اختیار کیے ہوں اس کے متعلق تمہیں کچھ شبہ ہے شک ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اپنا شک اپنے تک رکھو۔ میں تمہارے اس شک کی وجہ سے اسے چھوڑ کے کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کر سکتا کبھی نہیں کرونگا۔ مجھے اتنا یقین ہے اس روش کے سچے ہونے کے اوپر' میں تو اسی خدا کی محکومیت اختیار کرونگا کہ جس کے ہاتھ میں قوموں کی موت اور حیات ہے۔ ہاتھ میں کیا معنی؟ جس کے قانون سے وابستہ ہیں قوموں کی موت اور حیات' میں تو اسی کی محکومیت اختیار کرونگا۔ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ میں اسی کے مطابق اپنا یقین رکھوں اپنا ایمان رکھوں۔(**و ان اقم وجھک للدین حنیفًا و لا تکونن من المشرکین**) (10:105) مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ میں اس نظام کے اوپر اس طرح سے چلوں کہ ناک کی سیدھ جسے کہتے ہیں نا ہمارے ہاں محاورہ وہ ناک کی سیدھ جا رہا ہے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر۔ اِدھر اُدھر تکتا وہ ہے جسے کچھ تھوڑا سا شبہ ہوتا ہے راستے کے صحیح ہونے کا۔ جسے یقین ہوتا ہے کہ یہ راستہ اُدھر ہی جاتا ہے آپ دیکھیں گے کہ آپ دیکھ بھی نہیں رہے راستے پہ اور پاؤں آپ کے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ یہ حنیف ہوتا ہے کہ جو راستہ چلتا ہوا جسے ضرورت نہ پیش آئے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کہ ٹھیک جا رہا ہوں یا نہیں۔ اتنا یقینِ محکم ہوتا ہے اس چلنے والے کو' یوں میں جا رہا ہوں۔(**و لا تکونن من المشرکین**) (10:105) ضرورت ہی نہیں کہ میں یہ سوچوں کہ یہ راستہ یا اس کے ساتھ یہ راستہ' یہ روش یا اُس کے ساتھ یہ روش۔ سوال ہی نہیں۔ حنیف ہے۔ نصب العین متعین' راستے کے صحیح

ہونے پہ یقینِ کامل اور اس کے بعد اٹھ کے چل پڑنا۔ یہ آخری چیز تو سب سے مقدم ہے۔ یہ اس کے لیے تھی پہلی چیز بھی۔ نصب العین کا تعین منزل کا اور راستے کا صحیح ہونا تو اسی کے لیے فائدہ مند ہے جو چلے گا اس راستے پہ۔ یہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی شرط کیوں ہے؟ یہ چیزیں چلنے والے فائدہ دیں گی۔ راستہ صحیح ہے وہاں پہنچنا بھی ہے یہاں بیٹھ گئے جناب حقہ لے کے' بیٹھا رہو۔ یہ یقین کہ راستہ وہاں پہنچائے گا یہ یقین کہ وہ ہے جہاں ہم نے پہنچنا ہے اور بیٹھا ہے ڈر کے درخت کے نیچے حقہ لے کے۔ تو یہ پہنچ جائے گا وہاں؟ اسے اس راستے کی صحت اور منزل کے تعین کے اوپر یقین فائدہ کیا دے سکتا ہے۔ یہ ہے وہ چیز کہ یہ خالی مان لینا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ یقین ضروری ہے اس چلنے والے کے لیے کہ خوامخوہ غلط راستے کے اوپر نہ چل پڑے۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے لیکن یہ اس چیز کا یقین ہی کافی نہیں ہے چلنا ضروری ہے اس کے لیے۔ اسی لیے کہا **(وان اقم وجهک للدین حنیفًا ولا تکونن من المشرکین)** (10:105)۔ **(ولا تدع من دون الله ما لا ینفعک ولا یضرک فان فعلت فانک اذًا من الظٰلمین)** (10:106)

وہی پھر واحد کے صیغے چلے آ رہے ہیں مخاطب کے۔ وہی جو میں نے شروع میں کہا تھا یایھا الناس میں سے ان کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ تو کہا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کے قانون کے ساتھ اپنی امیدیں نہ وابستہ رکھو۔ قانون کے خلاف نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ کوئی نقصان۔ یہ سب اس کے قانون کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو یاد رکھو یہ ظلم ہے' ظلم میں نے بتایا تھا عربی زبان میں وہ کہتے تھے' کسی شے کا اس مقام پہ نہ ہونا جہاں اس کو ہونا چاہیئے'۔ **(وان یمسسک الله بضر فلا کاشف له الا هو و ان یردک بخیر فلا رآد لفضله یصیب به من یشآء من عباده و هو الغفور الرحیم)** (10:107) پھر اس آیت کا ترجمہ جو ہے اس میں عام کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو کوئی نہیں اس کے سوا جو اس تکلیف کو رفع کرے اور وہ اگر کوئی فائدہ پہنچائے تمہیں تو کوئی نہیں جو اس فائدے کو دور کرے اور وہ فائدہ پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے اس کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ چل بھئی۔ ارادہ فیصلہ حرکت عمل سب ختم۔ وہ فائدہ پہنچانا چاہے کوئی روک نہیں سکتا نقصان پہنچانا چاہے کوئی ٹال نہیں سکتا اور (یصیب به من یشآء) جس کے لیے چاہتا ہے وہ فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں قدم قدم پہ ساری تعلیم جو ہے اس کی پوری عمارت ہی دھڑام سے نیچے گر جاتی ہے۔ ہر ترجمے میں یہ نظر آئے گا آپ کو۔ اور بات تو اس نے وہی کہی کہ یاد رکھئے یہاں فائدے اور نقصان یہ تو سارا اس کے متعین کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ آگ میں انگلی ڈالئے انگلی جلے گی سخت تکلیف پہنچے گی۔ اب اس کے بعد یہ جو آپ کے ہاں کی یہ تکلیف ہے بڑے سے بڑے آپ کے President کی سفارش بھی اگر کہیں سے آپ لے آئیں تو کہو اے درد تو اس کو چھوڑ دے تو وہ درد نہیں مانتا' لاکھ روپیہ رشوت میں دیدیجئے کہ صاحب یہ درد کم ہو جائے نہیں کم ہو سکتا۔ ایسی جگہ انگلی ڈالئے آگ میں جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے کہ صاحب کسی سپاہی نے نہیں دیکھا تھانے نہیں لے گئے عدالت میں نہیں گئے۔ سزا تو اس طرح ہوتی ہے نا دنیا میں۔ تنہائی میں کمرے کے اندر یہ کیجئے تو پھر بھی وہ صورت ہے۔ یہ ہے جو کہا ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جو

نقصان پہنچنے والا ہو کوئی اس کو دور نہیں کر سکتا(الـہ) آگ کے جلے کا علاج اس دوائی میں کہ جو خدا نے اس کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔قانون کی خلاف ورزی سے تکلیف پہنچی قانون کے مطابق کام کرو تو پھر اس سے شفاء ہوگئی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے یاد رکھو۔جتنی شکلیں اور اختیار کرو گے وقتی طور پہ تو کچھ تمہیں فریب دے جائیں گی لیکن یاد رکھو کہ اس کا کبھی یقینی فائدہ نہیں پہنچے گا۔آپ ان دوائیوں کی بجائے دم اور درود اور گنڈے اور تعویذ اور یہ اور وہ کراتے پھریے وہ تو ذرا سا جلا تھا ناسور ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد ہاتھ کاٹنا پڑتا ہے۔(**فلا کاشف له الا هـــــو**) (10:107) یہ ہے عزیزانِ من! قرآن سے مفہوم متعین کرنے کا طریق۔یہ مفہوم خود میں نے اپنے طور پہ نہیں متعین کیے ہوئے قرآن کی دوسری آیات میں یہ سب کچھ موجود ہے۔تو جہاں خدا کہتا ہے کہ ہم یہ کرتے ہیں وہ کہتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کے لیے مقرر کر دیے ہیں کلمات اور سنت اللہ۔(**ولـن تـجد لسنت الله تبديلا**) خدا کے ان قوانین میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں تم پاؤ گے۔یہ ہے جو کچھ قرآن کہتا ہے اس معاملے میں۔(**فـلا رآد لـفـضـلـه**) (10:107) کوئی نہیں روک سکتا اس کے اس فضل کو۔میں نے کہا ہے نا کہ جب تم اس کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق یہ کچھ کرو اس کا جو نتیجہ حاصل ہونا ہے کوئی نہیں اُسے روک سکتا۔صحیح بیج صحیح زمین صحیح محنت اس میں ڈالا ہوا بیج وہ جو ایک ایک بیج سے سات سات سو دانے نکلتے ہیں کوئی اسے روک نہیں سکتا۔روک سکتا ہے کوئی؟ سوچو تو سہی۔کوئی ہے قوت اس قسم کی آپ کی کہ آم کی گٹھلی میں سے آم پیدا نہ ہو اور اس میں آم کی بجائے ببول کے کانٹے لگ جائیں۔روک سکتا ہے خدا کے قانون کے مطابق جو نفع ہونے والا ہو اس کو کوئی بھی؟ اور دے سکتا ہے نفع کوئی بھی کہ آپ نے اگر ببول بویا ہے تو اس میں آم لگ جائیں؟ ہے کوئی(**فـلا كاشف لـه الا هو**) (10:107)۔اور اس کے بعد(**يـصـيـب بـه من يشآء من عباده**) (10:107) پھر وہی ترجمے کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اسے دیتا ہے۔بابا یہ من یشآء عربی جاننے والے جانتے ہیں یہ ہمارا فضل وہ ہے کہ ہم نے کسی خاص نسل خاص قوم خاص رنگ خاص افراد کے لیے مختص نہیں کیا۔(**مـن يشـآء من عباده**) ہمارے بندوں میں سے جو چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے۔ذرا سا یہ وہاں سے نکل کے گذرا عجم کے راستے سے اور وہ راستے کی دھول اتنی پڑی اس کے اوپر عزیزانِ من! کہ اصلی چہرہ نظر ہی نہیں آتا۔یہ سارے ترجمے وہاں سے ہوئے ہیں(**من يشآء**) جسے خدا چاہتا ہے وہ دیتا ہے۔کتنی صاف بات ہے(**يصيب به من يشآء من عباده و هو الغفور الرحيم**) (10:107) اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے ہی تم اگر حفاظتی تدابیر اختیار کرو تو وہ محفوظ رکھتا ہے تمہیں، غلطی کر جاؤ اس کے اندر اور پھر اس کے قانون کی طرف رجوع کرو تو رحیم ہے پھر مرحمت بھی عطا کر دیتا ہے۔غفور اور رحیم ہے۔کہاں لایا ہے یہ دو لفظ۔میں نے کہا تھا نا کہ آیتوں کے آخر میں خدا جو اپنی صفات بیان کرتا ہے عزیزانِ من! غور کرنے کی چیز ہوتی ہے۔قانون کی رو سے نقصان قانون کی رو سے فائدہ، جو چاہتا ہے حاصل کرے اور اس کے لیے غفور رحیم لانا۔ارے پہلے سے ہی اگر تم حفاظتی (Precautionery Measure) جسے کہتے ہیں کہ پہلی چیز ہمارے ہاں Health کے لیے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ آ رہا ہے ہیضہ یہاں بھئی اس کے لیے یہ گلے ہوئے پھل نہ کھانا وہاں نہ

جانا یہ کرنا وہ کرنا۔ یہ ساری چیز مغفرت کی ہے حفاظت حفاظت حفاظت۔ کہا حفاظت بھی ہے۔ اور اگر کہیں غلطی ہو جاتی ہے کوئی بات نہیں رحیم' مرحم بھی ہم عطا کر دیں گے۔ وہ بھی اسی کے قانون کے مطابق پھر ہوتی ہے۔ جب ہیضہ ہو جاتا ہے تو اس کے بعد پھر وہ ڈاکٹر کے پاس وہ چیزیں بھی ہوتی ہیں جو اسکی صفتِ رحیمیت کی مظہر ہوتی ہیں صاحب۔ (**قل یایھا الناس قد جآء کم الحق من ربکم**) (10:108) پکار کے کہہ دو نوعِ انسانی سے الحق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ کتنی خود اعتمادی ہے اس اعلان کے اندر۔ پکار کے کہہ دو کہ آ گیا ہے۔ اور سنیے عزیزانِ من! جو میں نے کہا تھا کہ یہ جو چیزیں میں بیان کرتا ہوں اپنی طرف سے نہیں قرآن ہی کی طرف سے ہے۔ یہیں ایک آیت آ گئی پکار کے کہہ دو (**فمن اھتدٰی فانما یھتدی لنفسہٖ و من ضل فانما یضل علیھا**) (10:108) جو صحیح راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے ہی لیے صحیح راستہ اختیار کرے گا اُسے اس سے فائدہ پہنچے گا۔ جو غلط راستے پہ چلے گا وہ تباہی اپنے لیے خریدے گا وہی تباہ ہوگا نہ خدا کا کچھ بگڑے گا نہ کسی اور کا کچھ بگڑے گا۔ دیکھتے ہیں آپ' اس کی موجودگی میں یہ چیز کہنا کہ صاحب جسے وہ چاہے گمراہ کرے جسے وہ چاہے ہدایت دیدے جسے چاہے وہ نقصان پہنچا دے جسے چاہے وہ فائدہ پہنچا دے۔ (**فمن اھتدٰی فانما یھتدی لنفسہٖ**) الناس کو پکارا ہوا ہے نوعِ انسانی کو پکارا ہوا ہے۔ جو بھی صحیح راستے پہ چلے گا (**یھتدی لنفسہ**) (10:108) عربی جاننے والے جانتے ہیں ل کس چیز کے لیے آیا کرتا ہے' اپنے ہی فائدے کے لیے وہ یہ کرتا ہے'۔ (**و من ضل فانما یضل علیھا**) (10:108) اور جو غلط راستے پہ چلتا ہے اس کا وبال اس کی تباہی بھی اسی کے اوپر آتی ہے۔ (**وما انا علیکم بوکیل**) (10:108) ان سے کہہ دو کہ نہ میں نہ میرا خدا تمہارے اوپر نگران بن کے نہیں آئے ہوئے کہ ڈنڈا مار مار کے تمہیں صحیح راستے کے اوپر چلاتے پھریں۔ دورا ہے پہ تمہیں کھڑا کر دیا سائن پوسٹ لگا دیا راستہ بتا دیا آنکھیں دیدیں روشنی دیدی۔ ہمارا فریضہ یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد ڈنڈے مار کے چلاتے پھریں کیونکہ ڈنڈے مار کے چلانے والی بات جو ہے وہ انسان کے اختیار و ارادے کے خلاف جاتی ہے۔ اس دورا ہے کے اوپر ہم نے کہہ دیا ہے کہ (**فمن اھتدٰی فانما یھتدی لنفسہ و من ضل فانما یضل علیھا**) (10:108) ادھر جاؤ گے منزلِ مقصود پہ پہنچ جاؤ گے' یہ راستہ اختیار کرو گے ہر قدم منزل سے دو گنے فاصلے پہ لے جائے گا تمہیں یاد رکھو۔ اور اس کے بعد اگر یہ چاہو کہ صاحب یہاں سے پھر اب زبردستی تمہیں (**وما انا علیکم بوکیل**) (10:108)۔ کتنا احترام ہے عزیزانِ من! خود خدا کو شرفِ اختیار و ارادے کا۔ کیا مشکل ہے اس کے لیے نگران ہو جانا۔ قطعاً نہیں پھر۔ صاحبِ اختیار بتا دیا جتنی چیزیں ضروری تھیں صحیح اختیار کے استعمال کرنے کے لیے وہ سب بتا دیں سب کچھ دکھا دیا' زبردستی نہیں ہے صاحب۔ یہ کہتے ہیں ٹھیک ہے صاحب وہ خدا تو نہیں ہے ہم تو ہیں نا زبردستی۔ وہ اکبرالہ آبادی جو تھا کہ کام لیتے ہیں پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو' وہ تو آگے جا کے کی بات ہے پہلی رات میں حوالات میں یہ کچھ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں نا وہ لوگ کہ ٹھیک ہے صاحب خدا نگران نہیں ہے وہ زبردستی نہیں کرتا وہ جہنم میں نہیں پھینکتا نہ پھینکے ہم جو بیٹھے ہیں یہاں نگران ہم ہیں تمہارے اوپر داروغے۔ وہ رسول سے کہتا ہے کہ (**نست بمستیر علیھم**) تم ان کے اوپر تھانیدار نہیں مقرر

کر کے بھیجے گئے بابا' تم داروغے نہیں ہو۔ ہمارا ملا یہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے خدا نہیں وہ نہیں ہم ہیں داروغے ''اے تمہاری ایسی کی تیسی'' ایک سال کے نوٹس کے بعد ساری قوم کو قتل کر دیا جائے گا۔ چل بھئی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ''باقی اوہے رہن جیہڑے اوہناں نوں ووٹ دین''۔ ''بڑا سہل طریقہ ہے انتخاب جتن دا''۔(**وما انا علیکم بوکیل**) (10:108)۔(**و اتبع ما یوحٰی الیک**) (10:109)

اب یہ کہا گیا ہے کہ تیرے لیے کرنے کا کام یہ ہے۔ سب کچھ کہہ چکا ہے نا دوسروں کو۔ ٹھیک ہے اب تو اس راستے پہ چلنا شروع کر دے یہیں کھڑا ہو کے وعظ کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ جو وحی کی جاتی ہے تمہاری طرف' اس کے اوپر چلتا جا۔(**واصبـــــر**) (10:109) استقامت سے چلتا جا' ثابت قدمی سے چلتا جا۔(**حتّٰی یحکم اللہ**) (10:109) تآنکہ خدا کا وہ فیصلہ سامنے آ جائے۔(**و ھو خیر الحٰکمین**) (10:109) سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا تو وہی ہے۔ ابھی آئے گا فیصلہ تمہارے سامنے (**واصبر**) استقامت شرط ہے عزیزانِ من! سورۃ یونس آج ختم ہوگئی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم